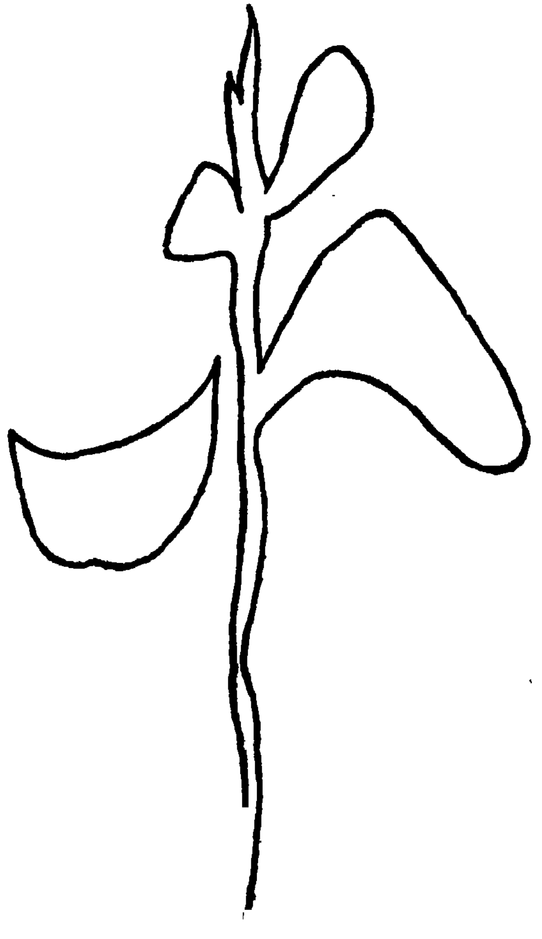
ادارہ ادبیات اردو



بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جنوری ۱۹۸۴ء جلد (۴۶) شمارہ (۱)

سن اجرا: ۱۹۳۸ء

فون: ۳۸۴۶۹

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

زر سالانہ: ۲۵ روپے کتب خانوں سے: ۲۵ روپے

بیرونی ملکوں سے: (بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے)

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطی:	۱۵ ڈالر	۸ ڈالر
امریکہ:	۲۴ ڈالر	۸ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون:	۴ ڈالر	۲½ ڈالر
انگلستان:	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

• سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر حیدرآباد ۲ سے شائع کیا • کتابت: رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

ترتیب

اپنی بات

"سب رس" کے اس شمارے کے ساتھ ہم نئے سال کا نئی امیدوں اور نیک تمناؤں کے ساتھ پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو سالِ نو کی مبارک باد دیتے ہیں۔

ایک عرصے سے ہم "سب رس" میں کچھ صوری اور معنوی تبدیلیاں لانے کے خواہش مند رہے ہیں۔ ہم محدود وسائل کی وجہ سے اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لانے سے قاصر رہے۔ اب حالات کسی قدر سازگار ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس شمارے سے ہم نے رسالے کی ضخامت میں تھوڑا سا اضافہ کیا ہے۔ قارئین کو مواد کے تنوع کے ساتھ معیار میں بھی بہتری محسوس ہوگی۔

خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہم نے قدم آگے بڑھایا ہے۔ امید ہے کہ قلمی معاونین اور قارئین کا بھرپور تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔ کاغذ کی قیمت، کتابت و طباعت کی اجرت اور ڈاک خرچ میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے مجبوراً زرِ سالانہ میں بھی اضافہ کرنا پڑا لیکن اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ خریدار پر زیادہ بار نہ پڑے۔ ہم اپنے تمام قارئین اور اردو دوستوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ "سب رس" کی توسیعِ اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

مغنی تبسم

(ڈاکٹر) عالم خوندمیری

عوض سعید کی افسانہ نگاری کا جائزہ "رات والا اجنبی" کی روشنی میں

عوض سعید کے افسانوں کا یہ نیا مجموعہ پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں چند افسانے نہایت مختصر اور بعض اوسط حد تک طویل ہیں۔ کم از کم چھ کہانیاں اس قابل ہیں کہ انھیں پچھلے چند برسوں میں لکھی جانے والی معنی خیز اور نمایاں کہانیوں میں شامل کیا جائے۔ عوض سعید کا فن انتہائی مختصر کہانیوں میں اپنا کمال دکھاتا ہے اور کم از کم اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد' استقرائی طور پر' یہ بات بے جھجک کہی جا سکتی ہے کہ جہاں عوض سعید نے ایک مکمل کہانی لکھنے کی کوشش کی وہاں ایک بلند پایہ افسانہ نویس کی حیثیت سے اپنے فن کو اُجاگر نہ کر سکے۔ مکمل کہانی سے میری مُراد وہ کہانی ہے جو قاری کے ذہن کو کسی قسم کی الجھن میں نہیں ڈالتی۔ ایسی ہی کہانی دُہرائی بھی جا سکتی ہے اور ایک قصے کے طور پر بیان بھی کی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک نتیجہ بھی ہوتا ہے اور علت اور حصول کا نظام بھی برقرار رہتا ہے۔ ایسی ہی مکمل کہانی پڑھ کر ایک مہذب قاری تو یہ فیصلہ صادر کرتا ہے کہ کہانی حقیقی زندگی سے اتنی قریب ہے۔ کسی بھی مقام پر قاری کو تشویش اور کرب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

یوں بظاہر عوض سعید کی ایسی ہی "مکمل" کہانیاں کہانی کہنے کے مروجہ معیار پر پوری اترتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک عام قاری کو جو سفر کو آسان بنانے کے لئے یا بستر پر تنہا وقت گزارنے کے لئے افسانوی ادب کا مطالعہ کرتا ہے ایسی ہی مکمل کہانیاں پسند آئیں گی۔ مثلاً وہ "رات والا اجنبی" کے مقابلے میں "سمجھوتہ" کو اور "فیری" کو پسند کرے گا۔ "جلا وطن" کے مقابلے میں "خاک دل" اور "غنڈہ" اسے پسند آئیں گی۔ جہاں جہاں عام آدمی پڑھتے ہوئے اسے ایک عجیب سی ہیئت طاری ہوگی اور اپنے دماغ کی رگوں کو پھٹتا ہوا محسوس کرے گا وہیں "کفارہ" اور "جاہت" کے پنگھٹ پڑھ کر عوض سعید کو دعائیں دے گا اور "اداس نسل کا آخری آدمی" پڑھتے ہوئے شاید وہ کتاب کو پھینک دینے پر مائل ہو جائے لیکن صبر کرتے ہوئے "صلیب" اور "دل خانہ خراب" پڑھے گا تو اس کی برگشتگی تسکین میں مصنف سے نفرت محبت میں بدل جائے گی۔ شاید عوض سعید سے سمجھوتہ کر لے

پھر اپنے آپ کو آمادہ کرلے۔ لیکن یقین ہے کہ 'مردہ گاڑی' اس کو قطعی بے معنی لغو اور مہمل کہانی نظر آئے گی۔ ایسے اوسط مہذب قاری کا ردِ عمل یہی ہوگا کہ جدیدیت کی رَو نے اتنے پیارے افسانہ نویس کو کس حد تک تباہ یا گمراہ کردیا۔

مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگر اس مجموعے میں ایسی ہی منفی " کہانیاں ہوتیں تو کوئی اردو اکیڈیمی اس مجموعہ کو انعام کا مستحق قرار نہ دیتی۔ عوض سعید نے شاید اکیڈیمیوں کی لاج رکھنے کے لئے "مکمل" کہانیاں بھی شامل کردی ہیں۔ اردو کی حفاظت اور بقا کے لئے بہرحال اردو اکیڈیمیوں کا وجود ضروری ہے۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ مکمل کہانیاں در خورِ اعتنا نہیں بلکہ مواد کے لحاظ سے ان میں مدھم جو انسانیت دوستی ہے اور اس بات کی بھی گواہی ملتی ہے کہ عوض سعید سماجی شعور کا بھی حامل ہے۔ فن کے لحاظ سے اس میں حقیقت پسندی کے معیار کا بھی کامل لحاظ رکھا گیا ہے بلکہ دو ایسی کہانیوں میں حقیقت پسندی سماجی حقیقت پسندی کے قریب قریب بھی پہنچ جاتی ہے۔

میرا مطلب یہ بھی نہیں کہ ایسی مکمل کہانیاں لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ یقیناً ان کا ایک ادبی اور سماجی جواز ہے۔ ایسی ہی کہانیاں ادب کو سماج کے لئے زندہ رکھتی ہیں اور سماج سے ادیب کے رشتے کو برقرار بھی رکھتی ہیں لیکن جہاں سوال جواز کا نہیں، معنویت اور فنی ضرورت کا ہو وہاں ایسی مکمل کہانیاں ادیب کے لئے صرف اعتذار کا لیکن ادب خصوصاً افسانوی ادب کا ایک رُخ سماج سے رشتہ توڑ لینے کا بھی ہے اور ہر سماج میں خواہ وہ کتنا ہی آسودہ ہو کبھی کبھی اگر خارجی طور پر نہیں تو روحانی یا باطنی طور پر رشتہ توڑ لیتا ہے۔ ایسے ہی ٹوٹتے ہوئے لمحات ادبی تخلیق کا لمحہ ہوتے ہیں، اس خواب ناک لمحہ میں راست بیان کے بجائے اشاروں، زندہ استعاروں اور نئی اور پُراسرار علامتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ زیست کی بے آہنگی اور انتشار کے ایک ایسے تخیل کو جنم دیتا ہے جس کو بجا طور پر وجودی تخیل (EXISTENTIAL IMAGINATION) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ فرد اور سماج کی بے ربطی اور فرد اور کائنات کے ٹوٹے ہوئے رشتے ایک اندرونی اور باطنی آہنگ پیدا کرتے ہیں اور یہی باطنی آہنگ فن کا آہنگ اور ربط بن جاتا ہے۔ اس منزل پر فن کی تکمیل کے مروجہ معیارات بیکار ہوجاتے ہیں اور فنی تخلیق کا لمحہ خود اپنا معیار تلاش کرلیتا ہے۔

عوض سعید کی کم از کم چھ کہانیوں 'رات والا اجنبی' 'جلا وطن' 'چوتھا آدمی' 'تثلیث' 'مردہ گاڑی' اور 'اداس نسل کا آخری آدمی' میں وجودی تخیل کا بھرپور کرشمہ نظر آتا ہے۔ ان کے کردار بھی حقیقی معنوں میں وجودی کردار ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ وجودی کردار بھٹکا ہوا PERVERTED کردار نہیں ہوتا وہ جنسی تسکین کے لئے حقیقی جنسی معروض کی بجائے جنسی تبادلات کی تلاش نہیں کرتا، وہ زیست کے ہنگامہ کا ایک ایسا شریک تماشہ ہوتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے کرب اور اضطراب میں شریک۔

ہوتا ہے۔ ان چھ کہانیوں کے کردار اسی مفہوم میں وجودی کردار ہیں ان کہانیوں میں ایک امر مشترک ہے۔ ان کے کردار اجنبی ہیں۔ اپنے آپ سے بھی اجنبی اور انسانی کائنات سے بھی (A LIE NABET) ایسے اجنبی کردار اپنی شخصیت کا دوسرا رخ بھی رکھتے ہیں جہاں وہ باطنی طور پر شریک بھی بن جاتے ہیں۔ اس لئے وہ کردار سے زیادہ غیر کردار اور ہیرو سے زیادہ غیر ہیرو نظر آتے ہیں لیکن وہ جو بظاہر غیر کردار یا غیر ہیرو ہیں دراصل باطنی طور پر انسانی موقف کو بدل دینے کی بے پناہ آرزو اور تمنا بھی رکھتے ہیں۔ ان کی ناکامی یہ نہیں کہ وہ بے حوصلہ ہیں بلکہ ان کی ناکامی کا راز ان کے اس عرفان میں پوشیدہ رہتا ہے کہ انسانی تاریخ فرد کی ناکامیوں کی ایک طویل کہانی ہے جب انفرادی حزن تاریخی عرفان سے قریب تر ہوتا ہے تو اسی لمحہ وجودی تخیل پیدا ہوتا ہے اگر ایک طرف موجودہ تخیل پامال علامتوں اور استعاروں کو رد کرتے ہوئے کئی علامتوں اور استعاروں کی تخلیق کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے اور خارجی حقیقت کے فرق اور بُعد کو ایک ایسے خالص انفرادی عمل سے رفع دفع کرتا ہے جس میں بظاہر سماجی افادیت نہیں ہوتی لیکن زیست کی سطح پر یہ عمل مکمل اور ختم ہوتا ہے۔ مثلاً رات والا اجنبی کے آخری جملے :

"وہ دیوانہ وار سڑک پر بھاگ رہا تھا۔

ارے اس آدمی کو تو دیکھو کیسے تیز بھاگ رہا ہے' جیسے ریل چھوٹنے والی ہو۔

اب سارے لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو چکی تھی اب اپنی عقل اور بساط کے مطابق ہر آدمی کوئی نہ کوئی فقرہ کس رہا تھا۔' یکبارگی اسے ایسا لگا جیسے اس کا بکھرا ہوا وجود تکمیل پا چکا ہو"

یہ ایک خود سے بیگانہ یا اجنبی فرد کی کہانی ہے جس نے زیست کی تکمیل کے لئے اپنے لئے ایک رول چن لیا ہے۔ یہ رول اتنا ہی غیر حقیقی ہے جتنی کہ اس کی زندگی۔ لیکن اسی رول میں اس نے معنویت بھی تلاش کی ہے اور آزادی بھی۔ عوض کو ایسے بیگانہ اور اجنبی کرداروں کا گہرا عرفان حاصل ہے اور اسی لئے وہ ایسی علامتوں اور ایسے استعاروں کی تخلیق پر قدرت رکھتا ہے جو ایسے کرداروں کی وحشت اور ان کے تردد کا مکمل اظہار کرتی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کہانی "جلاوطن" اس ہنگامہ خیز جملے پر ختم ہوتی ہے :

"اس نے تکیہ سیدھا کرنے کے لئے جب ہاتھ بڑھایا تو اسے حیرانی ہوئی کہ

آج خلاف توقع گھڑی بند تھی ——————"

جلاوطن خود ایک علامت ہے، نئے دور کے فرد سے بیگانہ حساس فرد کی۔ یہاں سڑک آرزو اور گھڑی کی تثلیث جہاں بیگانگی کو ابھارتی ہے وہیں اندرونی یا باطنی مصالحت یا —————— (RECONCILIATION) کے عمل کی علامت بھی بن جاتی ہے اس طرح جو تھا آدمی اپنی

بیگانگی کی ایک عجیب قسم کے پُراسرار انسانی رفاقت سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کہانی میں ایک پُراسرار انسیت (HUMANISM) کی فضا ابھرتی ہے ایک ایسی انسیت کی جو سماجی نہیں بلکہ عصری ہے اور اس کا آخری جملہ : "ارے بھائی۔ یہ تو اپنا قبرستان نہیں ہے" جہاں اس عصری انسیت کا پلہ بھاری کر دیتا ہے وہیں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہے کہ انسانی تاریخ کے بوجھ کو اپنے کندھوں سے اتارا نہیں جا سکتا۔ ایک نوع کی بیگانگی بہرحال انسانی مقدر ہے۔

غیر کردار یا غیر فرد کی باطنی امنگ کا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے "تثلیث" میں یوں اظہار ہوتا ہے

"بوجھ اٹھانے سے .... سرایت کر چکا ہے۔

اور ادھر نسل کا آخری آدمی میں عوض سعید نے عصری دنیا کے ان تھکے ہوئے اور خستہ حال انسانوں کی علامتی تصویر پیش کی ہے جس پر غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

وہ جو خود زیست میں آزادی حاصل نہیں کر سکتے، زیست سے آزادی میں تکمیل تلاش کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کی اس تمنا کی تکمیل کر دے۔

اس مجموعے کی سب سے کامیاب اور زندہ کہانی "مردہ گاڑی" ہے جو ایک ایسی مکمل نظم یا مکمل تصویر کی مانند ہے جس کا تجزیہ ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں افسانہ، شاعری اور تصویرکشی "مردہ گاڑی" کی علامت میں متحد ہو جاتے ہیں ایسی کہانی کسی بھی کہانی کار کی آرزو بن سکتی ہے۔

لانبے بال والا نوجوان ہی اس دور کا ہیرو ہے جس پر انسانی نجات کا دار و مدار ہے۔ شاید یہی فوق البشر بھی ہے اور اقبال کا مردِ مومن بھی۔ یہی گمنام زر رستیدہ شخصیت کا حاصل ہے جو "امانت" اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ یہاں عوض سعید کا وجودی تخیل اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے۔

ان کہانیوں کی زبان عوض سعید کی فن کاری کا اعلیٰ ترین نمونہ فراہم کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس سے پہلے کے مجموعے کی کہانیوں پر رائے دی تھی:-

"ان افسانوں میں اسرار سطح پر نہیں تیر رہے ہیں بلکہ بطن سے ابھر رہے ہیں۔"
"رات والا اجنبی" میں یہ عنصر اور گہرا ہو گیا ہے۔ ●

عوض سعید

کوما

روز کی طرح آج بھی رات کے تابوت میں وہی سب کچھ تھا۔

بن یہ صبح ـــــ ؟ یہ تو رات سے بھی زیادہ ظالم 'کھٹور' بھیانک اور بدصورت ہے۔

معبود۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ رات گزرنے کے بعد پھر لوٹ کر نہ آئے اور صبح کی سپیدی اپنا منہ چھپائے یں اور چلی جائے۔ دور جنگلوں اور بیابانوں میں تاکہ وہ اپنے چہرے کے نقوش اجالے کے سامنے بے نقاب نہ کر سکے۔

وہ کرسی پر اس طرح لاتعلقی سے بیٹھا تھا جیسے بیمار کی ذات سے اُسے ذرا بھی دلچسپی نہ ہو۔ پھر وہ ہسپتال کیوں آیا تھا۔ کس نے اسے یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔

ایسے کئی سوال اس کے ذہن میں اُبھر رہے تھے جنھیں وہ ذرا سی بھی اہمیت دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ انجانا سا غم جس کی گرفت میں وہ جکڑا ہوا تھا۔ خود اس کے لئے ایک سوال تھا اور جب سوال ایک چیلنج بن جائے تو جواب کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

آج تنہائی کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وسوسے' الجھنیں' دوری قرب' زندگی موت' اچھائی' برائی' کچھ پانے اور کچھ کھونے کی خواہش ـــ اور ہر خواہش کے مزار پر بیٹھا ہوا کالا ناگ ـــــــــــ

کوما ـــــ کوما ـــــــــ کتنا زہر بھرا ہے اس لفظ میں۔

شاید ایسی منزل پر پہنچ کر آدمی کا دماغ شعوری سطح پر بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔

اب وہ اس کے سرہانے کھڑا تھا اس انتظار میں کہ اس کے منجمد ہونٹ ذرا بھی حرکت میں آئے تو وہ اسے یاد دلا سکے کہ وہ ......

نہیں نہیں ـــ وہ تو اب ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان اپنے بیڈ پر آخری سانس لے رہا ہے۔

"ڈاکٹر ـــــ ؟"

"شاید بچ جائے۔"

"ڈاکٹر ـــــــــ"

"ابھی کچھ امید باقی ہے۔ کیوں کہ اس کے منجمد ہونٹ کبھی کبھار ۔۔۔۔"

"ہاں میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔ جیسے وہ آخری بار کچھ کہنے کیلئے تڑپ رہا ہو ـــ"

اس کے ہونٹوں کی طرح اس کے گھر پر بھی مدت سے تالا پڑا تھا۔ اس کے گھر کی چابی کہیں گم ہو چکی تھی۔ شاید در و دیوار پر مکڑیوں نے جالے بکھیر دئے ہوں۔ پرندوں نے اپنا گھر بنا لیا ہو۔

موت ـــــــــــ

چابی ـــــــــــ

تالا ـــــــ اور بند گھر ـــــــــــ

"ممکن ہے بچ جائے۔" ـــــــ "شاید نہ بچے۔"

"وہ مرتا بھی تو نہیں۔"

کبھی وہ روز اس کے گھر آیا کرتا تھا۔ لمبی لمبی گپیں ہانکنے، ہنسنے ہنسانے اور کبھی کبھار ڈرامائی انداز میں آنسو بہانے کے لئے۔ جیسے وہ اسٹیج کا ایک منجھا ہوا ایکٹر ہو۔

"بھابی مجھے آپ کے ہاتھ کی چائے بہت پسند آتی ہے۔ مجھے تو دہلی میں بھی وہ مزا نہیں آتا جو آپ کے ہاتھ کی چائے پینے میں آتا ہے۔"

"گپ باز کہیں کا۔"

وہ پرانا دیو ہیکل اسپتال شہر کی اس اہم سڑک سے کچھ اس طرح جڑا ہوا تھا جیسے زندگی اور موت کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہ ہو۔

اس شاہراہ پر سے وہ روز اس طرح گزرتا تھا جیسے یہ راستہ ـــــــ راستہ نہ ہو کوئی پل صراط ہو۔

وہ یکبارگی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آفس کی طرف چل پڑا۔

آفس سنسان تھا۔ لوگ باگ جا چکے تھے۔ ایک چپراسی ہاتھ میں ایک فائل دبائے آفس کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

"ذرا دیکھنا میڈم کہیں اسٹاف روم میں تو نہیں ہے؟"

"نہیں صاحب، اسٹاف روم بند ہے۔ جو یہاں تھے، وہ سب جا چکے۔"

اس نے ذرا سا بھی انتظار نہ کیا۔ کم از کم آج تو اسے ٹھہرنا چاہیے تھا۔

"بھابی یہ میری طرف سے آپ کی سالگرہ پر تحفہ ـــــــــ"

"انھیں تو میری سالگرہ کی تاریخ یاد نہیں رہتی۔"

"مان لو اگر کسی دن میں اچانک مرجاؤں۔ اس وقت تم کیا کرو گے۔ یہی نا کہ مجھے مٹی میں پھینک آنے کے چند ہی ماہ بعد اپنی تنہائی کا جواز تلاش کرلو گے۔"

"کیا تم بھی مجھے ان ہی لوگوں کی طرح سمجھتی ہو' جنھوں نے....."

"میں جانتی ہوں تم آگے کیا کہنا چاہتے ہو۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہوا کے جھونکے کی طرح گھر میں داخل ہو اور اسی انداز سے لوٹ جائے۔"

"ایک بھانڈ جب اپنا روپ بدلتا ہے تو کبھی کبھی ایک سنجیدہ آدمی کو بھی اس کی جگہ لینی پڑتی ہے لیکن میری نظر میں وہ دونوں مسخرے ہیں' کیا تم میرے اس خیال سے متفق ہو؟"

"نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی مر کر بھی دفن نہیں ہوتا اور کوئی زندہ رہ کر آپ ہی آپ دفن ہو جاتا ہے۔"

"آئندہ کیا ہوگا۔ یہ میں نے کبھی نہ سوچا۔ میں نے ہمیشہ آج کی چوکھٹ پر سجدہ کیا ہے۔ آنے والے کل سے مجھے ذرا بھی واسطہ نہیں۔ آج تم تنہا میرے ساتھ ہو۔ یہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔"

وہ گھر کی دہلیز پر کھڑا ان گڈمڈ ہوتے ہوئے سایوں کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ ایک انجانا سا غم جس کی گرفت میں وہ جکڑا ہوا تھا خود اس کے لئے ایک سوال تھا اور جب سوال ایک چیلنج بن جائے تو جواب کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

اس پل صراط پر وہی نہیں اور لوگ بھی تھے جن کے چہروں پر کالی نقابیں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ بے نقاب تھا۔

"چہرہ پر ماسک لگالو۔ ورنہ اوندھے منہ گر پڑو گے۔" کسی نے پیچھے سے ہانک لگائی اور وہ نیچے گرتے گرتے بال بال بچ گیا۔

"چہرے پر ماسک لگالو ورنہ نیچے پاتال میں گر جاؤ گے۔"

پھر اچانک اس کے ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔ اسے احساس ہوا جیسے اس کا چہرہ بھی اور چہروں کی طرح نقاب سے ڈھکا ہوا ہے۔

"اب بھی وقت ہے چہرہ پر ماسک لگالو" پھر وہی آواز ابھری۔ اسے یہ سب کچھ خواب سا لگا۔

سہ پہر کی اُداسیاں' شام کے سایوں میں آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھیں اور اس کے قدم اسپتال کی جانب اس طرح بڑھ رہے تھے جیسے کسی نے اس پر سحر کردیا ہو۔

ہسپتال سے لگی ہوئی خاموش سڑک آج لوگوں کے ہجوم سے اٹی ہوئی تھی اور لوگ اپنے اپنے اعمال ناموں کا بوجھ اٹھائے ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

اس کے پاس بھی اپنے اعمال نامے کی ایک کہنہ پٹاری تھی جس میں اس کے شب و روز کے حساب کی بجائے کسی اور کے شب و روز کا حساب کب کا جمع ہو چکا تھا۔

اب اس کے سامنے دواخانے کی کہنہ عمارت سر اونچا کئے کھڑی تھی جہاں اسے جانا تھا۔ وہ ہسپتال کے لان سے گذرتا ہوا سیڑھیوں سے لگی لفٹ کے قریب جب پہنچا تو اس کی نگاہیں اس تختی پر گئیں جہاں "آج لفٹ OUT OF ORDER ہے" کی اطلاع درج تھی۔

دواخانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے آج پھر ایک بار احساس ہو رہا تھا جیسے وہ پل صراط پر چل رہا ہو۔ " ۲۷ نمبر والا تو ابھی تک موت سے جنگ کر رہا ہے"۔

ایک لمحے کے لئے اس کے قدم رک سے گئے۔

"جس شخص میں موت سے لڑنے کی اتنی ہمت ہو وہ کسی نہ کسی طرح ہسپتال کی گھٹن سے باہر آ ہی جاتا ہے"۔ لو وہ ڈاکٹر بھی آ گیا۔

شائد ۲۷ نمبر والا ؟ اس کے قدم پھر ایک بار رُک گئے۔

" ڈاکٹر کیا وہ بچ جائے گا ؟ میں نہیں چاہتا کہ وہ مزید زندہ رہے"۔

" کیا کہہ رہے ہو ؟"

" ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں ڈاکٹر"

کوئی مر کر بھی دفن نہیں ہوتا اور کوئی زندہ رہ کر آپ ہی آپ دفن ہو جاتا ہے۔

" مگر وہ ۲۷ نمبر والا تو کبھی کا ؟"

اس کے قدم چلتے چلتے پھر ایک بار رُک گئے۔

اب اس پل صراط پر وہ ہی نہیں اور لوگ بھی تھے جن کے چہروں پر سیاہ نقابیں چڑھی ہوئی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ بے نقاب تھا۔

"چہرے پر ماسک لگالو۔ ورنہ اوندھے منھ گر پڑو گے"۔

اس نے نیم وا آنکھوں سے نیچے کی طرف دیکھا۔ ہسپتال سے لگی ہوئی خاموش سڑک آج لوگوں کے ہجوم سے اٹی ہوئی تھی اور لوگ اپنے اپنے اعمال ناموں کی پٹاریاں کھولے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے ! ●●

عوض سعید

پھانس

ایک مدت کے بعد جب اچانک اس سے میری مڈبھیڑ ہو گئی تو وہ مجھے کافی نڈھال اور مردم گزیدہ سا لگا۔ اس کے موٹے موٹے خشک ہونٹوں کی محراب سے اس کے میلے دانت یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ دانت نہ ہوں پپیتا پھل کے بیج ہوں۔

میں نے اس کی ذات میں کوئی دلچسپی لینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ حتمی طور پر میری مدد کا محتاج ہو۔ تاہم وہ ساری پچھلی باتیں اور یادیں لگ بھگ بھلا چکا تھا۔ بھولنا اور بھلا دینا شائد اس کی کمزوری تھی۔

آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی دیکھی۔ ایک ایسی ویرانی جو الفاظ کے کئی حصاروں کو توڑ تو سکتی ہے لیکن گرفت میں نہیں آتی۔ میں جلدی میں تھا۔ شائد میں جلدی میں نہیں تھا۔ پھر وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے نہ آگے بڑھنے کی اجازت دی اور نہ پیچھے ہٹنے کی۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ پھر کبھی ہم فرصت سے ملاقات کر سکیں؟"

"نہیں نہیں جو بھی بات ہوگی آج ہی ہوگی۔ اس کے بعد پھر کبھی نہ ہوگی۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں، بلکہ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے یاروں ہی کے سامنے اس کا ذکر کر سکتا ہے۔"

"تم عمارت کی بنیاد میں غلط پتھر رکھ رہے ہو، تمہیں یقین ہے کہ میں تمہارے مسائل میں دلچسپی دکھاؤں گا؟"

"یقین ہے اور ساتھ ساتھ اعتماد۔ اور بھرپور اعتماد۔"

"یقین اور اعتماد میری نظر میں بڑے بودے لفظ ہیں۔"

ٹریفک کے شور میں میری باتیں شائد وہ سن نہیں پا رہا تھا اور اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

'اچھا تو ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ کوئی گوشۂ تنہائی تلاش کریں اور وہاں بیٹھ کر ۔۔۔۔۔۔ دراصل ان بھاگتے دوڑتے چہروں کو دیکھتے دیکھتے میں اوب سا گیا ہوں۔ وہی سڑکیں ' وہی ہوٹلیں ' وہی لوگ ' لیکن مدتوں بعد تمہارے چہرے کی زیارت نصیب ہوئی ہے تو سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر دید کا بار اٹھا لوں۔' یہ کہتے ہوئے وہ اداسی کا ایک نوحہ بن گیا۔ میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا گھر اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و بالا تھا۔

یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اسی کا گھر ہے۔ سرونٹس کوارٹرس سے گذرتے ہوئے سلام کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر میں ویسے بھی دم بخود تھا لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کی لہریں ہویدا تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے۔

'کیا بھابی گھر میں نہیں ہے ۔۔۔۔ ؟'

'کس کی بھابی تمہاری یا میری ۔۔۔۔۔ ؟'

اس جواب کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مزید میں اس سے کوئی اور سوال کرسکتا۔

'چائے پیوگے یا ڈرنکس لوگے ؟'

'چائے ہی ٹھیک رہے گی۔'

'میں اپنی مرضی کبھی کسی پر نہیں ٹھونستا۔ تم نے چائے کے علاوہ زہر کی بھی فرمائش کی ہوتی تو میں خوشی خوشی زہر کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں تھما دیتا اور تمہیں مرتا ہوا دیکھ کر اطمینان محسوس کرتا کہ کہیں تو میرا وجود کسی کے کام آیا۔ دراصل میں یہاں تمہیں اس لئے لایا تھا کہ اپنے بارے میں تم سے کچھ کہہ سکوں۔ کئی دنوں سے میرے ذہن پر ایک بوجھ ہے۔ میرا ذہن وسوسوں ' اندیشوں اور خوف کے بے نام سایوں سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کبھی کبھی خود میرا وجود کانپ سا جاتا ہے۔ میں ان دنوں بڑے پیچیدہ مسائل سے گذر رہا ہوں۔'

وہ اپنے ہر تیسرے جملے کے بعد اسی بات کو دہراتا تھا کہ مسائل بے حد پیچیدہ ہیں اور نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں۔ وہ یہ کہتے کہتے روہانسا ہو گیا اور ہانپنے لگا۔

وقت رینگ رہا تھا لیکن رازوں میں ڈھکے کہانی کے انجام سے میں ہنوز ناواقف تھا۔

میں کوشش کے باوجود اس کی دلجوئی نہ کر سکا۔ اب میرے لئے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن میرے مسائل اس سے دیگر تھے۔ وہ سخت ذہنی الجھنوں اور اعصابی کیفیت سے دوچار تھا اور سزا میں بھگت رہا تھا۔ گھڑی کا ہر سیکنڈ اور ہر منٹ مجھے پہاڑ کی طرح لگ رہا تھا۔

'میرا انجام دیکھ رہے ہو ؟' اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم مجھے اپنے ہاتھ کی ریکھائیں بتانا چاہتے ہو؟"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ خود میرے ہاتھ میں دھن ریکھا بھی ہے اور رنگ آف سلومن!"

"تو تم آخر چاہتے کیا ہو...."

"میری گھڑی کی طرف دیکھو۔" اس کا سانس پھول رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے باریک باریک قطرے نمایاں انداز میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے ہونٹوں میں دانت اس طرح گاڑ رکھے تھے جیسے کوئی خوف کے تصور سے ہراساں ہو..."

"تمہاری گھڑی تو برابر چل رہی ہے۔"

"نہیں — سیکنڈ کا کانٹا گھوم نہیں رہا ہے۔"

"غور سے دیکھو —؟" لیکن میں بجائے گھڑی کے اس کے چہرے کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔

اس نے کہا: "میری موجودہ زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو کر رہ گئی ہے۔"

"لیکن گھڑی سے ان باتوں کا کیا تعلق؟"

"میرے سارے پیچیدہ مسائل اسی گھڑی کے گرد گھوم رہے ہیں اور میں بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔"

میں اس کی عجیب و غریب باتوں سے عاجز آچکا تھا۔ چاہتا تھا کہ گھر سے نکل بھاگوں۔ اس نے اچانک خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا دبلا پتلا سینہ طوفانی سمندر کے مدوجزر کی طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے وہ مدت سے بیمار ہو۔

"میں اب چل رہا ہوں۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ سن رہے ہو؟" مگر اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اب بھی وقت ہے کسی بھی چیز کو پوشیدہ رکھے بغیر وہ سب کچھ ڈالو۔ جو تمہارے دل میں ہے۔ سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے مل کر تمہاری بے سروپا باتوں کو سن کر ادھ موا سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جو میری تم سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ تم سے ملنے کے بعد..."

میں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ اچانک ایک خطرناک قسم کی ابابیل کمرے میں داخل ہوئی اور پے در پے کمرے کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ایسا لگتا تھا جیسے اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔

—— میرا دل خوف اور وحشت سے [illegible]

یہ روز کا معمول ہو۔

"گھبراؤ نہیں۔ یہ تمہیں ضرر نہیں پہنچائے گی۔ یہ ابابیل یہاں روز آتی ہے اور اپنے مقررہ چکر کاٹنے کے بعد یوں ہی چلی جاتی ہے۔ مگر دیر سے آئی ہے نا تو چکر بھی اسی تیزی سے لگا رہی ہے۔ لو اب وہ چلی گئی۔" واقعی ابابیل کمرے سے جا چکی تھی۔

وہ اضطراری کیفیت جو اچانک ابابیل کے آجانے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی' وہ اب آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بھی اب خاموشی کا لبادہ اوڑھے میری جانب عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

"اب بھی وقت ہے' وہ ساری باتیں کہہ ڈالو۔ جس کے لئے مجھے تم یہاں گھسیٹ لائے تھے۔ سن رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" لیکن وہ پھر بھی چپ تھا۔ بت کی طرح خاموش اور قبر کی طرح پرسکون۔

میں بڑی مایوسی کے عالم میں اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔ ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں اور سڑک پر دور دور تک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ اِکّا دُکّا لوگ بارش میں بھیگتے ہوئے سڑک پار کر رہے تھے۔ میں بارش سے بچنے کے لئے ایک سائبان کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ دو تین اور لوگ بھی یہاں کھڑے ہیں۔ کسی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بجا ہوگا ؟"

"گھڑی بند ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"تعجب ہے ؟ وہ تو چل رہی ہے۔"

"لیکن سیکنڈ کا کانٹا ؟" ●

حیدرآباد کا یہ ادارہ کئی لحاظ سے میرے ذہن سے قریب رہا ہے۔ اس کے بانی پروفیسر زورؔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ یہ ادارہ اسی "انجمن" کی سحر انگیز شخصیت کا کرشمہ ہے۔ علوم کے اس مرکز پر حاضری دے کر ایک سکون سا ملا۔

اس کا تحفظ اردو کلچر کا تحفظ ہے۔

۔ڈاکٹر شکیل الرحمٰن ' (صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی)

انور معظم

آہنگِ جرس

کہنے کو تو امریکہ کا سفر تھا مگر ثابت ہوا وہ تین شہروں کا سفر۔ شمالی امریکہ سے پرے ایک جزیرہ کا شہر پورٹو ریکو اور برطانیہ میں لندن اور برمنگھم۔ امریکہ کی ایک انجمن "نیوایرا" نے جنوری ۱۹۸۳ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ کانفرنسیں اور سیمینار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان سب کا موضوع زیادہ تر انسان اور انسانی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس کانفرنس کے منتظمین نے مخلوق کے بجائے خالق کو موضوع بنادیا۔ "خدا۔ معاصر مذاکرہ" مقصد یہ تھا کہ معاصر معاشرے میں مذہب کی معنویت پر بات کی جائے۔ میں نے کانفرنس کے موضوعاتی خاکے کے ایک ضمنی حصے "خدا اور سماجی حقیقت" کا انتخاب کیا۔ سفر سے ہمیشہ گھبراتا ہوں اور غیر شعوری طور پر اس سے بچنے کی تدابیر اختیار کرتا ہوں۔ چنانچہ اس بار بھی اپنا مقالہ لکھنے میں اس خیال سے دیر کی کہ کانفرنس والے مقالہ دیر سے ملنے پر سلیقے سے مجھے مطلع کریں کہ "پھر کسی اور وقت مولانا۔"

لیکن تین ماہ تاخیر سے مقالہ بھیجنے کے باوجود مقالہ قبول کرلیا گیا۔ ٹکٹ بھی آگئے۔ دوسری طرف شریکِ حیات، فرزندِ ارجمند اور شرکاء شعبہ نے یہ فرض کرلیا تھا اور مجھے یقین بھی دلا دیا تھا کہ میں بہرحال یہ طویل سفر اختیار کرنے والا ہوں۔ سندباد، ابن بطوطہ، المسعودی، ابن انشا اور جمیل الدین عالی نے طویل بحری اور ہوائی سفروں کی بڑی بڑی مثالیں قائم کر رکھی ہیں اور پھر ہمارے صوفیائے کرام بھی اس کے بڑے شائق رہے ہیں۔ چنانچہ جی کڑا کرکے ہم نے تجربکار سیاحوں کے مشورے کے بعد رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ باندھنے کا عمل ابھی ادھورا تھا کہ عزیز دوست مغنی تبسم نے طلب کیا۔

بولے، "آپ امریکہ جارہے ہیں۔"

میں نے کہا، "خیال تو ہے۔"

میں نے ہوائی معلومات کے بل پر کہا۔ "مزدور بڑھتا ہوگا"۔ مغنی تبسم نے اس بے بنیاد شبہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بنیادی نکتہ کی جانب اشارہ کیا۔

"آپ یہ تو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اس بین الاقوامی کانفرنس میں ایک دفعہ شرکت کے بعد کوئی دوبارہ آپ کو مغرب کی جانب آنے کی دعوت دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔" میں نے اس نکتے پر چند لمحے غور کیا تو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔

تب وہ بولے: "تو یہ سب جانتے بوجھتے آپ لندن کو نظر انداز کر رہے ہیں؟"
سوال معقول تھا اور با معنی بھی۔ اور میں نے ان کا مقصد بھی بھانپ لیا۔ چنانچہ ٹکٹ بدلوا کر لندن کے لیے جگہ فراہم کر لی۔

۲۲ر دسمبر ۸۳ء گھر والوں اور باہر والوں کے ارمانوں اور آرزوؤں کو لے کر دہلی پرواز کی اور ۲۴ر کی صبح براہ کویت لندن روانہ ہوا۔ رفقائے سفر میں دہلی کے اطراف و اکناف کے مزدور تھے جو بیڑیاں پیتے ہوئے بسلسلۂ ملازمت کویت جا رہے تھے۔ ان سے کافی علمی مباحث رہے۔ مثلاً دہلی کے دیہاتوں کی معاشی اور سماجی ساخت کس قسم کی ہے۔ کویت کی دولت کا اس پر کس قسم کا اثر پڑنے کا خطرہ ہے وغیرہ۔ مجھے اندازہ نہیں ان محنت کشوں نے میرے ان سوالات سے میرے بارے میں کیا نتائج اخذ کئے ہوں گے۔ لیکن یہ طے ہے کہ میری تعلیمی قابلیت کے بارے میں وہ یقیناً مزید کچھ جاننے کے خواہشمند ضرور ہو لیے گے۔ چنانچہ کویت پر جہاز اترنے سے قبل ان میں سے چند نے اپنے لینڈنگ کارڈز مجھ سے بھروائے اور پھر بڑی دیر تک بغور میرے لکھے ہوئے الفاظ کا مطلب پوچھتے رہے۔

بہرحال کوئی چار گھنٹے میں کویت اور وہاں ایک گھنٹے کے قیام کے بعد سات گھنٹے میں لندن کے ہیتھ رو ایرپورٹ پہنچے۔

ایرپورٹ پر دفعتاً احساس ہوا کہ وہ مغرب جس کے ایشیا پر مضر اثرات کے بارے میں برسوں سے بڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں' مجھ سے بدلا چکانے پوری طرح تیار ہے۔ ہر چیز مختلف۔ حرکات و سکنات' انگریزی بولنے کا انداز' قطار میں کھڑے رہنے کی مجبوری' بار بار معذرت اور شکریہ ادا کرنے کی پابندی اور سب سے بڑھ کر آپ کو پریشان نہ کرنے کا رویہ! جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ بھئی تم کالے ہو اور پچھڑی ہوئی ایک ایشیائی ملک کے باشندے۔ ہم تمہیں کھرے کے تمہاری اہمیت کو کیوں تسلیم کریں۔ خیر' میں اس قسم کی باتوں کے لیے ذہنی طور سے تیار ہی تھا۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ چنانچہ بغیر کسی کسٹم یا ویزا کے میں ایرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گیا۔

اب میں لندن میں تھا۔

لندن میں اپنے دوست غلام یزدانی کے یہاں قیام رہا۔ غلام یزدانی ہیں تو بیرسٹر مگر عادات واطوار اور اندازِ گفتگو جج کا سا ہے۔ قطعی اور فیصلہ کن۔ ہر بات کے لیے ثبوت کی تلاش اور ہر مسئلے کے لیے ایک حل کی موجودگی پر ایمان۔ ان سے ملاقات کے چند لمحوں کے اندر میں نے سفر کی تھکن کو ذہن سے جھٹک دیا۔ سب سہل ہے۔ سفر بے حد خوشگوار تجربہ ہے۔

یزدانی نے ایر پورٹ سے اپنی جرمن کار میں گھر لے جاتے ہوئے فیصلہ کیا کہ مجھے لندن کا کچھ حصہ ابھی دکھا دیا جائے کہ لندن کا موسم حیاتِ انسانی کی طرح بے اعتبار ہوتا ہے اور فی الوقت نہایت خوشگوار ہے۔ چنانچہ میں نے کچھ لندن دیکھا — اور کیسا لندن؟

۲۴ر دسمبر کی رات' یعنی کرسمس کے دن کو جنم دینے والی رات کا لندن ... جگمگاتا ہوا' مگر خاموش ..... سنسان سڑکیں' جن کے کنارے شیشوں کے اندر سے روشن روشن' سجی سجائی عالی شان دکانیں' جا بجا کرسمس کے مسکراتے روشنی بکھیرتے شجر ... یزدانی اور ان کی بیگم تہمر وقفے وقفے سے تاریخی عمارتوں اور اہم سڑکوں کی نشان دہی کرتے جا رہے تھے۔ کار تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور ٹرک رہی تھی ...... ہیروڈس اسٹور (جس کے سامنے بم کے دھماکے نے انگلستان میں سنسنی پھیلا دی تھی) بکنگھم پیلس' آکسفورڈ سرکس' ریجنٹ پارک' پکاڈلی سرکس' ٹریفالگر اسکوائر' دس ڈاؤننگ اسٹریٹ' بگ بن' پارلیمنٹ ہاؤس' ویسٹ منسٹر ایبے' چرچل اور لنکن کے مجسمے' دریائے ٹیمز' کلیو پیٹرا کی سوئی' ٹیمز کا کنارہ .... تیز سرد ہوا کی مضبوط گرفت ... سینٹ پال کا کیتھڈرل' اولڈ بیلی' اس کے سامنے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھامے' آنکھوں پر پٹی باندھے ایک عورت کا مجسمہ' کیٹس کا گھر' ہائیڈ پارک' اس کا مقررین کا گوشہ ...

یہ سب میں دیکھ رہا تھا۔ یہ سب مجھے دیکھ رہے تھے۔ خاموش ۔ میں جوانی کی اٹھارویں سے بیسویں صدی کے نصف تک زندگی کا ایک جزو لاینفک تھا' ان عمارتوں اور مجسموں کے پیچھے کے ذہن کا حصہ بنے رہنے پر اب بھی مجبور تھا۔

یزدانی اور تہمر میری خاموشی میں شریک ہو گئے۔

کار چند چڑھائیوں کو طے کرتی ہوئی اوپر پہنچی۔ پہاڑی کے کنارے یزدانی نے کار روک لی۔

' الگزینڈرہ پیلس' بی بی سی کا پہلا گھر ' سامنے دیکھو!'

سامنے تین طرف لندن اپنی سینکڑوں روشن آنکھوں کے ساتھ پھیلا ہوا ۔ جیسے اپنے ستاروں سمیت نیلے آسمان زمین پر اتر آیا ہو ...... اپنی تمام خاموشیوں کے ساتھ۔ اخباروں' ناولوں' تاریخ کی کتابوں میں سوچا ہوا' پُراسرار' ظالم' خوبصورت لندن ... تہمر اپنے نپے تلے انداز میں پچھلے سالوں

میں دیکھے ہوئے لندن کے مختلف موڑ بیان کرنے لگیں۔ یزدانی' وھیل چیئر پر ہاتھ رکھے' اپنے سگار کی راکھ کی طرح' بکھر بکھر کر' اس بیان پر فٹ نوٹ لگاتے رہے۔

گھر پہنچے۔

خوبصورت سا گھر' دروازے کھڑکیاں بند' گھر والوں کے دل اور دماغ کھلے۔ یزدانی اور مہر کے بچے عادل' انجم' زبیر... یزدانی کے چھوٹے بھائی صمدانی' ان کی بیگم طہورا اور ان کا شیر خوار عمر میں نے بزبانِ انگریزی ان بچوں سے تبادلۂ خیال کی کوشش کی تو پتہ چلا زبان سے زیادہ تلفظ' اور لہجے سے نمٹنا دشوار ہے۔ میں نے اپنا بھرم قائم رکھتے ہوئے انھیں بی بی سی کے تلفظ اور لہجے کی خوبیوں کی طرف متوجہ کیا۔ وہ سمجھ گئے۔ اس کے بعد صورتِ حال کافی خوشگوار ہو گئی۔

جس وقت مہر باورچی خانے میں اور یزدانی اپنے آفس میں مصروف رہتے ہیں چودہ سالہ عادل سے کمیونزم' سرمایہ داری' جوہری جنگ' جوہری جنگ کے اثرات پر نئی فلم "دی ڈے آفٹر" دنیا کے مستقبل پر گفتگو کرتا۔ عادل ہر چیز سے مایوس ہے۔

"کچھ باقی نہیں۔ مکمل تباہی" عادل سے پانچ برس چھوٹے زبیر نے ٹی وی پر ایک کھیل شروع کیا۔ "انکل یہ کھیل بڑا اچھا ہے۔ آپ بھی کھیلئے۔" میں نے اُداسی سے کہا۔ "مجھے یہ کھیل کھیلنا نہیں آتا" وہ ہنسنے لگا۔ "سیکھ لیجئے۔ بہت آسان ہے ورنہ آپ بھی عادل کی طرح باتیں کرنے لگ جائیں گے۔"

مجھے بات ٹھیک ہی لگی۔ ٹی وی کے کھیل سیکھے بغیر دنیا کے مستقبل' اس کی بقا یا فنا کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکے گا۔ میں کھیلنے لگا۔ واقعی یہ ایسا مشکل کام نہیں لیکن عادل یہ سب کر چکا تھا۔

۱۹۸۴ء کا لندن' جوہری طاقت کا صدر مقام' امریکی مزائلز سے لیس' حریف روس کی سیدھی زد میں' اپنے بچوں کو اپنی جوانی سے کس قدر مایوس بنا رہا تھا اور حیدرآباد میں سترہ سالہ فرحان زیڈ اکس اسپکٹرم کا منتظر تھا مگر مایوس نہیں تھا۔ کیوں ؟ ایشیا میں جوہری بم کہیں رکھا ہوا نہیں' اس لئے ؟ یا ایشیا اپنی تہذیب' روحانیت (توہمات' گندگی' جہالت) میں مگن ہے' اس لئے ؟...... پتہ نہیں۔ پتہ کریں گے اس وقت تو یہ تینوں' دو کم سن لڑکے اور ایک لڑکی کمپیوٹرس کی مختلف اقسام مجھے بتا رہے ہیں۔

اسی میں شام ہوئی۔ چار بجے۔ صبح آٹھ بجے سورج طلوع ہوا تھا۔ صرف آٹھ گھنٹے کا دن (گرما میں اٹھارہ گھنٹے کا۔ روزہ داروں کے لیے شرعی مسئلہ) یزدانی نے پوچھا۔ ساقی فاروقی سے بات کرو گے ؟ ساقی فاروقی ؟ بیس بائیس برس پہلے جس کم سن نوجوان سے کراچی میں شمیم احمد' قمر' سلیم احمد' غوث محی الدین اور عبدالرؤف عروج کے ساتھ مختلف ملاقاتوں میں کل ملا کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات رہی ہو' (اور وہ مجھے اچھا لگا تھا) وہ آج مجھے لندن میں کیوں ملے گا ؟ مگر ملے تو اچھا ہے۔ یزدانی نے فون ملایا

اور بتایا کہ ساقی بات کرنا چاہتے ہیں۔

آواز آئی۔ "میری جان کب آئے؟ پہلے اطلاع کیوں نہیں کی؟"

میں چکرا گیا۔ "میری جان"! اس طرح تو مجھے آج تک کسی نے آواز نہ دی تھی۔" میں ابھی آرہا ہوں، کہیں مت جانا" اور آدھے گھنٹے میں ساقی اپنی کار میں واقعی گھر آگئے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سرد جھونکے کے ساتھ ساقی اندر آئے۔ دروازہ بند کیا۔ ساقی نے چند سیکنڈ مجھے سر سے پیر تک دیکھا جیسے خود کو یقین دلا رہے ہوں کہ "یہ جسم میری جان سہار سکتا ہے یا نہیں"۔

پھر وہ گلے سے ملنے لگا۔ "کیسے ہو؟ اتنی دور کیسے آگئے؟ کب تک رہو گے؟ کوئی تو آئے اُدھر سے"۔

یہ "اُدھر" یہاں کے ہر ہندستانی اور پاکستانی میں مضطرب رہتا ہے۔ دو گھنٹے تک ہم دنیا کے ہر موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ہندستان، پاکستان، انگلستان، مغرب، مشرق، "استحصال" تاریخ، جمہوری ادب، اردو ادب، انگریزی ادب، تہذیب، ن م راشد، فیض، مخدوم، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، منیر نیازی کی موت کی خبر (ظالموں نے مار ہی ڈالا تھا) جیلانی بانو، شمس الرحمٰن فاروقی، دہلی، مشاعرے، اردو شاعری، اصلی نقلی، شاعری اور شاعر، اصلی نقلی تنقید اور نقاد، ادیبوں کی گروہ بندی، ادب میں دولت، دولت میں ادب، ... پھر ساقی نے اپنی نئی نظمیں سنائیں، خوبصورت، بدصورت، کھردری نازک، لپنے استعارے۔

"لیکن یہ کیا، صرف دو دن لندن میں؟ بھئی یزدانی، یہ واپسی میں یہاں رُک نہیں سکتے؟"

"یہ یہاں رکیں گے" یزدانی نے سگار کا گُل جھاڑتے ہوئے کہا۔ میں نے بے بسی سے یزدانی کو دیکھا

"آپ کو عمرہ کرنا ہے نا؟ تو آپ کو واپسی میں یہاں رُکنا ہوگا۔"

دوسرے دن حبیب حیدرآبادی کے یہاں لنچ پر اکبر حیدرآبادی اور ان کی بیگم افتخار عارف اور ذاکر یوسف سے ملاقات رہی۔ حبیب حیدرآبادی کی کتاب "انگلستان میں" اچھی کتاب ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں طرح۔ افتخار عارف اور اکبر حیدرآبادی نے نئی غزلیں سنائیں۔ پھر اکبر حیدرآبادی نے مجھ سے فرمایش کی۔ میں نے کہا۔ "دیکھیے اب (سوائے جیلانی بانو کے) ادب سے میرا کوئی جائز تعلق باقی نہیں رہا۔ اس لیے ....." سب سرپرستانہ انداز میں مسکرائے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں لیکن مہمان نوازی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ سنا دیجئے۔

افتخار عارف لندن کے "اردو مرکز" کے کرتا دھرتا ہیں۔ "اردو مجلس" دوسری اہم تنظیم ہے جس کے صدر غلام یزدانی اور سکریٹری سید عباس زیدی ہیں۔ اردو مرکز اور اردو مجلس میں ایک دوستانہ رقابت ہے جس کا فائدہ اچھے ادبی محفلوں کے انعقاد کی صورت میں لندن کے اردو دوستوں کو ملتا رہتا ہے

خدا کرے اس رقابت میں اور اضافہ ہو سکتا ہے افتخار عارف اور ساقی فاروقی ایک دوسرے سے پوری طرح مطمئن نہیں لیکن ان دونوں نے مجھ غیر متعلق آدمی سے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ ورنہ ناواقف لوگوں کو دوسروں سے بدگمان کرنے کے لیے بعض کوتاہ نظر منتظر رہا کرتے ہیں جیسے کہ حیدرآباد کے ایک ناکام صاحب نے جو آج کل لندن میں بین الاقوامی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں، میرے بارے میں میرے پہنچنے سے پہلے یہ خبر پھیلا دی کہ میں اسلامیات کا آدمی ہوں لیکن دراصل اشتراکی ہوں۔ کام بہت سلیقے سے کیا۔ اس حد تک کہ یہ خبر اخبار جنگ (لندن) کے ادارتی عملے تک پہنچا دی۔ چنانچہ جنگ کے ظہور نیازی صاحب نے اس کی تصدیق مجھ سے چاہی۔!

میں نے عرض کی کہ جن صاحب نے یہ ضیا پاشی کی ہے اگر انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میرے چند مضامین اور میری تازہ کتاب، جمال الدین افغانی، نہ پڑھی ہو (جو بد قسمتی سے انگریزی میں ہیں) کبھی موقع ملے تو آپ پڑھ لیں اور رائے قائم کر لیں۔ ویسے بُرا مسلمان ہونے کے لیے اشتراکی ہونا ضروری نہیں۔ یہ ذرا سفرنامے سے ہٹ کر بات ہو گئی لیکن جو لوگ پہلی بار اپنے ملک سے باہر اپنے ملک والوں سے ملیں ان کی صحت کے لیے مفید ثابت ہو گی۔

تیسرے دن برمنگھم گیا۔ وہاں میرے حیدرآباد کے بہت گہرے دوست، ڈاکٹر حسن عسکری سے ملنا تھا۔ وہ اسٹیشن پر اپنے پورے قد و قامت اور بلند آہنگ قہقہے کے ساتھ موجود تھے۔ انہوں نے برمنگھم سے حیدرآباد فون کر کے اصرار کیا تھا کہ میں ان سے آ کر ضرور ملوں۔

عسکری ان نایاب لوگوں میں سے ہیں جن سے ایک بار مل کر دوسری بار ملنے کی ہوس جاگ اٹھتی ہے بلکہ جاگی رہتی ہے۔ عسکری ماہر سماجیات ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی، علی گڑھ، ہالینڈ کے بعد اب برمنگھم یونیورسٹی سے ملحق "اسلام اور عیسائی مسلم تعلقات کے مرکز" میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں، سماجیات، فلسفہ، تصوّف اور اسلامی دینیاتی مسائل سب میں بیک وقت ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک لہر آئی تو نثری نظموں سے ایک کاپی بھر دی۔ اور پھر وہ کاپی گُم کر دی۔

اسٹیشن سے سیدھے اپنے مرکز لے گئے۔ کرسمس کی چھٹیاں تھیں۔ مرکز بند تھا۔ جیب سے کنجی برآمد کی۔ اور مرکز تفصیل سے دکھایا۔ بہت اچھی لائبریری ہے۔ یہ مرکز "یوروپ میں اسلام" پر کتابیں اور مضامین اور ان کے خلاصے تیار کر رہا ہے یہاں مختلف ممالک سے طلبا آ کر اسلامیات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ عسکری نے مرکز میں کافی بنائی۔ کافی پر حیدرآباد، انگلستان اور دوسری جگہ معاصر اسلام پر کام کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ عسکری نے اپنی تازہ تحریروں سے واقف کروایا۔ وہی مضطرب شخصیت جو کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔

عسکری کے گھر پہنچے۔

عسکری کی بیگم لیاقت، علی، محمد اور موسیٰ نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ گھر پہنچ کر عسکری نے سب سے پہلے ٹی وی پر امریکہ کی سرد لہر کے بارے میں خبر سنی۔ معلوم ہوا کئی برسوں کے بعد اس قدر شدید سردی پڑ رہی ہے۔ کئی افراد جان سے گئے۔ عسکری نے سخت پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا اس پریشانی میں کچھ ترحم کا شائبہ بھی ہے۔ بیگم عسکری اور محمد نے فوراً اطمینان دلایا کہ عسکری یوں ہی پریشان ہوجاتے ہیں۔ اب آپ کو بھی پریشان کر رہے ہیں۔ آپ اس سردی کو جھیل جائیں گے۔ میں نے فوراً اس سے اتفاق کیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دو دن برمنگھم میں گذرے۔ حیدرآباد کے لذیذ کھانے کھائے۔ عسکری کے ایک دوست کی کار میں برمنگھم کی سیر کی۔ ایک خوبصورت مسجد دیکھی جس کی امامت پر بریلوی اور دیوبندی حضرات میں اختلاف رائے نقضِ امن تک پہنچ گیا اور پولیس کو اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کرنی پڑی۔ وہ علاقے بھی دیکھے جہاں ہندستانیوں اور پاکستانیوں نے اپنے اپنے صوبے قائم کرلیے ہیں۔ مسلمانوں کی پندرہ بیس تنظیمیں ہیں جو اسلام کی پندرہ بیس تفسیروں کے جواز کی گنجائش فراہم کرنے میں شب و روز مصروف ہیں محمد سے کمپیوٹروں کی مختلف اقسام پر پھر درس لیا۔ پھر برمنگھم کے ایک اسٹور سے زیڈ اکس ۸۱ خریدا اور اطمینان ہوا کہ کانفرنس کے سفر کا ایک مقصد پورا ہوا۔ عسکری کے گھر اپنے گھر کا لطف لیا۔ مطلب یہ کہ خوب آرام کیا اور لذیذ کھانے کھائے۔ عسکری نے مغربی کانفرنسوں کے رسم و رواج پر ایک مختصر لیکچر دیا۔ "آپ خوش ہوں گے"۔

تیسرے دن صبح کوچ کے ذریعے لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پہنچا۔ اور کوئی آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد شام ۴½ بجے نیویارک پہنچا۔ انٹرنیشنل ہوٹل میں رات گذاری۔

دوسرے دن نیویارک سے پورٹوریکو ایرپورٹ اور پھر سرا مور فیج ہوٹل پہنچا۔ مزیدی کارروائیوں کے بعد اپنے کمرے میں آیا۔ وہاں معشوق علی (اسلامک فاونڈیشن، انگلینڈ) سے ملاقات ہوئی۔ یہ ہم کمرہ تھے۔ نہایت ذہین اور باخبر نوجوان۔ عالم اسلام کے رجحانات پر گہری نظر ہے اور اسلامک فاونڈیشن میں بڑا اہم علمی کام کر رہے ہیں۔

چار راتیں ان سے نہایت مفید مباحث میں گذریں۔ ہندستان میں بیٹھ کر ہم عالمِ اسلام کو صحیح اور پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے لیے ہندستان اور عالمِ اسلام دونوں سے باہر آنا ضروری ہے کانفرنس میں سو سے اوپر اہلِ علم شرکت کر رہے تھے ان کا تعلق دنیا کے کئی ممالک سے تھا۔ ان میں جاپان، نیوزی لینڈ، تھائی لینڈ، ملیشیا، بنگلہ دیش، ہندستان، سری لنکا، ایران، سعودی عرب

نائجیریا، جنوبی افریقہ، تنزانیہ، گھانا، اٹلی، فرانس، مغربی جرمنی، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، اسرائیل، بلجیم، یونان، انگلینڈ، اور شمالی اور جنوبی امریکہ شامل ہیں۔

پاکستان سے کوئی نہیں آیا۔ ان میں تمام مذاہب کے نمائندے اور مختلف سماجی علوم کے ماہ[ر] تھے۔ مسلمان غالباً آٹھ یا نو تھے۔ میرے سکشن میں صرف ایک مسلمان، ایک ہندو اور باقی عیسائی [تھے]۔ کانفرنس کے تمام اجلاس جس سلیقے اور پابندیٔ وقت سے چلائے گئے نہ صرف قابلِ تعریف بلکہ قا[بلِ] رشک بات تھی۔ تمام مقالے شرکار کے پاس کانفرنس سے کوئی دو ہفتے قبل بھجوائے جا چکے تھے۔ ہر ایک کو اپنا مقالہ لکھنے کے علاوہ ایک دوسرے مقالے پر اپنا تبصرہ بھی لکھنا تھا۔ ہر سیشن میں ج[ب] کسی مقالے کی باری آتی تو پہلے تبصرہ نگار سات آٹھ منٹ میں اپنا تبصرہ پیش کرتا، پھر سات آٹھ منٹ میں مقالہ نگار اس کے جواب میں اپنی بات کہتا اور پھر (۴۵) منٹ مقالے پر بحث ہوتی۔ چونکہ شرکا[ء] سیشن میں مختلف علمی نقاطِ نظر کے عالم ہوتے اس لیے مقالہ کے موضوع کے ہر پہلو کو پوری گہرائی سے جانچا جانا آسان تھا۔ بحث کا معیار خاصا اونچا تھا لیکن سب سے زیادہ متاثر کن وہ علمی تہذیب تھی جس کا اظہار بحث کرنے، تنقید کرنے، اختلاف کرنے میں کیا گیا۔

ہر حصہ لینے والا اپنی باری پر، صدرِ اجلاس کی اجازت سے، مختصر مگر نکات سے بھرے سوالات کرتا۔ مطمئن ہوتا تو اس کا اظہار کرتا۔ اگر نہ ہوا ہو تو یہ بھی معذرت کے ساتھ کہہ دیتا۔

کانفرنس میں محسوس ہوا کہ عہدِ حاضر میں عیسائیت کو جو چیلنج درپیش ہیں وہ شائد کسی اور مذہب کو نہیں۔ مذہب اور معاشرے کے باہمی تعلق کو معاشی، سیاسی، فلسفیانہ اور تہذیبی زاویوں سے [دیکھا] گیا اور مقالوں میں دُنیا کے مختلف معاشروں میں اس تعلق کی نوعیت پوری شدت سے ابھ[ری] تھی۔ صحیح معنوں میں ایک عالمی تصویر۔ اس میں ایک تقابلی مطالعے کا موقع بھی ملا۔

حیرت اور اطمینان بھی ہوا کہ ہمیں ایک تہذیبی اور تعلیمی اعتبار سے بچھڑے ہوئے معاشرے میں اسلام کے مسائل پر حیرانی کی ضرورت نہیں۔ ترقی یافتہ معاشرے نے عیسائیت کے لیے نہایت [نئی] صورتِ حال پیدا کر رکھی ہے اور اس تجربے سے مشرق اور خصوصاً مسلم معاشرے بہت کچھ سیکھ[کر اس] صورتِ حال کو اپنے یہاں پیدا ہونے سے روک سکتے ہیں اور باتوں کے علاوہ جو دو باتیں اس کانفرنس [میں] اُبھر کر سامنے آئیں وہ یہ تھیں کہ مغربی نوجوان ذہن جذباتی انتشار اور روحانی ناآسودگی کی وجہ [سے] متبادل فکری اور روحانی ماخذ تلاش کر رہا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اب مذہب پر عزیزوں اور محبوں کے دل سے سوچنا اور ان کی نظر سے [دیکھنا] ضروری ہے بصورتِ دیگر مذہب اور انسان کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ قابلِ غور بات یہ کہ مذاہ[ب]

ناظر یہ سے سوچنے پر خدا ان کی عقل پرستی اور سائنس دوستی کو کوئی اعتراض نہیں۔ ہر نظام قابل غور ہے ئج جو بھی برآمد ہوں۔

اس رجحان کی ایک طاقت ور مثال لاطینی امریکہ سے ابھرنے والی "نجات پسند دینیات (لبریشن لیوجی) ہے جس نے عیسائی کلیسا کو عیسائیت کی نئی تعبیر کرنے پر مجبور کر دکھا ہے۔ اسی کانفرنس کے سیکشن میں ایک عیسائی بشپ نے اپنا مقالہ پیش کرکے سب کو چونکا دیا جس میں اس نے حضرت ح کا ایک بشر' ایک پیغمبر کی طرح مطالعہ کیا تھا۔ معشوق علی نے بتایا کہ وہ بے خبر تھا کہ یہی قرآنی ربھی ہے۔ کانفرنس میں جو مقالے مختلف عالمی مذاہب کے پس منظر میں لکھے گئے' ان پر خاص ہ دی گئی۔

اسلام پر مقالے گنتی کے تھے لیکن ان پر گفتگو کافی ہوئی۔ میرے مقالے پر اسلام کے مختلف مداور اداروں پر سوالات کی بوچھار ہوئی۔ ان میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش ں تھی۔ مغربی جرمنی کے ڈاکٹر شوارٹز نے اسی ضمن میں افسوس کا اظہار کیا کہ اس کانفرنس میں یئوں کی تعداد زیادہ ہے۔ آئندہ تمام مذاہب کی مناسب نمائندگی کا خیال رکھنا چاہیے۔ خصوصاً می تصور جہاد نے سب کی توجہ کھینچی' جب میں نے بتایا کہ جہاد کا ایک اہم مقصد ظلم کے خلاف ج' مزاحمت اور عمل ہے۔

بعد میں لنچ پر ایک نوجوان امریکی مندوب نے مجھ سے اسلام کے بارے میں مزید تفصیلات یں۔ میں بتاتا رہا۔ وہ سنتا رہا۔ بالآخر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ اسلام کے بارے میں جس زیادہ بتاتے جائیں گے' مجھے اسلام قبول کرنے پر مائل کرتے جائیں گے۔"

ہوٹل جہاں یہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی' پتہ نہیں کتنے ستاروں کا تھا۔ ہر چیز موجود تھی لیکن ب پیتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ دوران اجلاس سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ چائے' کافی ہر لمحہ یاب تھی۔ کھانوں کا انبار تھا۔ ریسٹوراں کے سامنے ساحل حسین تھا' موجیں خوش مزاج تھیں۔ ساحل کے حسن اور موجوں کی خوش مزاجی سے ہم آہنگ ہونے کی فرصت کہاں تھی۔

چار دن یوں گزرے۔ ملک ملک کا آدمی بلا۔ ہر ایک کے مسائل سے آگاہی ہوئی۔ اطمینان ہم اپنے ہی حیران نہیں۔ سارا عالم ہی آئینہ ہے۔

پانچ جنوری ۸۴ء کی صبح ہمارا ایک گروہ منہ اندھیرے ایرپورٹ روانہ ہوا۔ دس بجے نیویارک ۔ لندن کی فلائٹ دوسرے دن رات میں تھی۔ وقت تھا۔ جے پور کے فلسفہ کے پروفیسر شن' کروکیشتر کے ڈاکٹر گوپی کا موہن بھٹاچاریہ' بنارس کے پروفیسر نارائن ہمن داس بھامنی کے

ساتھ نیویارک کی مرکزی شاہراہ ففتھ ایوینیو تین چار گھنٹے گھومتے رہے۔ آرٹ گیلری آرائش نو کے سبب بند تھی۔ کیا فلک ہمسایہ شہر ہے ہمیشہ سر اٹھائے رکھنے پر مجبور رکھتا ہے۔ سردی شدید تھی۔ چہرہ برف کی سِل پر رکھا محسوس ہوتا تھا۔ افسوس سرسری اس جہان سے گزرے۔

۶ر کی صبح لندن پہنچے۔

لندن میں اہم مسئلہ عمرہ ویزا اور کویت سے جدّہ کا ٹکٹ حاصل کرنا تھا۔ یزدانی نے اپنے دوست انور ملک سے ویزا حاصل کر لیا اور پھر ٹکٹ بھی۔ یہ مجھے ناممکن لگا تھا مگر یزدانی کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ خصوصاً لوگوں کو عمرہ یا حج کے لیے بھیجنا۔ ایشیائیوں کے تمام مسائل عدالتوں میں حل کرنے کے ساتھ انہوں نے گناہ گاروں کو مکّے اور مدینے بھجوانے کا فرض بھی اپنے چوڑے کاندھوں پر لے رکھا ہے۔ ساقی فاروقی کو میری آمد کی اطلاع ہوئی تو اپنے گھر لے گئے۔

" گنڈی تمہیں اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی ڈشیں کھلائیں گی۔"

راستے میں ایک دکان سے ہندستانی مٹھائی خرید لی۔ ایک مختصر سی دکان تھی۔ "چند برس پہلے یہ دوکاندار قلاش تھا۔ اب لکھ پتی ہے۔"

میں نے پوچھا: "پھر کیا خیال ہے؟ اس پیشے میں کیا عیب ہے؟" ساقی نے اپنے سجے سجائے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "یہی عیب کہ ہم مٹھاس کا نہیں، آب تلخ کا کاروبار کرتے ہیں۔ دوسری قسم کی شاعری ہوتی ہی نہیں۔"

گنڈی کچن سے آئیں۔ ہم برطانیہ میں ایشیائیوں کے مسائل پر بات کر رہے تھے کہ انگریزوں کو شکایت ہے کہ ایشیائی برطانیہ کو اپنا ملک اور یہاں کی تہذیب کو اپنی تہذیب نہیں مانتے۔ اپنی تہذیبی شناخت پر اصرار کرتے ہیں۔

" بھلا بتاؤ! ہم میں جو میرؔ، غالبؔ ہے اس کا کیا کریں۔ یہ تو ملنے والے نہیں۔"

گنڈی نے ہمیں روکا۔ بولیں: " یہ بتائیں مجھے ایشیائی کیوں قبول نہیں کرتے؟ میں نے ہر طرح سے کوشش کی۔ میں انھیں پسند کرتی ہوں۔ ان کی تہذیب مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔" گنڈی نے ساقی کی طرف دیکھا۔ "میں ان کے کھانے پسند کرنے لگی ہوں۔ انھیں کی طرح رہتی ہوں۔ اب دیکھو میں نے سگریٹ بھی چھوڑ دی .... لیکن وہ اب بھی مجھے اجنبی، غیر سمجھتے ہیں۔ کیوں کرتے ہیں ایسا؟"

میرے لیے یہ سوال بڑا اچانک تھا۔ میں نے سوچنے کی کوشش کی۔ ساقی نے کچھ بہلانے بنانے نفسیاتی، تہذیبی اسباب تلاش کیے۔ مگر گنڈی کی اُداسی کم نہ ہوئی۔ ہم کھانا کھانے لگے۔ واقعی بیگم ساقی نے مزیدار ڈشیں بنائی تھیں۔ گنڈی بہت خوش تھیں کہ ساقی کے ایک "قدیم" دوست کو کھانا پسند آیا۔

"یار تم نے شعر کہنا بند کر دیا۔ بڑا کیا۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی۔" ساقی نے ہندستانی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے مٹھائی کا ایک ٹکڑا میری پلیٹ میں ڈال دیا۔ "یہ کھاؤ یہ مجھے بہت پسند ہے۔" گنڈی کا موڈ بگڑ گیا۔ "ساقی بڑی بات۔ تم انھیں اپنی پسند قبول کرنے پر مجبور کیے جا رہے ہو۔ پہلے اد میں' اب کھانے میں ۔۔ انھیں اپنی پسند سے کھانے تو دو۔"

ساقی نے ہتھیار ڈال دیئے اور مجھے معلوم ہوا مشرق کیوں مغرب کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ لا قبول نہیں کر سکتا۔ گنڈی کا مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے۔ ساقی کے ساتھ نہ ہو' ایشیا کے ساتھ تو رہے گا۔

اردو مجلس کے زیر اہتمام صدر مجلس یزدانی نے اپنے گھر میرے "اعزاز" میں ایک محفل منعقد کی۔ میں نے حسب روایت ایک ادیب سے اپنے جائز اور ادب سے ناجائز تعلقات کی طرف اشارہ کیا۔ یزدانی اور عباس زیدی نے غالباً اسے خاکساری' انکساری' بہانہ سازی' ظاہرداری پر محمول کیا۔ میں نے پھر توجہ دلائی کہ وطن عزیز میں سوائے چند رازدار احباب کے ہر ایک نے میری ادب سے دست بردار کو بسر و چشم قبول کر لیا ہے اور اب میں صرف کراچی کی مہمان نواز محفلوں میں کلام خوانی پر مجبور کیا جاتا ہوں۔ آپ ایک غیر اردو معاشرے میں 'اردو والوں کے سامنے مجھے اور اپنے آپ کو شرمندہ نہ کریں۔ لیکن ان دونوں کو اس پر یقین نہیں آیا۔

بہرحال مہر اور طہورا نے چالیس آدمیوں (جن میں خواتین بھی شامل ہیں) کے لیے پُرتکلف کھانا تیار کیا۔ جب سب کے سب آگئے تو سب کو کھلایا بھی۔ محفل رات کے ایک بجے تک چلی۔ ساقی' یاور عباس' وقار لطیف' محسنہ گیلانی' آصف گیلانی' شاہدہ' مجیب صدیقی اور ان کی بیگم مریم' صدیقہ شبنم' حبیب حیدرآبادی' اکبر حیدرآبادی' نقی تنویر' ڈاکٹر یوسف' زبیدہ یٰسین علی خاں' ظہور نیازی (جنگ) اور کئی پاکستان اور حیدرآباد کے خوش مزاجوں سے ملاقات رہی۔

افسانے سنے۔ پھر کلام سنا اور سنایا۔ ساقی کی سب سے نوک جھونک چلتی رہی۔ مسکراہٹیں' قہقہے دوسروں پر' اپنے پر' ..... یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں۔

دوسرے دن عمرہ کی نیت سے ایرپورٹ روانہ ہوئے۔ یزدانی کے گھر ایک ہفتہ یوں گذرا جیسے ایک دن گذرا ہو۔ وہ دن بھی یوں کہ ہر لمحہ میرے قیام کا مقصد پورا ہوتا رہے۔ میں لندن کی سڑکوں پر کافی گھوما۔ میرا ہر پروگرام گھر پر یزدانی اور ان کے گھر والے بناتے۔ گھر سے کہاں' کب اور کس طرح جانا ہے' وہ سب تفصیل سے بتلا دیا جاتا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ اگر باہر کوئی مشکل پیش آئے تو گھر فون کر لینا' میں ان ہدایات کے مطابق عمل کرتا اور خوش خوش اپنے کام کرتا اور اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آتا۔ اسکول آف افریکن اینڈ اورینٹل اسٹڈیز میں اردو کے ڈیوڈ میتھوز سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اردو کی تعلیم اور طلبا کے

بارے میں بتایا۔ وہ ابھی ہفتے روس سے لوٹے تھے۔ میں نے ذکر کیا کہ ماسکو میں ایک صاحب جیلانی بانو کی تحریروں پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ کیا ان سے آپ کی کہیں ملاقات ہوئی؟ بولے "نہیں میں ماسکو نہیں جا سکا۔ پھر جب گفتگو میں انھیں ان خاتون سے میرے رشتے کا پتہ چلا تو چونک کر بولے۔ "خوب۔ ان کے افسانے تو ہم یہاں پڑھاتے ہیں کیونکہ افسانوں کے ذریعہ زبان، معاشرت اور تہذیب براہِ راست واقفیت میں مدد ملتی ہے۔"

پھر ایشیائیوں کے بارے میں بات ہوئی تو انہوں نے دلچسپ ریمارک کیا۔

"اب یہاں گورے اور کالے کا فرق نہیں، بلکہ سب انگریز ہیں، کوئی گورا انگریز اور کوئی کالا انگریز۔"

واقعی، اس جملے میں یہاں کے رہنے والے ایشیائیوں کی تہذیبی تبدیلی کی دونوں تہیں موجود ہیں۔

بی بی سی کی اردو سروس میں مجیب صدیقی نے انٹرویو لیا۔ موضوع تھا آج کے ادبی رجحانات۔ میں نے سوچا اب سچ بولنا بے کار ہے۔ لوگ جھوٹ سمجھیں گے اور سچ تو یہ ہے کہ ادب پرانا کہاں ہوتا ہے۔ ادیب پرانے ہوتے جاتے ہیں۔ تو اگر میں نے سات آٹھ برس سے تقریباً کچھ نہیں لکھا تو اس کی کیا ضمانت کہ کل سے دوبارہ لکھنا شروع نہ کر دوں؟ لہٰذا اپنے کو شاعر، ڈرامہ نگار دوبارہ مان لو اور یوں ہی بات کرنے لگو۔ چنانچہ نہ صرف انٹرویو میں موجود ادبی رجحانات پر روشنی ڈالی بلکہ نظم بھی سنائی۔

اب پتہ نہیں مجیب صدیقی اور سننے والوں پر کیا گذری۔ مجیب صدیقی اردو سروس "آل انڈیا ریڈیو" دہلی میں عرصے سے کام کرتے ہیں اور ہندستان پاکستان کے سامعین میں بہت مقبول ہیں۔ آج کل ایک دو برس کے لیے بی بی سی کی اردو سروس نے ان کی خدمات حاصل کی ہیں۔ مجیب صدیقی نے چند ماہ قبل ایک اردو ڈرامہ لندن میں پیش کیا جس کی کامیابی کے چرچے میں نے بھی سنے۔ اب اپریل میں ایک اور ڈرامہ اسٹیج کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ انگلینڈ میں رہنے والے ایشیائیوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ کہانی بیحد دلچسپ ہے۔

بش ہاؤس میں رضا واسطی سے مختصر سی ملاقات رہی۔ وہ گفتگو کر رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں بی بی سی سُن رہا ہوں۔ یہ بات جب میں نے انھیں بتائی تو معذرت کی کہ کیا کروں عادت پڑ گئی ہے۔ روز یوں ہی بات کرنا ہوتا ہے۔

جب عمرہ کا ویزا اور کویت سے جدہ کا ٹکٹ لیے ایرپورٹ پہنچے تو معاملہ کچھ اور ہی ہو گیا۔ کاؤنٹر پر ایک خاتون نے اطلاع دی کہ میں جہاز میں نہیں بیٹھ سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ مجھے جدہ کی فلائیٹ کے لیے کویت میں (۱۵) گھنٹے رکنا ہوگا۔ اور چھ گھنٹے سے زیادہ قیام کے لیے نئے قوانین کے مطابق، کویت کا ویزا ضروری ہے۔ یزدانی اور مہر نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ کویت میں اتنی دیر صرف مجبوراً ٹھہرنا پڑ رہا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بے بس ہو کر واپس گھر آئے، یزدانی نے گھر پہنچتے ہی کویت سفارتخانہ سے بات کی۔ اس نے عمرہ جانے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کویت کا ویزا مل سکتا ہے بشرطیکہ میں یونیورسٹی کا "کوئی

ن نہیں‘ سرٹیفیکیٹ پیش کروں۔ ظاہر ہے لندن میں یہ ناممکن تھا۔ میں نے یزدانی کو ان کا جملہ یاد دلایا
، کوئی جاتا نہیں۔ بلایا جاتا ہے‘۔ شاید مجھے بلاوے کا انتظار کرنا ہوگا۔

اب تیسرے دن لندن سے براہ کویت دہلی کی نشست محفوظ کرادی۔ ان دو دنوں میں برنٹ
، کے شاپنگ سنٹر کی سیر کی۔ صمدانی اور ان کی بیگم طہورا ساتھ تھے۔ دو منزلہ عظیم الشان اس اسٹور میں
مال ہر ایک کی عزت اور امارت کا امتحان لے رہا تھا۔ میں نے زیڈ اکس ۸۱ واپس کر کے زیڈ اکس
خرید ا اور مطمئن ہوگیا۔ جس صبح لندن چھوڑنا تھا اس کی رات صمدانی مجھے ریجنٹ اسٹریٹ کی جامع
دکھانے لے گئے۔ رات کے دس بجے تھے۔ مسجد کے مینار کی چوٹی سے لگا چودھویں کا چاند اپنی اسلامی
ت پر ہنس رہا تھا۔ صمدانی نے اس کی تصویر لی۔ شدید سردی سے گزرتے ہوئے ہم مسجد کے اندر داخل
ے۔ فائبر گلاس کی عظیم الشان گنبد‘ تقریباً چار پانچ ہزار افراد کی نماز کی حفاظت کرتی ہوئی‘ پورا فرش
قالینوں سے ڈھکا ہوا‘ مسجد کے باہر وسیع و عریض احاطہ۔ ایک سڑک احاطے کے نیچے سے جاتی
جہاں زیر زمین کاریں پارک کرنے کی جگہ ہے۔ صمدانی نے بتایا کہ جمعہ کی نماز پر مسجد اور باہر کا احاطہ
ملتا ہے یہیں ایک اسلامک کلچرل سنٹر بھی ہے‘ جس کی بہت اچھی اور بڑی لائبریری ہے۔

گیارہ بجے واپس ہوئے۔

یزدانی نے چلے جانے سے پہلے؟ ... یزدانی نے چلے بنوائی۔ پھر کار کی کنجی لے کر مجھ سے کہا‘ صبح آپ جا رہے ہیں۔ آیئے باہر چلیں‘۔
رویسلیپ کی خاموش سڑکوں سے بہتے ہوئے الگزینڈر پیلس کی بلندی پر پہنچے۔ لندن اسی طرح اپنی
آنکھوں کے ساتھ سامنے‘ نیچے‘ دور‘ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ یزدانی لندن
پنی زندگی کے نشیب و فراز کے واقعات آہستہ آہستہ سنانے لگے۔ مشکلات‘ تنہائی‘ مخالفتیں‘ مایوسیاں
پھر بڑھتے ہوئے قدم‘ نمودار ہوتی ہوئی کرنیں‘ پھیلتی ہوئی روشنی‘ اعتماد اور یقین۔ اپنے سے
ر دوسروں کی زندگیوں میں دلچسپی...... ‘ میرا خیال لندن سے گزر کر‘ سمندروں سے ہو کر‘ پاکستان
، میں اپنی امی‘ بھائیوں‘ دوستوں سے ملتا ہوا‘ حیدرآباد کے گھر میں داخل ہوا‘ جہاں بانو اور
ن بے خبر تھے کہ میں اس وقت کہاں ہوں‘ کیا کر رہا ہوں‘ کیا سوچ رہا ہوں......

صبح ہوئی۔ میں نے یزدانی‘ ہیر‘ صمدانی‘ طہورا‘ عادل‘ انجم‘ زبیر‘ عمر اور زیدی‘ ساقی‘
ب‘ اکبر‘ وقار‘ نقی‘ مجیب‘ تاج‘ عسکری‘ سلیمان‘ کیٹس کے گھر‘ انڈیا آفس لائبریری‘
ٹ فن پلے اسٹیشن کو خدا حافظ کہا۔ صمدانی نے ہیتھرو ایرپورٹ تک پہنچایا۔ میں لندن سے دہلی
۔ دہلی ایرپورٹ پر جمبو جیٹ کی آٹھ دس گھنٹوں کی مسلسل گرج اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی...
تمام ہوا...... یا اب شروع ہوا ہے؟ ●●

جیلانی بانو

بھاگو، بھاگو

انتقام کے اندھیرے میں ساری گلیاں، سارے شہر ایک ہو گئے تھے۔

مارو ـــــ مارو ـــــ بھاگو۔ بھاگو۔ ہر طرف آوازیں گونج رہی تھیں۔

آشا کہاں جاتی ـــــ ؟

وہ اپنے دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے چاروں طرف دیکھتی ـــ پناہ کہیں نہیں تھی۔

آج سے پہلے ننھے بچوں کے آگے کبھی یوں راستے بند نہیں ہوتے تھے۔

میرے بچوں پر حملہ کرنے والے آ رہے ہیں۔

مارو ـــــ مارو ـــــ بھاگو ـــــ بھاگو ـــــــــ

آشا وہ سب راستے جانتی تھی جو دل کے یقین سے پھوٹتے ہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بے شمار سمتوں میں پھیلی ہوئی ان سڑکوں کے انت پر کہیں نہ کہیں روشنی کا پڑاؤ ہے۔ جبھی تو سب چل رہے ہیں۔ دنیا کے تمام فلاسفر، آرٹسٹ، ادیب اور سائنٹسٹ ـــ سب اسی راہ کی کھوج میں ہیں۔ وہ جس میں بے شمار ظلم جنم لیتے ہیں، جنھیں ہم روا رکھتے ہیں۔ کیونکہ لاکھوں برسوں کی کھوج کے بعد آشا کے سائنسٹسٹ شوہر سلطان نے جو امرت نچوڑا تھا، وہ کوئی راکشس پی گیا۔ اب ساری دنیا کے سمندروں میں بس بھرا ہوا تھا۔ مگر آشا کے آنے والے بچے راہول اور چنی جیسے اس بات کو نہیں مانتے تھے۔ وہ تو یہ حق مانگتے ہوئے آئے تھے کہ خوشی کا خوش ذائقہ پھل، دُنیا کے تمام مذہبوں اور دستوروں کا وعدہ ہے۔ وہ پلٹ کر ان لوگوں کا حشر کیوں نہیں دیکھتے، جو اس حق کو مانگنے والوں کا ہوا ـــــــــــ

ماں بننے کے بعد آشا خطروں میں گھر گئی تھی۔ حالانکہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود وہ کبھی تشکیک میں نہیں الجھی تھی ـــ وہ تو کالج میں ہسٹری پڑھاتی تھی۔ پانچ برس میں پانچسو اسٹوڈنٹس کو اس نے بھارت کی تاریخ پڑھائی تھی۔ یورپ کی تاریخ، یونان اور روما کی تاریخ، عربوں کی فتوحات اور روس کا انقلاب۔ اس نے تمام دنیا کے ادب کی بہترین کتابیں پڑھی تھیں اور ہر مذہب کے بنیادی عقیدے کو سمجھتی تھی۔

پھر بھی اسے شک تھا کہ لوگ اس کے بچوں کو مارنے آ رہے ہیں، ہر طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔
مارو ــــــ مارو ــــــ بھاگو ــــــ چاروں طرف سے یہ آوازیں آتی تھیں۔ کالج
ڈرنگ ہو گئی۔ پانچ لڑکے مارے گئے۔ پانچ برس کی لڑکی کی جبری توہین۔ مراد آباد میں قتلِ عام۔
یر میں فساد۔ دہلی میں بچوں کا اغوا ــــ اخبار آشا کے ہاتھ میں کانپنے لگتا۔ "کون سے راستے سے راہول
ل بھیجے گی؟ چھٹی کو کیسے محفوظ رکھے گی؟"
ساری گلیاں، سارے راستے اندھیرے میں ایک ہو گئے تھے ــ پناہ کہیں نہیں تھی۔
مارو ــــــ بھاگو ــــــ ہر طرف یہی آوازیں گونجتی تھیں۔
سو جاؤ ــــــ ہر وقت ایسے بھیانک خواب مت دیکھا کرو۔" سلطان اُسے اپنی بانہوں میں چھپا کر
دیتا تھا۔ اس کا سائنٹسٹ شوہر، جسے اس سال وگیان کا سب سے بڑا ایوارڈ ملا تھا۔ وہ خلا میں
بھیج چکا تھا۔ مگر پہلے اپنے بچوں کے پیر تو زمین پر ٹکا دیتا!
دشمن گھات میں تھا۔ لاکھوں ننھے ننھے بچے چھپتے پھر رہے تھے ــــــ بچاؤ ــــ بچاؤ ــــــ
ہ کے اندھیرے میں ساری گلیاں، سارے شہر ایک ہو گئے تھے ــــــــــــ
آشا، ہر رات تمام دروازے کھڑکیاں بند کر کے سونے کی عادی تھی۔ پھر بھی سلطان کے بہکاوے میں
ــــــ سلطان سائنٹسٹ تھا۔ اس لیے اُسے دنیا سے بڑی آس لگی تھی۔ پھر جب راہول نے
دروازے پر دستک دی تو سلطان خوشی کے مارے اُچھل پڑا ــــــ لو، وہ آگیا جو نئے چاند،
برج ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ دنیا میں پھیلی ہوئی خود غرضی اور بے رحمی کا علاج اپنے ساتھ لائے گا۔ میرا بیٹا۔
نے والے دن کا اجالا ــــ اتنے اہم انسان کی تشکیل کتنے جان جوکھوں کا کام تھا۔
اب آشا کو ساری دنیا سنوارنے کی فکر ہو گئی تھی۔ دھوپ تیز نہ ہو۔ بارش تھم جائے۔ کسی نئی لڑائی
نہ پڑے، کالونی میں کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ وہ اخبار بڑے دھیان سے پڑھتی۔ خبریں بڑے غور
سنتی۔

مارو ــــ مارو ــــ بھاگو ــــــــ بھاگو سارے اخبار میں ایک ہی خبر پھیلی ہوتی۔ ہر
آوازیں گونج رہی تھیں۔ قاتل ہر طرف دوستوں کا سوانگ بھرے گھوم رہے تھے۔ ساری گلیاں،
شہر انتقام کے اندھیرے میں ایک ہو گئے تھے۔
سلطان کو آشا کے خوف پر ہنسی آتی تھی ــــــ وہ جب چھٹی پر آتا تھا تو آشا اور بچوں کو
بے فکری سے گھوما پھرتا۔ آگرہ، کشمیر، دہلی، بنگلور ــــــ اس نے اپنے بچوں کو بھارت
دکھایا تھا۔ مگر بچے تو ان دونوں کو گھسیٹ کر "زو" لے جاتے تھے۔ انھیں "زو" بہت پسند تھا۔

سلطان کو آشا کو بھی جنگل کا پُرسکون ماحول اچھا لگتا۔ راہوں اور چھوٹی موڑ چھوتے، ہرن کو اپنے ہاتھ سے پتے کھلاتے اور بن مانس کے لئے سگریٹ پھینکتے رہتے تھے۔

"ممی بندر کا بچہ شرارت کرے تو اس کی ممی مارتی کیوں نہیں!"

چھٹی اس کی ساڑی کا پلو پکڑ کر پوچھنے لگی۔ پھر تو آشا کو بھی سوچنا پڑا کہ بندر کے بچے بڑے ہو کر بندر کیسے بن جاتے ہیں۔ انسان کے بچوں کو انسان بنانا تو بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ بندریا کتنے مزے میں ہے۔ اسے بچوں کو اسکول بھیجنا ہے نہ انسانیت کے سبق پڑھانا ہیں۔ وہ بے فکری کے ساتھ بندروں سے عشق بازی میں معروف ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا عاشق ہندو ہے یا مسلمان ——

ایک بار "زو" میں آشا اور سلطان کے قریب ایک امریکن جوڑا شیروں کے فوٹو لے رہا تھا۔ شیران کے قریب آیا تو لڑکی لڑکے سے ڈر کے مارے لپٹ گئی۔

"اوہ ڈارلنگ! میں شیر کو اپنے اتنے قریب نہیں دیکھ سکتی۔"

"مگر شیر بڑا سمجھدار جانور ہے ڈیر۔" لڑکے نے لڑکی کا منہ چومنے کا بہانہ ڈھونڈا۔

"جب تک اسے انسان سے خطرہ نہ ہو، وہ کبھی حملہ نہیں کرتا۔"

"پاگل ہے یہ امریکن۔" آشا نے ہنس کر سلطان سے کہا۔ "کتابوں سے فقرے رٹ کر آیا ہے۔ بھلا ان خوفناک درندوں پر کوئی اعتبار کر سکتا ہے۔" اور پھر اس نے بچوں کو بلا کر کہا۔

"اب چلو یہاں سے۔ مجھے ان خوفناک جانوروں کے بیچ میں رہنے سے وحشت ہو رہی ہے۔"

"چلو بھئی، تمہاری ممی بڑی ڈرپوک ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی سے ڈرتی رہتی ہے۔"

سلطان بچوں کے ساتھ اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

پھر ایک دن بازاروں میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔

"اری پاگل! بچوں کے ساتھ مسلمانوں کے محلے میں کیوں گھوم رہی ہے۔ گھر میں چھُپ جا۔"

"کون سے گھر میں چھُپ جاؤں! کس سے کہوں کہ میرے بچے ہندو نہیں ہیں۔ ان کا باپ مسلمان ہے مگر کالونی کے سب ہندو مسلمان ان دونوں سے ناراض تھے —— برہمن کی لڑکی اور ایک ملیچھ مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی —— منحوس سید زادہ ایک کافر عورت کو گھر میں ڈالے ہوئے ہے۔ ان دونوں کو تو سنگسار کرنا چاہیئے۔

مارو —— مارو —— پکڑو —— بھاگو ——

یوں لگتا اب آسمانوں پر خدا کی بادشاہت ختم ہو گئی ہے۔ ورنہ وہ ان مست زور انسانوں کے منہ میں لگام دینے کے لئے کسی کو نیچے کیوں نہیں اُتارتا؟

آشا نے سلطان کو زندگی بھر کے لئے قبول کیا تھا تو صرف اپنے بارے میں سوچا تھا۔ اپنے برہمن خاندان
ں برہمنی اور سلطان کے سید خاندان کی بدنامی کا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ اب تو اسے یقین تھا کہ راہول ہی وہ
پتہ ہے جو نئی دنیا کی نیو رکھے گا۔ کیونکہ وہ راہول ہے۔ اس کے پُرکھوں نے تمام دنیا کے دکھوں کا کڑوا ذائقہ
عا تھا تاکہ وہ بھی مٹھاس ڈھونڈھ سکیں۔ انہوں نے اپنے اوپر ہر سکھ حرام کر کے نروان پالیا تھا۔ اب
رہ یگ کے بچے باس کے بعد اپنا کشکول راہول کو دے دیا تھا۔ راہول کسی کی جیو ہتیا نہیں کرے گا۔ کبھی کھیت
ں نفرت کے بیج نہیں بوئے گا۔ کوئی ناکامی اس کا راستہ نہیں روکے گی ——— مگر موت تو ہر گلی میں ہر موڑ
اِس کی تاک میں تھی ——— انتقام کے اندھیرے میں ساری گلیاں، سارے راستے ایک
وگئے تھے ——— آشا بچوں کو لے کر کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

"کھولو ——— کواڑ توڑ دو ——— جلا دو ——— باہر لوگ چلّا رہے تھے۔ اس کے دروازے پر
قر اور لاٹھیاں برس رہی تھیں۔

"سو جاؤ آشا ——— سو جاؤ ——— تمہارے دروازہ پر کوئی مارنے والا نہیں آیا ہے۔"

سلطان اسے تھپکیاں دے کر سلا دیتا تھا۔

مگر اتنی ہاہاکار بھی ہو تو کوئی ماں چین سے سو سکتی ہے؟ سارے مارنے والے آج سڑکوں پر نکل آئے
یں نا۔ انہوں نے اپنے چہروں سے نقلی نقابیں نوچ پھینکی ہیں۔ اب وہ ننھے بوڑھوں، بے قصور نوجوانوں،
ور ہنستے کھلکھلاتے بچوں کو روندتے پھر رہے ہیں۔ سارے خالی ہاتھ انسان گھروں میں بند تھے کہ قتل ہونا
ن کے نصیب میں لکھا تھا۔

آشا کے چاروں طرف رات پھیلی ہوئی تھی۔ ننھے بچوں کی ماں والی رات، جب آکاش پر ہر طرف
تارے جھلملاتے ہیں۔ چاند کے لئے مچلنے والے بچے کی خاطر، چاند سچ مچ ماں کی گود میں اُتر آتا ہے۔ اور
نیند کی پریاں اسے جھولا جھلانے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں ——— راہول اس کی بانہوں
پر سر رکھے سو رہا ہے۔ چنّی اس کے پیٹ پر لیٹی ہے۔ چنّی کے سنہرے بال آشا کے چہرے پر پھیل
گئے ہیں۔ چنّی کا ننھا سا ہاتھ اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہے۔

"ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں غنڈے ہماری کالونی میں نہ آجائیں ——— ؟"

"ایسی بُری بات مت سوچو۔ میری جان۔ تم راہول ہو۔ کیا ڈر جاؤ گے ——— ؟"

راہول کو سُلا کر آشا سوچتی ——— کیا پہلے بھی ننھے بچے راتوں کو ڈرتے تھے۔

آج قاتلوں نے ننھے بچوں سے ان کی نیندیں چھین لی ہیں ان کے دل اندیشوں سے بھرے ہوتے ہیں۔
یہ کس اعتبار کو تھام کر کالی راتیں کاٹیں گے؟ کیسے اُجالے تک پہنچیں گے؟

ایک دن آشا نے کہا۔ "سنو سلطان ـــــ ہم اپنے بچوں کو لے کر اسٹیٹس چلے جائیں گے۔ تمہیں وہاں
ت اچھی جاب مل سکتی ہے۔"

"ہاں لیکن میں نے جو پروجیکٹ شروع کر رکھے ہیں وہ ادھورے رہ جائیں گے۔ میں اپنا کام کیسے
ڑ سکتا ہوں اور پھر وہاں کالے بچوں کی توہین کی جاتی ہے۔ میرے بچے نفرت کا یہ عذاب کیوں سہیں؟"

وہ چپ ہو گئی۔ بلکہ انتظار کرنے لگی کہ سلطان کے پراجیکٹ پورے ہو جائیں تو ضرور کوئی نہ کوئی انقلاب
ئے گا۔

اور پھر سلطان کو کسی کام کے لئے مڈل ایسٹ جانا پڑا۔

"میں بھی چلوں گی۔" آشا جھٹ تیار ہو گئی۔

"ارے نہیں بھئی۔ تم آشا ہو۔ جانتی نہیں کہ مسلمانوں کے دیش میں آشا کو جگہ نہیں دی جاتی۔ وہاں تمہیں
کے ماتھے سے بٹو مٹانا پڑے گا۔"

"پھر راہول اور چنٹی کو لے کر کہاں جاؤں؟"

یہ سلطان کیسا بے حس ہے۔ دن رات خلاؤں کی کھوج میں اوپر تکے جاتا ہے۔ اس کے لئے چاروں
ف پھیلی ہوئی کائنات بڑی اہم ہے۔ مگر آشا ماں تھی اس کی جڑیں دھرتی میں پھیلی ہوئی تھیں جہاں سے
تا کا بیج پودا بن کر پھوٹتا ہے۔ جہاں سے سورج زمین کا سینہ چیر کے اُگتا ہے۔ سلطان کتنا مطمئن تھا کتنے
ینان کے ساتھ وہ آنے والے سو برسوں کی ریسرچ کا پروجیکٹ تیار کر رہا تھا۔ جبکہ آشا کے لئے آنے والی
ایک دھوکہ تھی۔ پھر اس نے بھی طے کر لیا کہ اب وہ کسی سے نہیں ڈرے گی ـــــ بھاگ جاؤ۔ تم مجھے
یں مار سکتے۔ میں آشا ہوں۔ میں نے ساری دنیا کی تاریخ پڑھی ہے۔ تم تاریخ کے ہر ورق پر راون بن کر
لے گئے ہو۔ یزید بن کر پڑھے گئے ہو۔ ہم ہر سال تمہارا شریر جلاتے ہیں۔ تم پر لعنت بھیجتے ہیں اور تم
راپنا خوفناک چہرہ لئے آجاتے ہو؟ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ـــــ میں ہوم منسٹر سے ملوں گی۔ میں کوئی
ولی عورت نہیں ہوں۔ میں سلطان کی بیوی ہوں ـــــ میں مخالف فرقہ واری کنونشن کی سکریٹری
ں۔ تم جیسے غنڈوں کا کیا علاج ہونا چاہیئے اس پر اب تک چار سیمینار کر چکی ہوں ـــــ

مگر آشا کی پکار کون سنتا! چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی۔

مارو ـــــ مارو ـــــ بھاگو ـــــ جلادو ـــــ

"ہیلو ہیلو ـــــ غنڈوں نے ہمارے مکان کو گھیر لیا ہے۔ میں مسز سلطان ہوں۔ ہیلو ہیلو ـــــ
اس نے ہوم منسٹر کو فون کیا) کیا میں بچوں کو لے کر وہاں آجاؤں ـــــ ہاں ـــــ راستے تو بہت خطرناک
ہیں ـــــ ہیلو ہیلو ـــــ خدا سلطان کو خبر کر دیجیئے ـــــ ہیلو ہیلو ـــــ مارو ـــــ مارو ـــــ

چیخ و پکار میں دب گئی) سلطان زمین پر نہیں تھا۔ وہ تو بس خلا میں جیتا تھا ـــــ اس کے علاوہ ڈنڈا اور
ـــــ اس کا پروجیکٹ اور فرقہ واریت کے خلاف لڑتے ہوئے آشا کے پیپر ـــــ سب منتشر ہوکر بیدل
فضاؤں میں بکھر چکے تھے ـــــ آشا بچوں کو پلو سے چھپاتے [illegible] گلی
بشور ناتھ کی دکان تھی جہاں ساری کالونی کے ہندو غنڈوں کا اڈہ تھا۔ دکانوں کے [illegible] میں
لاٹھیاں اور برچھیاں چھپا کر رکھی تھیں ـــــ پناہ کہیں نہیں تھی ـــــ وار کرنے والے انہیں ہر طرف
تھے آج ـــــ ساری گلیاں، سارے راستے انتقام کے اندھیرے میں ایک ہو گئے تھے۔
نہیں چھپ جاؤ ـــــ لوگ اسے صلاح دے رہے تھے ـــــ
بھاگو ـــــ بھاگو ـــــ وہ بھاگتی رہی ـــــ یہ تو جنگل تھا۔
میں "زو" تھا۔ سامنے خوفناک شیر منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ (جب تک انہیں انسان سے خطرہ نہ ہو شیر
) ایک امریکن لڑکا کہہ رہا تھا ـــــ
ور آشا جلدی سے بچوں کا ہاتھ تھامے شیر کے پنجرے میں گھس گئی ـــــ اب وہ مطمئن تھی کہ وہ درندوں سے بچ نکل
گئی تھی۔ ●●

نقد و نظر، ص ۴۵ سے آگے پڑھیے:

بشوا ناتھ مہرہ، آمر تخلص، وطن لکھنؤ، حیدرآباد کے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے خاندان اور شاد کی شعری و تہذیبی
ت کے علمبردار ہیں۔ مہاراشٹر کے ضلع جالنہ میں قیام ہے وہیں کے ایک مارواڑی سخنور آنجہانی ہر لیش چند دکھی جالنوی
شاگرد اور ضلع میں شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں منہمک بزرگ ہیں۔ "یادوں کے چراغ" ان کی روایتی
شاعری اور قطعات کا مرقع ہے۔ کلام میں سادگی، سلاست، شرافت اور قدیم اقدار کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے
عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" حیدرآباد، مرحوم اوج یعقوبی ملک الشعرا آندھرا پردیش اور جناب مغنی
ے علاوہ م۔ ع۔ باسط نے بھی آمر کی شاعری اور ان کی وضعدارانہ شخصیت پر اس کتاب میں اپنے تاثرات
ئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ذرا بھی جس کی وفا کا یقین آیا ہے — قسم خدا کی اسی سے فریب کھایا ہے
مشکل میں اپنی کام جو آئے وہی ہے دوست — ملنے کو روز ملتے ہیں جہاں نئے نئے
آدمی ہے آئینہ خانہ عین دنگ — ہاں تخیل مائل پرواز ہے
بندہ پرور دیکھئے کیسا زمانہ آگیا — ہے تلاش اہل دل اور اہل دل ہیں دل سے دور
فسانے سنائیں آمر ہم کہاں تک — حقیقت حقیقت، کہانی کہانی

عبارت منصور آمر جالنوی گئی رُتوں کی سوگندھ کے شاعر اور انسانی رشتوں کے سخنور ہیں جنہیں ان اقدار

ایک زمین میں دو غزلیں

مصحف اقبال توصیفی

نقشِ پا منزلِ غبار میں ہے
راستہ کسی کے انتظار میں ہے

ایک دل تھا جو تیری نذر کیا
ایک جاں ہے سو انتظار میں ہے

ایک غم کی مہک ہے خوشیوں میں
ایک رنگِ خزاں بہار میں ہے

دل نے اب تک تجھے نہیں دیکھا
آنکھ صدیوں سے انتظار میں ہے

میری تصویر اک فریم میں ہے
عکس آئینے کے حصار میں ہے

شاہد کبیر

دل محبت کے کاروبار میں ہے
زندگی ان دنوں قرار میں ہے

یہ بھی ہے زندگی کا طور کوئی!
جس کو دیکھو کھڑا قطار میں ہے

اک پری لے اُڑی ہے لڑکے کو
ایک لڑکی اداس کار میں ہے

میز سے کب گرے گا یہ گلدان!
دیر سے فرش انتظار میں ہے

ایک تم ہی نہیں گئے شاہدؔ
اب تو وہ بھی کسی کے پیار میں ہے

اسلم عمادی

دو غزلیں

جینا ہے تو اب اپنے ہنر بھول کے جینا
یعنی سببِ دیدۂ تر بھول کے جینا
آئینے سے بچ بچ کے گذر جانا سرِ راہ
واماندگیِ شوقِ سفر بھول کے جینا
سہہ لینا ہر اک سانس کی بےہودہ سی ذلت
یعنی کہ تری راہ گذر بھول کے جینا
کھو دینا حسین قمقموں کی قید میں دن رات
اور پرتوِ رخ، شمس و قمر بھول کے جینا
صحرا میں بھی سامان ہیں تنہائی و غم کے
اسلم مجھے راس آ گیا گھر بھول کے جینا

بچھڑے جو تجھ سے عالمِ جاں ہی جدا ملا
کیا شے ہے دل گرفتگی اس کا پتہ ملا
ہم کیسے کینوس پہ نیا رنگ ابھارتے؟
ساری ہوا میں نیلا سمندر بھرا ملا
لوٹے تو گھر کے فرش پہ دروازہ کے قریب
بچپن کا ایک اپنا ہی فوٹو پڑا ملا
جب آنکھ کھولی ساعتِ مغرب تھی روبرو
سورج زمانِ شوق کا بجھتا ہوا ملا
اچھا ہوا کہ اس سے ملاقات ہو گئی
دل کے زیاں کا ایک نیا راستہ ملا
اسلم دکن[1] سے دور جو آئے کرو حساب
سوندھی زمیں کو چھوڑ کے صحرا میں کیا ملا

[1] حیدرآباد: کہ دوشیزہ برافگندہ نقاب

عبدالرحیم نشتر

ایک نظم

کھوئی ہوئی وہ شے
میں جس کو
اک مدت سے ڈھونڈ رہا ہوں
اس کے گھر محفوظ ہے اب تک
لیکن ــــــــ
میرا دوست بڑا مخلص ہے
وہ میرا اچھا ساتھی ہے
اس کی چاہت،
اس کی یاری،
اور ــــــــ
اس کے ایمان کا
میں خود بھی قائل ہوں
کیسے اس پر تہمت رکھ دوں
کیسے کہدوں
تو میری بائیں پسلی
مجھ کو لوٹا دے ــــــــ !!

علی الدین نوید

خداوندا میں راضی ہوں

کھلونا کیسے ٹوٹا کیا بتاؤں
نہ کانوں تک کوئی آواز آئی
نہ آنکھوں میں لہو کا بیل بوٹا
کھلونا کیسے ٹوٹا کیا بتاؤں !!

پرندے آشیانوں سے نکل کر
لچکتی ڈالیوں پر جھومتے تھے
سحر کے عارض ولب چومتے تھے
درختوں کی جبینوں پر لکھی تھی حمدِ باری
ابھی انگڑائیاں لینے کو تھی بادِ بہاری
کہ ایسے میں ــــــــ
اُفق سے صف بہ صف اُتری فرشتوں کی سواری۔
مشیت اوڑھ کر گھر پر مرے بارات اُتری
منور ساعتوں میں رات اُتری

○

عمارت میں کہیں جالے تنے تھے
کہیں چمگادڑیں لٹکی ہوئی تھیں
چلو اچھا ہوا اک زور کی آندھی تو آئی ــــــــ
کھل گئیں سب کھڑکیاں ــــــــ
مرا کیا ــــ میں ازل ہی سے نئے زخموں کا عادی ہوں
خداوندا میں راضی ہوں !!!

غزلیں

رضا وصفی

جسے نہ دھوپ نہ سایہ دکھائی دیتا ہے
اسی کو دشت میں دریا دکھائی دیتا ہے

میرا شعور اناالحق' میرا سرور ـــــــ انا
میرے ہی خون کا پیاسا دکھائی دیتا ہے

رُکو تو وقت بھی ہے سمت بھی تعین بھی
چلو تو رستہ ہی رستہ دکھائی دیتا ہے

دل و نگاہ کے ہر نکتۂ بلندی پر
مجھے تو ایک ہی چہرہ دِکھائی دیتا ہے

یہ تیری قربتِ جاں ہے کہ میرا وصفِ جنوں
نہ کوئی غیر ـــــــ نہ اپنا دکھائی دیتا ہے

کھلی ہے آنکھ تو ہر ذرّہ بزمِ امکاں کا
سراپا حرفِ تمنا دکھائی دیتا ہے

جو آبرو تھا شجر کی وہ برگ بھی وصفیؔ!
ہُوا کے دوش پہ بہتا دکھائی دیتا ہے

علی الدین نوید

میرے اعصاب میں اُترے گا کڑوا ذائقہ ہو کر
مجھے آنکھیں دکھائے گا میرا لڑکا بڑا ہو کر

نہیں ایسا کہ کھو جاؤں گا صحرا کی صدا ہو کر
میں سناٹے میں بولوں گا تیری آواز پا کر!

زمیں کی تشنہ رگوں سے آسماں نکلے گا وا ہو کر
زمانے میں رہے گا ایک دن یہ معجزہ ہو کر

کبھی ایسا ہو' تو مجھ سے نظر پھیرے خفا ہو کر
میں تیرے دل میں اتروں' تیری آنکھوں سے جُدا ہو کر

جزیرہ ہوں مگر میرے لیے یہ بات کیا کم ہے
سمندر میرے پہلو میں کھڑا ہے آئینہ ہو کر

بکھرتے ٹوٹتے لمحوں میں ہم بھی سانس لیتے ہیں
ہمیں جینے کا فن تو آتا ہے بے دست و پا ہو کر

مرے سائے میں کل تک موجِ گل انگڑائی لیتی تھی
بھٹکتا پھر رہا ہوں آج جنگل کی ہوا ہو کر

شکاری ڈھونڈنے مجھ کو نکل جائیں گے جنگل میں
پروں میں قید ہو جاؤں گا پنجرے سے رہا ہو کر

یہ چیخیں یہ کراہیں یہ کٹے بازو یہ جلتے گھر
ہمیں کھا جائیں گے سیلاب' آندھی' زلزلہ ہو کر

نویدؔ اس شخص سے اب دور ہی رہتے میں لذت ہے
کہ اس کی قربتیں ڈسنے لگی ہیں فاصلہ ہو کر

پروفیسر اکبر الدین صدیقی

نصرتی کی فارسی غزل

نصرتی کے متعلق استادِ محترم بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک مستقل کتاب لکھ دی ہے جو حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے اس کے بعد جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اس کا دیوان اور تاریخ اسکندری شائع کی اس میں نصرتی کے فارسی کلام کا کوئی تذکرہ نہیں اور نہ مولوی عبدالحق نے اس کا ذکر کیا ہے۔

"سب رس" (حیدرآباد دکن) میں راقم الحروف نے نصرتی کی ایک فارسی غزل پیش کی اور اس کا اظہار کیا۔ جید شعرا نے اس زمین میں غزلیں کہی ہیں چنانچہ نظیری نیشاپوری جو اکبر کے عہد (۱۵۸۴ء / ۹۹۲ھ) میں ہندستان آیا اور اکبر کے دربار میں (۱۵۸۸ء / ۹۹۷ھ) میں باریاب ہوا۔ پھر خانخاناں کے پاس احمد آباد چلا گیا۔ جہانگیر نے اس کو (۱۶۱۰ء / ۱۰۱۹ھ) میں اپنے دربار میں طلب کیا، اس نے باریابی پائی، کچھ عرصے دربار میں رہا اور پھر احمد آباد واپس ہوکر ۱۰۲۱ یا ۱۰۲۳ھ میں فوت ہوا۔ اس زمین میں اس کی غزل ملتی ہے۔ مطلع اور مقطع ذیل میں درج ہے:

مطلع: قاصد دل آزردہ تر از آبلہ دارد
می آید از آں کوے وز رفتن گلہ دارد

مقطع: چوں گفتہ و ناگفتہ بہ سنجیدن بجنت است
شعرے کہ نہ گفتہ بہ نظیری گلہ دارد

یہ زمین کافی مقبول ہوئی اور صائب نے جو شاہجہاں کے عہد میں ہندستان آیا اور کشمیر سے برہان پور تک سفر کرکے واپس ہوا، اس زمین میں غزل کہی، مطلع اور مقطع یہ ہے:

مطلع: از گریۂ اشکم صفِ مژگاں گلہ دارد
زیں آبلہ پا خارِ مغیلاں گلہ دارد

مقطع: در عالمِ حیرت بود آرامی اگر ہست
صائب عبث از دیدۂ حیراں گلہ دارد

صائب نے ۱۰۸۱ھ میں اصفہان میں وفات پائی۔

مرزا عبدالقادر بیدل کا مطلع اور مقطع حسبِ ذیل ہے:

مطلع: از پنبہ اگر آتشِ سوزاں گلہ دارد
دیوانہ ہم از خارِ مغیلاں گلہ دارد

مقطع: بیدل ہوسِ داغِ محبت نہ فروزی
ایں شب کہ تو داری ز چراغاں گلہ دارد

بیدل کے ایک معاصر محمد ہاشم موسوی خاں جرأت ہیں وہ ۱۰۸۸ھ میں گیلان میں پیدا ہوئے اور اپنے

والد مرزا محمد شفیع کے ساتھ ہندوستان آئے اور امیر الامراء سید حسین علی خاں کی وساطت سے فتح آباد (دھارور) ضلع بیڑ کے قلعدار مقرر ہوئے۔ ۱۱۳۱ھ میں دہلی گئے۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور میر عبدالجلیل بلگرامی کی صحبتوں میں فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد آصف جاہ اول کی خدمت میں اورنگ آباد آ گئے۔ ۱۱۷۵ھ میں انتقال کیا۔ یہ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا ایک نہایت نفیس خطی نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے صفحے کی لکیریں نیلی، سرخ اور سنہری ہیں۔ مقطع دو سطروں میں درمیان میں لکھا ہے۔ اس زمین میں ان کی ایک غزل ہے:

مطلع: دل از خمِ زلفِ تو بپا سلسلہ دارد
آسودگی انما چہ قدر قاصلہ دارد

مقطع: جرات غزلے بدولت گلشنِ معنی است
ہر بیت تو صد کانِ جواہر صلہ دارد

نصرتی، صائب، بیدل اور جرات کا پیش رو ہے اس نے ۱۰۸۵ھ میں شہادت پائی۔ "نصرتی شہید شد" مادۂ تاریخ وفات ہے اس نے نظیری یا اس کے کسی اور معاصر کی غزل پر اپنی زمین میں غزل لکھی ہے بیجاپور کے کتب خانے کی ایک بیاض میں نصرتی کی یہ غزل دستیاب ہوئی ہے۔ اس کا ذکر میں نے مذکورہ "سب رس" حیدرآباد دکن اور اپنے دکنی ادب پر مضامین کے مجموعے "بجھتے چراغ" میں کیا ہے۔ یہاں اس کی تکرار بیجا نہ ہوگی۔

غزل: از پنجۂ من چاک گریباں گلہ دارد
وز گریۂ من گوشۂ داماں گلہ دارد

داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

گہ بت شکنم گاہ پرستندۂ آتش
از مذہبِ من گبر و مسلماں گلہ دارد

از بسکہ بہ زندانِ غمت دیر بماندیم
زنجیر بہ تنگ آمدہ زنداں گلہ دارد

گہ گریم و گہ خندم و گہ آہ جگر سوز
اے نصرتی از وضعِ تو جاناں گلہ دارد

یہ عجیب بات ہے کہ قدرت اللہ گوپاموی نے اپنے تذکرے "نتائج الافکار" میں جہانگیر کے ذکر میں لکھا ہے۔
"در بیاض یکے ثقات این چند بیت بنام بیگم موصوفہ (نور جہاں بیگم) دیدہ مدیں جا نگارش یافتہ۔

پہلا شعر: از پنجۂ من..... ۲۔ داماں نگہ تنگ
۳۔ سنبل بہ چمن نافہ بچین مشک بہ تاتار
از نکہت آں زلف پریشاں گلہ دارد
۴۔ از بسکہ بہ زندان غمش ... ۵۔ گہ بت شکنم
۶۔ در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

بیجاپور کی بیاض میں تیسرا اور چھٹا شعر نہیں ہے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانے میں نہایت نفیس خط میں لکھی ہوئی ایک بیاض ہے جس میں مخمس، غزلیں اور رباعیات و قطعات مندرج ہیں، اس میں ایک مخمس میں اسی غزل کی تضمین ملتی ہے، جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

تضمین

از زلفِ پریشانِ تو نالاں گلہ دارد

وز دیدۂ تو دیدہ مہ تاباں گلہ دارد
عاشق [illegible] گلہ دارد
از جنبش من [illegible] گلہ دارد
[illegible] گلہ دارد

تا جسم [illegible] آتش
از [illegible] آتش
گلہ فگنم [illegible] جہان افگنم آتش
[illegible] آتش
از شرب من گیرد مساماں گلہ دارد

گر مست خرامی بہ سر بام تماشا
دل ہائے پریشان کنی از دام تماشا
دل گشتہ چناں بر رخ تو رام تماشا
در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

ماییم کہ در ہجر تو دل گیر بماندیم
از زلف سیاہ تو بہ زنجیر بماندیم
غمہائے بسر آمدہ و ما زیر بماندیم
عمریست کہ در بند غمت دیر بماندیم
زنجیر چو تنگ آمد و زنداں گلہ دارد

دل در غم عشق تو ... الم و آہ
گشتیم ضعیف از ستم ہجر تو چوں کاہ
ایں معرکہ شد خاک نکردیم سپہ آہ
پامال [illegible] گشتیم و دریں راہ
ایں دیدہ کہ از سایۂ مژگاں گلہ دارد

[illegible] شب غم [illegible] روز
[illegible] فرقت آں [illegible]
پس از چہ فغاں نست ترا ہر شب و ہر روز
گہ نالہ و گہ خندہ و گہ آہ جگر سوز
اے نصرتی از وضع تو جاناں گلہ دارد

نصرتی کی غزل میں تخلص موجود ہے' غالب گمان یہ ہے کہ یہ تضمین بھی نصرتی کی ہے۔ اس زمین میں' نورجہاں اور اس کے معاصرین' قدسی اور ابوطالب' کلیم نے بھی کہی ہوگی۔ دواوین کے مطالعے سے علم ہوسکے گا۔

انتخاب طرحی محفلِ شعر: مشاعرہ سالِ نو

اربابِ نثر و نظم کی طرف سے چوتھا سالانہ طرحی مشاعرہ سالِ نو ۱۹۸۴ء۔ یکم جنوری کو ۹ بجے شب بمقام "مہران ہال" مغلپورہ، حیدرآباد بصدارت ڈاکٹر مغنی تبسم منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ سے دستیاب بیشتر شعرا صاحبان کی غزلوں کا انتخاب پیش ہے۔ مصرعِ طرح "پھر نئے سال نے دروازے پہ دستک دی ہے" (ڈاکٹر ...)

بشیر وارثی :

سالِ نو تجھ کو مبارک ترا آنا لیکن — سالِ ماضی سے جدائی بھی کڑی ہوتی ہے
شب کے سناٹے میں خوشیوں کی امنگیں جاگیں — جب نئے سال نے دروازے پہ دستک دی ہے
کل بدل جائیں گے یہ انفس و آفاق بشیر — وقت نے گردشِ حالات کو جنبش دی ہے

منوہر لال بہار :

راہ سنسان ہے سناٹوں کی آبادی ہے — دل کی دنیا میں چلے آئیے تنہائی ہے
اختلافات کی تلخی کو مٹا دو یارو — دشمنی ملک سے یہ قوم سے غداری ہے
داخلہ عام ہے ساقی کی طرف سے رندو — سالِ نو کے لیے یہ دعوتِ میخواری ہے

جوہر ہاشمی :

پھر قیامت کے سوالات اُبھر آئے ہیں — "پھر نئے سال نے دروازے پہ دستک دی ہے"
منتظر رہنا ہے کب وقت کسی کا جوہر — وقت کے طرزِ عمل میں یہی سفاکی ہے

خورشید جنیدی :

پردۂ کربِ مسلسل مری خاموشی ہے — بند مٹھی میں ابھی شرمِ تہی دستی ہے
جائزہ لے کے غموں کا کبھی ہنس لیتا ہوں — اتنی فرصت تو مرے غم نے مجھے بخشی ہے
فتنۂ ترکِ تعلق نہ اُٹھا ہو خورشید — اجنبی سی کوئی آواز سنائی دی ہے

خواجہ ذاکر گوڈر شاہی :

نہیں ملتے ترے قدموں کے نشانات مگر — دل کی دھڑکن تری امید کا پتہ دیتی ہے
ہونے پائے نہ زمانہ کہیں واقف مجھ سے — لب تو لب میں نے زباں زخم کی بھی سی لی ہے
تشنگی اپنی بجھالوں گا میں آنسو پی کر — میرے ساقی کی نظر میرے لیے کافی ہے

راجہ لال راجہ پردیسی :

تھا ابھی شہر میں اک مجرمِ الفت دوست — اور ابھی شہر کی اب آب و ہوا کیسی ہے
شمعِ احساس کی لو فکر میں ڈھل کر راجہ — صورتِ شعر میں اک پیکرِ جاں بنتی ہے

راز عابدی :

زندگی آج عجب موڑ پہ آپہنچی ہے — وقت بدلا ہے تو دنیا کی نظر بدلی ہے
سب یہاں مصلحتِ وقت کے بندے دیکھے — حق کا اظہار بھی کرنے سے زباں رکتی ہے

ڈاکٹر راہی :

میرے حالات سنورنے کا ابھی وقت نہیں — میری تقدیر کے ہاتھوں میں ابھی مہندی ہے
دل کی بستی کا معمہ ہے عجب سے راہی! — جب اجڑنا ہی مقدر ہے تو کیوں بستی ہے

زور آفاقی: 'پھر نئے سال نے دروازے پہ دستک دی ہے' — ہونے والی یہاں شاید کوئی تبدیلی ہے !
زور آفاقی ہوں وابستۂ دامن اُن کا ! — جن کے بندوں نے فقیری میں خدائی کی ہے

خواجہ شوق: اس طرح آپ نے تنظیم گلستاں کی ہے — قید کی قید ہے آزادی کی آزادی ہے
میری بینائی مرے حق میں سزا ٹھہری ہے — دیکھتے دیکھتے زخموں کی نظر زخمی ہے
ہر کسی کو تو توجہ نہیں رُکنے پاتا — ایک موج اٹھتی ہے اور ایک فنا ہوتی ہے

صاحب حیدرآبادی: کاٹتے جاؤ گلے خوب گلے مل مل کے — یہ زمانے کی نئی رسمِ وفاداری ہے
قتلِ ہابیل تو ہے پر نہیں قاتل کا پتہ — لے میں قربان عجب شانِ خطاپوشی ہے

نظیر علی عدیل: منہ کہے کوئی بھی آپ سے ہمدردی ہے — آج کے دور میں یہ لفظ بڑی گالی ہے
میرے احباب نہیں آئے عدالت تک بھی — اور دشمن نے مرے حق میں گواہی دی ہے
اور سبھی لوگ مرے گھر کو جلانے والے — کس لیے میرے پڑوسی کی نظر نیچی ہے

علی احمد جلیلی: وقت و حالات نے یوں ذہن پہ یورش کی ہے — فکر مجروح ہے، شعروں کا بدن زخمی ہے
اپنا دیوان جو پڑھنے کو کبھی کھولا ہے — جانے کیوں اس سے ترے لمس کی بو آئی ہے
چمن کے آتی ہے دروازوں سے صبا کی خوشبو! — کس نے یہ رنگ بھرے ہاتھ سے دستک دی ہے

فرید متین: جان سی شے بھی ترے دل کے عوض دے دی ہے — اس طرح پیار کی تاریخ مرتب کی ہے
خود نمائی جسے کہتے ہیں متین اہلِ جہاں — کتنی اونچائی سے لوگوں کو گرا دیتی ہے

محمد منظور احمد منظور: ظلمتوں سے رہی پیکار مسلسل جن کی — ان جیالوں نے کہ تہذیب کی خدمت کی ہے
پھر منور ہی منور ہے گزرگاہِ حیات — پھر نئے سال کے سورج کی ضیا بخشی ہے
کارواں اپنا بڑھے گا سوئے منزلِ منظور — کامیابی نے ہمیں اب کے صدا بھی دی ہے

یوسف نظر: کوئی شکوہ کوئی حسرت، کوئی ارماں بھی نہیں! — جانے کس موڑ پہ دنیا سے وفا ٹھہری ہے
ہم سے مل کر ہی حالات سنبھلتے ہیں نظر! — ہم نے حالات پہ کچھ ایسی نظر رکھی ہے

وقار خلیل: پھر وہی صورتِ حالات چلی آئی ہے — 'پھر نئے سال نے دروازے پہ دستک دی ہے'
انقلاب آئے گا ایسا تو نہیں اب کے برس — جاگتی آنکھوں نے اک عمر یوں ہی کاٹی ہے
جاگتے گاتے ہوئے شہر کی تہذیب گئے — حاکمِ شہرِ تمنا! یہ ادا کس کی ہے

وقار خلیل

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔)

نام کتاب: **چراغِ منزل** (شاعری)　ذواکر راہی　جلد معہ گرد پوش　صفحات: ۲۷۲
قیمت: ۲۵/- روپے　ناشر: بزمِ ادب رامپور　ملنے کا پتہ: مصنف، پریم کنج، سیول لائنز، رامپور (یو۔پی)

"چراغِ منزل" کے شاعر ذواکر راہی، ادبی مرکز رامپور کے بزرگ کلاسیکی شاعروں میں اپنے فکر و فن کے بھاؤ اور شخصیت کی گنگا جمنی صفات کے سبب اساتذۂ سخن سے اپنے کلام کا لوہا منوا چکے ہیں۔ "چراغِ منزل" کی غزلوں میں نزاکتِ خیال، زندگی کی بوقلمونی، حقایقِ حیات کا ادراک، حسن و عشق کی جھلک اور انسانی اقدار کی سگندھ دیر تک پڑھنے والوں کو اپناتی ہے۔ راہی نے اپنی شاعری کے ذریعہ خلوص، سادگی اور دردمندی سے ان تمام ارفع و اعلیٰ خیالات کی ترسیل کی ہے جن سے زندگی اور انسانیت عبارت ہے۔ مجموعہ بے حد خوبصورت چھپا ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔ اب ایسے مثالی اردو دوست عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ چراغِ منزل کو کہیں سے بھی پڑھیے، شعری اُفق روشن نظر آتا ہے دو چار شعر مثالاً پیش ہیں ؎

حفاظت کر رہا ہوں اپنے غم کی　　یہ میری خندہ پیشانی نہیں ہے
ہمیں تاریخ کا رُخ موڑنا ہے　　ہمیں تاریخ دہرانی نہیں ہے

سن رہا ہوں ضمیر کی آواز　　جیسے مجھ سے خدا مخاطب ہو
زندگی میں بڑا ضروری ہے　　یہ سمجھنا کہ کیا ضروری ہے
ہم بصیرت سے کام لیتے ہیں　　اس لئے تیرا نام لیتے ہیں

نام کتاب: **اقبال کی قومی شاعری**　مصنفہ: اَمتہ الکریم　صفحات ۹۶　قیمت: ۶/۰ روپے
ملنے کا پتہ: الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد ۲

"اقبالیات" وہ موضوع ہے جس پر شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی حیات ہی میں ارتقائی منزلوں سے

گزرنا نصیب ہوا۔ اقبال صدی کے بعد تو یہ اُفق عالمی سطحوں تک روشن ہوگیا۔ کتنی ہی کتابیں اقبال شناسی کے نام پر مطبوع ہوئیں، پھر بھی یہ گوشہ ناتمام ہی نظر آتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کی طالبہ امتہ الکریم کی اس مختصر مگر مفید اقبال شناسی پر اطمینان ہوتا ہے کہ اقبال کی قومی شاعری کو اختصار کے ساتھ ہی سہی سمجھ کر اپنے تنقیدی رویّہ اور تاثرات کو رقم کرنے کا سلیقہ مصنفہ میں پایا جاتا ہے۔ (۷۰) صفحات کا یہ مقالہ تقریباً (۲۹) کتابیات کا عطر مجموعہ ہے اور پڑھنے والے پر اقبال شناسی کے قومی محرکات وا کر دیتا ہے۔ فوقانی درجوں کے طلباء کے لئے یہ کتاب بے حد مفید قرار پاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف سرمست "امتہ الکریم کی محنت، جستجو، اور لگن بہرطور قابلِ تحسین ہے۔"

نام کتاب: **دیوانِ لطف** مرتبہ: **ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ** ڈیمائی سائز مجلد معہ گرد پوش
قیمت ۲۵/ روپے صفحات (۱۵۲) ناشر: ادارۂ شعر و حکمت ۸۹۵-۶-۱۱ ریڈہلز، حیدرآباد۔ ۴

مرزا اکبر علی بیگ، حیدرآباد کی نئی نسل کے منفرد اصحاب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ تعلیم و تدریس اور تحقیق و تنقید سے ان کی گہری وارفتگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صاحب جنھیں بہت پہلے دنیائے ادب میں آنا تھا بڑی دیر میں طلوع ہوئے ہیں، ان کا گھرانہ علمی و شعری اقدار کا گہوارہ رہا ہے اور یہ خود بھی ہمہ وقت ادب، شعر اور اردو کلچر میں غرق نظر آتے ہیں، سٹی کالج میں اردو کے لکچرار رہے، پھر ادب میں پی ایچ ڈی کی اور ان دنوں جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اردو سے وابستہ اور سرمۂ صاحب نظراں بنے ہوئے ہیں، سنجیدہ بھی، زندہ دل بھی، یار باش بھی اور لکھنے پڑھنے کے معاملے میں گوشہ گیر بھی۔ فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنف اور تذکرہ نویس شاعر مرزا علی لطف کی حیات اور کارنامے پر ۱۹۷۹ء میں اکبر علی بیگ نے 'پی ایچ ڈی' کی ڈگری جامعہ عثمانیہ سے لی اور پھر ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا۔ جس کی اشاعت پر برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے اظہار پسندیدگی کیا گیا۔ اکیڈیمیوں نے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا۔ اس طرح ڈاکٹر اکبر کے جوہر روشن ہوتے چلے۔ زیر نظر' دیوان لطف''، جامعہ عثمانیہ اور سالار جنگ کتب خانوں کے مخطوطات کی عرق ریزی اور متنی تحقیق کے ہفت خواں سے گزر کر سامنے آیا ہے۔ اس کا "مقدمہ" جسے اکبر علی بیگ صاحب ہی نے لکھا ہے ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے لطف شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ (۴۲) صفحات پر مشتمل یہ مقدمہ ڈاکٹر اکبر کی تحقیقی دروں بینی اور تنقیدی طور طریق کو اعتبار بخشنے کیلئے ہر آئینہ درست قرار پاتا ہے۔ جس کی تعریف ڈاکٹر غلام عمر خاں، سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی کر دی ہے۔ لطف، میر اور سودا کے ہمعصر شاعر تھے اور دنیائے ادب انھیں 'تذکرہ گلشن ہند' کے مرتب کی حیثیت میں پڑھتی رہی ہے۔ اس دیوان

کی اشاعت سے لطف کے سخن معتبر سے لطف اندوزی کا کیف دوبالا ہوگا جس کیلئے ڈاکٹر بیگ شکریہ کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ لطف کی غزلیہ شاعری اور قصائد کا مطالعہ قدیم کو جدید سے منسلک و مربوط کرنے وہ سلسلہ ہے جس سے ادب کی اعلیٰ روایات رشتہ دوز ہیں۔ اس تناظر میں "دیوانِ لطف" کی اشاعت مفید ادبی سعی قرار پاتی ہے۔

نام کتاب: **خوش نفساں** (تعارف و تذکرہ) مصنف: ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ
صفحات (۱۲۸) مجلد معہ گردپوش قیمت ۱۵/- روپے ملنے کا پتہ: الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد - ۲

حیدرآباد کی درجن بھر ادبی، علمی نیز سماجی شخصیتوں پر تعارفی و تذکرہ نما زیرِ نظر کتاب "خوش نفساں" اس کے مصنف ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی حیدرآبادیت شناسی کا روشن اُفق ہے۔ حیدرآباد علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا صدیوں پرانا مرکز اور دارالخلافہ رہا ہے۔ ہر عہد اور ہر زمانے میں اہلِ حیدرآباد نے اپنی دانش و بینش، حرفت و اہلیت سے دکنی روایات کو عزیز رکھا ہے۔ اکبر علی بیگ صاحب نے اپنے صحافتی اندازِ نگارش اور سیدھے سادھے اسلوب میں خوش نفسانِ دکن کے سوانحی کوائف کو یکجا کرکے اچھا اقدام کیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت پہلے ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے جناب غلام پنجتن شمشاد کی ایک کتاب "حیدرآباد کے بڑے لوگ" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب کو اسی سلسلے کی مربوط کڑی قرار دیا جاسکتا ہے۔ "خوش نفساں" میں جناب ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر سید علی اکبر، جناب محمد عزیز مرزا، نواب سعید جنگ، ڈاکٹر موہن لال نگم، جناب باقر امانت خانی، جناب سعید شہیدی، محترمہ سکینہ بیگم، ڈاکٹر سید مہدی علی، جناب میر جعفر علی، جناب برق موسوی اور ڈاکٹر نور احمد شیخ کو باتصویر طریق پر منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ عصرِ حاضر اور عہدِ عثمانی کے منتخب افراد پر مشتمل یہ سوانحی خاکے نسلِ نو کیلئے مفید سوغات کی اہمیت رکھتے ہیں۔ سوانحی معلومات کی فراہمی میں تحقیق و تفتیش کی دقتوں سے گزر کر ڈاکٹر بیگ نے بالکل درست معلومات مجتمع کر دی ہیں جن سے آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کو بقول ڈاکٹر مغنی تبسم (مطبوعہ: پیش لفظ کے بموجب) کافی مستند مواد ملے گا۔ "خوش نفساں" میں بشمولہ افراد اپنے کارناموں، صلاحیتوں اور فکر و فن کے ذریعہ عہدِ قدیم و جدید کے نمائندہ نظر آتے ہیں جن سے حیدرآباد کا کلچر عبارت رہا ہے۔ یقین ہے اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ (وقار خلیل)

نام کتاب: **یادوں کے چراغ** (شاعری) بی۔ این۔ مہرہ آمر صفحات (۱۱۸) قیمت: ۱۲/- روپے
ملنے کا پتہ: مسٹر اونکار ناتھ مہرہ، ۱۲ موتیا بلڈنگ، اسٹیشن روڈ، ضلع جالنہ (مہاراشٹرا)

(باقی ۳۳ پر ملاحظہ کریں)

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم ڈسمبر: جناب جلیل پاشاہ صدر اردو تعلیمی کمیٹی نے مرکزی وزیر تعلیم محترمہ شیلاکول کو ایک یادداشت پیش کرتے ہوئے اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ حیدرآباد میں ترقی اردو بیورو کی شاخ قائم کی جائے جس سے جنوبی ہند کے اردو والوں کو سہولیات میسر آسکیں گی۔

● جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے نصر اسکول کے جلسۂ اولیائے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے نئی نسل کو تعلیم کے ذریعہ روشن خیال بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔ بیگم انیس خاں پرنسپل، بیگم زہرہ علی یاور جنگ نے بھی مخاطب کیا۔ مس سلمیٰ احمد نے رپورٹ سنائی اور مس فرحین نے خیر مقدمی تقریر کی۔

● نیرنگِ ادب کا ادبی و شعری اجلاس جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں ہوا، شاغل ادیب نے سکندرآباد میں اردو شاعری پر مضمون اور شکیل مظہری نے مرہٹی نظم کا اردو منظوم ترجمہ سنایا۔ بشیر وارثی، راز عابدی، شکیل، شاغل، ساثر مظہری، معراج صوفی اور جگجیون استھانہ سحر نے کلام سنایا۔

۲ ڈسمبر: ماہر اقبالیات پروفیسر غلام عمر خاں سابق صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی نے آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کا جائزہ لیا۔

۵ ڈسمبر: جناب صلاح الدین نیّر کا پانچواں شعری مجموعہ "خوشبو کا سفر" شائع ہوا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے نیّر کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔

۷ ڈسمبر: اسٹیٹ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن کے ایک وفد نے مسٹر این ٹی راما راؤ چیف منسٹر آندھرا پردیش کو یادداشت پیش کرتے ہوئے اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی تنظیم جدید عمل میں لائی جاکر اس کی کارکردگی کو فعال بنایا جائے۔

۱۰ ڈسمبر: حلقۂ اربابِ ذوق اسٹیڈی سرکل اتحاد اسلامک ادبی ... نظامس ٹرسٹ لائبریری کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب اختر حسن معتمد اردو اکاڈمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب یوسف اعظمی لکچرر انگریزی انوار العلوم کالج نے "نقشِ اقبال" مصنفہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری پر تبصرہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد معتمد اعزازی اسٹیڈی سرکل نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

● محفلِ خواتین کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس محترمہ سلمیٰ کمال الدین احمد کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر حبیب ضیا لکچرر اردو کالج نے فکاہیہ اور محترمہ عائشہ ارشاد احمد نے "نئی نسل اور اردو کا مستقبل" پر مضمون سنایا۔ عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید، مظفر النساء ناز، حفیظ النساء حزیں اور نسیم نیازی نے کلام سنا کر داد پائی۔

محترمہ فاطمہ عالم علی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۶ر ڈسمبر: ممتاز ادیب اور دانشور ڈاکٹر ضیاءالدین احمد شکیب، پروفیسر اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریقن اسٹیڈیز لندن یونیورسٹی نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کا معاینہ کیا اور اس کی کارکردگی پر ستائش کا اظہار کرتے ہوئے برطانیہ میں مقیم پاکستانی سخنور افتخار عارف کا مجموعہ کلام 'مہر دو نیم' کتب خانہ کو تحفۃً مرحمت فرمایا۔

۱۸ر ڈسمبر: کل ہند نعتیہ مشاعرہ 'دارالسلام' میں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی نگرانی میں منعقد ہوا، مہمان اور میزبان شعراء خمار بارہ بنکوی، مہدی نظمی، حامد بھوپالی، فنا اکبرآبادی، مشکور کاپیوری، خواجہ شوق، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، خورشید جنیدی، خواجہ ذاکر گودڑشاہی، وقار خلیل، رئیس اختر، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، صادق نقوی، فیض الحسن خیال، پرشدرام پرشاد، جوہر ہاشمی، راز عابدی، داؤد نصیب، بشیر وارثی، صلاح الدین نعیم، نصرت آغائی، صبا آغائی، ہاشم جاہ، قادر نعیم، ظہیر الدین، باہر راحت عزمی، آغا سروش، اسد انصاری، قاسم موسوی، بے ہوش محبوب نگری، اور میر الزماں میر نے بارگاہ رسالت میں نذرانہ سخن گزرانا۔ جناب صادق نقوی لکچرر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے نظامت کی۔

۱۹ر ڈسمبر: الحاج علی افسر کے تیسرے نعتیہ مجموعہ 'ایکم شکی' کی رسم اجراء مولانا سید رشید پاشاہ قادری امیر جامعہ نظامیہ نے انجام دی۔

● پروفیسر شکیل الرحمن صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی نے ادارہ ادبیات اردو کے تمام شعبوں کا معاینہ کیا۔ اس موقع پر ادارہ میں ڈاکٹر مغنی تبسم، جناب متین سروش اور وقار خلیل موجود تھے، ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی ہوا۔

۲۱ر ڈسمبر: محبِ اردو آنجہانی مسٹر کے وی رنگاریڈی ڈپٹی چیف منسٹر کی یاد میں بمقام اردو گھر، مغل پورہ مشاعرہ مسٹر ٹی انجیا سابق چیف منسٹر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خمار بارہ بنکوی، مہدی نظمی، سید شہیدی، شاذ تمکنت، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، وقار خلیل، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، رئیس اختر، جہاندار افسر، عزیز النساء صبا، انجم قمر سوز، فدا حیدرآبادی، رؤف رحیم، جیلانی بیگ صادق اور انور ہاشمی نے کلام سنایا فکر حیدرآبادی اور علی احمد صدیقی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

۲۵ر ڈسمبر: ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیر اہتمام دبستانِ دکن کے نامور محقق، مصنف اور بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے ۸۰ ویں یوم ولادت پر ایوانِ اردو میں یوم زورؔ کا ادبی اجلاس جناب حامد علی عباسی صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جناب شمس الرحمن فاروقی اور جناب عابد علی خاں نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کیا۔ پروفیسر سید سراج الدین، جناب رحمن راج سکسینہ معتمد ادارہ، پروفیسر سید ہاشم علی صدر شعبہ اردو میسور یونیورسٹی اور ڈاکٹر محمد علی اثر نے ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی خدمات پر مقالے سنائے۔ اس موقع پر بزرگ شاعر مظفر الدین صاحب حیدرآبادی کی آٹھویں تصنیف 'ورق در ورق' کی رسم اجراء بھی انجام پائی۔ ابتداً ڈاکٹر

غنی تبسم نے ایک قرارداد تعزیت یش کی جس کے ذریعہ پروفیسر کمال الدین حمد، سکندر علی وجد، ڈاکٹر آمنہ خاتون عزرت آورج یعقوبی، حکیم رکن الدین سعید، علیم احمد، پروفیسر عالم خوندمیری، در معلم عبیدی کی وفیات پر خراج عقیدت ادا کیا گیا۔

● حیدرآباد لٹریری فورم نے شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ ایک شام کا پروگرام بصدارت ڈاکٹر مغنی تبسم کا اہتمام کیا۔ نئی شعریات پر جناب فاروقی نے اپنے دانشورانہ خیالات کا اظہار کیا۔ مباحثہ میں ڈاکٹر تبسم، ڈاکٹر یوسف سرمست، وقار خلیل، یوسف اعظمی، نسیم عارفی نے حصہ لیا۔ محفلِ شعر میں ڈاکٹر تبسم، فاروقی، غیاث متین، علی ظہیر ڈاکٹر محمد علی اثر، ماجد حلیم، علی الدین نوید، طالب خوندمیری، یوسف اعظمی اور افتخار احمد بشر نے کلام سنایا۔

۲۷ر ڈسمبر: بزرگ ناول نویس جناب ایم اسلم (۱۸۸۱ء - ۲۳ر نومبر ۱۹۸۳ء) کی وفات پر حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں اظہار رنج و ملال کیا گیا ادارہ کے بانی ڈاکٹر زور سے جناب اسلم کے گہرے علمی روابط تھے اور انھیں ادارہ کی ادبی سرگرمیوں سے بڑا خلوص تھا۔ سب رس کے ابتدائی زمانے میں کہانیاں بھی شائع ہوا کیں۔ حق مغفرت کرے وہ مقبولِ عوام فکشن رائٹر تھے۔

۲۹ر ڈسمبر: ریاستی حکومت نے اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے صدر حافظ ابو یوسف کا استعفیٰ قبول کر لینے کا اعلان جاری کیا۔

۳۰ر ڈسمبر: 'ایوان اردو' میں ادارہ "قلم اور آواز" کی طرف سے ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی نئی مطبوعات "خوش نفساں" اور دیوانِ لطف کی رسم اجرا جناب حامد علی عباسی صدر ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ہاتھوں انجام پائی۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس تقریب کی صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر یوسف سرمست نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ اور محترمہ سیدہ طیبہ بیگم نے ڈاکٹر اکبر کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور ان کی شخصیت پر اظہار خیال کیا۔

JANUARY 1984

R.
Regd.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004.

جناب عابد علی عباسی صدر ادارہ کا خطاب

یوم محمد قلی قطب شاہ

قومی یک جہتی تقاریب

جناب صدر، محترم شیو شنکر صاحب اور معزز خواتین و حضرات!

"یوم محمد قلی قطب شاہ" کی تقاریب کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ تقریب گذشتہ بائیس ۲۲ تیئس ۲۳ سال سے ہر سال اسی مقام پر منائی جاتی رہی ہے۔ اس کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔ یاد کیجیے کہ اس وقت یہاں کی فضا کا کیا رنگ تھا۔ ریاست حیدرآباد کی تقسیم اور اس کے بعد ریاست آندھرا پردیش کی تشکیل کے وقت بعض گوشوں میں طرح طرح کے اندیشے ظاہر کیے جا رہے تھے جن کی بنیاد علیحدگی پسندی اور پست ہمتی پر تھی۔ میں صاف صاف کیوں نہ کہوں کہ تلنگانہ کے بہت سے قائدین اور سرکردہ اصحاب یہ سمجھتے تھے کہ تلنگانہ کو ریاست آندھرا پردیش کا جزو بنانے کے بجائے اگر علیحدہ رکھا جائے تو اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ ایسے وقت میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے قومی یکجہتی کے مقصد کے تحت اس تقریب کا انعقاد شروع کیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش بڑی حد تک [illegible] کیونکہ اس تقریب میں شہر کے دور دراز علاقوں سے بھی ہر قوم اور مذہب اور فرقے کے لوگ شریک ہوتے ہیں جب کہ دوسرے بہت سے جلسے اور تقاریب جو قومی یک جہتی یا NATIONAL INTEGRATION کے نام پر منائی جاتی ہیں۔ محض برائے نام ہوتی ہیں اور کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتی ہیں۔

[illegible] خود مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں کا [illegible]

بحیثیت مجموعی یہ چیز اس کے خمیر میں داخل ہے کہ بلا امتیاز نسل و مذہب ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں بھی یہی چیز پائی جاتی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے اس جشن کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ بہت سے گوشوں میں علیحدگی پسند رجحانات کو تقویت پہنچائی جا رہی ہے ہم ان رجحانات کے خلاف ایک مثال قائم کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ بعض حضرات اپنی کم فہمیا ذہنی پستی کے باعث یہاں تک کہہ گزرے ہیں کہ حیدرآباد کے کلچر میں باہر کے اثرات بھی نمایاں ہیں اس لیے ریاست آندھرا پردیش کا دارالحکومت یہاں سے ہٹا کر آندھرا میں منتقل کر دیا جائے۔

چیف منسٹر صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس بیان کو مضحکہ خیز قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ یہ فتنہ سر نہ ابھارے گا۔

یوم محمد قلی قطب شاہ کے پہلے اجلاس کا افتتاح ۱۹۵۸ء میں اس وقت کے گورنر بھیم سین سچر نے فرمایا تھا۔ اس کے بعد سے ہر سال ملک کی بہت سی ممتاز شخصیتوں کو تکلیف دی جاتی رہی ہے۔ اس سال کی تقریب کے افتتاح کے لیے ہم نے جناب پی شیو شنکر صاحب کو زحمت دی ہے۔ موصوف جو فی الوقت مرکزی حکومت میں پٹرولیم اور انرجی کے وزیر ہیں حیدرآبادی عوام کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ ایک عرصہ تک آندھرا پردیش بار کے ممتاز رکن رہے۔ آپ کی قانونی قابلیت اور وسیع النظری کی بناء پر صدر جمہوریہ نے آپ کو آندھرا پردیش ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا لیکن آپ اس عہدہ جلیلہ پر چند ماہ فائز رہے اور اس عہدہ سے مستعفی ہونے کے بعد آپ عوام سے زیادہ قریب ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء کے ضمنی انتخابات میں آپ حلقہ حیدرآباد سے پارلیمنٹ کے لیے بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے اور اس وقت کے اپوزیشن کے ایک رکن کی حیثیت سے تعمیری اپوزیشن کی روایت قائم کی۔ ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں آپ دوبارہ حلقہ سکندرآباد حیدرآباد سے منتخب ہوئے اور مرکزی وزیر مقرر کیے گئے۔ آپ اردو ادبیات کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور خاص کر شاعری کے شائق ہیں۔

ہمارے لیے انتہائی خوشی کی بات ہے کہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب جسٹس رفیع الدین احمد انصاری (موجودہ صدر نشین آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن) فرما رہے ہیں۔

موہن راج سکسینہ

خیر مقدمی تقریر یوم محمد قلی قطب شاہ

آج ہم، بانی شہر حیدرآباد، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور تلگو دکنی تہذیب کے پاسدار

[illegible] قطب شاہ کی یاد میں سالانہ جشن منانے کے لیے یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں بانیٔ [illegible] [illegible] کی تحریک اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام پہلا یوم محمد قلی قطب شاہ [illegible] کے لیے بطور خاص سری نگر کشمیر سے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ [illegible] تقریب [illegible] جشن [illegible] تقریب ہونی چاہیے تھی لیکن [illegible] میں چند سال بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر یہ تقریب منائی نہ جا سکی۔ ۱۹۵۸ سے آج تک [illegible] حیدرآباد اور حیدرآباد کے اہلِ ذوق حضرات کا بھرپور تعاون ان تقاریب کے سلسلہ میں ہمیں حاصل رہا ان تقاریب میں ریاست کے گورنر اور ملک کے نائب صدر جمہوریہ اور مرکزی وزراء سے لے کر ایک معمولی شہری بھی حصہ لیتا رہا ہے۔

○ یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ تقاریب حیدرآباد میں ایک ادبی اور تہذیبی جشن کا درجہ رکھتی ہیں ان تقاریب کی وہی اہمیت ہے جو دہلی میں پھول والوں کی سیر اور پنجاب و ہریانہ میں بیساکھی میلہ کو حاصل ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو اپنے محدود وسائل کے ساتھ ان تقاریب کا اہتمام کرتا رہا ہے۔ ریاستی حکومت کی جانب سے ان تقاریب کے لیے صرف (۱۵۰۰) روپے کی مالی امداد دی جاتی ہے جو اس عظیم تقریب کے وسیع اخراجات کے لیے انتہائی معمولی رقم ہے۔ ہم میونسپل کارپوریشن حیدرآباد اور ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے ممنون ہیں کہ ان اداروں کی جانب سے اس تقریب کے لیے مالی تعاون ہمیشہ حاصل رہا۔ ہمیں توقع ہے کہ اس سال آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے بھی اس تقریب کے لیے گراں قدر امداد منظور کی جائے گی۔ ادارہ ریاستی اردو اکیڈیمی کا ممنون ہے کہ اس دوران مالی اعانت کی گئی

○ ہم اراکینِ ادارۂ ادبیاتِ اردو آپ کے بھرپور تعاون کے لیے انتہائی شکر گزار ہیں۔ آپ [illegible] میل کی مسافت طے کر کے اور کافی اخراجات برداشت کرتے ہوئے اس اجلاس میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور ان تقاریب کو کامیاب بناتے ہیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ آپ کی یہ دلچسپی، تعاون [illegible] آئندہ بھی حاصل رہے گا اور اسی طرح تین سال بعد ان تقاریب کی [illegible] جوبلی بھی منا سکیں گے

○ ہر زمانہ میں ترقیات کے حصول کے ساتھ ساتھ چند نئے مسائل بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ [illegible] اور شہر حیدرآباد کے لیے بھی اب کئی سنگین مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] [illegible] شہر حیدرآباد کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ شہر حیدرآباد جو کبھی قرونِ وسطیٰ [illegible] کے ساتھ جدید میٹروپولیٹن شہر بنتا جا رہا ہے۔ [illegible] باغ اور کشادہ [illegible] [illegible] خوبصورت عمارتوں کی جگہ [illegible] رونق [illegible]

ہو رہا ہے۔ وسیع خانہ باغ اب عمارات اور شاپنگ سنٹرز کی نذر ہو رہے ہیں۔ شہر حیدرآباد عمارات کا شہر بنتا جا رہا ہے۔ اگر آج ہم اس مسئلہ پر غور کر کے کوئی چارہ کار اختیار نہ کریں تو ہمارے شہر کا کل کیا نقشہ ہوگا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ تیز رفتار صنعتی ترقی کی وجہ سے کارخانوں کی عمارتیں، سکونتی علاقوں میں بھی بنائی جا رہی ہیں اور اس طرح ماحولیاتی مسائل سے تمام شہری متفکر ہیں۔

○ ہمارے شہر کا خوبصورت ترین اور تاریخی مقام گولکنڈہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ تباہ کاریوں کا شکار ہو رہا ہے۔ قلعہ گولکنڈہ اور گنبدان قطب شاہی، ہماری تلگو دکنی مشترکہ تہذیب اور تاریخ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ قلعہ گولکنڈہ اور گنبدان قطب شاہی کے اطراف جو خوبصورت میدان اور ٹیلے پھیلے ہوئے ہیں انھیں تیزی کے ساتھ تباہ کیا جا رہا ہے تاکہ پتھر تعمیری کام میں استعمال کیا جا سکے اور ہموار میدان پر مکانات کے لیے پلاٹس بنائے جا سکیں۔

گنبد عبداللہ قطب شاہ کے اطراف مکانات کے پلاٹس بنائے گئے ہیں اور حدود کے پتھر بھی نصب کیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح محمد قلی قطب شاہ کے اس گنبد کے عین مقابل کچھ فاصلہ پر مکان کی تعمیر کے لیے اینٹ پتھر جمع کیے گئے ہیں جو آپ اس چبوترہ سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ ان تخریبی کارروائیوں کے خلاف نہ تو شہریان حیدرآباد نے کوئی احتجاج کیا اور نہ ہماری اردو صحافت (بجز اخبار سیاست) کسی قسم کی تنقید کی گئی۔ اس کے برعکس انگریزی اور تلگو اخباروں نے ان تخریبی کارروائیوں کے خلاف تفصیلی اداریے شائع کیے اور احتجاجی بیانات جاری کیے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنے اس قیمتی ورثہ کے تحفظ کے لیے ایک گولکنڈہ بچاؤ تحریک شروع کی جائے اور ارباب مجاز سے مطالبہ کریں کہ وہ قلعہ گولکنڈہ اور گنبدان قطب شاہی کے اس تمام حصہ کو محکمہ آثار قدیمہ کے تحت محفوظ علاقہ قرار دیں اور اس کے اطراف کسی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے یہ بات واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ محض تہذیبی جھلکیاں سجا کر یا صرف چوکی ڈنر ترتیب دے کر دکنی تہذیب کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔

○ اس موقع پر اس بات کا اظہار آپ کے لیے باعث اطمینان ہوگا کہ جناب عابد علی خاں مینجنگ ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ حیدرآباد و مدیر سیاست کی کوشش اور توجہ خاص سے اب ادارہ کا مالیہ بڑی حد تک مستحکم ہو گیا ہے۔ صاحب موصوف کی شخصی دلچسپی سے ادارہ کو ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل ہوئے ہیں۔ ادارہ، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کا اس تعاون اور اشتراک کے لیے شکر گزار ہے۔ جناب حامد علی عباسی صدر ادارہ کی رہنمائی اور اراکین ادارہ کی خاص دلچسپی سے یہ ادارہ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کو بدستور جاری رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔

حضرات!

آج اس بائیسویں سالانہ جشن کا افتتاح ہمارے ہردلعزیز وزیر برقی و لیبر و انرجی جناب پی شیوشنکر صاحب فرمارہے ہیں۔ جناب پی شیوشنکر صاحب لوک سبھا میں حلقہ سکندرآباد کی نمائندگی فرماتے ہیں۔ انہیں حلقہ میں شہر حیدرآباد کا نصف سے زیادہ حصہ شامل ہے۔ جناب پی شیوشنکر صاحب اس شہر میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں وہ ایک ٹھیٹ حیدرآبادی ہیں اور حیدرآبادی شرافت، یگانگت اور مروت کا نمونہ ہیں۔ آپ اردو، ہندی، تلگو اور انگریزی پر عبور رکھتے ہیں اور ان زبانوں کے ایک بہترین مقرر ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے مدرسہ اردو شریف میں حاصل کی اور آپ کی زندگی ان تمام لوگوں کے لیے ایک چیلنج ہے جو اس خیال میں مبتلا ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ صرف "منشی" بن سکتے ہیں بڑے "عہدے دار" نہیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس اجلاس کی صدارت جسٹس محمد رفیع الدین احمد انصاری صاحب فرمارہے ہیں۔ صاحب موصوف آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن کے صدرنشین ہیں، ابھی کچھ دن پہلے جموں و کشمیر کے چیف جسٹس کی حیثیت سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔ جناب انصاری صاحب آندھرا پردیش کے نیلور کے ایک قاضی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مدراس یونیورسٹی سے آرٹس اور قانون طیلسان حاصل کرنے کے بعد مدراس ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک آپ مقننہ مدراس کے رکن رہے۔ ۱۹۶۹ء میں آپ دہلی ہائیکورٹ کے جج اور ۱۹۷۷ء میں جموں و کشمیر ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے آپ تمام اصحاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کا محمد قلی کو خراج عقیدت

جناب وی نرسمہا راؤ ڈپٹی میونسپل کمشنر، سرکل نمبر۱، حیدرآباد میونسپل کارپوریشن نے کمشنر بلدیہ کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ کے اختتامی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ شرفائے حیدرآباد کے اس اجتماع میں شرکت کرتے ہوئے انبساط و اعزاز محسوس کرتے ہیں جسے ادارۂ ادبیات اردو نے برپا کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بانیٔ شہر محمد قلی قطب شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یاد دلایا کہ یہ شہر جو محمد قلی قطب شاہ اور اس کی ہم دم بھاگیہ متی کے لازوال عشق کا تحفہ ہے، ہمیشہ انھی

بنیادوں پر ہندو مسلم دوستی کے لیے مثالی دوستی کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ مثالی تہذیب مختلف مذاہب اور سماجی اقدار کے مناسب اور پرخلوص اختلاط سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ روایات تاابد قائم رہیں گی۔

انہوں نے محمد قلی قطب شاہ کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا اور فنون اور ادب کا بلحاظ لسان و ملت سرپرست تھا۔ اس نے فارسی اسعد اور تلگو شعرا دونوں کی سرپرستی کی اور دکنی تہذیب کی بنا رکھی ڈالی۔

راؤ صاحب نے محمد قلی قطب شاہ کو حقیقی معنوں میں "آندھرا بادشاہ" قرار دیا جس کی سلطنت کے حدود، جدید آندھرا پردیش کے مماثل تھے۔ گویا (۱۵۰) برس بیتے ہوئے اس کے بعد دوبارہ قلی قطب شاہ کا آندھرا پردیش قائم ہو سکا۔

نرسمہا راؤ صاحب نے ۱۸۶۹ء سے تاحال "بلدیہ" کے نظام کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہوئے یہ واضح کیا کہ کس طرح پانچ لاکھ نفوس سے ۲۵ لاکھ نفوس تک آبادی میں اضافہ کے باوجود بلدیہ شہر فرخندہ بنیاد کو خوبصورت، اس کی شوارع کو وسیع اور اس کے مجاری اور آبی نظام کو جدید اور بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہے اور کس طرح حکومت کروڑوں روپے صرف کرکے عوام کے لیے صحت مند فضا اور سہولتیں فراہم کرنے میں دلچسپی لے رہی ہے۔

انہوں نے بتایا کہ اس شہر کو سرسبز بنانے کے لیے پارکوں، باغوں اور باغیچوں کا منصوبہ پیش نظر ہے۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ اس تاریخی تقریب کے موقع پر انہوں نے شہر حیدرآباد کے بلدی ارتقاء کے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔ اور ادارۂ ادبیات اردو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شہریت اور شہری سماجیات کے فروغ کے لیے تعاون کی خواہش کی۔ (ترجمہ: ا، ع)

● یہاں آکر یہ احساس ہوا کہ ابھی اردو دنیا میں زندگی کی چنگاری باقی ہے کہ وہ اپنے جواہرات کی آبرو پہچان سکے۔

ادارۂ ادبیات اردو لائق مبارک باد ہے کہ جواہر پاروں کی امانت کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔

میری گزارش صرف یہ ہے کہ اس ذخیرہ میں اضافہ ضروری ہے۔

——— ڈاکٹر محمد حسن، صدر شعبۂ اردو، جواہر لال یونیورسٹی، دہلی۔

شری پی شیو شنکر، مرکزی وزیر [illegible]

خطبۂ افتتاحیہ یوم محمد قلی قطب شاہ

سب سے پہلے میں صدر اور اراکین ادارہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے یوم سلطان محمد قلی قطب شاہ کے اس جلسہ کے افتتاح کے لیے مدعو کیا اور اس طرح مجھے سولھویں صدی کے قومی یکجہتی کے عظیم علمبردار کو خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع دیا۔

شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے بانی، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، گنگا جمنی تہذیب کے روح رواں، فنون لطیفہ کے سرپرست اور سب سے بڑھ کر ایک عاشق صادق قلی قطب شاہ کی شخصیت ہندستانی تہذیب و تمدن کا ایک نایاب گوہر ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کا ذکر ناگزیر ہے جنھوں نے آج سے ۲۹ برس پہلے یوم قلی قطب شاہ کو ایک قومی یکجہتی کے جشن کی صورت میں منانے کی بنا ڈالی اور اس طرح عوام کو اس عظیم سلطان کے درخشاں اور زرین کارناموں سے روشناس کرایا اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ ڈاکٹر زور مرحوم کے ۱۹۶۲ء میں دار فانی کو کوچ کر جانے کے باوجود ادارہ ادبیات اردو کے کارکنوں نے اس جشن کو جاری رکھنے کا سلسلہ برقرار رکھا۔ اس کے لیے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

قلی قطب شاہ اپنے والد کے بڑے بیٹے نہ ہونے کے باوجود، ان کی وفات کے چند دن کے اندر، صرف پندرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ اتنی کم عمری میں [illegible] سلطنت کی موجودگی میں ان کی تخت نشینی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ امرائے سلطنت کو ان کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا اور ان میں سے بیشتر شاہ کی تخت نشینی سے قبل ہی انھیں سلطان تسلیم کر چکے تھے۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ امرا کا اپنے سلطان پر یہ اعتماد بے بنیاد نہ تھا۔

سبھی اس بات سے آگاہ ہیں کہ قلی قطب شاہ دکنی اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان سے قبل صرف محمود، ملا خیالی اور فیروز کے سرسری تذکرے ملتے ہیں لیکن قلی قطب شاہ جو دکنی میں "معانی" تخلص کرتے تھے، دکنی اردو کے عظیم شاعر ہیں، جنھوں نے ہر اس موضوع پر لکھا تھا جو اس وقت ان کے علم میں تھے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ وہ کوئی معمولی شاعر نہ

تھے، انہوں نے جس موضوع پر طبع آزمائی کی اس کا حق ادا کردیا۔

قلی قطب شاہ نے فنونِ لطیفہ کی بھرپور سرپرستی کی۔ ان کے عہد میں تمام فنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ فنِ تعمیر ہو یا فنِ کتبہ سازی یا مصوری اور فنِ کتابت، ہر فن کو سلطان کی سرپرستی حاصل تھی۔ فنِ تعمیر کی سرپرستی کی زندہ مثال خود شہر حیدرآباد، فرخندہ بنیاد ہے، جہاں کھڑے ہوکر آج ہم قلی قطب شاہ کو خراجِ عقیدت پیش کررہے ہیں۔

قلی قطب شاہ کی حکمرانی کا دور دکنی تاریخ بلکہ ہندوستانی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس کے دور میں معرکہ آرائی کم اور بزم آرائی زیادہ ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کئی صدیوں کے بعد بھی ہم قلی قطب شاہ کو اس عقیدت اور محبت سے یاد کرتے ہیں۔

گنگا جمنی تہذیب کے بانی کے طور پر اکبر اعظم کا ہی نام عام طور پر لیا جاتا ہے لیکن لوگ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ اکبر ہی کے ہم عصر قلی قطب شاہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے ارضِ دکن میں اس خوبصورت تہذیب کی بنا ر ڈالی جسے ڈاکٹر زور مرحوم نے "ہندلمانی (ہندو + مسلمانی) تہذیب" کا حسین نام دیا۔

سلطان قلی قطب شاہ نے اپنی حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر ہندوؤں کو ملازم رکھنے کی روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے فروغ بھی دیا۔ قلی قطب شاہ کو نہ صرف یہ کہ خود "تیلگو" پر عبور حاصل تھا بلکہ انہوں نے اپنی سلطنت کے "درباری شاعر" کا رتبہ تیلگو زبان کے ایک شاعر کو عطا جن کا نام "پنا ہنا سوما یا جو" تھا۔ اس کے علاوہ ان کی سلطنت کے سب سے بڑے پنڈت ایک اور تیلگو شاعر "گنیشا پنڈتلو" تھے۔

زبان کی زندگی کا نایاب پہلو یہ ہے کہ ان کی حکومت کی بنیادی پالیسی سلطنت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہونے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابر کے مواقع فراہم کروائیں۔ ملے راؤ، کونڈہ ویڈو کے اہم قلعہ کے صوبیدار تھے اور اسوا راؤ، مسلی ڈیگو کے قلعہ کے حکمراں تھے۔

اسی طرح بلا خوف و تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ قلی قطب شاہ نے سچے سیکولرازم کی نہ صرف یہ کہ بنیاد ڈالی بلکہ اسے عملی طور پر برت کر بھی دکھایا۔

سلطان کے دورِ حکومت میں ہندو۔ مسلمان جس طرح شیر و شکر تھے اس کی نظیر ہندوستانی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ آج کے ہندوستان میں قومی یک جہتی کی اہمیت بیان کی محتاج نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب قلی قطب شاہ کی پیش کردہ عملی مثال کو مشعلِ راہ بنائیں۔ اور قومی یک جہتی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ ●

مخدوم محی الدین

شانِ نزول

۱۹۶۷ء میں مخدوم نے جامعہ ملیہ دہلی کے ایک اجتماع میں اپنا منتخب کلام سنایا اور اپنی شاعری کے بارے میں بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے بڑی دلچسپ اور دل نشین گفتگو کی۔ اس گفتگو میں زیادہ تر ایک ہی پہلو سامنے کہ ان کی مختلف نظموں کی شانِ نزول کیا ہے اور کیا شعری تخلیق ان کے لیے کسی خاص وقت میں کوئی بالارادہ عمل ہے۔ یہ گفتگو ٹیپ کر لی گئی تھی، جسے یہاں من و عن پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

مخدوم نے اپنی کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اسی دوران میں کسی نے پوچھا کہ فلاں غزل کی شانِ نزول کیا ہے۔ مخدوم کا اپنا جواب ٹیپ نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد پھر یہی سوال کسی نے دہرایا تو صدرِ جلسہ نے کہا۔ وہ جواب تو انہوں نے دے دیا ہے کہ یہ کام تو جراحوں کا ہے یا ماہرینِ نفسیات کا کہ وہ اس کا پتہ چلائیں۔ شاعر سے پوچھنا اور وہ بھی بھرے مجمع میں کہ شانِ نزول کیا ہے، زیادتی ہوگی۔

مخدوم :- نہیں، شانِ نزول کی اس کو خبر ہی نہیں ہوتی، خاص طور پر غزل میں، نظموں میں بھی ایسا ہوتا ہے لیکن خاص طور پر غزل میں۔

سوال :- کیا غزل کچھ بے ارادہ ہو جاتی ہے۔

مخدوم :- نہیں، دونوں ہی بے ارادہ ہوتی ہیں۔ غزل ہو یا نظم ہو، وہ بالکل بے ارادہ ہوتی ہیں اسی لیے میں "طرح" پر کچھ نہیں لکھ سکتا۔

کسی سوال کے جواب میں مخدوم نے کہا، شعر کہنے سے عین قبل پریشانی کیا ہوتی ہے، معلوم نہیں۔

محفل میں کسی نے کہا! EXCITEMENT

مخدوم :- EXCITEMENT میں تو نظم ہوتی ہی نہیں، چاہے وہ خوشی ہو یا غم ہو۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ نظم ایسے وقت ہوتی ہے جب دماغ میں بالکل ایک قسم کی خاموشی ہو۔ بالکل خاموشی۔ ذہن میں بھی۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں کہ کیا ہونے والا ہے لیکن غیر محسوس سی ایک بے چینی ضرور ہوتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے لیکن کیا ہونے والا ہے یہ معلوم نہیں ہوتا اور پھر کچھ مصرعے یا کچھ لفظ، ترکیبیں آنا شروع ہوتی ہیں اور پھر اس میں فکر (غور) بھی شامل ہوتی ہے، پھر سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(ایک اور سوال جو سُنا نہیں جا سکا غالباً یہ تھا کہ کیا ارادہ کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔)

مخدوم :۔ اس وقت تو نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں۔ پہلے ہی سے شاعر کے ذہن میں تاثرات ہوتے ہیں، الفاظ کی اور نغمگی کی شکل میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ میں کئی تجربے ایسے بتا سکتا ہوں۔ "چاند تاروں کا بن" میری ایک نظم ہے جو ٹرین میں ہوئی۔ میری اکثر نظمیں ٹرینوں میں ہوئی ہیں۔ جہاں مجھے تنہائی ملتی ہے۔ کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔

(ایک آواز :۔ مسافر تو ہوتے ہیں، ڈبے میں)

مخدوم :۔ ہم خود الگ ہو جاتے ہیں، ڈبے والوں سے (قہقہے) تو وہ نظم (چاند تاروں کا بن) ایسے ہوئی کہ میں دلی آ رہا تھا، حیدرآباد ۔ راستہ کاٹنے کے لیے کوئی کتاب درکار تھی تو میں نے پلیٹ فارم پر آربندو گھوش کی ایک کتاب — نظموں کا ترجمہ تھا، ودیاپتی کی۔ انہوں نے بنگلی سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ تو وہ کتاب میں نے لی اور پڑھتا رہا۔ اس کے بعد دماغ میں کچھ گونج سی ہونے لگی ایک تو ٹرین کی جو رفتار ہوتی ہے، وہ (RYTHME) دیتی ہے اور خیالات، ایسے ہی بکھرے بکھرے، پریشان سے خیالات آنے شروع ہوئے۔ بالکل بے معنی سے۔ بہت سے مصرعے ایسے تھے کہ بے معنی تھے لیکن اسی میں سے یہ نظم بنتی چلی گئی۔

"ویسے ہی "اندھیرا" نظم ہے، میں نے کلاس میں لکھی یہ نظم۔ جب میں سٹی کالج میں پڑھاتا تھا۔ میں جب کلاس میں گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اب پڑھانا وغیرہ تو ہو نہیں سکتا، بس کچھ لکھنے کی جلدی سی تھی — میں خاموش لکھتا رہا اور لڑکے (۴۵) منٹ تک خاموش، چپ چاپ بیٹھے رہے اور اس کے بعد جب پیریڈ ختم ہوا تو میں چلا گیا۔ دوسرے دن جب میں کلاس میں آیا تو لڑکوں نے گھیر لیا کہ کل ہم نے آپ کو اجازت دی تھی، ایک نظم لکھنے کی، وہ سنائیے۔ تو وہ نظم "اندھیرا" ایسے ہوئی، حالانکہ کوئی ارادہ نہیں تھا، اس میں۔ میں تو پڑھانے گیا تھا، لیکن وہاں نظم ہو گئی۔

ایک اور نظم۔ کچھ احباب تاش کھیلنے بیٹھے، وہاں ایک دم مجھے خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہیے میں وہ سب چھوڑ کر چلا گیا۔ تنہائی کے لیے کہیں جگہ نہ ملی تو قریب ہی ایک طویلہ تھا، میں پہنچ گیا طویلے میں، میں نے ایک نظم لکھی۔ "قمر" طویلے میں، جہاں گندگی تھی، بدبو تھی، مچھر تھے، جی ہاں، وہ ہاں "قمر" جیسی نظم ہوئی، تو بات یہ ہے کہ میرے لیے تخلیق کا عمل اتنا پُر اسرار ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ خیال آ جاتے ہیں، الفاظ چلے آتے ہیں اور شعر بنتے چلے جاتے ہیں — میں الفاظ کی بات کر رہا تھا۔ مثلاً میری نظم "سناٹا" میں ایک لفظ آیا ہے: "سنبھلنا" عام طور پر یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا لیکن ابھی دکنی میں گھریلو بول چال میں، خاص طور سے دیہات میں، یہ برابر استعمال ہوتا ہے۔ جی ہاں اب بھی ہوتا ہے — اچھی بات ہے کہ یہ نظم سنانے والا ہوں،

یہ کیسے ہوئی وہ بھی بتا دیتا ہوں۔ مخدوم نے پہلی نظم "سناٹا" سنائی ہے

کوئی دھڑکن / نہ کوئی چاپ / نہ سنچل / نہ کوئی موج / نہ ہلچل / نہ کسی سانس کی گرمی / نہ بدن / ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتہ کھڑکے / کوئی پگھلا ہوا موتی / کوئی آنسو / کوئی دل / کچھ بھی نہیں / کتنی سنسان ہے یہ راہ گذر / کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

ہاں تو یہ جو نظم ہوئی ہے اس میں لفظ سنچل آیا ہے حالانکہ روزمرہ کی بات چیت میں بھی اسے میں استعمال نہیں کرتا۔ جانے کب کا کان میں پڑا ہوا لفظ ہے بچپن کا۔ سنچل، اس کا روٹ سنسکرت ہے۔ چل کی ضد سنچل ہے یہ آہٹ کے معنوں میں آتا ہے۔ ایسی کیفیت کہ بس تھوڑی سی آہٹ ہو اور ایسا کہ آہٹ بھی نہ ہو۔ کچھ ایسی ہی کیفیت کو سنچل کہتے ہیں۔ یہ نظم دن بھر کے کام کے بعد لکھی گئی۔ دن بھر انتہائی غیر شاعرانہ قسم کے کام، ٹریڈ یونین کے کام، سیاسی کام، مزدوروں کی شکایتوں اور ان کی نمائندگی کے کام۔ غرض دن بھر کی تھکن کے بعد میں ایک مرتبہ ایک "بار" میں گیا، وہاں میں نے تھوڑی سی شراب پی۔ بالکل تنہا تھا میں۔ چند منٹوں میں یہ نظم ہو گئی۔

یہ سوال کہ نظم کیسے ہوتی ہے، تو میرا تجربہ یہ ہے کہ اس کو، اس وقت کا جو ماحول ہے اس سے یا کسی کے اہتمام یا ارادے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے پوری بے باکی کے ساتھ اپنا تجربہ آپ کے سامنے رکھا ہے۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جو بڑی تیاری کرتے ہیں نظموں پر۔ طویل نظموں کے لیے شاید یہ ضروری ہے لیکن جو تاثراتی نظمیں ہیں، ان کے لیے یہ بالکل ضروری نہیں۔ آپ مثنوی مولانا روم (جیسی تخلیق) کوئی لکھنے بیٹھے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے انسپریشن (INSPIRATION) اس کو درکار نہیں ہے گا۔ ایسی چیز کا بالکل پلان ہوگا، خاکہ ہوگا اور ایک مستقل خیال ہوگا اور ایک کیفیت ہوگی شعر کی، تو ایسی صورت میں وہ لکھ سکے گا۔ ایسی چیز لیکن جو چھوٹی چھوٹی تاثراتی نظمیں ہوتی ہیں، ارادہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کب کب کے لفظ، کیفیتیں اور تاثرات ہوتے ہیں، جو سمٹ کر ایک ہی وقت سے چلے آتے ہیں اور تخلیق ہوتی ہے۔

بہت سی نظمیں میں نے پارٹی کی میٹنگوں کے دوران لکھی ہیں۔ میٹنگ ہو رہی ہے۔ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے بھی بھاگ جانا چاہیے اور پھر چپکے سے بھاگ کر کسی کونے میں یہ نظم ہو جاتی ہے اور پھر دماغ پوری جولانی کے ساتھ میٹنگ کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ "لومبا" پر نظم ایسے ہی ہوئی۔ "بھاگ متی" پر نظم ایسے ہی ہوئی۔ پارٹی میٹنگ میں اور نظم "قید" بھی کچھ اسی انداز میں ہوئی۔ یہ نظم جیل میں ہوئی تھی۔ بہت دنوں سے ہم نے کوئی نظم نہیں کہی تھی۔ وہاں جیل میں مختلف خیالوں کے لوگ تھے۔ جیل میں کچھ کام نہیں ہوتا تو باغبانی کرتے ہیں یا شاعری کرتے ہیں۔ تو کچھ

تو ہم پوئٹری کارنر میں رہتے تھے، پوئٹری کارنر، ڈرامہ کارنر، فلاں کارنر، فلاں کارنر — کارنرز (گوشے) بن گئے تھے۔ میں تو رہے لیکن شاعری نہیں لکھ گیے۔ ایک وقت ہمیں علیحدہ علیحدہ سیل (چھوٹی تاریک کوٹھری) میں بند کر دیا گیا۔ مجھے جیسے ہی اس کوٹھری میں بند کیا گیا، ایسا معلوم ہوا کہ دروازہ کھل گیا ہے — جہاں، دو تین منٹ میں، میں نے نظم لکھ دی۔ اب نظم لکھنے کے بعد سنانے کی خواہش ہوتی ہے۔ آڈئینس (سامعین) چاہتی ہے طبیعت۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ بس پہرے پہ "سیل" کا برقنداز۔ "سیل" کے چوکیدار کو ہمارے یہاں برقنداز کہتے ہیں۔ وہ برق انداز تھا محمد خاں، میں نے اس سے کہا، خاں صاحب ایک نظم ہوئی ہے انہوں نے کہا "ارشاد"۔ وہ سلاخوں کے باہر تھا اور میں اندر۔ میں نے اسے نظم سنائی۔ نظم سنانے کے بعد طبیعت چاہتی ہے کہ رائے پوچھیں۔ میں نے پوچھا "خاں صاحب! اس کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟ کہنے لگے "اس کے کیا کہنے، یہ تو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے" اور پھر انہوں نے بیڑی دے دی مجھے کہ آپ بیڑی پیجئے۔ (مخدوم نے سامعین کے اصرار پر نظم "قید" سنائی) تو جناب اس کے بعد ہمیں بیڑی ملی تھی، بیڑی جیل میں ایک مسئلہ ہوتی تھی۔ ملتی نہیں تھی بیڑی۔ ہم لوگوں کے لڑنے کے بعد اب ملی تو کیا! اس وقت تو نہیں ملتی تھی۔

ایک اور نظم میں نے ٹرین میں لکھی تھی۔ "چاند تاروں کا بن" (آزادی سے پہلے، بعد اور آگے) یہ ایک چھوٹی سی نظم ہے لیکن اس میں پیریڈز (وقفے) آگیے (سامعین کے اصرار پر مخدوم نے یہ نظم بھی سنائی، پھر ایک اور نظم "احساس کی رات" کی فرمائش ہوئی) مخدوم نے کہا نظم "احساس کی رات" میں اصل خطرہ ہے، تیسری ایٹمی جنگ کا

یہ تو میں نے بعض واقعات بیان کیے ہیں۔ اب یہ بتانا کہ نظم یا شعر کے دوران میں کیا کیا تصویریں آتی ہیں، امیج کیا شکل لیتا رہتا ہے، بڑا مشکل ہے ان کا سمجھنا۔

(ایک سوال کیا گیا، جس کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ کیا شعر کا ماحول سے تعلق نہیں ہوتا؟)

مخدوم:۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ شاعر، اس وقت کے ماحول سے — یعنی جب شعر کا نزول ہوتا ہے، اس وقت کے ماحول سے بے تعلق ہو جاتا ہے ———

اصل میں یہ کہنا کہ شعر ایک بے معنی سی فضا سے پیدا ہوتا ہے، قطعی فضول بات ہے۔

ایسا نہیں ہوتا ———

شاعر کی فکر کا، اس کے تاثر کا ایک تسلسل رہتا ہے، لیکن ایک لمحہ آتا ہے، جہاں آپ کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا، جہاں وہ چشمہ پھوٹتا ہے۔ تخلیق کا۔

مصحف اقبال توصیفی

اے مری شبِ رفتہ

اے مری شبِ رفتہ
تو بچھڑ گئی مجھ سے
اور پاس اتنی تو
جیسے دل کی ویرانی
جیسے آنکھ میں آنسو
تجھ کو اس طرح دیکھا
جیسے چل رہا ہوں میں
مدرسے کی راہوں میں
جیسے سو رہی ہے وہ
اب بھی میری باہوں میں
تجھ کو اس طرح دیکھا
خواب اک جوانی کا
اور نیند کے پہرے
تجھ کو اس طرح پایا
جیسے دل میں شک ٹھہرے
تجھ کو اس طرح کھویا
جیسے تو بدن میں ہو
اور بدن کے سو چہرے

○

اے مری شبِ رفتہ
صبح کی سپیدی سی
سقف و بام و در پہ ہے
آنکھ کے مکانوں میں
تو کہاں گئی۔ جانے
کن گئے زمانوں میں
چاپ تیرے قدموں کی
بج رہی ہے کانوں میں
تیرا آخری منظر
منزلِ سفر میں ہے
گرد رہگذر میں ہے

محمد منظور احمد

غزل

دل غمِ ہجر سے لہو ہوگا
مفت میں خونِ آرزو ہوگا

ذکر تیرا جو کو بہ کو ہوگا
تیز تر شوقِ جستجو ہوگا

ہر کٹھن مرحلہ پہ بالآخر
تیرا دیوانہ سرخرو ہوگا

مر چکیں ہم تو سب کے ہونٹوں پر
تو ہی عنوانِ گفتگو ہوگا

روشنی ہوگی ہر طرف منظورؔ
ساتھ جب اپنے شعلہ رو ہوگا

ڈاکٹر مقبول فاروقی

اردو شاعری کا ہندوستانی آہنگ

اُردو زبان وادب میں قومی یک جہتی کے عناصر کی تلاش ایسی ہی صورت حال پیدا کرتی ہے۔ جس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے کہ ؎

خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے　　اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

اس لیے کہ اس لسانی حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خود اُردو زبان کا وجود میں آنا ہی، مختلف قوموں اور تہذیبوں کے درمیان طویل اختلاط اور لین دین کا ایک خوشگوار نتیجہ ہے اور اتحاد و یک جہتی ہی کے عناصر سے اس خوبصورت زبان کا خمیر گوندھا۔ اُردو شاعری کے مجموعی آہنگ کو پیش نظر رکھیں یا اُردو شاعری کا بحیثیت مجموعی عروضی جائزہ لیں تو یہی حقیقت روشن ہوتی ہے۔

عروض دراصل شعر کا فنی اور تکنیکی پہلو ہے جو شعر کو ایک (FRAME WORK) فراہم کرتا ہے۔ شعر کی دل آویزی اور اثر پذیری میں ایک بنیادی کردار ادا کرنے کے باوجود عروض ایک پس منظر میں رہنے والی چیز ہے اس لیے کہ عام طور پر ہم شعر کی موزونیت، ترنم اور نغمگی سے لطف اندوز تو ہوتے ہیں لیکن فاعلات تفعلات کے چکر میں کم ہی پھنسنا چاہتے ہیں۔

جب ہم اُردو شاعری کے اس فنی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں بھی اتحاد و یک جہتی اور رواداری کے کئی گوشے نکل آتے ہیں اور ہمارا یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے کہ اتحاد و یک جہتی اور رواداری کی زمین میں اُردو زبان وادب کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔

اگر ہم عروضی نقطۂ نظر سے ہماری شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اُردو کے شعراء نے اُردو میں عربی کی مروجہ بحروں کے ساتھ ساتھ سنسکرت یا ہندی کی کئی مترنم بحروں کا خوب استعمال کیا ہے۔ خصوصاً اُردو کی ابتدائی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس دور کے صوفی شعراء نے اُردو شاعری کی بنیاد ہی ہندوستانی اوزان پر رکھی تھی۔ اُردو شاعری میں عام طور پر سنسکرت یا ہندوستانی

جو تفصیل حسب ذیل ہے۔ [illegible] (۲۸ ماترائیں) [illegible] (۲۶ ماترائیں) سار (۱۶ ماترائیں)
[illegible] (۱۶ ماترائیں) تاٹنک (۳۰ ماترائیں) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وضاحت کے لیے ہر ایک کی
مثالیں پیش ہیں۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کا ایک دوہا یہ ہے

فرید روڑا باٹ کا تھ من کا بھیمان ۔۔ ایسی رہنی جو رہے تا ہی ملے بھگوان

اور بابا فرید کے یہ دو شعر ۲۷ ماتراؤں والے سرسی چھند میں ہیں

روٹے گو روگا میں جھگڑا اور پیا سے پیار ۔۔ چلوں فرید تو کیوں جیسے رہوں تو ٹوٹے پیار
جو بن جائے تو جائے پر پیا کی پریت نہ جائے ۔۔ دیکھی سیکھی جو بن کتنے بن پریت کیے کمہلائے

حضرت امیر خسرو کا یہ دوہا تو خاصا مشہور ہے ہی

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس ۔۔ چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چوندیس

خسرو کی پہیلیاں بھی ہندی عروض کے مطابق ہی ہیں۔ ایک پہیلی یہ ہے جو ۲۸ ماتراؤں والے سار چھند
میں ہے

ساون بھادوں بہت چلے ہے ماگھ پوس میں تھوری ۔۔ امیر خسرو یوں کہیں تو بوجھ پہیلی موری

شیخ بو علی قلندر پانی پتی کا یہ دوہا بھی مشہور ہے

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے ۔۔ بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نا ہوئے

افقر پانی پتی کی "بکٹ کہانی" ۱۶ ماتراؤں والے سیرو چھند میں ہے۔ اس چھند (بحر) میں ہندی
کے مشہور شاعر جے شنکر پرساد کا یہ شعر پہلے دیکھیے

اکلی چھوڑ کر جانے نہ دوں گی ۔۔ بدنے کو توڑ کر جانے نہ دوں گی

اور اب "بکٹ کہانی" کے یہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی ۔۔ بھئی ہوں عشق کے غم سوں دیوانی
نہ مجھ عشق سے پیا کیا بلا ہے ۔۔ کہ جس کی آگ سوں سب جگ جلا ہے

ہندی شاعری کی ایک روایت یہ رہی ہے کہ اس میں جذبۂ عشق کا اظہار عورت کی جانب
سے ہوتا ہے۔ اردو شعراء نے اس ہندستانی روایت کو بھی اپنایا ہے۔ افقر کی "بکٹ کہانی" اس
کی بہترین مثال ہے ہی، ساتھ ہی اردو کے بعض دیگر شعراء کے یہاں بھی ہم کو اس روایت کا عکس ملتا
ہے خصوصاً ابتدائی دور کے صوفی شعراء کے یہاں۔ گجرات کے ایک صوفی شاعر قاضی محمود دریائی کا
یہ شعر دیکھیے جو (۱۶) ماتراؤں والے چوپائی چھند میں ہے

کی کروٹ لی اہر اسا یئں　　　سندس رہن کی بیلا ہا ئیں

میراں جی شمس العشاق کا بیشتر کلام ہندی اوزان پر مبنی ہے۔ "مغز مرغوب" کا ایک شعر یہ ہے جو ۲۷ ماتراؤں والے سرسی چھند میں ہے ؎

اللہ محمدؐ علی امام دائم ان سوں حال　　　سب خاصوں سوں اللہ اللہ تو رکھوں کیا کال

یہی کیفیت شیخ برہان الدین جانم کے کلام کی ہے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں۔ پہلا سرسی میں ہے اور دوسرا ایک چھوٹی بحر "چنگ" میں ہے جس میں ۱۳ ماترائیں ہوتی ہیں ؎

بہروپ پرگٹ آپ چھپایا کوئی نہ پایا انت　　　ملیا موہ میں سب جگ باندھیا کیوں کر سوچے پنت
(وصیت الہادی)

جیئے دھارے اس کی نیت　　　نا سمجھیا کس یہ انت　　　(حجت البقا)

ولی کے عہد ہی سے اردو شاعری پر فارسی کے اثرات گہرے ہونے لگتے ہیں اور ساتھ ہی اردو میں عربی عروض پوری طرح رائج ہوجاتا ہے لیکن ہماری شاعری کے عہد متوسط میں بھی ہندستانی اوزان کے استعمال کا سلسلہ بالکل ہی منقطع نہیں ہوجاتا۔ اس عہد کے کئی شعراء نے بھی ہندی بحروں پر مبنی شعر لکھے ہیں۔ اس دور کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ بعض شعراء نے عربی بحور پر مبنی اپنے مرثیوں کے درمیان کچھ دوہے بھی کہہ کر شامل کرلیے ہیں۔ مسکین کا درج ذیل دوہا ایسے ہی ایک مرثیے سے لیا گیا ہے ؎

نیر ڈوبن ہندی منیں تلون لاگی آگ　　　انجواں چلے بجھاونے جلتو دیکھ سہاگ

مرزا سودا کے مرثیوں سے لیے گئے دو دوہے یہ ہیں ؎

دیکھ غضا جس کو ذرا کہتے سبھے رسولؐ　　　لال کو میرے فاطمہ کاہے کیا ملول

کاری رین ڈراونی گھر سے ہوئے نراس　　　جنگل بیچ بجا سوے کوئی آس نہ پاس

جرأت نے بھی دوہے کہے ہیں۔ جن میں ان کا اپنا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے دو دوہے یہ ہیں ؎

عجب بلا میں پھنس گئے کہیں سو کیا جنجال　　　گویا رات ملاپ کی ہوگئی خواب خیال

کیا من للچائے دیکھ وہ ابھری گات　　　ہاتھ کہاں وہ آئے ملوں نہ کیوں کر ہات

نظیر کی شاعری کا عوامی رنگ اور ہندستانی مزاج تو اس بات کا متقاضی تھا ہی کہ شعر کا آہنگ بھی دیسی ہو۔ ان کے دو شعر یہ ہیں۔ پہلا دوہا ہے اور دوسرا ۳۲ ماتراؤں والے سمان سویّا چھند میں ہے ؎

برہ آگ تن میں لگی جلن لگے سب گات　　　ناڑی چھووت بید کے پڑے پھپھولے ہات

میں کیا کیا وصف کروں یارو اس شام برن بنواری کے
سری کرشن کنہیا مرلی دھر من موہن کنج بہاری کے

امانت نے اپنی "اندر سبھا" میں راجہ اندر اور پریوں کے مکالمے دوہوں کی شکل میں لکھے ہیں کچھ دوہے یہ ہیں :

راجا اندر : راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام　　بن پریوں کی دید کے نہیں مجھے آرام

لال پری : بیٹھی تھی میں قاف میں جوڑا پہنے لال　　یہاں بلا کر آپ نے بڑھا دیا اقبال

اُردو شاعری کے دورِ جدید میں ہندی اصناف و اوزان کے استعمال میں زیادہ فراخدلی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ خصوصاً عظمت اللہ خاں کے عروضی اجتہادات و نظریات نے ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ انہوں نے تو اردو عروض کی بنیاد ہی ہندی "پنگل" (عروض) پر رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔

اس دور میں سب سے پہلے ہم کو مولانا حالی کی نظم "مناجات بیوہ" نظر آتی ہے' جو ۱۶ ماتراؤں والے چوپائی چھند میں ہے اس کے دو شعر یہ ہیں ۔

اے سب سے اوّل اور آخر　　جہاں تہاں حاضر اور ناظر

جو سمجھے تیری جل اور عقل میں　　پاس ہے تیری پھول اور پھل میں

کلام اقبال میں بھی ہم کو (ضرب کلیم میں) ایک نظم ایسی ملتی ہے جو سرسی چھند میں ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ۔

رومی بدلے شامی بدلے' بدلا ہندوستان　　تو بھی اے فرزند کہستاں اپنی خودی پہچان

حسرت موہانی نے بھی ہندی بحروں میں نظمیں اور ہولیاں وغیرہ لکھی ہیں۔ عظمت اللہ خاں کے عروضی تجربات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے یہاں کچھ دیگر شعرا کا ذکر کرتا ہوں۔

میرا جی کو قدیم ہندستانی تہذیب و اساطیر سے ایک فطری لگاؤ اور ایک تعلق خاطر رہا ہے۔ اور اس کا پر تو ان کی شاعری پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے گیتوں سے قطع نظر متعدد غزلیں اور نظمیں ہندی عروض پر مبنی لکھی ہیں۔

اپنی ایک نظم "بھیدی" میں وہ سرسی اور چوپائی چھندوں کو یکجا کر دیا ہے۔ یعنی ہر بند کا پہلا اور آخری مصرعہ سرسی چھند میں ہے اور درمیانی دو مصرعے چوپائی ہیں۔ ایک بند یہ ہے ۔

پیچھے لاکھو شکاری آگے ایک شکار
دھن گن گیان بھی کام نہ آئے۔
نام ہری کا جپتا جائے
اپنی سی وہ کہے جائے ٹھاکر لو اتیا چار۔

مجاز کی نظم "بول اری او دھرتی بول" پندرہ ماتراؤں والے "چوپائی چھند" میں ہے۔ فراق نے بھی سرسی اور چوپئی میں شعر کہے ہیں۔ "گل نغمہ" میں ان کی ایک نظم "دھرتی کی کروٹ" (سورج چاند اٹھلائی ایسی سگے) چوپائی چھند میں ہے اور "ترانۂ عشق" سرسی میں ایک شعر یہ ہے ؎

جلوۂ گل بلبل کو بہت ہے شمع کو گریۂ شام   بادِ بہاری گل کو بہت ہے مجھ کو تیرا نام

عبدالمجید بھٹی اور عبدالاحد کے یہاں بھی ایسی نظمیں ملتی ہیں جو ہندی اوزان پر مبنی ہیں۔ کرشن موہن کی ایک نظم "سوچ" (شبنم شبنم) ۳۲ ماتراؤں والے سمان سوئیا چھند میں ہے۔ ایک شعر یہ ہے ؎

کھوئی کھوئی جانے میں کیا سوچتی رہتی ہوں دن رین
پی درشن کی پیاس لگی ہے پی درشن کو ترسیں نین

جمیل الدین عالی سرسی چھند میں بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں لیکن وہ ان کو دوہے کہتے ہیں۔ دو شعر یہ ہیں ؎

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے   جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے
گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرما تا روپ   تو ہی بتا او نار! میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

معشور سبزواری کی دو مختلف غزلوں کے درج ذیل مطلعے سرسی چھند میں ہیں ؎

ہولے ہولے گونج رہی ہے کنگن کی جھنکار   پیا ملن کی رات میں گوری چھپ چھپ کرے سنگھار
ان دیکھے برسوں سے یہی ہے پریم نگر کی ریت   دل والوں کی ہار ہوئی ہے چندر مکھوں کی جیت

بلراج کومل کی نظم "یہ بھی ایک کہانی" (میری نظمیں) ۲۴ ماتراؤں والے سار چھند میں ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

کہتے ہیں ایک بار کہیں سا گر در بن میں   چندا نے اک بھولی بھالی صورت دیکھی

ان کے علاوہ بھی اردو کے کئی ممتاز شعراء نے ہندی عروض پر مبنی نظمیں، غزلیں اور گیت وغیرہ لکھے ہیں جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں، تاہم اس جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، ہماری شاعری میں سنسکرت یا ہندی بحروں کا استعمال آغاز سے اب تک برابر ہوتا رہا ہے۔ ایک اور بات جو خاص اہمیت کی حامل ہے یہ سامنے آتی ہے کہ اردو کا عروض، عربی کی کئی مترنم بحروں کے پہلو بہ پہلو سنسکرت یا ہندی کے کئی سریلے چھندوں سے تشکیل پایا ہے۔ ان ملے جلے اوزان پر مشتمل ہمارا عروض خود بھی اتحاد و رواداری کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ ●●

دو نظمیں

نمیش پارسلو

مجھ سے نہ پوچھ
زندگی کے معنی!
کیوں کہ
میں ایک مردہ ہوں
جو
استھر بے بس
نر نمیش آنکھوں سے
دیکھتا رہتا ہے
چیلوں اور کوؤں دوارا
اپنے بدن کے ماس اور انتڑیوں کو
لوٹتے کھسوٹتے ہوئے
پر بے جان کچھ کر نہیں پاتا!
مجھ سے پوچھ موت کیا ہے
کیوں کہ
اسی جنم میں
انیک بار میں مر کر جی چکی ہوں
آکاش کو تکتے
لہروں کو پڑھتے
اجنبیوں سے ملتے
میں نے انیک بار پنر جنم لیا

آج
اچانک گھر کی ساری گھڑیوں میں سے
گھنٹے دکھانے والا کانٹا چھٹک کر دور جا گرا!
کتنا مشکل ہے اب
پل پل گننا
اور پھر اس کے آدھار پر گھنٹے گننا
اور پھر اس کے آدھار پر دن گذارنا
میں
عرصے سے اب پلک پل پل گن رہی ہوں
ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا
پھر بھی لگتا ہے عمر گذر گئی!
نہیں
یہ مجھ سے نہ ہوگا
تم
ابھی جاکر
سب گھڑیوں میں پھر سے
گھنٹوں کا کانٹا جڑوا کر لاؤ
پر کیا اس کے جڑ جانے ماتر سے
پل پل کاٹنا آسان ہو جائے گا؟
ہاں
شاید گھنٹوں میں بندھ کر دن جلدی
گزر جائے گا نا!

مصطفیٰ علی فاطمی

سررشتۂ تالیف و ترجمہ، جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد میں علم و ادب کی سرپرستی اور تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں سلطان العلوم آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں والیٔ دکن کا ہم سب پر بڑا احسان ہے۔ مہتمم تعلیمات عماد الملک سید حسین بلگرامی کے مشورہ سے ساری ریاست حیدرآباد میں مدارس تحتانیہ سے فوقانیہ تک مادری اور سرکاری زبان اُردو میں تعلیم کا بندوبست ہوا۔ دورِ حاضر کی تعلیم سے عام دلچسپی اور اعلیٰ تعلیم کا شعور پیدا ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری معتمد تعلیمات و امور عامہ نے ریاست حیدرآباد کے لیے ایک یونیورسٹی کے قیام کی عرضداشت حضور نظام کی منظوری کے لیے پیش کی۔ شہریار دکن نے واضح ہدایات کے ساتھ قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو فرمان جاری کیا۔ "مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی و دماغی و روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجے کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو کو قرار دیا جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسبِ مذکور اصول محولۂ عرضداشت کے موافق حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا۔ اور ہر اہم و اصولی امر کی نسبت جو اس کارروائی میں پیدا ہو، صراحت کر کے میری منظوری

وقتاً فوقتاً خاص کی جاتی رہے۔" (۱۷ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ)

اُردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جدید فلسفہ، نفسیات، منطق، اخلاقیات، تاریخ، سماجی علوم، قانون و دستور، سائنس و ریاضی، طب اور انجنیری کی جملہ فنی و نصابی کتابوں کا عربی، فارسی، جرمن، فرنچ اور خصوصاً انگریزی سے اُردو ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ معتمد تعلیمات نے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے قیام کی منظوری کے لیے معروضہ پیش کیا۔

معروضہ منظور ہوا اور بموجب فرمانِ خسروی مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء جامعہ عثمانیہ کے پیش رو ادارے "سررشتۂ تالیف و ترجمہ" کا ۱۷ ستمبر ۱۹۱۷ء کو قیام عمل میں آیا۔

اس سررشتہ کے لیے ایک ناظم اور دس قابل ادیب اور مترجم مقرر کیے گئے۔ زبان و ادب، علوم و فنون کے ماہرین اور اساتذہ کے علاوہ مجالس نصاب کے ارکان کی مدد سے ایک جامع منصوبے کی تیاری کے بعد انگریزی، فرنچ، جرمن اور عربی و فارسی سے پانچ سو (۵۰۰) مستند اور کارآمد کتابوں کا ترجمے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ اُردو میں ترجمہ کے بعد ان کتابوں کی طباعت و اشاعت سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے فرائض میں داخل تھی۔ تیس ایک سال کے عرصے میں (۵۶۳) کتابیں ترجمے اور طباعت سے آراستہ ہو کر آن بان کے ساتھ شائع ہوئیں۔ یہ نایاب ذخیرہ اب عثمانیہ یونیورسٹی کے ریفرینس کلکشن میں محفوظ ہے۔ اس کی ترتیب و تہذیب میرے ہاتھوں ہوئی ہے۔

ترجمہ و تالیف کی اولین ضرورت علوم و فنون کی اُردو میں اصطلاح سازی تھی۔ اس مہم کے لیے مجلس وضعِ اصطلاحات بنائی گئی جس کی پانچ کمیٹیاں تھیں۔

۱۔ کمیٹی برائے طبیعیات، کیمیا و ریاضی
۲۔ کمیٹی برائے آرٹس (فلسفہ، عمرانی علوم اور تاریخ جغرافیہ)
۳۔ کمیٹی برائے حیاتیات
۴۔ کمیٹی برائے طب
۵۔ کمیٹی برائے انجنیری

مجلس وضع اصطلاحات کا پہلا اجلاس ۱۹۱۸ء میں ہوا اور آخری اجلاس کی تاریخ ۱۵ جمادی الثانی [illegible] ہے۔ وضع اصطلاحات کی کمیٹیوں نے ۱۹۲۹ء تک ۵۵ ہزار علمی اصطلاحات کا انگریزی اور دوسری زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کر لیا اور ان کی ایک ابجدی فہرست بھی شائع کی۔ اصطلاح سازی بڑے خلوص اور محنت سے ہوتی رہی اور تین دہائیوں یعنی ۱۹۴۷ء تک اُردو اصطلاحات کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہو گئی جس میں سے ۹۱۰۸۸ کی فن واری تفصیل ڈاکٹر نظام الدین صاحب ناظم سررشتہ نے اپنے

مرتب کیے ہوئے جدول میں اس نوٹ کے ساتھ دیا ہے کہ متفرق اصطلاحات کی کثیر تعداد ابھی جدول کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ نظرثانی کے بعد انھیں فن وار ترتیب میں شامل کیا جائے گا۔

سررشتۂ تالیف و ترجمہ کی جانب سے چھ مجموعہ اصطلاحات مرتب اور شائع ہوئے۔

۱۔ مجموعہ اصطلاحات علمیہ	۱۹۲۹ء	۴۔ اصطلاحات علم ہیئت	۱۹۴۸ء
۲۔ مجموعہ اصطلاحات تدریسات	۱۹۲۷ء	۵۔ مصطلحات طب جلد اول	۱۹۴۸ء
۳۔ مجموعہ اصطلاحات ریاضیات	۱۹۴۸ء	۶۔ تحقیقات ریاضی و سائنس	۱۹۴۹ء

مجلس وضع اصطلاحات میں زبان کے نمائندے بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر وحیدالدین سلیم علامہ نظم طباطبائی اور عبداللہ عمادی صاحب تھے۔ سائنس کے نمائندے جناب نصیر احمد عثمانی، برکت علی چودھری، قاضی محمد حسین اور عبدالرحمن خاں صاحب تھے۔ ہر شعبۂ تعلیمی کی نمائندگی کے لیے ممتاز اساتذہ اور ماہرین مقرر تھے ایک ایک اصطلاح کی منظوری کے وقت ارکین مجلس میں جو علمی و ادبی مباحثے ہوئے وہ خود ایک مستقل ریسرچ کا موضوع ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ریکارڈ دورِ انقلاب زمانہ اور دفتریت کی دستبرد سے بچ گئے ہوں۔

ابتدا میں اگرچہ دس مترجمین کا تقرر ہوا تھا لیکن ترجمہ و تالیف طباعت و اشاعت میں ترقی کے سبب مستقل، موقتی یا عارضی مترجمین کی تعداد ۱۲۰ سے زائد ہوگئی۔ ناظم سررشتہ کی عام نگرانی کے علاوہ دو ناظر بھی موجود تھے۔ ایک ناظر ادبی اور دوسرے ناظر مذہبی۔ ناظر ادبی کے تفویض ترجمے کے مسودہ کی ادبی اعتبار سے نظرثانی تھی اور ناظر مذہبی اس بات کا خیال رکھتے کہ ترجمے کی عبارت میں کسی مذہب یا عقیدے کے ماننے والوں کی دل آزاری نہ ہو اور طنز و تعریض نہ آنے پائے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلطان العلوم کے مطلق العنان شاہی دورِ حکومت میں مذہبی رواداری، انسانی اقدار اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا کس قدر پاس و لحاظ رکھا جاتا تھا۔

سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق صاحب تھے اور ان کے بعد مولوی سید محی الدین پرنسپل ورنگل کالج، حبیب احمد انصاری صاحب رجسٹرار جامعہ عثمانیہ، محمد عنایت اللہ رکن دارالترجمہ، عبدالرحمن، سید ... پروفیسر محمد نظام الدین اور آخر میں ڈاکٹر عبدالمعید خاں ناظم ہوئے۔ پہلے ناظر ادبی مرزا ہادی رسوا تھے اور پہلے ناظر مذہبی مولانا سید ... تھے اور ان کے بعد مولانا عبداللہ العمادی کا تقرر ہوا تھا۔

سررشتۂ ... کے ناظموں کی قابلیت ان کے خلوص اور سر اکبر حیدری صدر المہام فینانس ...

کی خاص توجہ کے سبب سالانہ مواز نے (بجٹ) میں ضروری رقومات کی گنجائش فراہم ہوتی رہی۔ ۱۹۳۶ء میں تالیف و ترجمے کا بجٹ ۲ ۱۲ لاکھ ۹ ہزار ۴ سو ۵ روپے تھا اور اس سے متعلق عثمانیہ یونیورسٹی پریس کے لیے ۵۷۹,۲۰۷ روپے فراہم کیے گئے تھے۔ مالیہ میں سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا رہا جو سلطان العلوم آصف سابع کی علمی سرپرستی اور اردو نوازی کا مظہر ہے۔

سررشتہ کی مطبوعات کی ابتدا ۱۹۱۹ء میں پانچ کتابوں سے ہوئی۔ پہلی مطبوعہ تالیف عبدالماجد (دریاآبادی) کی "منطق (استخراجی و استقرائی)" ہے اور آخری کتاب پروفیسر محمد مجیب کی تالیف "تاریخ تمدن ہند" مطبوعہ ۱۹۵۱ء ہے۔ تالیف و ترجمہ کی مطبوعہ کتب کا شعبہ جاتی اور زبان واری فیصد تجزیہ حسب ذیل ہے:

شعبہ فنون: I	فیصد کتابیں
۱۔ فلسفہ نفسیات منطق اخلاقیات	۱۶٪
۲۔ تاریخ و جغرافیہ (بشمول سوانح)	۳۳٪
۳۔ عمرانیات، سیاسیات، معاشیات	۷٪
جملہ شعبہ فنون:	۵۶٪
II شعبہ قانون و دستور	۶٪
III شعبہ ریاضیات و سائنس	۲۲٪
IV شعبہ انجینیری	۷٪
V شعبہ طب	۸٪
مجموعہ اصطلاحات	۱٪

زبان واری تجزیہ	فیصد کتابیں
انگریزی سے اردو ترجمے	۷۶٪
جرمن سے اردو ترجمے	۱٪
فرانسیسی سے اردو ترجمے	۱٪
عربی سے اردو ترجمے	۱۰٪
فارسی سے اردو ترجمے	۳٪
اردو تالیفات	۹٪

۱۹۳۷ء کی فہرست مطبوعات مرتبہ پروفیسر الیاس برنی ناظم اور ۱۹۴۶ء کی فہرست مطبوعات مرتبہ ڈاکٹر نظام الدین ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ کا تقابلی مطالعہ درج ذیل ہے۔

شعبہ تعلیمی	تعداد مطبوعہ کتب مطابق فہرست ۳۷ء	تعداد مطبوعہ کتب مطابق فہرست ۴۶ء
I شعبہ فنون		
۱۔ فلسفہ نفسیات منطق اخلاقیات	۲۷	۵۸
۲۔ تاریخ و جغرافیہ بشمول سوانح	۷۹	۱۱۸
۳۔ عمرانیات سیاسیات معاشیات	۱۸	۲۸
جملہ شعبہ فنون:	۱۲۴	۲۰۴

شعبہ تعلیمی	تعداد مطبوعہ کتب مطابق فہرست ۴۳ء	تعداد مطبوعہ کتب مطابق فہرست ۴۶ء
I شعبہ قانون و دستور	۱۳	۲۳
II شعبہ ریاضیات و سائنس	۵۳	۷۳
III شعبہ انجینیری	۱۷	۲۶
IV شعبہ طب	۹	۳۰
جملہ مطبوعہ کتب:	۲۲۶	۲۵۶

فہرست مطبوعات ۱۹۴۶ء کے جدول کے مطابق ۲۵۶ کتابیں شائع ہوئیں اور ۵۸ کتابیں اس وقت زیر طبع تھیں ان کے علاوہ ۸۶ کتابیں ترجمے تالیف وتیاری کے مرحلوں میں تھیں۔ ۱۹۴۷ء کی سیاسی سرگرمی حصول آزادی کے ساتھ ہی ہند۔ حیدرآباد قضیہ شروع ہوا۔ ستمبر ۴۸ء میں پولیس ایکشن کے نتیجے میں سلطنت حیدرآباد کا خاتمہ ہوگیا۔ ان قیامت خیز حالات کے باعث حیدرآباد کی علمی وادبی زندگی میں بھی انقلاب آگیا۔

آج بھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ۱۹۴۶ء میں ان ۵۸ کتابوں میں سے جو پریس میں تھیں، کتنی چھپ سکیں اور جو طبع نہ ہوسکیں، ان کے مسودات کیا ہوئے پھر ان ۸۶ کتابوں پر کیا بیتی جو تیاری کے مرحلوں میں تھیں اور وہ نامکمل مسودات اب کہاں ہیں، ان سب کا ریکارڈ بھی موجود ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا کے مقالہ میں ۱۹۵۲ء کی فہرست مطبوعات سے مزید ۲۶ کتابوں کی طباعت کا پتہ چلتا ہے۔ ان فہرستوں میں مجموعہ اصطلاحات علمیہ کو کہیں شمار نہیں کیا گیا ہے اس طرح جملہ مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۳۸۲ ہوتی ہے لیکن اس کو بھی قطعی اور آخری نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال یہ ہنوز تحقیق طلب اور حساس مسئلہ ہے کیونکہ اگست ۱۹۵۵ء میں شعبہ تالیف وترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی کتابوں کا اسٹاک جل گیا اور ریکارڈ منتشر اور تلف ہوگیا اور اردو ترجمہ کا زریں دور اپنے اختتام کو پہنچا۔

سررشتہ تالیف وترجمہ کے چند ممتاز ارکان اور ان کی کتابوں کی تعداد درج ذیل ہے:

قاضی تلمذ حسین	۱۹	برکت علی چودھری	۱۴	مرزا محمد ہادی	۱۰
سید ہاشمی فریدآبادی	۱۸	محمد نذیر الدین	۱۳	ڈاکٹر محمد عثمان خان	۱۰
احسان احمد	۱۶	عبدالرحمن خان	۱۲	حمید احمد انصاری	۹
قاضی محمد حسین	۱۵	فدا حسین طالب	۹	سید محمد ابراہیم ندوی	۸
عبداللہ عمادی	۱۴	رشید احمد	۸	مسعود علی	۷

برکت علی شیخ	۷	معتمد ولی الرحمٰن	۶	ضیاء الدین انصاری	۶
عبدالباری ندوی	۶	سید علی رضا	۵	ڈاکٹر غلام دستگیر	۵
محمد الیاس برنی	۵	محمد عنایت اللہ	۴	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۴
ہارون خاں شروانی	۴	ڈاکٹر محمد حسین	۴	ڈاکٹر اشرف الحق	۳
رائے شیو موہن لال	۳	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۳	ڈاکٹر ولی الدین	۳
نصیر احمد عثمانی	۲	رائے بیج ناتھ	۲	ڈاکٹر سیادت علی خاں	۲
حیدر یار جنگ طباطبائی	۲	سید عبدالساقی شطاری	۲	مارماڈیوک پکتھال	۲
عبدالحلیم شرر	۲	محمد سعید الدین	۲	حسین علی مرزا	۱
ڈاکٹر حمید اللہ	۱	پروفیسر کشن چند	۱	ظفر علی خاں	۱
مرتنجے راو	۱	رشید احمد صدیقی	۱	ڈاکٹر زاہد علی	۱
معشوق یار جنگ	۱	جے تیرتھ ساشودکر	۱	سردار بلدیو سنگھ	۱
عبدالقدیر صدیقی	۱	عبدالمجید صدیقی	۱	ڈاکٹر عابد حسین	۱
للت موہن مکرجی	۱	رحم علی الہاشمی	۱	ڈاکٹر مظفر الدین قریشی	۱
ڈاکٹر محمد رحیم اللہ	۱	میر اکبر علی موسوی	۱	ڈاکٹر حیدر علی خاں	۱

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۱ (انگریزی تالیف)

اراکین سررشتہ کے ناموں سے ہی ظاہر ہوگا کہ اس علمی خدمت کے لیے بلا امتیاز رنگ و نسل، مذہب و ملت تمام عالی دماغ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، عالم، فاضل، ادیب، صحافی، انشاپرداز، سائنس داں، ماہرین تعلیم اور ماہرین طب و انجینئری کی خدمات معقول مشاہرہ اور معاوضہ پر حاصل کی گئیں، اور اردو ترجمے اور تالیف کے کام میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، مدراسی، دکنی، پنجابی، دہلوی، لکھنوی، حیدرآبادی سب نے ٹیم اسپرٹ کے ساتھ حصہ لیا ہے۔

اردو زبان کو علمی اور سائنسی زبان بنانے کا ایک جوش اور جذبہ ہے جو، ہر مترجم اور مولف میں موجزن ہے اور اس کے دل و دماغ خوب سے خوب تر اصطلاحات، الفاظ اور عبارت کی تلاش میں دن و رات مصروف نظر آتے ہیں۔

اپنے ۳۲ سالہ دور کارکردگی میں سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کی بدولت اردو میں فلسفہ، عمرانی علوم، قانون، سائنس و ریاضی، انجینئری و طب اور دیگر فنون کو علمیت، مقبولیت اور عالمی شہرت ملی کہ بقول قاضی محمد حسین صاحب، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی: "علم غیر زبانوں میں مقید

تھا' جامعہ عثمانیہ کے طفیل نافذ ہوا' آزاد ہی نہیں ہوا' آسان ہوا' آسان ہی نہیں ہوا' عام ہوا۔ کاش جب کہ اُردو کے چاروں طرف بادِ سموم چل رہی ہے' ہمارے لسانی' علمی اور فنی ورثے کی حفاظت اور ضروری ہو گئی ہے۔ ہمارے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ زمانہ حاضر کے سائنس و ٹکنالوجی کو اُردو میں منتقل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ اُردو میں ترجمے اور جدید ترین اصطلاح سازی کے ذریعہ عالمی ادب اور عالمی زبانوں میں اُردو اپنا مقام اور اپنا چلن برقرار رکھ سکتی ہے۔

ترجمہ ایک نازک فن ہے۔ جو فطری صلاحیت' ریاضت' خلوص اور پیہم جستجو کا طالب ہوتا ہے۔ سررشتہ' تالیف و ترجمہ جیسے ادارے ہمارے علم و فن' تہذیب و تمدن آبرو ہیں۔

مطلق العنان شاہی دورِ حکومت میں سلطان العلوم نے زبان و ادب' علوم و فنون کی سرپرستی کی تو موجودہ سلطانِ جمہور کے دور میں جمہور اور جمہوریت کا فرض ہے کہ وہ ماضی کے اس شاندار ورثے کے تحفظ اور اُردو کی ترقی میں شایانِ شان حصہ لے۔ ○

بقیہ نتائج: صفحہ ۱۸ سے آگے

۲۲۳۔ شاہدہ بیگم درجہ سوم

(۱۸) مرکز وی کوٹہ

۲۲۳۔ حافظ محمد خلیل الرحمٰن فہیم درجہ سوم

(۱۹) مرکز بیدر

۲۰۵۔ سیدہ خالدہ بانو درجہ سوم

(۲۰) حیدرآباد (A)

۲۲۹۔ ایس اے عزیز درجہ اول

۲۲۴۔ قاضی محمد عبدالماجد صدیقی ” سوم

۲۲۵۔ کبیر احمد ” ”

۲۳۰۔ سید عبدالجلیل ” ”

۲۳۳۔ محمد الیاس ” ”

۲۳۶۔ سید افتخار حسن جعفری درجہ سوم

۲۳۹۔ نجم النساء بیگم ” دوم

۲۴۱۔ زہرہ شاہین ” سوم

۲۴۲۔ زینت النساء بیگم ” ”

۲۴۵۔ علی نثار ” ”

۲۴۶۔ مرزا بہادر علی بیگ ” ”

۲۴۸۔ حافظ محمد عبدالقیوم ” ”

(۲۱) مرکز حیدرآباد (B)

۲۵۰۔ ساجدہ محبوب درجہ دوم

۲۵۱۔ رفیق النساء ” سوم

۲۵۲۔ عائشہ صدیقہ درجہ سوم

۲۵۷۔ انجم شاہین ” دوم

۲۵۸۔ سیدہ صفیہ بی بی ” سوم

۲۶۰۔ محمدی فاطمہ ” دوم

۲۶۱۔ منیر النساء ” سوم

۲۶۴۔ [illegible] النساء بیگم ” دوم

۲۶۷۔ صابرہ بیگم ” سوم

مغنی تبسم

(معتمد اعزازی امتحانات)

غزلیں

عبدالرحیم نشتر

مہک رہا ہے کسی پھول سا بظاہر تو
ترس نہ جائے ہری شاخ کو بھی آخر تو

پکارتی ہے زمیں آ یہیں پہ دم لے لے
کہ اور جائے گا اٹھ کر کہاں مسافر تو

ہزار درد سہی زندگی عطیہ ہے
اسے بھی پھینک رہا ہے یہ کس کی خاطر تو

وہ کون لوگ ہیں جو تجھ کو رونے آئیں گے
یہ تاجروں میں کہاں آ پھنسا اے شاعر تو

خالد سعید

ہوتی ہے صرف دولت بیدار بے سبب
پھر بھی پلک پلک ہے گرانبار بے سبب

ان دیکھے دشمنوں کے اشارے گھڑی گھڑی
ہم نے لگایا جسم میں رادار بے سبب

شکلیں بگاڑ دی ہیں تو آنکھیں بھی نوچ لے
دکھلا ہے کیوں خرابے میں آثار بے سبب

اک تو کہ سود و نفع کا قائل ہے ہر گھڑی
اک میں کہ خرچ ہوتا ہوں بے کار بے سبب

ویسے بھی اب دلوں سے تعلق نہیں رہا
کیوں درمیاں اٹھاتے ہو دیوار بے سبب

نے عشق ہے کسی سے نہ سودا نہ کوئی غم
پھرتے ہیں شہر شہر ہمیں خوار بے سبب

ساجدہ عابد

ایک افسانہ ایک حقیقت

وہ بستر پر کروٹ بدل رہی تھی تاریک رات اور اس کا مہیب سنّاٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا، مگر نہیں رات کی اس تاریکی کو چاند کی ٹھنڈی روشنی فرحت بخش رہی تھی۔ خیالات کی رو میں وہ بھی جا رہی تھی اس کا دماغ ہر طرف دوڑ رہا تھا بالکل آسمان کے اس چاند کی طرح جو تھا تو ایک ہی جگہ نگاہوں کے دھوکے میں وہ بادلوں کے ساتھ ساتھ ناچتا اور گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ ایک کرب ناک اذیّت اسے محسوس ہو رہی تھی۔ بازو پلنگ پر فہیم خرّاٹے لے رہا تھا۔ پہلو بدل بدل کر جب وہ تھک گئی تو اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کمرہ میں جا کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور پنکھا تیز کر دیا۔ پنکھا پوری رفتار سے گھوم رہا تھا۔ وہ پہلے یہ سوچا کرتی کہ غیر ضروری پنکھا نہ کھولا جائے تاکہ بجلی کا بل کم ہو مگر آج اس کا موڈ بالکل الگ تھا وہ چاہتی تھی کہ نہ صرف اس کے کمرے کا پنکھا بلکہ گھر کے سارے پنکھوں کو پوری رفتار کے ساتھ چلنے دے اور سارے گھر کے کمروں کو روشن کر دے تاکہ بجلی کا بل (Bill) زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ خرچ اگر کم ہو بھی تو اس سے اس کو کیا فائدہ۔ وہ تو شادی کے وقت سے کفایت کرنے کا سوچتی آئی ہے لیکن باوجود اس کے گھر میں کبھی کفایت نہ ہو سکی بلکہ فضول خرچی ہی ہوتی رہی گھر چلانے کی ذمّہ داری رکھتے ہوئے بھی فہیم کی سخاوت، فیاضی اور دریا دلی نے گھر کے خرچے پر کوئی کنٹرول نہ رکھنے دیا پھر وہ اب بھی پیسے بچانے کا کیوں سوچے؟ اور جب اس نے بازو والے کمرے پر نظر ڈالی تو وہاں بھی پنکھا پوری تیز رفتار سے چل رہا تھا، دو دن پہلے آئی ہوئی مسز بیگ ٹیپ ریکارڈر لگا کر سو چکی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر بج بج کر خود ہی بند ہو جائے گا اور اسے مسز بیگ کے خراٹوں کے ساتھ ساتھ فہیم کے بھی خراٹے برابر سنائی دے رہے تھے۔

بھاڑ میں جائے فہیم اور بھاڑ میں جائے مسز بیگ۔ اس نے سر جھٹک کر اپنے دل کو بہلانے کے لیے بے تعلقی کا اظہار کیا لیکن یہ بے چینی اور یہ آگ ـــ یہ آگ کیسی تھی جو اس کے سینے میں لگی ہوئی تھی اور وہ کونسا لاوہ تھا جو اس کے اندر جل رہا تھا جس کی گرمی سے وہ بھسم ہو رہی تھی۔ مسز بیگ اس کے منہ سے نکلا۔ فہیم کے دوست کی بیوہ۔ وہ پھر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ یہ کیسی بے چینی تھی آخر۔ باہر جا کر اس نے صراحی سے پانی انڈیلا اور پی گئی مگر ٹھنڈے پانی نے بھی اس کے دل کی آگ نہیں بجھائی۔ اس نے دوسرا گلاس بھرا اور غٹ غٹ پی گئی بازو میں سوئے ہوئے فہیم نے ایک کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔ ٹھنڈک کا تھوڑا سا احساس اسے ہوا۔ ایک ... تو پانی،

دوسرے فہیم کی موجودگی کے دوسرے ہی لمحے بیزار ہوگیا۔ فضا میں فہیم کے خراٹے گونج رہے تھے۔ دھیرے سے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ٹھنڈک کہیں نہیں ہے اور نہ ہی ٹھنڈے پانی میں ہے اور نہ ہی چاندر کی ٹھنڈی روشنی میں۔ اس کا دل چاہا کوئی منوں برف کے نیچے اسے دبا دے تاکہ اس کے دل میں جو آگ جل رہی تھی وہ ٹھنڈی ہو جائے۔

پنکھا پوری رفتار سے گھوم رہا تھا اور اسی رفتار سے اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ چکر کاٹ رہا تھا۔ مگر۔ چانخ چانخ بیوہ۔ جس نے فہیم کو اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا ہے کہ فہیم اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔

"رضو" فہیم نے اسے پکارا۔

"کیا ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"تم جاگ رہی ہو۔ سو جاؤ مجھے صبح آفس جلد جانا ہے۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی دل چاہا واقعی اسے جگا دے اور پکار پکار کر کہہ دے تمہاری رضو نے تمہیں کبھی نہیں جگایا، خود تکلیف اٹھائی مگر تمہیں کوئی تکلیف ہونے نہیں دی۔ البتہ مسز بیگ ہاں ہاں وہی جو آج تمہاری مہمان ہے اس نے دن بھر تمہیں تھکا دیا۔ تم نے اسے شاپنگ کروائی، تم نے اسے عینک دلوائی، میوا خریدوایا، تم نے اس کے زیور بنوائے چوڑیاں پہنائیں، چلچلاتی دھوپ میں اسے امتحان ہال تک چھوڑ آئے اور اب جو تھکاوٹ ہو رہی ہے تو رضو کو سونے کی ہدایتیں دیتے ہو، اسے جس کی آنکھیں تارے گنتی رہتی ہیں جس نے دن بھر کھانا نہیں کھایا جس نے شادی کے دن سے اب تک اپنا تن من دھن سب کچھ تمہاری محبت میں لٹا دیا۔ مگر اس کے خیالات فہیم کے خراٹوں میں گم ہوتے چلے گئے۔ تو یہ زندگی بھی کتنی اذیت ناک ہے۔ چند گھنٹے بعد صبح ہو جائے گی فہیم اٹھے گا، شیو (SHAVE) کرے گا، پانی نہائے گا پھر فہیم۔ وہ اور مسز بیگ مل کر ناشتہ کریں گے۔ فہیم اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے بھی مسز بیگ کی پلیٹ میں بار بار نظر رکھے گا۔ اس کی خوشی میں خوشی ملاتے ہوئے اس کا پسند کے پراٹھے کھلائے گا۔ پھر مسز بیگ اس سے کہے گی میرا امتحان ہے پڑھا دیجیے اور فہیم ہر روز کی طرح پوری یقین دہانی کے ساتھ کہے گا۔ ہاں میں پڑھاؤں گا تمہیں ضرور پڑھاؤں گا اور اتنا پڑھاؤں گا کہ تم میری محبت اور وفاداری کا اپنے دل میں یقین کر لو۔ وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے گی، اس کی تعریف کرے گی اور اپنے چہرہ پر ایسے تیور بھی ڈالے گی جس سے فہیم کے دل کو دھکا لگے گا کہ کہیں اس سے کوئی ایسی غلطی تو سرزد نہیں ہو گئی جس سے وہ ناراض ہو گئی ہو۔ پھر فہیم اس کی پوری پوری دلجوئی کرے گا۔ اس کی ہر حرکت صرف مسز بیگ کی خوشی پوری کرنے کے لیے ہو گی اور جب یہ فہیم پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ شادی کے بعد اس نے اب تک اپنے دل کے کونے میں اسے چھپا کر اسی سے سچی محبت کی ہے۔ اسی کی خاطر، صرف اسی کی خاطر اس نے زندگی کے ہر موڑ پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اسی کی خاطر صرف اسی کی خاطر اس نے زندگی میں سارے دکھوں کو بڑی ہنسی خوشی سے جھیلا ہے اسی کی خاطر ہاں صرف اسی کی خاطر اس نے کانٹوں کو پھول سمجھا ہے اور اسی دھوکہ میں رہی کہ اس کا فہیم

[illegible] پھولوں کی سیج پر سلائے گا جس کی اس نے بڑی محبت سے آبیاری کی تھی، [illegible] قربانیاں
[illegible] اپنی زندگی میں خوشی کے پھول بکھرتے تو فہیم اسے نصیحت کرتا
"تم تو بڑی دل والی ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ نہ دو۔ میں نے پچیس سال تمہارے ساتھ گزارے
ہیں تمہیں حساب تھکا چکا ہوں بس اسی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے میں نے مسز بیگ کا ہاتھ تھام لیا ہے۔
تم وسیع النظر ہو، تعلیم یافتہ ہو اور پڑھی لکھی ہو۔"
پڑھا لکھا ہونے کے یہ معنی تو نہیں کہ عورت کے سارے لطیف جذبات کی طرف سے آنکھیں پھیر لی جائیں
اُسے صرف ایک فرنیچر سمجھ کر گھر میں رکھ دیا جائے۔ کبھی فہیم نے یہ بھی سوچا کہ اس کی بیوی بھی ایک عورت ہے
کبھی اس نے اس عورت کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی کی۔ کبھی اس کی ضرورت بھی سمجھی کہ دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے
اور وہ ایک وفا شعار اور ایمان دار بیوی کی حیثیت سے کیا چاہتی ہے۔
اتنے میں فہیم نے ایک کروٹ بدلی اور آہستہ سے پکارا۔ "رضو! آخر تم کیا چاہتی ہو۔ جاگ جاگ کر سب
کی نیند کیوں خراب کر رہی ہو۔ کہیں اس گڑبڑ میں مسز بیگ اٹھ نہ جائیں۔ اسے کل امتحان دینا ہے۔"
"اُفوہ"۔ وہ بولی۔ نا تو اس نے فہیم کو اٹھایا تھا۔ نہ ہی کسی کی نیند خراب کی تھی بھلا اس کی آواز
مسز بیگ تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ پھر آخر فہیم اتنا سنگدل کیوں ہو گیا ہے۔ وہ ایک ننھے بچے کی طرح رات بھر
سسکیاں لیتی رہی۔ زندگی ایک ہی محور پر گھومتی رہی اس کے جذباتی دھچکے اسے رات بھر رلاتے رہے اس کی
سوچ اس سے زندگی کی رنگینیاں طلب کر رہے تھے جس سے وہ چند سال سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کے
بیٹے کی ذہنی بیماری فہیم کا چند سال کیلیے اس سے دور ہو جانا۔ بڑے بیٹے کا روزگار کی تلاش میں وطن سے
دور چلا جانا۔ بیٹی کا بیاہ، اس کے پاس سب کچھ رہتے ہوئے بھی کچھ نہ رہنے کا احساس اُسے دیوانہ
بنا رہا تھا۔
محض کھانے پینے، تھوڑی دیر شوہر کے ساتھ بیٹھ کر گھریلو مسائل پر گفتگو کر لینے کو وہ زندگی کا نام
دینے تیار نہ تھی۔ وہ ان جذباتی تقاضوں کی تکمیل چاہتی تھی جس کے سہارے زندہ رہنے کی توانائی
حاصل ہوتی ہے۔ اسے ضرورت تھی اُن بھرپور پیار کے شراروں کی جس کی زندگی بخش حرارت
کے سہارے وہ اپنے آپ کو آنے والے دن کی جدوجہد کے لیے تیار کر لے۔ وہ صرف پیار چاہتی تھی
فہیم کا پیار۔ جو اس کے حق میں امرت تھا، اور یہی امرت اب اس کے لیے زہر بن رہا تھا جس کی وہ تنہا
حق دار تھی اور یہی حق آج اس سے چھینا جا رہا تھا جس کے لیے وہ تیار نہ تھی اور اسے اپنی شادی کے
وہ لمحات یاد آنے لگے جب فہیم ہر روز آفس جانے سے پہلے اسے خدا حافظ کہتا اور اگر کبھی وہ کہنا بھول جاتا
تو اس کا سارا دن بے کیف گزرتا۔ جب وہ شام واپس گھر آتا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا تب وہ آ

غزلیں

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

موضوعِ سخن بن گئی آشفتہ حواسی
محفل میں امیروں کی فقیرانہ لباسی

ملنے کو سمندر سے گئی پیاس بجھانے
سیراب کرے کس کو ندی خود بھی ہے پیاسی

کچھ درد سا پہلو میں اٹھا تھا انھیں کھو کر
بڑھتی ہی گئی بات مگر تھی وہ ذرا سی

سناٹے میں راتوں کے کبھی نیند اڑانے
آتی ہے کہیں دور سے دلسوز صدا سی

کچھ لوگ تو لمحوں میں بدل لیتے ہیں چولا
اک ہم ہیں کہ آتی ہی نہیں وقت شناسی

آئی نہ تمہیں یاد۔ وطن کی نہ ہماری!
تم اب بھی ہمیں یاد ہو اے دور کے باسی

غازے سے تو چھپ جاتا ہے چہرے پہ لکھا غم
رہ رہ کے ابھر آتی ہے آنکھوں کی اداسی

لٹنے کے سہی حاصلِ ہنگامۂ شب ہے
بجھتی ہوئی شمعیں ہیں کہیں پھول ہیں باسی

اردو پہ بھی بھارت میں بہار آئے گی اک دن
ہے طاہرہ اس قسم کی اسپیکولیشن قیاسی

ڈاکٹر نظیر صفی پوری

زلف بکھرائے ہوئے یوں وہ نہا کر نکلے
یک بہ یک جیسے گھٹا سے کوئی منظر نکلے

فکرِ دنیا میں سحر ہوتے جو لشکر نکلے
بہرِ دل ہم بھی قلم اپنا اٹھا کر نکلے

میری نظروں میں تو محرومیِ صہبا ہے گناہ
پارسا وہ ہے جو میخانے سے پی کر نکلے

غور سے دیکھتے رہیے تو گماں ہوتا ہے
قیدِ تصویر سے ممکن ہے وہ باہر نکلے

اے نظیر آج کھلا ان کی محبت کا بھرم
ہم جنھیں پھول سمجھتے تھے وہ پتھر نکلے

محمد جاوید اقبال

لاسمتیت کا سفر

(منی کہانی)

شور سُن کر وہ جاگ اٹھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا۔ گھبراہٹ کے عالم میں دروازے تک گیا تو اس نے دیکھا کہ رات کے اندھیرے پر دن کے اُجالے نے شب خون مار دیا ہے۔ ہر شخص بھاگ رہا ہے۔ اور ان کا سایہ ان سے کئی قدم آگے دوڑا جا رہا ہے۔ لوگوں کے تیزی سے بھاگتے ہوئے چہروں میں خوف و سراسیمگی، کسی پر بوکھلاہٹ، کوئی زرد چہرہ، کوئی لال، کوئی خوفناک چہرہ کسی کا رنگ اڑا ہوا۔ تمام چہرے ایک دوسرے کے درمیان اس تیزی سے گردش کر رہے ہیں کہ ان کے نقوش اپنی اصلیت کھو بیٹھے ہیں۔ اس نے بہت چاہا کہ تھوڑی دیر کے لیے ان تیز رفتار چہروں کو روک دے اور انھیں پہچاننے کی کوشش کرے مگر وہ ایسا نہیں کر سکا۔ یہ بے چہرہ لوگ بھاگ رہے ہیں، اس نے دیکھا کہ اس میں اس کا سایہ بھی شامل ہے جو اس کو نظر انداز کر کے بے تحاشہ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اس نے اپنے وجود کو سنبھالا اور سایہ کو پکڑنے کی کوشش میں دوڑنے لگا لیکن سایہ اس کی گرفت سے کافی آگے نکل چکا ہے۔ اسی عالم میں اس نے بھاگتے ہوئے بے چہرہ شخص کو پکڑ لیا اور پوچھا تم کیوں بھاگ رہے ہو۔ اس نے حقارت بھری نظر ڈالی اور ہاتھ چھڑا کر تیزی سے نکل گیا۔ وہ پھر دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے ایک بار پھر اس نے ایک بے چہرہ شخص کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس سے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے اس سے ہی اُلٹے سوال کر ڈالا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ وہ حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بڑبڑانے لگا وہ کیوں بھاگ رہا ہے ؟؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور پھر تیزی سے بھاگنے لگا۔ کافی دور نکلنے کے بعد ایک بے چہرہ شخص کو پھر اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت چھڑانے کی کوشش کی، مگر اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس کے منہ سے مغلظات گالیاں نکل رہی تھیں۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو سب بھاگ رہے ہیں۔ تم نے [illegible] صدیوں پیچھے کر دیا تم بالکل نامعقول آدمی ہو اپنی راہ لو ورنہ زمانہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا پھر وہ تیزی سے بھاگنے لگا۔ یکایک اس کے عقب سے آواز

"آ ہی رک جاؤ !! اس نے پیچھے مڑکر دیکھا کیا تم نے آواز لگائی۔ دوڑتے ہوئے شخص نے جواب دیا نہیں۔
اس نے بہت سے لوگوں سے پوچھا مگر سب نے نفی میں جواب دیا۔

پھر آواز آئی، تم کون ہو !!

میں! میں کون ہوں !! میں وہی ہوں جو کل تھا۔

تم اپنے کو گذشتہ سے پیوستہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ آج اور ابھی کی بات کرو۔ وہ گھبرا گیا کیونکہ وہ اپنی شناخت کھو چکا تھا اور وہ پھر تیزی سے بھاگنے لگا اس بھاگ دوڑ میں اس کی روح اس کے جسم سے آگے نکل گئی۔ وہ اپنے جسم کو لیے دوڑ رہا ہے۔ لاسمتیت کی کوئی حد نہیں تم کون ہو، کیا ہو، کیا سے تم کیا ہو گئے ہو، یہ سرگوشی کرتے ہوئے سوالات اب بھی اس کا پیچھا کر رہے ہیں ●

سے معافی چاہتا۔ روز کا یہی معمول تھا کہ یہ پہلے سوتی اور اس کے بعد فہیم سوتا۔ رات میں وہ کروٹ بدلتی تو وہ فوراً اٹھ بیٹھتا اور ہزاروں سوالات کرتا کہ کہیں طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ بیمار ہوتی تو وہ بےچین ہو جاتا، فوراً ڈاکٹر کو بلا لاتا۔ اپنے ہاتھ سے دوائی پلاتا تاکہ یہ لاپرواہی نہ کرے۔ غرض وہ بڑے آرام اور بےفکری سے زندگی گزارتی رہی اور اپنے آپ کو بڑی ہی خوش قسمت سمجھتی رہی۔ اپنے دوستوں سے یہی کہتی تھی کہ فہیم کی محبت کے سہارے وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات یوں ہی ہنسی خوشی بےفکری اور سکون سے گزار دے گی جس طرح موت کا ہونا یقینی ہے اسی طرح اس بات کا یقین تھا کہ فہیم اس کے سوا کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ دن اور آج کا دن گزرے ہوئے دنوں کو گزرنے والے دنوں سے ملا دیا جائے تو ۱۹ اور وہ ماضی اور حال کا تانا بانا بُننے لگی، جیسے مکڑی اپنا جالا خود بُن رہی ہو۔

اتنے میں فہیم نے ایک کروٹ بدلی اور پوچھا "رضو صبح ہونے میں کتنی دیر باقی ہے" اور اس نے چُپ سادھ لی۔ ●●

بقیہ اردو نامہ: دیتے ہوئے کہا کہ ہم تلگو کو ریاست میں اردو کا نہیں بلکہ انگریزی کا مقام دینے کے خواہاں ہیں اور اردو کو ریاست میں اس کا مستحقہ مقام ملنا لازمی ہے۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے رسم اجراء کے اس اجلاس کی صدارت کی۔ بیرسٹر اکبر علی خاں، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، نواب شاہ عالم خاں، ڈاکٹر سری رام شرما، پروفیسر غلام عمر خاں، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر یوسف اعظم نے تیرکی شاعری پر اظہار خیال کیا اور مبارکباد دی۔ جناب رشید اختر نے شکریہ ادا کیا۔ ۳۰ر جنوری: جدید تر لہجے کے شاعر جناب اسلم عمادی (حال مقیم لیبیا) کا تیسرا مجموعہ غزل "اگلے موسم کا انتظار" ادارۂ شعر و حکمت کی طرف سے منظر عام پر آیا۔ خطیب پروفیسر مغنی تبسم نے اسلم کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ سب رس کتاب گھر سے یہ مجموعہ ۱۲ روپے میں خریدا جا سکتا ہے۔ ۳۱ر جنوری: مرکزی وزیر تعلیم مسز سیتی شیلا کول نے کل ہند اردو تعلیمی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت ہند اردو زبان اور اس کے کلچر کے فروغ میں پوری ذمہ داری سے اپنا کردار ادا کر رہی ہے ریاستی حکومت پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اردو کو ریاست میں اس کا مستحقہ مقام عطا کرے۔ ریاستی وزیر تعلیم مسٹر آنند گجپتی راجو اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو نے بھی مخاطب کیا۔ جناب جلیل پاشاہ نے رپورٹ سنائی ●

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم جنوری: "ارباب نثر و نظم" کے زیر اہتمام سال نو کا طرحی سالانہ مشاعرہ پروفیسر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام "مہران ہال" مغلپورہ منعقد ہوا۔ وقار خلیل نے معتمدی کی۔ اختر جمالی اور بشیر وارثی نے اس مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ سب رس جنوری ۹۴ء میں اس مشاعرہ سے کے اقتباسات شامل کیے گیے۔

● ادبی ٹرسٹ کی طرف سے بتعاون مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی کل ہند صنعتی نمائش میں اردو بک اسٹال قائم ہوا۔ اس بک اسٹال سے اختتام نمائش تک اردو دوستوں نے ہزاروں علمی، ادبی سائنسی اور نصابی کتابیں خریدیں۔

۲ر جنوری: بزم کیلاش ورک سالانہ انتخابات میں جناب محمد ظہور الحسن کو دوبارہ صدر منتخب کیا گیا۔

۳ر جنوری: ڈاکٹر معتمد علی بیگ سابق ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی تصنیف "تصوف کے مسائل اور مباحث" منظر عام پر آئی۔

۴ر جنوری: اردو بھاکی طرف سے نعتیہ مشاعرہ الحاج مرزا شکور بیگ کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ ابتداً وقار خلیل نے اردو میں نعتیہ شاعری کے موضوع پر مقالہ سُنایا۔ جناب خورشید جنیدی نے مشاعرہ کی نظامت کی۔ اور صدر اردو بھا راجہ لال راجہ پردیسی نے خیر مقدم کیا کئی شاعروں نے بارگاہ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

۵ر جنوری: رسالہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو کے تحت جناب محمد عبدالرحیم آرزو ایڈوکیٹ گلبرگہ کا مجموعۂ کلام "اظہار آرزو" شائع ہوا۔ آرزو کی شخصیت اور شاعری پر پروفیسر علی محمد خسرو، پروفیسر مغنی تبسم، جناب عابد علی خاں، ڈاکٹر مرتضیٰ صدیقی، جناب دمن واقع سکینہ معتمد ادارہ اور جناب احمد جلیس نے اظہار خیال کیا ہے۔ 'سب رس کتاب گھر' ایوان اردو حیدرآباد ۔ ۸۲ سے ۱۵ روپے میں یہ مجموعہ خریدا جا سکتا ہے۔

● لندن میں مقیم حیدرآبادی شاعر جناب یوسف امتیاز کے خیر مقدم میں ایک محفل شعر بصدارت نواب طاہر علی خاں کا انعقاد عمل میں آیا۔ جناب بصیر افضل خصوصی مہمان تھے۔ خیرات ندیم، جہاندار افسر، زاہد رضوی، روشن خیال اور سوز عابدی کے علاوہ یوسف امتیاز نے کلام سنایا۔

۸ر جنوری: ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات حیدرآباد، آندھرا کے ضلعوں، تلنگانہ، مہاراشٹرا اور دہلی کے مرکزوں پر ۸ تا ۱۱ر جنوری منعقد ہوئے۔

● ریاستی انجمن ترقی اردو کا سالانہ دو روزہ اجتماع بصدارت ڈاکٹر سید عبد المنان صدر انجمن بمقام "اردو ہال" منعقد ہوا۔ جناب عزیز سیٹھ وزیر اوقاف وصنعت کرناٹک، جناب شہاب الدین (ایم پی) اور جیش گوپال راؤ ایکبوٹے نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کلیدی خطبہ پڑھا۔ مقررین نے ریاست اور پورے ملک میں اردو

زبان اور اس کی ترقی کے امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اردو داں عوام سے اردو کے حقوق کو منوانے کی جدوجہد میں حصہ لینے کی اپیل کی۔ ڈاکٹر عینی شاہد جنرل سکریٹری انجمن نے خیر مقدمی تقریر کی۔

شب میں حضرت سعید شہیدی کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ علی احمد جلیلی، برق یوسفی، وحید مرزا، ثریا مہر، عزیز النساء صبا اور نصرت محی الدین نے کلام سنایا۔

● ریاستی گورنر مسٹر رام لال نے اخبار نویسوں سے ملاقات میں بتایا کہ وہ اردو کے مداح رہے ہیں اور روزآنہ اردو اخبارات کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ گورنر آندھرا پردیش نے مزید کہا کہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اردو تعلیم و تدریس ناگزیر ہے۔

● ڈاکٹر احمد سجاد (صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی) نے اقبال کے تعلیمی نظریہ پر اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام توسیعی لکچر دیا۔ جناب ظہیر الدین احمد نے صدارت کی اور جناب مصلح الدین سعدی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۹ر جنوری : انجمن ترقی اردو کے اجتماع کے موقع پر مندوبین کے اجلاس میں اردو تعلیم اور نظم و نسق کے مسائل پر اظہار خیال کیا گیا۔ اور طے پایا کہ اردو تحریک کو نیا رُخ دینے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ نیز اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں اردو کے قانونی موقف کی وضاحت کے سلسلے میں ایک غیر سرکاری بل کی پیش کشی پر غور کیا گیا۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے اس اجلاس کی صدارت کی، مسز منوہر راج سکسینہ، کامریڈ کے یل مہندرا اور اضلاع کے کارکنوں نے مخاطب کیا۔

۱۳ر جنوری : محفل خواتین کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس محترمہ وحیدہ ہاشم علی کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ محترمہ رفیعہ رؤف نے مضمون اور محترمہ قمر جمالی نے کہانی سنائی۔ خواتین شعراء عظمت عبدالقیوم، مظفر النساء ناز اور نسیم نیازی نے کلام سنایا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی سکریٹری نے نظامت کی۔

۱۴ر جنوری : ریاستی انجمن ترقی اردو کے پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ ریاستی حکومت کی اردو سے بے نیازی کے رویہ کے خلاف اردو بچاؤ کونسل کی تشکیل عمل میں لائی جا رہی ہے۔ انجمن کے ریاست گیر شاخوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اردو کے حقوق کی صیانت کے سلسلہ میں کلکٹرز اور تحصیلداروں کو میمورنڈم پیش کرے۔

● جناب سید رحمت علی (ایم پی) نے تلگو دیشم حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ریاستی اقلیتی کمیشن کی پیش کردہ سفارشات کو شائع کرتے ہوئے اردو کے بارے میں واضح سرکاری پالیسی کا اعلان کرے۔

۱۶ر جنوری : جامعہ نظامیہ کے جشن تاسیس کے موقع پر امیر جامعہ مولانا سید رشید پاشاہ نے نواب میر برکت علی خاں آصف جاہ ثامن "نظام الملۃ والدین" کا اعزاز پیش کیا

۱۷ر جنوری : محترمہ شفیعہ قادری کی کتاب "حیدرآباد کے علمی ادبی ادارے" کی رسم اجراء نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے ایک علمی اجتماع میں انجام دی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے اس تقریب کی صدارت کی۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر غلام عمر خاں،

نواب شاہ عالم خاں، پروفیسر مغنی تبسم
اور ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحبان
نے اپنی تقریروں کے ذریعہ مصنف
کی علمی صلاحیتوں کو آئینہ دکھایا۔
جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کی۔

۱۸؍ جنوری : جناب تسنیم بیتابی، مدیر "فاران" کراچی کے خیر مقدم میں اردو سبھا کے زیر اہتمام محفل شعر جناب روحی قادری کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، تسنیم، روحی، داود نصیب خورشید جنیدی، رضا وسفی، ڈاکٹر یوسف کمال، تاج مہجور، فکر بدایونی راجہ لال راجہ، باقر منظور، اوم پرکاش نرمل، صادق نقوی، رشید شہیدی جیلانی بیگ، صادق، وید پرکاش ساون اسماعیل ظریف اور شبیر حسن خاں عزم نے کلام سنایا اور داد پائی۔

۲۰؍ جنوری : الحاج سید لطیف الدین قادری منیجنگ ایڈیٹر روزنامہ "رہنمائے دکن" کا اچانک دہلی میں ہارٹ اٹیک کے باعث انتقال ہو گیا۔ دوسرے دن نعش حیدرآباد لائی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ لطیف پاشاہ کی بے وقت اور اچانک رحلت پر مرکزی وزراء وزیر اعلیٰ اور چیف منسٹر کے علاوہ سیاسی اور قومی و مذہبی قائدین اور ارباب صحافت نے گہرے رنج و الم کا اظہار کیا۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ دینی، ملی اور صحافتی اعلیٰ اوصاف و اقدار کے حامل فرد تھے۔

۲۱؍ جنوری : کل ہند صنعتی نمائش کے موقع پر نمائش سوسائٹی کا سالانہ مشاعرہ جناب سید ہاشم اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سعید شہیدی، شاذ تمکنت، علی احمد جلیلی، مغنی تبسم، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، منوہر لال بہار، غیاث صدیقی، رحمٰن جامی، ڈاکٹر نظم، ہاشم جاہ، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، عزیز النساء صبا، اور معتمد مشاعرہ صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔

۲۲؍ جنوری : ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کی کتاب "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" کی رسم اجراء جناب صادق علی سابق گورنر مہاراشٹرا نے انجام دی۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر غفور کی کتاب اور ان کی علمیت و مزاح نویسی پر پروفیسر مغنی تبسم، جناب مجتبیٰ حسین اور جناب رشید قریشی نے مخاطب کیا اور مبارکبادی دی جناب محمد منظور احمد معتمد سرکل نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۳؍ جنوری : اردو ریسرچ اسوسی ایشن عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام نامور طنز و مزاح نویس جناب مجتبیٰ حسین کا پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ڈین، فیکلٹی آف آرٹس نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے تعارف کرایا اور مجتبیٰ کے فن اور ان کی شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر مجتبیٰ حسین نے اپنا ایک فکاہیہ سنا کر داد پائی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست معتمد اسوسی ایشن نے شکریہ ادا کیا۔

● عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے محمد عبدالبشیر خاں کو ان کے "ایم فل" کے مقالہ "خلیفہ عبدالحکیم حیات اور فن" پر ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا۔

۲۸؍ جنوری : ڈاکٹر سی نارائن ریڈی صدر سرکاری زبان کمیشن نے اردو گھر میں جناب صلاح الدین نیر کے مجموعۂ کلام "خوشبو کا سفر" کی رسم اجرا

(بقیہ ص ۳۵ پر دیکھئے)

نتائج امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو

منعقدہ جنوری ۱۹۸۴ء

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے امتحانات منعقدہ جنوری ۱۹۸۴ء (اُردو دانی' اُردو زباندانی' اُردو عالم اور اُردو فاضل) کے کامیاب اُمیدواروں کے نتائج 'رول نمبر اور سنٹر کی صراحت کے ساتھ درجِ ذیل ہیں۔ مجلس امتحانات کے فیصلوں کے مطابق اگلے امتحانات ۲۷ر مئی تا ۳۰ر مئی ۱۹۸۴ء کو منعقد ہوں گے۔ شرکت کی آخری تاریخ ۱۱ر اپریل مقرر کی گئی ہے اور دیرینہ ۵ روپے۔ ا ضافہ ۲۸ر اپریل تک درخواستیں' فیس کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔ اس کے بعد کوئی درخواست قابلِ قبول نہ ہوگی۔ امیدوار راست بھی ادارہ کے پتے پر فیس اور فارم بعد تکمیل روانہ کرسکتے ہیں۔ فارم پر گزیٹیڈ عہدہ دار/ ایڈوکیٹ کی مہر زدہ دستخط کے ساتھ سرپرست/ والد کی دستخط بھی لازمی ہوگی۔ مجلس امتحانات نے اُردو عالم کی فیس ۳۰ روپے اور اُردو فاضل کی فیس ۴۰ روپے مقرر کی ہے۔ فاضل گروپ اول یا کسی ایک گروپ کی فیس ۳۰ روپے اور دو گروپس کی صورت میں ۴۰ روپے فیس ہوگی۔ اُردو فاضل کے پانچویں پرچے کے نصاب میں کتاب "ڈاکٹر زورؔ: شخصیت اور فن" مصنفہ عطیہ رحمانی اور ساتویں پرچے کے نصاب میں کتاب 'ادب کی ماہیئت' منصب اور تاریخ' مصنفہ ڈاکٹر یوسف سرمست کو سابقہ کتابوں کے ساتھ متبادل کتب کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔

اُردو فاضل' اُردو عالم کے فارم کی قیمت ایک روپیہ اور اُردو زباندانی و اُردو دانی کے فارم کی قیمت ۵۰ پیسے مقرر کی گئی ہے۔ قواعد و ضوابط و نصاب نامہ ایک روپیہ ۳۰ پیسے ذریعہ M.O/ پوسٹل آرڈر ٹکٹ بھجوا کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ امتحانات سے متعلقہ تمام امور کے سلسلے میں جوابی ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ منتظم شعبہ امتحانات سے بہ اوقاتِ دفتر "ایوانِ اُردو" پنجہ گٹہ روڈ' حیدرآباد ۴ پر ربط پیدا کیا جاسکتا ہے

(ادارہ)

اُردو دانی

① مرکز ادھونی:

۱۔ کے غوثیہ بیگم' کامیاب

۲۔ ممتاز بیگم کامیاب

۲۔ یم سلطانہ بیگم' کامیاب

۴۔ پی رضوانہ بیگم' کامیاب

[illegible] بانو کامیاب
۶۔ [illegible] بانو ،،
۷۔ [illegible] النساء ،،
۸۔ تسنیم بانو ،،
۹۔ ایس شہناز بیگم ،،
۱۰۔ شہناز بیگم ،،
۱۱۔ محمد ایوب ،،
۱۲۔ واحدہ بانو ،،
۱۳۔ دلشاد بیگم ،،
۱۴۔ فرزانہ بانو ،،
۱۵۔ زرینہ بانو ،،

(۲) مرکز خواجہ نگر (کوداڑی)

۱۷۔ آمنہ بیگم کامیاب
۱۸۔ اختر النساء بیگم ،،
۱۹۔ ریحانہ سلطانہ ،،
۲۰۔ شاہین سلطانہ ،،
۲۱۔ محمد غوث محی الدین ،،
۲۲۔ سلیم النساء ،،
۲۲ عبدالرفیع الدین ،،
۲۴۔ ریحانہ بیگم ،،
۲۵۔ محمد عبدالواحد ،،
۲۶۔ احمد النساء ،،

(۳) مرکز خانہ پور:

۲۷۔ نعیم النساء بیگم کامیاب
۲۸۔ سلطان محمد ،،
۲۹۔ تنویر احمد ،،
۳۰۔ نظیر احمد کامیاب
۳۱۔ سغیر احمد ،،
۳۲۔ [illegible] خاں ،،
۳۳۔ زاہدہ بیگم ،،

(۴) مرکز دہلی:

۳۴۔ ناظرین بیگم کامیاب
۳۵۔ عشرت جہاں ،،
۳۶۔ نور جہاں ،،
۳۷۔ متین خاں ،،

(۵) مرکز سرپور (کاغذ نگر)

۳۹۔ سراج حسین کامیاب
۴۰۔ مجاہد احمد ،،
۴۱۔ سید صابر ،،
۴۲۔ سید خواجہ معین الدین ،،
۴۳۔ محمد کلیم ،،
۴۴۔ رحیم خاں ،،
۴۵۔ فیروز خاں ،،
۴۶۔ شیخ حبیب ،،
۴۷۔ سید فاضل احمد ،،
۴۸۔ شیخ سلطانہ ،،
۵۱۔ تاج بیگم ،،
۵۲۔ ممتاز بیگم ،،
۵۴۔ افضل النساء کوثر ،،

(۶) مرکز کریم نگر:

۵۷۔ محمد منظہر الدین خاں کامیاب
۵۹۔ محمد شریف الدین ،،
۶۱۔ محمد انوار اللہ خاں کامیاب
۶۲۔ محمد عبدالقادر قریشی ،،
۶۳۔ محمد مجیب الدین ،،
۶۴۔ محمد غوث خاں ،،
۶۶۔ محمد زبیر احمد ،،
۶۷۔ محمد شبیر حسین ،،

(۷) مرکز کورٹلہ:

۶۸۔ نکہت فاطمہ کامیاب
۶۹۔ زرینہ ماہ جبین ،،
۷۰۔ تسنیم بیگم ،،
۷۱۔ ساجدہ بیگم ،،
۷۲۔ طاہرہ بیگم ،،
۷۳۔ کوثر زہرا جبیں ،،

(۸) مرکز مدن پلی:

۷۸۔ ایس۔ پروین کامیاب
۸۰۔ ایس ممتاز ،،
۸۱۔ ایس پروین ،،
۸۲۔ ایس نگینہ بانو ،،
۸۳۔ ایس غوثیہ ،،
۸۴۔ نوہیرہ بانو ،،
۸۵۔ ایس ممتاز بیگم ،،
۱۳۸۔ ایس شاہینہ ،،

(۹) مرکز نظام آباد:

۸۶۔ عرفان احمد کامیاب
۸۷۔ سید عمر علی ،،
۸۹۔ نجمہ شاہین ،،

(۸)

(۱۰) مرکز نیلور:

۹۴۔ شیخ غوث باشاہ کامیاب
۹۵۔ سیدہ بشیر النساء بیگم "
۹۶۔ شیخ عبدالعظیم "

(۱۱) مرکز وجے واڑہ:

۹۷۔ حسینہ بیگم کامیاب
۹۸۔ صغورا بی "

(۱۲) وی کوٹہ (آندھرا)

۱۰۰۔ محمد اکبر باشاہ کامیاب
۱۰۱۔ ڈی۔ حسینہ "
۱۰۲۔ محسینہ "

(۱۳) مرکز جے سی اسکول (حیدرآباد)

۱۰۳۔ رئیس کامیاب
۱۰۴۔ محمد جہانگیر "
۱۰۵۔ زاہد "
۱۰۶۔ سید سعید "
۱۰۷۔ ظہیر الدین "
۱۰۸۔ محمد حمید "
۱۰۹۔ محمد افضل "
۱۱۰۔ محمد غوث "
۱۱۱۔ یوسف "
۱۱۲۔ شیخ محبوب "
۱۱۳۔ محمد اقبال "
۱۱۴۔ سید اکبر "

(۱۴) مرکز حیدرآباد (A)

۱۱۵۔ م عبدالسلام [illegible] کامیاب

(۱۴) مرکز حیدرآباد (B)

۱۱۶۔ تہنیت جہاں کامیاب
۱۱۷۔ زینب بیگم "
۱۱۸۔ اسمیٰ تحسین "
۱۱۹۔ سہیل احمد "
۱۲۰۔ کلثوم طہورہ "

(۱۵) مرکز بیدر:

۱۲۵۔ سید علی کریم اللہ حسینی کامیاب
۱۲۶۔ سید خواجہ صدر الدین "
۱۲۸۔ قیصر بیگم "
۱۲۹۔ طاہرہ بیگم "
۱۳۰۔ صبیحہ بیگم "
۱۳۱۔ محمد شفیع الدین "
۱۳۲۔ نور جہاں "
۱۳۳۔ عبدالرزاق "
۱۳۵۔ سعادت جہاں "
۱۳۶۔ شاکرہ فاطمہ "
۱۳۷۔ غزالہ رحمت "

اردو زباندانی

(۱) مرکز ادھونی:

۱۔ قاضی محمد مظہر الدین امتیاز
۲۔ پروین بانو "
۳۔ نذینہ بانو "
۴۔ قمر بانو "
۵۔ سی خواجہ بانو امتیاز
۶۔ جی اعجاز احمد "
۷۔ یم زیلا "

(۲) مرکز خواجہ نگر:

۸۔ آصف علی غریب الوطن امتیاز
۹۔ محمد نور العین "
۱۰۔ محمد افضل افتخاری کامیاب
۱۲۔ محمد منصور علی "
۱۳۔ وصفی [illegible] "
۱۴۔ شمیم النساء بیگم امتیاز
۱۵۔ صابرہ بیگم "
۱۶۔ ام الاسرار بیگم "
۱۷۔ آصفہ بیگم قیصر کامیاب
۱۸۔ کہف الوریٰ بیگم امتیاز

(۳) مرکز کاغذ نگر

۱۹۔ مجاہد خاں کامیاب
۲۰۔ عطاء اللہ خاں امتیاز
۲۱۔ جعفر صادق "
۲۲۔ رحمٰن خاں کامیاب
۲۳۔ محمد سبحان غوری امتیاز
۲۵۔ سید صلاح الدین [illegible] امتیاز
۲۶۔ ارشد احمد کامیاب
۲۷۔ میر شجاعت علی ہاشمی کامیاب
۲۸۔ محمد یوسف الدین امتیاز
۲۹۔ محمد جیلانی کامیاب
۳ " " "

۳۱۔ عابدہ بیگم کامیاب
۳۲۔ نسیم سلطانہ "
۳۳۔ نعیم النساء "
۳۴۔ علیمہ نازنین "
۳۵۔ شاہین بیگم "
۳۷۔ نریس النساء امتیاز
۳۸۔ تسنیم سلطانہ کامیاب
۴۰۔ زیب النساء "

(۴) مرکز عادل آباد

۴۱۔ اشرف بانو امتیاز
۴۲۔ دردانہ بیگم کامیاب
۴۳۔ ریحانہ فردوس امتیاز
۴۴۔ محمد عبدالجلیل کامیاب
۴۶۔ ریحانہ بیگم "
۴۷۔ فسیم سلطانہ "

(۵) مرکز کریم نگر

۴۸۔ محمد عثمان کامیاب
۴۹۔ غلام دستگیر "
۵۰۔ ریاض محمد خاں "
۵۱۔ سید احمد حسینی "
۵۱۔ سید محمد خلیل ہاشمی "

(۶) مرکز کورٹلہ

۵۹۔ بیجہ تسنیم امتیاز
۶۰۔ صفیہ بانو "
۶۱۔ ساجدہ شاہین "
۶۲۔ آسمہ قدسیہ "
۶۳۔ تسنیم بانو امتیاز
۶۴۔ شہناز ثروت "
۶۵۔ عفت زہرا "
۶۶۔ عاقلہ شیریں "
۶۷۔ رفعت بیگم "
۶۸۔ صوفیہ پروین "
۶۹۔ رئیس بیگم "
۷۰۔ آصفہ ترنم کامیاب
۷۱۔ سالہ بیگم امتیاز
۷۲۔ زرینہ پروین "
۷۳۔ نفیس سلطانہ کامیاب
۴۔ زینت فاطمہ امتیاز
۷۵۔ پروین شاہدہ "
۷۶۔ عسکری بیگم "
۷۷۔ صالحہ بیگم "
۷۸۔ تسنیم سلطانہ "
۷۹۔ ادیبہ ذوالفقار "
۸۰۔ مہرالنساء بیگم "

(۷) مرکز نظام آباد

۸۱۔ شکیل احمد امتیاز
۸۲۔ سید چاند "
۸۳۔ احمد حسین "
۸۴۔ چاند خاں "
۸۶۔ عقیل احمد "
۸۷۔ نوشینہ جبیں کامیاب
۸۸۔ وسیمہ تحسین امتیاز

(۸) مرکز نیلور (آندھرا پردیش)

۹۳۔ بی ملکہ بیگم کامیاب
۹۵۔ محمد زاہدہ امتیاز
۹۶۔ شیخ شاہدہ "
۹۷۔ سیدہ ریحانہ بیگم "
۹۸۔ پٹھان لطیف احمد خان کامیاب
۱۰۰۔ سیدہ عابد النساء "
۱۰۱۔ شیخ شاہین سلطانہ امتیاز
۱۰۲۔ شیخ سندر راجہ بی "
۱۰۳۔ شیخ حسن بی "

(۹) مرکز وی کوٹہ

۱۰۶۔ وی محمد الیاس کامیاب
۱۰۸۔ ایم امجد علی "
۱۰۹۔ یس کے صبیحہ بیگم امتیاز
۱۱۰۔ یس وحیدہ کامیاب

(۱۰) مرکز وجے واڑہ

۱۰۵۔ منور سلطانہ کامیاب

(۱۱) مرکز جے سی اسکول (حیدرآباد)

۱۱۱۔ شیخ محبوب کامیاب
۱۱۲۔ محمد بشیر "
۱۱۳۔ اللہ بخش "
۱۱۴۔ محمد اعظم امتیاز

(۱۲) مرکز حیدرآباد (۸)

۱۱۵۔ عبدالسلام امتیاز

(۱۳) مرکز حیدرآباد ([illegible])

۱۱۶۔ صالحہ صدیقہ کامیاب

۱۱۷۔ نفیس بانو کامیاب
۱۱۸۔ شہناز بیگم امتیاز
۱۲۰۔ محمد عبدالستار کامیاب
۱۲۱۔ آمنہ انجم 〃
۱۲۲۔ سعدیہ اختر 〃
۱۲۳۔ محمد یونس 〃
۱۲۴۔ محمد عبدالحق حاتف امتیاز

⑭ مرکز بیدر

۱۲۷۔ عفت النساء کامیاب

اُردو عالم

① مرکز وی کوٹہ

۱۔ یس اے شاہ جہاں درجہ دوم
۲۔ شیخ رفیق احمد 〃 سوم
۳۔ عبدالباری 〃 دوم
۴۔ یس محمد عثمان 〃 〃
۵۔ یس ڈی وزیر پاشاہ 〃 〃
۷۔ پی پی حافظ اللہ 〃 〃
۸۔ یس نازنین 〃 〃
۱۰۔ مبارک بیگم 〃 〃
۱۲۔ ڈی فاطمہ 〃 〃
۱۳۔ حسنہ بیگم 〃 〃

② مرکز تنیالی

۲۸۔ میمونہ بی درجہ سوم
۲۹۔ سیدہ یوسف بانو درجہ دوم

③ مرکز نالگنڈہ

۴۱۔ محمد جاوید حسین درجہ دوم
۴۲۔ سید فصیح اللہ غوری 〃 سوم
۴۸۔ محمد غلام محی الدین درجہ دوم
۴۹۔ رضیہ خانم 〃 سوم
۵۱۔ زینت بیگم افسری 〃 〃

④ مرکز نظام آباد

۵۵۔ عتیق احمد درجہ سوم
۵۶۔ تمیز احمد درجہ دوم
۵۷۔ سید غوث درجہ سوم
۵۸۔ احمد محی الدین 〃 〃
۵۹۔ محمد وحید الدین 〃 〃
۶۰۔ سید واحد علی عابد 〃 〃
۶۱۔ حافظ محمد صدیق 〃 〃
۶۲۔ حافظ محمد عبدالرشید 〃 〃
۶۴۔ محمد عبدالمجیب صدیقی 〃 〃
۶۵۔ محمد عبدالوحد درجہ دوم
۶۶۔ صفیہ بیگم 〃 〃
۶۷۔ سعیدہ بانو 〃 〃
۶۸۔ سائرہ بانو 〃 〃
۶۹۔ انیس فاطمہ 〃 سوم
۷۰۔ محمد لطیف 〃 دوم
۷۱۔ سعادت فاطمہ 〃 سوم
۷۲۔ رضوانہ خاتون 〃 دوم
۷۳۔ ظہور فاطمہ 〃 〃
۷۴۔ فہیم فاطمہ 〃 〃
۷۵۔ صبیحہ سلطانہ 〃 سوم

۲۹۹۔ حفیظ الدین غوری درجہ دوم
۳۰۰۔ خواجہ عظیم الدین صوفی 〃 〃
۳۰۱۔ کنیز فاطمہ 〃 سوم
۳۰۲۔ جیلانی بیگم 〃 〃

⑤ مرکز منچریال

۷۶۔ حفیظ بیگم درجہ سوم
۷۸۔ شمیم سلطانہ 〃 دوم
۸۱۔ رضیہ سلطانہ 〃 سوم
۸۲۔ فاطمہ النساء 〃 〃
۸۳۔ عارفہ خانم 〃 دوم
۸۴۔ شاہدہ بیگم 〃 〃
۸۵۔ ریحانہ بیگم 〃 〃
۸۶۔ عشرت سلطانہ 〃 〃
۸۷۔ نورجہاں 〃 〃
۸۸۔ رضوانہ بیگم 〃 〃
۸۹۔ یس انیس سلطانہ 〃 〃
۹۰۔ عطیہ خانم 〃 〃
۹۱۔ کوثر ناہید 〃 سوم
۹۳۔ سیدہ شکیلہ بانو 〃 دوم
۹۶۔ بشریٰ فاطمہ 〃 〃
۹۷۔ سید مشتاق احمد 〃 〃
۹۸۔ نفیس بانو 〃 سوم

⑥ مرکز مدن پلی

۱۰۰۔ یس کمال اللہ درجہ دوم

⑦ مرکز محبوب نگر

۱۰۷۔ محمد صادق حسین درجہ دوم

۱۰۸۔ محمد عبدالباسط درجہ سوم
۱۱۰۔ محمد عبدالباری " "
۱۱۲۔ ایوب محمد " "
۱۱۴۔ شفیق النساء بیگم " "
۱۱۵۔ عشرت النساء بیگم " "
۱۱۸۔ شمیم ظہیر درجہ دوم

(۸) مرکز عارکاپور

۱۲۲۔ پٹھان بشیر خاں درجہ دوم

(۹) مرکز کورٹلہ

۱۲۸۔ ممتاز فاطمہ درجہ دوم

(۱۰) مرکز کریم نگر

۱۲۹۔ محمد عبدالشفیع درجہ سوم
۱۴۰۔ محمد تاج الدین خاں " "
۱۴۱۔ محمد عبدالغفور ذاکر " دوم
۱۴۲۔ محمد مشتاق احمد " سوم
۱۴۴۔ قمر سلطانہ " "

(۱۱) مرکز عادل آباد

۱۴۸۔ فرزانہ بیگم درجہ سوم
۱۵۰۔ نسرین سلطانہ " "
۱۵۱۔ سعیدہ بانو " "
۱۵۳۔ ذکیہ بیگم " "

(۱۲) مرکز شمس آباد

۱۵۵۔ محمد یوسف الدین درجہ سوم
۱۵۶۔ عبدالمجیب " دوم
۱۵۸۔ محمد عبدالغنی " "
۱۵۹۔ محمد نظیم الدین قادری " "
۱۶۰۔ لطیف جہاں بیگم درجہ دوم
۱۶۱۔ شیخ عبدالمغیر " سوم
۱۶۳۔ ماجدہ روحی " "
۱۶۴۔ رابعہ بیگم " دوم
۱۶۵۔ سراج النساء بیگم " "
۱۶۷۔ ظہور النساء بیگم " "
۱۶۸۔ خیر النساء بیگم درجہ سوم
۱۷۰۔ منور جہاں " دوم
۱۷۱۔ رقیہ عظیم " سوم
۱۷۲۔ سیدہ امتہ السمیع " دوم
۱۷۴۔ نسرین سلطانہ " سوم
۱۷۶۔ عتیق فاطمہ " "
۱۷۷۔ نسرین فاطمہ " "

(۱۳) مرکز سرپور (کاغذ نگر)

۱۷۸۔ محمد ابراہیم درجہ دوم
۱۸۳۔ سوہن لال شرما " "
۱۸۵۔ عزیزہ بانو " سوم
۱۸۶۔ خواجہ بانو " "
۱۸۷۔ ثاقبہ نسرین " "
۱۸۸۔ فاطمہ سلطانہ " "
۱۹۰۔ سرور سلطانہ " "
۱۹۱۔ شاہین بانو " "
۱۹۲۔ رخسانہ بیگم " "
۱۹۳۔ صابر النساء بیگم " "

(۱۴) مرکز دانی

۱۹۵۔ لیاقت علی درجہ دوم
۱۹۸۔ [illegible] درجہ دوم
۲۰۰۔ محمد منیر الحسن " "
۲۰۱۔ محمد صابر " "
۲۰۲۔ محمد شہاب الدین " سوم

(۱۵) مرکز خانہ پور

۲۰۶۔ افضل حسین درجہ سوم
۲۰۸۔ محمد عبدالخالق " "

(۱۶) مرکز بودھن

۲۱۰۔ محمد حسین درجہ دوم
۲۱۱۔ محمد یوسف ابراہیم " "
۲۱۲۔ غلام جیلانی " سوم
۲۱۳۔ محمد عبدالجاوید " دوم
۲۱۴۔ [illegible] " "
۲۱۵۔ فیض النساء بیگم " "
۲۱۶۔ بلقیس سلطانہ " "
۲۱۷۔ قمر سلطانہ " "
۲۱۸۔ مہ جبین " "
۲۲۰۔ معراج بیگم " "
۲۲۱۔ حلیمہ بیگم " "

(۱۷) مرکز [illegible]

۲۲۲۔ معز النساء بیگم درجہ دوم
۲۲۳۔ سید [illegible] الدین " سوم
۲۲۴۔ [illegible] " "
۲۲۵۔ محمد شفیع الدین صدیقی " دوم
۲۲۶۔ [illegible] سلطانہ صدیقی " "
۲۲۷۔ [illegible] النساء بیگم " "

۲۲۸۔ آمنہ بیگم [illegible]
۲۳۰۔ فاخرہ سلطانہ [illegible]
۲۳۲۔ حبیب النساء بیگم [illegible]

(۱۸) مرکز حیدرآباد (A)

۲۳۱۔ محمد عبدالعلیم درجہ دوم
۲۳۵۔ تراب الحق "
۲۳۶۔ محمد عبدالنعیم "
۲۳۹۔ محمد عارف "
۲۴۰۔ قاضی محمد مظہر الدین [illegible] "
۲۴۲۔ احمد حسین [illegible] سوم
۲۴۴۔ مظہر حسین [illegible] دوم
۲۴۵۔ سجاد محمد "
۲۴۶۔ فرید النساء "
۲۴۹۔ شیخ [illegible] سوم
۲۵۲۔ امۃ [illegible]
۲۵۵۔ قمر سلطانہ "
۲۵۶۔ قمر بیگم دوم
۲۵۷۔ رضیہ [illegible] "
۲۵۸۔ سید ابراہیم علی حسینی "
۲۵۹۔ محمد عبدالحق زبیر " سوم
۲۶۱۔ محمد حسین "
۲۶۸۔ سید قیصر صلاح الدین " دوم

(۱۹) مرکز حیدرآباد (B) ۵۱۱

۲۶۳۔ [illegible]
۲۶۴۔ [illegible]
۲۶۵۔ عاصمہ [illegible] دوم

۲۶۶۔ دُردانہ بیگم دوم
۲۶۸۔ [illegible] فاطمہ سوم
۲۶۹۔ ناہید فرزانہ [illegible]
۲۷۱۔ انور بیگم دوم
۲۷۲۔ آسیہ فاطمہ "
۲۷۳۔ سعدیہ حنا سوم
۲۷۵۔ فرحت سلطانہ "
۲۷۶۔ ریاض سلطانہ دوم
۲۸۰۔ مسرت سلطانہ "
۲۸۱۔ [illegible] فاطمہ "
۲۸۲۔ معین النساء بیگم "
۲۸۴۔ عشرت فاطمہ [illegible]
۲۸۶۔ نجمۃ [illegible]
۲۹۰۔ اشرف النساء بیگم [illegible]

(۲۰) مرکز [illegible] (کرناٹک)

۲۹۵۔ سیدہ [illegible] سوم
۳۰۱۔ امۃ اللہ بیگم دوم

اُردو فاضل

(۱) مرکز آرہ مور [illegible]

۱۔ یوسف علی خان درجہ دوم
۲۔ صدیقہ بیگم " سوم
۳۔ سلیمہ بیگم [illegible]
۴۔ صغیرہ سلطانہ [illegible]
۵۔ ذاکرہ بیگم دوم
۶۔ اختر النساء بیگم " دوم

۷۔ تنویر سلطانہ [illegible]
۸۔ صابرہ بیگم [illegible]
۹۔ نفیسہ شاہین [illegible]
۱۰۔ نور جہاں بیگم [illegible]
۱۱۔ عظمت ریحانہ [illegible]
۱۲۔ سائرہ بانو [illegible]
۱۳۔ اکبر سلطانہ دوم
۱۴۔ آسیہ نوشین سوم
۱۵۔ صالحہ نسرین دوم
۱۶۔ فہیم النساء بیگم [illegible]
۱۷۔ قیصر جبین سوم
۱۸۔ زہرہ تبسم دوم
۱۹۔ آمنہ شاہین " سوم
۲۰۔ نکہت سلطانہ "
۲۱۔ میمونہ بیگم [illegible]
۲۲۔ عارفہ [illegible]
۲۳۔ منیر النساء بیگم "
۲۴۔ رضیہ سلطانہ [illegible]
۲۵۔ عاقلہ بیگم [illegible]
۲۶۔ رضوانہ بیگم "
۲۷۔ محمد حبیب [illegible] خان [illegible]

(۲) مرکز [illegible]

۲۸۔ ابوالحسن [illegible]
۲۹۔ امتیاز احمد [illegible]
۲۹۔ معین الدین [illegible]
۳۰۔ محمد مظہر [illegible]

۳۱۔ اختر اللہ درجہ سوم
۳۲۔ محمد فہیم الدین 〃 دوم
۳۳۔ شیخ اکبر حسین 〃 سوم
۳۴۔ اقبال احمد 〃 دوم
۳۵۔ محمد موسیٰ 〃 〃
۳۶۔ احمد عبدالفہیم 〃 〃
۳۷۔ محمد ثناء اللہ حسین 〃 〃
۳۸۔ محمد طیب 〃 〃
۳۹۔ ریحانہ بیگم 〃 〃

③ مرکز بار بھنی (مہاراشٹرا)

۴۰۔ عبدالقادر درجہ دوم
۴۱۔ عبدالفہیم 〃 سوم
۴۳۔ عبدالرحیم 〃 دوم
۴۴۔ سید اصغر 〃 سوم
۴۵۔ وحید الدین 〃 〃
۴۶۔ سید افغان حسینی 〃 〃
۴۷۔ محمد اختر خاں 〃 〃
۵۰۔ محمد سلیم 〃 〃
۵۱۔ سید ولی الدین 〃 〃
۵۲۔ محمد عبدالمعز صدیقی 〃 〃
۵۳۔ تسنیم سلطانہ 〃 سوم
۵۴۔ نزہت فاطمہ 〃 دوم
۵۵۔ منہاج اختر 〃 سوم
۵۶۔ تنویر انجم 〃 دوم
۵۷۔ بدرین بیگم 〃 سوم
۶۰۔ علیم النساء بیگم 〃 〃

④ مرکز خانہ پور

۶۱۔ شکیل انجم درجہ دوم
۶۲۔ عبدالجاوید درجہ سوم
۶۳۔ محمد عبدالخلیل 〃 〃
۶۴۔ نجیب اللہ خاں 〃 〃
۶۶۔ شیخ مبین 〃 〃
۶۷۔ شیخ علی 〃 〃
۶۸۔ منظور محمد 〃 〃

⑤ مرکز دابلی

۷۵۔ محمد عبداللہ رسانی درجہ اول
۷۲۔ عادل اسیر 〃 دوم
۷۶۔ سید محمد طلحہ 〃 سوم

⑥ مرکز سرپاور (کاغذ نگر)

۷۷۔ قاضی مقبول علی خاں حکیم درجہ سوم
۷۸۔ محمد عبدالسمیع 〃 〃
۷۹۔ محمد خواجہ فریدالدین 〃 〃
۸۰۔ شیخ سرور 〃 دوم
۸۱۔ سید نذیر احمد 〃 〃
۸۲۔ مخدوم علی 〃 سوم
۸۳۔ عظیم الدین 〃 〃
۸۴۔ عبدالرحمٰن 〃 〃
۸۵۔ محمد عطاء الرحمٰن 〃 〃
۸۶۔ مظہر النساء 〃 دوم
۸۷۔ نفیس سلوت بیگم 〃 〃
۸۸۔ صدیقہ بیگم 〃 سوم
۸۹۔ نفیس بیگم 〃 〃

⑦ مرکز شمس آباد

۹۳۔ سید محبوب احمد درجہ سوم
۹۴۔ محمد احمد علی 〃 〃
۹۶۔ حافظ خواجہ محی الدین 〃 دوم
۹۷۔ سید فاروق 〃 سوم
۹۸۔ عبدالعزیز 〃 دوم
۹۹۔ حافظ محمد فیض الدین 〃 〃
۱۰۰۔ امۃ الحبیب 〃 سوم
۱۰۱۔ صالحہ بیگم درجہ سوم
۱۰۳۔ زرافشاں منور 〃 〃
۱۰۴۔ طلعت سلطانہ 〃 دوم
۱۰۵۔ غازی النوری بیگم 〃 〃
۱۰۶۔ عزیز النساء 〃 〃
۱۰۷۔ ساجدہ سلطانہ 〃 سوم

⑧ مرکز عادل آباد

۱۰۸۔ محمد عبدالرحیم درجہ سوم
۱۰۹۔ نجیب النساء بیگم 〃 〃
۱۱۰۔ خدیجہ بیگم 〃 دوم
۱۱۱۔ خورشید بیگم 〃 سوم
۱۱۲۔ انیس جہاں 〃 〃
۱۱۳۔ فاطمہ النساء بیگم 〃 دوم
۱۱۴۔ انجم آرا 〃 سوم
۱۱۵۔ اختر جہاں آرا 〃 〃

⑨ مرکز کریم نگر

۱۱۷۔ وقار النساء بیگم درجہ سوم
۱۱۸۔ وسیم بتول 〃 دوم

۱۲۰۔ طاہرہ بانو — درجہ دوم

(۱۰) مرکز کورٹلہ

۱۲۱۔ بدرالدین — کامیاب گروپ I
۱۲۲۔ عظمت النساء بیگم — " "
۱۲۳۔ عالم سلطانہ — " "
۱۲۴۔ فرزانہ بیگم — کامیاب گروپ II
۱۲۵۔ کنیز الاحد — کامیاب گروپ I
۱۲۶۔ ساجدہ پروین — " "
۱۲۷۔ شمیم سلطانہ — " "

(۱۱) مرکز مارکاپور

۱۳۰۔ پٹھان امان اللہ خاں — درجہ سوم

(۱۲) مرکز محبوب نگر

۱۴۴۔ خواجہ مصباح الدین — درجہ سوم
۱۴۵۔ محمد عبدالرفیق — " "
۱۴۶۔ محمد عبدالساجد خاں — " دوم
۱۴۷۔ محمد اقبال احمد — " سوم
۱۴۸۔ محمد جہانگیر خاں — " "
۱۴۹۔ ابوسعید حبیب الرحمٰن — " "
۱۵۰۔ محمد عمر — " "
۱۵۱۔ محمد عبدالمجید نیاز — " دوم
۱۵۲۔ محمد ہاشم — درجہ دوم
۱۵۳۔ محمد جہانگیر علی — " "
۱۵۵۔ محمد عبدالحمید — " "
۱۵۶۔ محمد عبدالوحید — " "
۱۵۷۔ خواجہ مسیح الدین — " سوم
۱۵۸۔ محمد حسن الرحمٰن — " دوم
۱۵۹۔ اختر الزماں خان — درجہ دوم
۱۶۰۔ سید خواجہ اسماعیل — " "
۱۶۱۔ خواجہ سلطان الدین — " "
۱۶۲۔ سید ارشاد احمد — " "
۱۶۳۔ محمد سلیم الدین — " "
۱۶۴۔ سید جمال الدین — " سوم
۱۶۵۔ حافظ محمد عبدالصمد — " "
۱۶۶۔ محمد طاہر — " "
۱۶۷۔ منظور حسین — " "
۱۶۸۔ محمد عطاء اللہ حسینی — " "
۱۶۹۔ محمد حنیف — " "
۱۷۲۔ محمد عبدالرحمٰن شریف — کامیاب گروپ I
۱۷۳۔ محمد الیاس — درجہ دوم
۱۷۴۔ غلام محمد — " "
۱۷۵۔ سید اشفاق احمد خطیب — " "
۱۷۷۔ اے ایس محمد اسماعیل — کامیاب گروپ I
۱۷۸۔ شرف الدین — درجہ دوم
۱۷۹۔ حسن الدین — " "
۱۸۰۔ حسینہ بیگم — " سوم
۱۸۱۔ ہما فردوس — " "
۱۸۲۔ نادرہ سلطانہ — " دوم
۱۸۳۔ سارہ بیگم — " "
۱۸۴۔ وحیدہ صغریٰ — " "
۱۸۵۔ رابعہ نسرین — " سوم
۱۸۶۔ زاہدہ بیگم — " دوم
۱۸۷۔ سیدہ خدیجہ یاسمین — " "
۱۸۸۔ پروین سلطانہ — درجہ دوم
۱۸۹۔ شہناز بیگم — " سوم
۱۹۰۔ سعادیہ سلطانہ — " دوم
۱۹۱۔ خواجہ احمدی بیگم — " "
۱۹۲۔ سعیدہ رضیہ — " سوم
۱۹۳۔ فرزانہ بیگم — " "
۱۹۵۔ سعادت جہاں بیگم — " دوم
۱۹۶۔ اقبال فاطمہ بیگم — " سوم
۱۹۷۔ سیدہ تسنیم جہاں بیگم — " "
۱۹۹۔ شکیلہ سلطانہ — " "
۲۰۰۔ طلعت فاطمہ — " "
۲۰۱۔ خورشید بیگم — " "
۲۰۲۔ معراج سلطانہ — " "
۲۰۳۔ آصفہ پروین — " "
۲۰۴۔ شمیم بیگم — " "
۲۰۷۔ ذکیہ سلطانہ — کامیاب گروپ I
۲۰۸۔ قدیر احمد النساء — " "
۲۰۹۔ پروین سلطانہ — " "
۲۱۰۔ محمد حفیظ الدین صدیقی — " "
۲۱۱۔ عبدالعلیم — " "
۲۱۲۔ محمد عبدالعزیز — " "

(۱۳) مرکز مدن پلی

۲۱۴۔ محمودہ بیگم — کامیاب گروپ II

(۱۴) مرکز نظام آباد

۲۱۷۔ محمد عبدالسلام — درجہ سوم
۲۱۸۔ سید محمد نوراللہ — کامیاب گروپ II

۲۱۔ انیس بیگم ۔ درجہ سوم
۲۔ خدیجہ بیگم " "
۲۱۔ صادقہ بیگم " "
۲۲۔ وحیدہ بیگم " "
۲۲۔ خورجہاں آرا بیگم " سوم
۲۲۔ عالیہ فردوس " "
۲۲۔ نعیم النساء بیگم " "
۲۲۔ سیدہ انیس سلطانہ " "
۲۲۔ قمر النساء بیگم کامیاب گروپ I
۲۲۔ محمد مرزا درجہ سوم
۲۷۱۔ محمد اظہر الدین احمد کامیاب گروپ II
۲۷۳۔ ناظر النساء بیگم درجہ سوم
۲۷۱۔ سید لیاقت علی " "
۲۷۵۔ نصیر احمد علی " "
۲۷۶۔ انوری فرزانہ بیگم " "
۲۷۷۔ فرخندہ بیگم " "

(۱۵) مرکز نلگنڈہ

۲۲۹۔ محمد عبدالبصیر درجہ سوم
۱۳۱۔ محمد عبدالمتین " "
۲۳۳۔ محمد عبدالغفار " دوم
۲۳۴۔ محمد عارف " سوم
۲۳۵۔ غلام مرتضیٰ " دوم
۲۴۰۔ مرزا لطف اللہ بیگ " "
۱۴۱۔ عزیزہ فاطمہ " "
۲۴۴۔ امیر اللہ قمری " دوم
۲۴۵۔ وحید النساء " سوم

۲۴۷۔ قدیر النساء بیگم درجہ سوم
۲۴۸۔ بمانی اعجم کامیاب گروپ I
۲۵۰۔ صفیہ خانم درجہ سوم
۲۵۱۔ سعیدہ فاطمہ " دوم
۲۵۲۔ امۃ اللہ فاطمہ " سوم
۲۷۰۔ محمد شہاب الدین صاحب " دوم

(۱۵) مرکز سندی پیٹ

۲۵۶۔ سید بشیر احمد درجہ سوم
۲۵۷۔ زین العابدین محمد ابراہیم " "
۲۵۸۔ سید عبدالرشید " "
۲۶۱۔ دفعدار عبدالکریم " "
۲۶۲۔ محمد حفیظ الرحمٰن " "
۲۶۸۔ سید مہدی حسین " "
۲۷۰۔ کے محمد ابراہیم حسینی " "
۲۷۲۔ بی محمد عثمان صاحب " "
۲۷۳۔ یس حبیب اللہ " "
۲۷۶۔ رضیہ بیگم " "
۲۷۷۔ یس مسرت بانو " "
۲۷۸۔ آمنہ بی عرف شاہین بانو " "
۲۷۹۔ سیدہ غزالہ نسرین " "
۲۸۱۔ ین دلشاد بیگم " "
۲۸۲۔ یم الطاف حسین " "
۲۸۳۔ عابدہ بیگم " دوم

(۱۶) مرکز نیلور

۲۸۴۔ سیدہ امۃ الخبیر درجہ سوم
۲۸۵۔ شیخ احمد باشاہ مدنی " "

۲۸۷۔ عبدالقدیر
۲۸۸۔ مظہر النساء
۲۸۹۔ شیخ شمیم " دوم
۲۹۰۔ شیخ شکیلہ بیگم " سوم
۲۹۱۔ سید حمزہ حسینی " دوم
۲۹۳۔ محمد عبدالجلیل " سوم
۲۹۴۔ محمد نقشبند باشاہ " دوم
۲۹۵۔ محمد عبدالباسط " سوم
۲۹۶۔ شیخ عبدالرؤف " "
۲۹۷۔ محمد حلیمہ سعدیہ " دوم
۲۹۹۔ محمد بشیر احمد " سوم
۳۰۰۔ محمد مختار احمد " دوم
۳۰۱۔ سید عثمان " سوم
۳۰۲۔ سید نذیر باشاہ " دوم
۳۰۳۔ شیخ فرحت سلطانہ " "
۳۰۴۔ شیخ صفیہ بیگم " "

(۱۷) مرکز وجے واڑہ

۳۰۸۔ عبدالرحیم درجہ سوم
۳۱۰۔ فیض الرحمٰن " "
۳۱۱۔ محمد ذاکر " دوم
۳۱۲۔ عبدالرؤف " سوم
۳۱۴۔ نسرین سلطانہ " "
۳۱۶۔ عصمت النساء بیگم " "
۳۱۷۔ اشتری بیگم " "
۳۱۹۔ صفیہ بیگم " "
۳۲۱۔ آسیہ بیگم " "

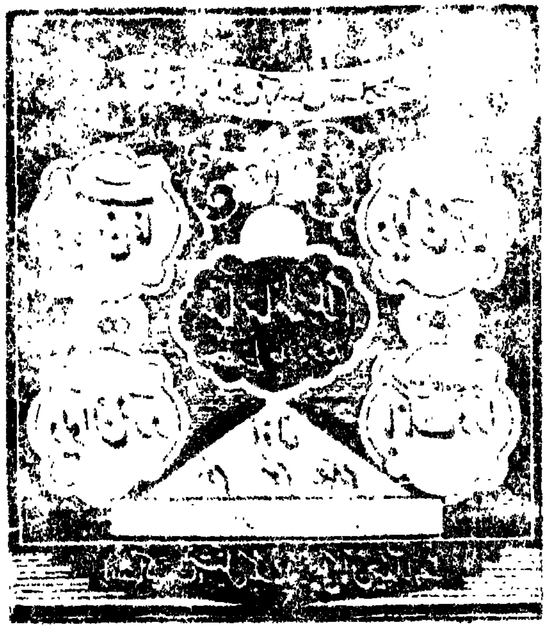
(باقی صفحہ دیکھئے)

R. N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

Y 1984

The "SABRAS" Urdu Monthly

"Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)



Press ... arkaman, Hyd

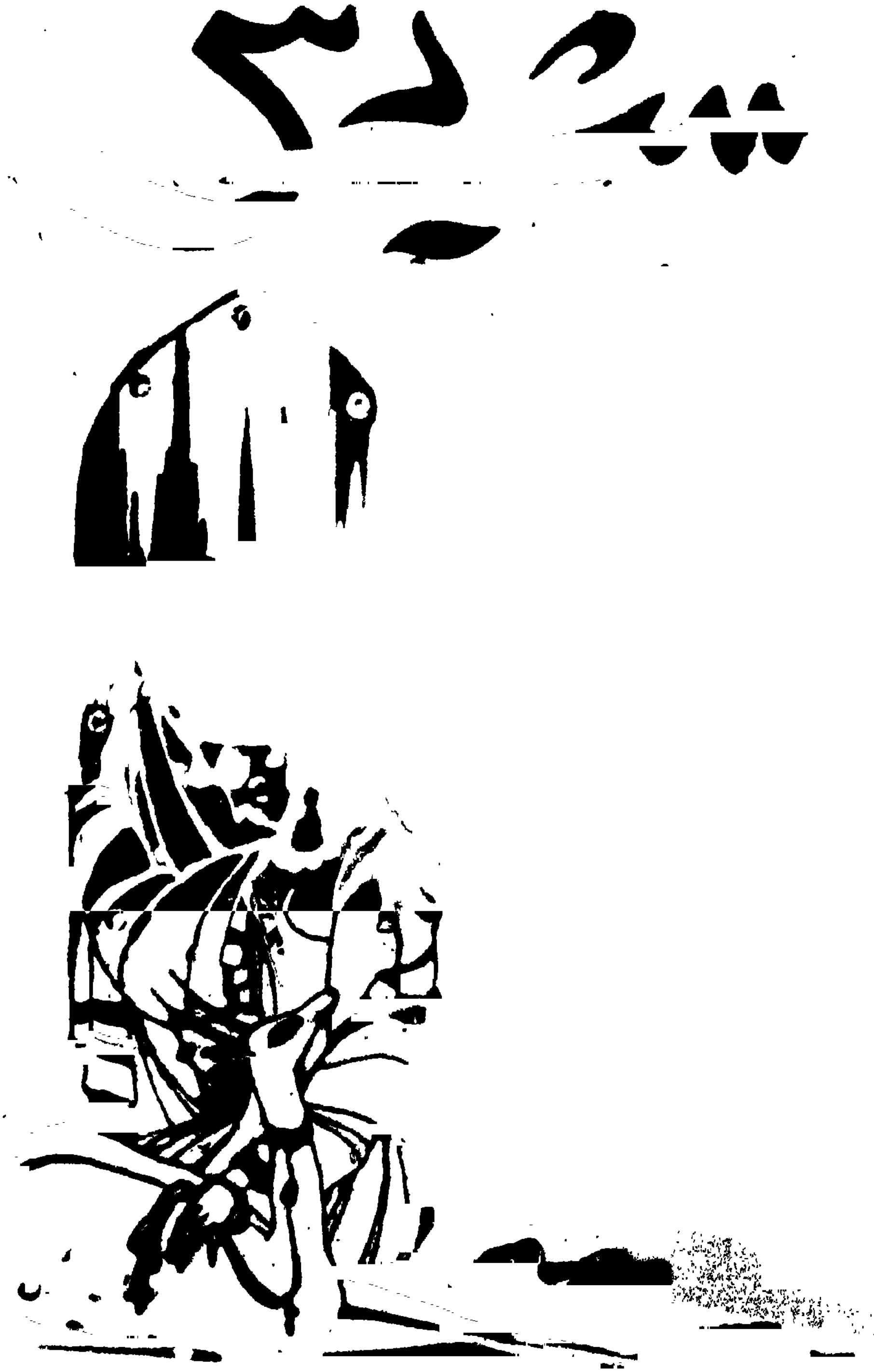
RUARY 1984

R. N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مارچ ۱۹۸۴ء

جلد ۴۴، شمارہ ۳ ؛ سن اجرا ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مجلس مشاورت:

صدر: محامد علی عباسی

نائب صدر: ہاشم علی اختر

معتمد: ڈاکٹر مغنی تبسم

ارکان

پروفیسر سید علی اکبر

عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ

محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ

پروفیسر سراج الدین

محمد منظور احمد

مدیر اعزازی: مغنی تبسم

معاون مدیر: وقار خلیل

شریک مدیر: محمد منظور احمد

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرسالانہ: ۲۰ روپے، کتب خانوں سے ۲۵ روپے

بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے

بیرونی ممالک سے،

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برازیل	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۳½ پونڈ

سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد - ۲ (اے پی) سے شائع کیا۔

کتابت: رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴

ترتیب

اپنی بات

یہ تو ہم سب سنتے آئے ہیں کہ شکوہ یا شکایت کے معنی شکست کے ہیں یعنی اگر ہم حالات یا زمانہ کا شکوہ کرتے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ہم جی چھوڑ بیٹھے اور ہم نے اپنی شکست یا پست ہمتی کا اعتراف کر لیا حالانکہ ہجوم یاس میں بھی عزم جواں، مصمم ارادہ اور حسن تدبیر کے ساتھ تقدیر بدل سکتی ہے بے شک خدا ان افراد اور اقوام کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرنا جانتی ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے صرف آنسو بہا سکتے ہیں، اپنی اور اپنی قوم کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

زمانہ کا اشارہ اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اردو سمجھنے، بولنے اور لکھنے پڑھنے والے کمر ہمت باندھیں، میدان عمل میں قدم رکھیں اور اپنی زبان، تہذیب، قوم، اپنے ملک اور ساری انسانیت کی خدمت کے جذبے کے تحت والہانہ انداز میں آگے بڑھیں۔ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی ہمیشہ امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آتی ہے۔ یہ قدرت کا انتظام ہے۔ اسی ہلکی سی کرن نے بسا اوقات مایوس انسانوں کی ہمت بندھائی ہے اور انھیں جد و جہد اور تگ و دو پر اکسایا اور ابھارا ہے زندگی کا قافلہ اسی امید افزا کرن کے سہارے آگے بڑھتا رہا ہے تہذیب و تمدن کے سرمایہ میں اسی طرح گراں قدر اضافہ ہوتا آیا ہے حضرت امجد حیدرآبادی کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے اور قول سے عمل کیلئے مہمیز کا کام کر رہی ہے ؎ کامیابی کچھ اور چیز نہیں کام کرنا ہی کامیابی ہے ؎ "سب رس" کے قارئین سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بھی فضا میں اس گونجتی ہوئی آواز پر کان دھریں جو صاف دعوت عمل دے رہی ہے اگر ہم واقعی خلوص دل کے ساتھ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے حلقہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی مسلسل اور ان تھک کوشش کریں اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اردو کی ابتدائی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے پروگرام کو آگے بڑھائیں تو ہمارے ملک میں اردو کا مستقبل یقیناً روشن و تابناک ہوگا۔ آپ "آج" کی فکر کیجئے، مستقبل خود بخود شاندار ہوگا۔ جو "آج" کی فکر نہیں کرتے وہ آئندہ کشمکش حیات میں اپنا حصہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ بقول اقبال ؎ وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں "امروز" نہیں ہے۔

— محمد منظور احمد

محمد منظور احمد

جناب محمد اکبر الدین صدیقی سے انٹرویو

میں نے جناب محمد اکبر الدین صدیقی سابق ریڈر، شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ سے حال ہی میں ایک انٹرویو لیا تھا۔ میں شکر گزار ہوں کہ جناب صدیقی نے میرے ہر سوال کا جواب نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ دیا اور اس طرح ۲½ گھنٹوں پر مشتمل اس انٹرویو سے جناب صدیقی کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں مجھے اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ انٹرویو کا وقت بھی صدیقی صاحب کی عمر اور عام صحت کا لحاظ کرتے تکلیف دہ تھا۔ یعنی موسم گرما میں ۱۱ بجے صبح۔ انٹرویو کے ختم ہوتے ہوتے ۱½ بج چکا تھا میں اس سلسلے میں صدیقی صاحب کے ضبط و برداشت کی داد دیئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

"گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) کی آٹھویں جماعت میں میری طالب علمی کے دوران" صدیقی صاحب میرے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ انٹرویو کے آغاز میں انہوں نے کہا کہ وہ ۵ر نومبر ۱۹۱۲ء کو بھینسہ ضلع عادل آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے وقت بھینسہ ضلع ناندیڑ میں شامل تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء سے ضلع عادل آباد کا ایک تعلقہ ہے۔ ضلع عادل آباد آندھرا پردیش میں ہے، اور اُس وقت نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی مملکت حیدرآباد میں شامل تھا۔

آپ کے والد جناب محمد اکرام الدین صاحب بھینسہ میں ناظر عدالت تھے۔ ان کا تبادلہ ناندیڑ پر عمل میں آیا اس کے بعد قندھار میں سررشتہ دار عدالت ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کی تعیناتی پھر ایک بار بھینسہ پر عمل میں آئی۔

میرے ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ آپ کے والد اُردو اور فارسی میں نعت اور نظموں کے علاوہ کبھی کبھی عربی میں بھی نعت لکھا کرتے تھے۔ اپنی ہائی اسکول کی تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب صدیقی نے کہا کہ تعلیم کی ابتداء ناندیڑ سے ہوئی۔ ناندیڑ سے آپ کے والد صاحب کے قندھار

بہتبادلہ کے بعد آپ قندھار کے اسکول کی جماعت سوم میں شریک ہوئے۔ آپ نے بتایا کہ ۱۹۲۷ء میں مڈل کا سالانہ امتحان' بورڈ کا سرکاری امتحان ہوا کرتا تھا۔ کامیابی پر سند بھی دی جاتی تھی۔ بورڈ کی طرف سے مڈل کے امتحان میں کامیابی پر دی ہوئی یہ سند میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ مڈل کا یہ امتحان جس میں' میں نے شرکت کی تھی' بورڈ کی طرف سے لیا جانے والا آخری سرکاری امتحان تھا۔ اس کے بعد مڈل کے سرکاری امتحان کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ آپ نے کہا کہ انگریزی کی خاطر میں حیدرآباد میں مدرسہ وسطانیہ' شاہ گنج میں شریک ہوا۔ حیدرآباد میں اس وقت میرا قیام ڈاکٹر زورؔ کے دولت کدہ پر رہا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر زورؔ ایم اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن ان کی مشہور کتاب "روحِ تنقید" شائع ہوچکی تھی۔ چنانچہ "روحِ تنقید" کا ایک نسخہ ڈاکٹر زورؔ نے میرے والد صاحب کو تحفتہً دیا تھا۔

مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج میں شرکت کے بعد میں ملیریا کے مرض میں مبتلا ہوا۔ علالت' یہ سلسلہ چلا تو چار مہینے بعد ضلع بیڑ چلا گیا اور میں نے اس ضلع کے ہائی اسکول میں پری میٹرک میں داخلہ لیا۔ یہاں میرے تایا زاد بھائی محمد افضل الدین [illegible] تھے جو نواب علی یاور جنگ کے کلاس میٹ اور ہاسٹل میں ان کے روم میٹ بھی تھے۔ وہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے گریجویٹ تھے اور سیشن جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ تایا زاد بھائی جناب محمد افضل الدین فاروقی کی دلچسپی اور ہمدردی کی بدولت میں اپنی تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھ سکا۔ ۱۹۲۰ء میں میرے والد جناب محمد اکرام الدین کا بیڑ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بھی بیڑ ہی میں عمل میں آئی۔ انتقال کے وقت میرے والد صاحب سررشتہ دار عدالت اور برسرِ خدمت تھے۔ (۵۲) سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ نے کہا کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں حیدرآباد آیا اور گورنمنٹ سٹی کالج کی جماعت پری میٹرک یعنی' نویں جماعت میں ۱۹۲۱ء میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ سٹی کالج ہی سے میں نے عثمانیہ میٹریکولیشن کا امتحان بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ گورنمنٹ سٹی کالج سے ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں بی اے بدرجہ سوم کامیاب کیا اور سٹی کالج میں ٹیچر کی حیثیت سے میرا تقرر عمل میں آیا۔ صغیر سے چھٹی جماعت تک مختلف کلاسوں میں اردو اور فارسی پڑھانے کا کام میرے تفویض کیا گیا۔ ایم اے (اردو) سے خانگی امیدوار کی حیثیت سے میں نے ۱۹۴۲ء میں کامیاب کیا۔ ٹیچر کی حیثیت سے (۲) سال ملازمت کے بعد' میں نے ایم اے کا یہ امتحان دیا تھا۔ ٹیچر ہونے سے پہلے سررشتہ گرداوری :

صرف ایک بینہ اہلکار (کلرک) کی حیثیت سے کارگذار رہا۔

میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں اپنے مضامین کے بارے میں آپ نے کہا کہ میٹرک میں آپ کا اختیاری مضمون فارسی تھا۔ انٹرمیڈیٹ میں اردو، فارسی اور معاشیات اور بی اے میں انگریزی اور دینیات لازمی مضامین اور اردو فارسی اختیاری مضامین تھے۔

میٹرک، انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے اساتذہ کے بارے میں استفسار پر آپ نے کہا کہ عثمانیہ میٹرک کے اساتذہ میں فارسی کے لئے جناب عمر فاروق، اردو کے لئے جناب سید محمد، انگریزی کے لئے محمد علی صاحب اور یوسف علی صاحب تھے۔

مولوی غلام محی الدین عرف چھوٹے مولوی صاحب ہم طالب علموں کو دینیات پڑھایا کرتے تھے۔ تاریخ و جغرافیہ کے لئے سید حسین زیدی صاحب، ریاضی کے لئے رتن لال صاحب، طبیعیات کے لئے سدرشن راج صاحب اور کیمسٹری کے لئے خلیل الرحمٰن صاحب مامور تھے۔

انٹرمیڈیٹ کے میرے اساتذہ میں، اردو کے لئے جناب سید محمد صاحب اور جناب ابوظفر عبدالواحد، فارسی کے لئے، جناب علی رضا شیرازی، انگریزی کے لئے جناب عطاء الرحمٰن، اور مسٹر درّاسوامی تھے جو آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ میں نے انٹر میں معاشیات خواجہ منیرالدین اور جناب میر محمود علی سے پڑھی تھی۔ میر محمود علی صاحب، صنعتی نمائش کمیٹی (نمائش مصنوعات ملکی) کے پہلے صدر تھے۔ یہ صنعتی نمائش، سب سے پہلی بار باغ عام (پبلک گارڈن) میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کے انعقاد اور انتظام کے سلسلے میں، میں نے بھی ایک والنٹیر کارکن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اُس وقت میں، سٹی ہائی اسکول میں ٹیچر تھا۔ انٹرمیڈیٹ میں ہمیں دینیات جناب سید نبی صاحب نے پڑھائی تھی۔ نواب لطیف یار جنگ سابق ناظم آبکاری کے صاحبزادے جناب عبدالقیوم بھی دینیات پڑھاتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں بی اے کے اساتذہ میں انگریزی کے لئے جناب پروفیسر حسین علی خاں اور دُرّاسوامی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، پروفیسر ویرا بعدر وڈو، پروفیسر اسپیٹ اور پروفیسر ہارڈنگ تھے۔

اردو کے اساتذہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صدر شعبۂ اردو تھے اور تنقید پڑھاتے تھے۔ اردو کے دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروری اور ڈاکٹر سید سجاد تھے۔ پروفیسر سید سجاد موٹر کے ایک حادثہ کے بعد رخصت بیماری پر تشریف لے گئے تو جناب شیخ چاند کا تقرر منصرم کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ شیخ چاند صاحب نثر پڑھاتے تھے۔ وہ یہاں سات مہینے رہے

اور پھر اورنگ آباد چلے گئے۔ بی اے میں شیخ عبدالمجید خاں شروانی نے فارسی پڑھائی تھی، اس زمانے میں ڈاکٹر نظام الدین صاحب صدر شعبہ فارسی تھے۔ ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب اور لطیف احمد فاروقی صاحب بھی اساتذہ شعبہ فارسی میں شامل تھے۔

شعبہ عربی میں مولوی سید ابراہیم، جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے اور علامۃ الدہر تھے صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے افسانوی طرز کے ہنگامہ پرور اور سنسنی خیز یادگار مضمون " آسمانِ شہرت پر پروانہ " میں مولوی سید ابراہیم ان اساتذہ جامعہ میں شامل تھے جنہیں اٹھاکر آسمانِ شہرت پر لے جایا گیا تھا۔

آپ نے بتایا کہ شعبہ ہندی میں پنڈت ونشی دھر ودیا لنکار لکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اردو میں مضامین نظم و نثر لکھنے کے مشغلہ کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے کہا کہ میٹرک میں زیر تعلیم تھا کہ افسانے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میرے لکھے ہوئے افسانے بمبئی کے ہفتہ وار اخباروں " مصور " (ہفتہ وار) " الاعظم " (ہفتہ وار) کے علاوہ بعض رسالوں میں بھی شائع ہوئے تھے۔ میں اپنی میٹرک کی طالب علمی کے زمانے میں سٹی کالج کے رسالہ " المُوسیٰ " کا ایڈیٹر رہا۔ طالب علمی کے اس دور میں مضامین لکھنے کے علاوہ میرا رجحان شعر گوئی کی طرف بھی تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میٹرک میں مجھے اردو اور تاریخ و جغرافیہ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔

آپ نے مزید کہا کہ تنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز بی اے کی طالب علمی کے دور سے ہوا۔ میرے چند تنقیدی مضامین لاہور کے رسالہ " شاہکار " میں شائع ہوئے تھے۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر جناب تاجور نجیب آبادی تھے۔

بی اے کے قابلِ ذکر ساتھیوں کے بارے میں آپ نے کہا کہ مرزا محمد بیگ کے صاحبزادے مرزا باسط بیگ اور مرزا فاروق بیگ میرے بی اے کے ساتھیوں میں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں آگے چل کر ایچ سی ایس ہوئے۔

میرے ایک اور ہم جماعت نواب داؤد جنگ کے داماد نواب علی حسین خان جاگیر دار تھے یہ فرصت کا زیادہ وقت نظام کلب میں گزارتے تھے۔ پروفیسر محمد حسین (انگریزی) محمد بن عمر (انگریزی اور اردو)، محمد عمر مہاجر (اردو) اور عباس علی خاں بھی میرے قریبی اور عزیز ساتھیوں

میں شامل ہیں۔

محمد بن عمر اور عباس علی خاں اپنے دور کے انگریزی کے بہترین مقرر تھے۔ یہ دونوں پروفیسر اسپیٹ کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ ان دونوں نے آکسفورڈ سے آئی ہوئی مقررین کی ایک ٹیم کے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ آکسفورڈ کی اس ٹیم کے ساتھ آئے ہوئے پروفیسر نے ان دونوں عثمانین کی اعلیٰ تقریری صلاحیت کو زبردست خراج تحسین ادا کیا تھا۔ اس طرح ان دو طلبا نے باہر کی دنیا کے پروفیسر کے سامنے عثمانیہ یونی ورسٹی کی نیک نامی، شہرت اور وقار میں اضافہ کیا تھا۔

ہائی اسکول میں ٹیچر اور کالجوں میں لکچرار اردو کی حیثیت سے کارگذار رہنے کے بارے میں صدیقی صاحب نے کہا کہ وہ ٹیچر کی حیثیت سے صرف سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۵ء تک کارگذار رہے۔ جناب سید محمد اعظم (نواب اعظم جنگ بہادر) سٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ جناب صدیقی صاحب ۱۹۵۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۵۸ء تک انہوں نے اردو کے لکچرار کی حیثیت سے سٹی کالج میں کام کیا۔ نواب اعظم جنگ بہادر کے بعد جناب احمد حسین خان، ڈاکٹر حسین ظہیر، ڈاکٹر رام لعل اور جناب غیاث الدین احمد سٹی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ جز وقتی لکچرار اردو کی حیثیت سے جناب صدیقی نے نظام کالج (ڈے) اور ایوننگ میں بھی کام کیا۔

اپنے ایم اے کے مقالے کے بارے میں جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے بتایا کہ ان کے مقالہ کا عنوان "پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری" تھا۔ اس مقالہ کے سوپروائزر ڈاکٹر زور تھے ایم اے کے زبانی امتحان کے لئے بیرونی ممتحن کی حیثیت سے جامعہ ملیہ (دہلی) کے پروفیسر محمد مجیب صاحب تشریف لائے تھے۔ ایم اے کا پہلا خانگی امتحان صدیقی صاحب نے ۱۹۴۲ء میں بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ آپ نے بتایا کہ کالجوں کی ملازمتوں کے دوران آپ نے سیف آباد کالج میں، ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک، سکندرآباد ڈے اور ایوننگ کالج میں ۱۹۶۴ء تک، حیدرآباد ایوننگ کالج میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک، آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک اور حیدرآباد ایوننگ کالج میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک کام کیا۔

صدیقی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ ۱۹۶۵ء میں ریڈر شعبہ اردو ہوئے تھے اور ۵ر فروری ۱۹۷۴ء کو ریڈر شعبہ اردو کی حیثیت سے وظیفہ حسن خدمت پر

ان کی سبکدوشی عمل میں آئی۔

آپ نے بتایا کہ مختلف کالجوں میں کام کے دوران کئی پرنسپل صاحبان سے ان کا سابقہ تعلق رہا۔ اور بفضلِ خدا ہر پرنسپل نے ان کی خدمات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ سٹی کالج میں لکچراری کے دوران جناب رام لعل پرنسپل تھے۔ سیف آباد کالج میں لکچرار کی حیثیت سے مامور تھے تو وہاں جناب محمد علی خاں اور ان کے بعد جناب خلیل الرحمٰن پرنسپل رہے۔ حیدرآباد ایوننگ کالج میں میجر احمد الدین اور پھر مسٹر پی وی راجگوپال پرنسپل رہے۔

آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل کے پرنسپل جناب قادر حسینی قریشی اور ان کے بعد جناب گنیش پرشاد جیسوال رہے۔

جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کے دوران انھیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک بدرو کا کالج آف کامرس میں جز وقتی لکچرار اُردو کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کام کی اجازت انھیں سررشتہ تعلیمات نے دی تھی۔ سررشتہ نے سٹی کالج کے پرنسپل جناب رام لعل کی خدمت میں مراسلہ ارسال کیا تھا کہ صدیقی صاحب کو بدرو کا کالج آف کامرس میں جز وقتی لکچرار اُردو کی حیثیت سے کام کرنے کی سہولت عطا کی جائے۔

جناب صدیقی نے کہا کہ آرٹس کالج عثمانیہ یونی ورسٹی میں انہوں نے ریڈر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک اُردو زبان دوم کے طلبا کو اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک ایم اے کی جماعتوں کے طلبا کو پڑھایا ہے۔

آرٹس کالج عثمانیہ یونی ورسٹی میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۴ء تک پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اُردو تھے اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران ڈاکٹر مسعود حسین خان اور ان کے بعد ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ موجودہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونی ورسٹی شعبہ اُردو کی صدر رہیں۔

آپ نے بتایا کہ پیشہ کا انتخاب میری مرضی اور پسند کے مطابق ہوا تھا۔ اس لئے درس و تدریس کے اس سلسلے سے مجھے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی اور میں نے حتی الامکان محنت، خلوص، انہماک اور احساسِ فرض کے ساتھ خدمت انجام دی۔

شادی کے بارے میں استفسار پر آپ نے کہا کہ میری شادی ۱۹۴۹ء م ۱۳۳۹ فصلی میں میرے حقیقی چچا جناب محمد خلیل الدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میرے خسر جناب محمد خلیل الدین

یا نگاؤں کے قاضی تھے۔ مجھے دو مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں نے پہلا حج ۱۹۷۷ء میں اور دوسرا حج ۱۹۸۰ء میں کیا تھا۔

حیدرآباد کے باہر اپنے سفر کے بارے میں جناب محمد اکبرالدین صدیقی صاحب نے کہا کہ دہلی، کشمیر، مدراس، میسور، بنگلور اور بمبئی کے سفر کا مجھے موقع ملا۔ ایک مرتبہ کیرالا کی کالی کٹ یونی ورسٹی میں میرے احباب جناب احتشام احمد ندوی اور جناب قدرت اللہ صاحب سے ملاقات کے لئے بھی گیا تھا۔ یہ سفر بھی بہت پُر تکلف اور یادگار تھا۔

آپ نے کہا کہ میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے علاوہ کشمیر یونی ورسٹی میں ایم اے کا ممتحن رہا۔ پانچ سال کے لئے جبل پور یونی ورسٹی کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کا ممتحن رہا۔ اس کے علاوہ مجھے بمبئی یونیورسٹی اور ناگپور یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کا ممتحن مقرر کیا گیا تھا۔

مرہٹواڑہ یونی ورسٹی (اورنگ آباد) اور میسور یونی ورسٹی کے بورڈ آف اسٹیڈیز کا ممبر بھی رہ چکا ہوں۔

عثمانیہ یونی ورسٹی اور اس کے تحت مختلف ڈگری کالجوں میں درس و تدریس کی مصروفیات کے علاوہ حیدرآباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی انجمنوں اور اداروں سے بھی میرا تعلق رہا ہے۔ اس کی تفصیل بتلاتے ہوئے آپ نے کہا کہ میں انجمن طیلسانین (گریجویٹس اسوسی ایشن) کا ۱۳۵۶ فصلی گیارہ سال تک معتمد رہا۔ انجمن طیلسانین کی معاشی کمیٹی اور نمایش سوسائٹی کا رُکن بھی رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ چار سال تک میں مجلہ طیلسانین کا ایڈیٹر بھی رہا۔

ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد سے اپنی دیرینہ وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے کہا کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے کتب خانہ کا اس ادارہ کے قیام سے آج تک بھی معتمد ہوں۔ ۱۹۷۰ء میں ادارہ ادبیات کے شعبہ امتحانات کا معتمد مقرر ہوا اور (۱۲) سال تک اس شعبہ کا معتمد رہا۔ مجھ سے پہلے معتمد شعبہ امتحانات جناب عارف الدین حسن تھے اور جناب عارف الدین حسن سے پہلے جناب خواجہ حمید الدین شاہد، جناب پروفیسر سید محمد اور جناب پروفیسر عبد القادر سروری نے بھی معتمد شعبۂ امتحانات کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ میں دس سال تک ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد کے ادبی ماہنامہ "سب رس" کی مجلس مشاورت کا معتمد اور اس رسالہ کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۶۰ء سے اب تک ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی مجلس انتظامی کا رکن ہوں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں جناب صدیقی نے کہا کہ میں نے نوجوانی میں نظمیں بھی کہی تھیں۔ میری یہ نظمیں سٹی کالج

کے میگزین "الموسیٰ" اور ایک اور ادبی رسالہ "آئینہ ادب" میں شائع ہوئی تھیں۔ جناب علی احمد جلیلی "آئینہ ادب" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ میری شعرگوئی کا یہ سلسلہ جلد ختم ہو گیا کیونکہ میرا رجحان زیادہ تر تحقیق کی طرف تھا۔ مجھے یاد ہے کہ شعرگوئی کے مختصر سے دور میں جناب فضل الرحمن اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی زیرِ صدارت، سٹی کالج میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں "قحط بنگال" پر میں نے ایک نظم سنائی تھی۔ میرے نثری مضامین "شہاب" مجلہ عثمانیہ، سب رس (کراچی) ہندوستانی ادب، سب رس (حیدرآباد) اور نقوش (لاہور) میں شائع ہوئے ہیں۔

جہاں تک نظم و نثر کے مطالعہ کا تعلق ہے شاعری میں غزل اور قصیدہ میری پسندیدہ اصناف ہیں اور نثر میں تنقید، تحقیق اور سفرنامہ مجھے بے حد پسند ہیں۔ اوائلِ عمر میں افسانہ اور ناول پڑھنے کا بھی شوق رہا لیکن اب اس مشغلہ کے لئے وقت نہیں ملتا۔

آنکھوں میں موتیا بند کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ فی الحال موقوف ہے۔

میں نے سوال کیا کہ کتابوں کی رسمِ اجرا یا رسمِ رونمائی کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ میں اس رسم کا کبھی قائل نہیں رہا۔

جناب محمد اکبر الدین صدیقی مشہور رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدرآبادی سے بہت قریب رہے ہیں۔ میرے ایک سوال پر آپ نے کہا کہ حضرت امجد حیدرآبادی ہمارے ایک رشتہ دار کے یہاں مقیم رہے ہیں اور امجد صاحب سے ہماری رشتہ داری بھی تھی۔ وہ برسوں محلہ آغاپورہ میں رہے، جہاں میں بھی برسہا برس سے مقیم ہوں، وہ سررشتہ صدر محاسبی میں ملازم تھے۔ میں انہیں سررشتہ صدر محاسبی کو جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے بھی دیکھا کرتا تھا۔

جناب صدیقی صاحب نے بانیٔ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد ڈاکٹر زورؔ کا تذکرہ نہایت ادب و احترام اور احسان مندی کے جذبات کے ساتھ کیا اور کہا کہ محض ڈاکٹر زورؔ کی توجہ دہانی کی بدولت میں نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا اور ان ہی کی مسلسل حوصلہ افزائی نے مجھے مصنف بنایا۔ اپنی تصنیف و تالیف کے مشغلہ کے بارے میں آپ نے کہا کہ ۱۹۳۸ء م ۱۳۵۵ء میں میری پہلی کتاب "مشاہیر قندھارِ دکن" شائع ہوئی۔ ایم اے کا مقالہ "پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری" ۱۹۴۲ء میں لکھا۔ یہ مقالہ دو قسطوں میں مجلہ طیلسانین میں شائع ہوا تھا۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی فہرست مطبوعات جلد اول کی اشاعت جناب غلام رسول صاحب اور میری مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے، فہرست مطبوعات جلد دوم اور جلد سوم میں نے مرتب کیں۔

ادارہ کی فہرست مخطوطات جلد اول تا پنجم ڈاکٹر زورؔ نے مرتب فرمائیں۔ فہرست مخطوطات جلد ششم میں نے مرتب کی۔ اس کی کاپیوں کی تصحیح، پروف ریڈنگ اور اس کے اشاریہ (انڈکس) کی ترتیب کا کام ڈاکٹر محمد علی اثرؔ لکچرار اردو عثمانیہ یونی ورسٹی نے انجام دیا۔

دکھنیات پر اپنے تحقیقی کام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ میں نے مرزا محمد مقیم، مقیمی بیجاپوری کی مثنوی " چندر بدن و مہیار " ۱۹۵۶ء میں ایڈٹ کی اور اسے شائع کیا۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں، میں نے اس مثنوی کو ہندی رسم الخط میں بھی شائع کیا۔ میں نے غواصی کی مثنوی " سیف الملوک و بدیع الجمال " کو ایڈٹ کیا ہے اور اسے اردو سے ہندی میں منتقل کیا۔ ہندی کا ایڈیشن دکھنی پرکاشن سمیتی نے شائع کیا۔ ان دو مثنویوں کے علاوہ مرزا جمال اللہ عشقؔ اورنگ آبادی کے دیوان "دیوان عشقؔ" کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ حضرت سید شاہ برہان الدین جانمؒ بیجاپوری کی " کلمۃ الحقائق " کو اپنے مقدمہ کے ساتھ جولائی ۱۹۶۱ء میں مرتب اور شائع کیا۔

جناب صدیقی نے بتایا کہ انہوں نے " کشف الوجود " مثنوی سید شاہ داول بیجاپوری خلیفہ حضرت برہان الدین جانم اور اتالیق سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ کو انہوں (صدیقی صاحب) نے ۱۹۶۵ء میں مرتب کر کے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ خاتمہ پر فرہنگ (لغت کشف الوجود) بھی دی ہے۔

جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے رسالہ " سب رس " کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس رسالے کے بعض اہم خصوصی شمارے مثلاً یادگار امجد (مئی ۱۹۶۱ء) غالب نمبر (دو جلدوں میں)، یادگار ہاشمی (نصیر الدین ہاشمی نمبر) بشیر النساء بیگم بشیر نمبر، یادگار زورؔ (ڈاکٹر زور نمبر) بھی شائع کئے۔ آپ نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے رسالہ " مبصر " کے مرتب ہیں۔ " مبصر " کا تیرھواں شمارہ عنقریب شائع ہوگا۔

۱۹۷۲ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خطوط " خطوط عبدالحق " کے نام سے اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کئے۔ سید محی الدین ابن سید محمود قادری کی فارسی تالیف صحیفۂ اہل ہدیٰ (تذکرہ خاندان حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری بیجاپوری) کا آپ نے اردو میں ترجمہ کیا اور ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ آپ نے حضرت برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ ۱۹۷۱ء میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے لکھا تھا۔

آپ نے بتایا کہ لچھمی نرائن شفیق کے تذکرۂ شعراے فارسی (کہ از ایران بہ ہند آمدہ) "شام غریباں" کو ۱۹۷۷ء میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ یہ تذکرہ خوبصورت ٹائپ میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا۔ اس میں "حرفے چند" کے زیر عنوان جناب جمیل الدین معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان کی تحریر اور جناب صدیقی کا نوشتہ "مقدمہ" شامل ہے

جناب صدیقی نے میر نظام الدین ممنون دہلوی کے کلیات جلد اول (قصائد) کو مارچ میں شائع کیا۔

مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) کے زیر اہتمام آپ نے کلیات محمد قلی قطب شاہ کا "انتخاب" اپنے مقدمہ ساتھ ستمبر ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

حضرت سید محمد بے نظیر شاہ وارثی بے نظیر کے مجموعہ "کلام بے نظیر" کو آپ نے اکتوبر ۱۹۸۱ میں مرتب کیا۔ دکنی ادب پر آپ کے (۲۲) مضامین کا مجموعہ "بجھتے چراغ" نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع

محمد عبد الرحمن بارکر اور شاہ عبد السلام نے جناب محمد اکبر الدین صدیقی کی اعانت کے ساتھ "دل پذیر" جلد اول (READER OF CLASSICAL URDU POETRY.) ۱۹۷۶ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں اردو کے کلاسیکی ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب اور ان کی سوانح ہے۔ اس کتاب کے (PREFACE) میں محمد عبد الرحمن بارکر نے جناب صدیقی کی ا
خدمات کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے۔ E OF THE ACKNOWLEDGED EXPERTS ON DAKKANI URDU." یہ کتاب یعنی "نقش دل پذیر" انگریزی زبان والوں کے لئے جو اردو پڑھتے ہیں، مرتب کی گئی اور نیویارک (امریکہ) سے شائع ہوئی۔ اس میں لکھا ہے کہ کتاب کی تحقیق و تدوین، محکمہ صحت، تعلیم و بہبود حکومت ریاست ہائے امریکہ کی مالی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔

جناب صدیقی حیدرآباد سے باہر کے معیاری رسالوں کی خصوصی اشاعتوں کے لئے مضامین اور مواد بھیجتے رہتے ہیں۔ جناب مالک رام کے رسالہ "تحریر" (دہلی) کے کالم "وفیات" کے سلسلے آپ نے حیدرآباد کے مرحوم شاعروں اور ادیبوں سے متعلق ضروری مواد ارسال کیا۔

مجلس ترقی ادب لاہور نے مقالات سرسید کی سولہ جلدیں شائع کیں۔ جناب صدیقی بتایا کہ انھوں نے ان جلدوں میں اشاعت کے لئے حیدرآباد سے سرسید احمد خاں کی ۱۸۷۸ء میں تصنیف کی ہوئی کتاب "قدیم نظام" دیہی ہندوستان" بھیجی تھی جسے مقالات سرسید حصہ شانزدہم میں

کیا گیا اور اس جلد میں جناب صدیقی کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔

نقوش (لاہور) نے جناب صدیقی کے حیدرآباد سے بھیجے ہوئے میر تقی میر کے فارسی دیوان کی فوٹو کاپی ۱۹۸۲ء میں شائع کی۔ "نقوش" کے اس نمبر میں "میر کی فارسی شاعری" پر جناب صدیقی کا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ صدیقی صاحب نے "نقوش" کے مثنوی نمبر کے لئے حیدرآباد سے دس بارہ مثنویاں ارسال کی تھیں۔ مثنوی نمبر ابھی شائع نہیں ہوا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے شائع شدہ "مرقع سخن" جلد اول اور جلد دوم میں محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے چار چار شعرا کے بارے میں مضامین لکھے تھے۔ ناگپور کے (ARCHIALOGIA INDICA) میں بھی آپ کے مضامین شائع ہوئے تھے۔

حیدرآباد کے اسکولوں کے لئے صدیقی صاحب نے درسی کتابیں بھی مرتب کی تھیں اس کے علاوہ مرہٹواڑہ اور کیرالا یونی ورسٹی کے تحت ہائی اسکولوں کے لئے اور میسور میں انٹرمیڈیٹ کے لئے آپ کی مرتب کردہ نصابی کتابیں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ حیدرآباد میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۹ء اور مرہٹواڑہ میں ۱۹۵۶ء میں اور کیرالا میں ۱۹۶۰ء میں یہ کتابیں نصاب میں شامل کی گئی تھیں۔

۱۹۷۸ء میں پرنسٹن، نیوجرسی (امریکہ) سے رچرڈ میکسول ایٹن نے SUFIS OF BIJAPUR (1300 — 1700) شائع کی تھی۔ اس کتاب کی تدوین میں جناب صدیقی صاحب نے بھی مرتب کو مفید مشورے دیئے تھے۔ جس کا رچرڈ میکسول ایٹن نے اپنے (PREFACE) میں شکریہ ادا کیا ہے۔

دکنیات میں صدیقی صاحب کا ایک اور کارنامہ ابن نشاطی کی "پھول بن" کی اشاعت ہے اس میں آپ کا مقدمہ اور آپ کی مرتبہ فرہنگ بھی شامل ہے۔ یہ مثنوی ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

میں نے صدیقی صاحب سے یہ خواہش بھی کی تھی کہ ملازمت کے دوران کا کوئی یادگار واقعہ ہوا ہو تو اس کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ اس سلسلے میں آپ نے کہا کہ میری ملازمت کے ابتدائی دور میں سٹی کالج میں ولی اورنگ آبادی کا جشن منایا گیا۔ اتنے بڑے اور شاندار پیمانہ کا جشن، میں نے کبھی نہیں دیکھا، اس جشن یادگار ولی کی سرپرستی نواب یوسف علی خاں سر سالار جنگ سوم نے فرمائی تھی۔ اس سلسلے میں پہلی بار بڑے پیمانے پر دکنی مخطوطات کی نمائش بھی ترتیب دی گئی تھی جس کے لئے کتب خانۂ سالار جنگ، کتب خانۂ آصفیہ (موجودہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدرآباد) سے دکنی مخطوطات حاصل کئے گئے تھے۔ آغا حیدر حسن نے بھی اس نمائش کے لئے اپنے ذاتی کتب خانہ سے دکنی مخطوطات

فراہم کئے تھے۔ یادگار ولی کے انعقاد کے سلسلے میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر سید محمد نے بہت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔
جناب علیم الدین تاجر کتب، نے اپنی طرف سے دیوانِ ولی کے بعض نسخے نمائش میں رکھے تھے۔ ولیؔ کے متعدد دیوان، نمائش میں جمع ہو گئے تھے۔ یادگار ولیؔ کے سلسلے میں منعقدہ بعض اجلاسوں میں نواب بسالت جاہ اور نواب اعظم جاہ بہادر نے بھی بہ نفس نفیس شرکت فرمائی تھی۔ صدیقی صاحب اس زمانے میں سٹی کالج کے ہائی اسکول سکشن میں ٹیچر تھے۔ سٹی کالج کے میگزین "الموسیٰ" کا "یادگار ولیؔ نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا تھا۔ یادگار ولیؔ کے ایک اجلاس میں نواب سالار جنگ نے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے قیام کا اعلان فرمایا۔ صدیقی صاحب سے میں نے ان کی طالب علمی کے دور کے کسی دلچسپ یا یادگار واقعہ کی یاد تازہ کرنے کی درخواست کی تو آپ نے کہا کہ نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی سلور جوبلی کا زمانہ تھا۔ یونی ورسٹی کے طلبا نے جوش و خروش کے ساتھ، امتحانات کے ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس زمانے میں مسٹر میکنزی، پرو وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی تھے۔ طلبا سے ان کا سلوک مشفقانہ رہا۔

انٹرویو کے آخری تین سوالوں میں سے ایک سوال تھا۔ آپ نے اپنی سوانح عمری لکھنے کے بارے میں بھی کبھی سوچا ہے؟

صدیقی صاحب نے اس سوال کا نفی میں جواب دیا اور کہا میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔

میرا ایک اور سوال تھا۔ کیا وہ سب کام پایۂ تکمیل کو پہونچ گئے جنھیں آپ کرنا چاہتے تھے؟ آپ نے کہا کہ کبھی کوئی خاص پروگرام پیش نظر نہیں رہا۔ میں ایک ٹیچر تھا اور ٹیچر (پیچ بد چھٹے تو) بڑے خواب کبھی دیکھ نہیں سکتا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اور اردو زبان و ادب کی خدمت مجھ سے جس قدر بھی ہو سکی اس میں ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی مدد میرے شامل حال رہی۔ میرے اس سوال کا آپ نے میر تقی میرؔ کا یہ شعر پڑھتے ہوئے دیا ۔

کام تھے عشق میں بہت سے میرؔ ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

آخر میں صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے درخواست کی کہ وہ "نئی نسل" کے نام کوئی پیغام [illegible] فرمائیں۔ صدیقی نے کہا کہ کام اور پیشہ میں ملن کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ ہر معاملہ میں دیانت داری بے حد ضروری ہے۔ تحقیق اور ادبی معاملوں کی صراحت اسکالر اور ادیب کا اخلاقی فریضہ ہے، جس پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ●

محمد اکبر الدین صدیقی

شامِ غریباں
ایک نادر مخطوطہ

لچھمی نراین شفیق کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ دکن آئے اور اورنگ آباد کو وطن بنالیا۔ ان کے والد رائے منارام مآثر نظامی کے مصنف تھے۔ شفیق نے بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اورنگ آباد میں کئی تذکرے لکھے گئے لیکن شفیق کے بارے میں کسی نے نہ لکھا۔ اس لیے کہ تذکروں کی تالیف کے وقت وہ ابھی بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے۔ نتایج الافکار (۱۲۵۷ھ) کے مصنف نے شفیق کے اردو فارسی کلام کا نمونہ دیا ہے اور ان کے تذکروں گلِ رعنا اور شامِ غریباں کا ذکر کیا ہے ۱۳۴۹ھ میں "تذکرۂ شعرائے دکن" شائع ہوا۔ اس میں عبدالجبار خاں ملکاپوری نے ان دونوں تذکروں کے علاوہ چمنستان شعرا کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ مآثر آصفی، مآثر حیدری، بساط الغنایم، حرارت الہند، گلستان وتذکرۂ بابا گرونانک کے نام دے کر وغیرہ ہا لکھ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ شفیق نے اور بھی کتابیں ضرور لکھی تھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے جب ۱۹۲۸ء میں چمنستانِ شعرا شائع کیا تو شامِ غریباں کے بعد گلِ رعنا کا تذکرہ کیا۔ اور دیگر تصانیف میں "حقیقت ہائے ہندوستان" تنمیق شنگرف اور حالاتِ حیدرآباد کا اضافہ کیا ہے۔ ثمر یافعی مرحوم نے شفیق کی ایک مثنوی تصویرِ جانان کا تعارف رسالہ تجلی حیدرآباد کے ذریعہ کرایا جو بعد کو مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہوئی ہے لیکن اس کے مقدمے میں شفیق کی کسی نئی کتاب کا ذکر نہیں۔ البتہ شفیق کا سنہ وفات ۱۲۴۳ھ دیا ہے۔ یوسف علی خان صاحب آج کل مآثر آصفی کی تدوین میں مصروف ہیں۔ صاحب موصوف نے شفیق کی مزید پانچ کتابوں یعنی خلاصۃ الہند، امرت کنڈہ، سوسن قلیان، مثنوی اقسامِ نسواں اور تحفۂ احباب کا پتہ چلایا ہے۔ یا تو کتابیں ملی ہیں یا ان کے نام۔ عبدالرزاق صاحب عرشی مالک کتب خانہ درگاہ یوسفین کے کتب خانہ میں شفیق کا ایک کشکول یا بیاض تھی جس کو اس نے چمنستان اشعار کا تاریخی نام دیا تھا۔ یہ مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب تھا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں "طرقہ صد پارہ" نام کی ایک کتاب فارسی میں پند و نصائح پر شفیق کی تصنیف

ملتا ہے۔ پروفیسر سید محمد[؟] نے اپنے مضمون "لچھمی نارائن شفیق" میں ان ناموں کے علاوہ کسی اور کتاب کا نام نہیں دیا۔ شامِ غریباں کے مطالعہ سے اس فہرست میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہوتا ہے۔ شفیق کے الفاظ ہیں :

"مخفی نماند کہ بندہ شفیق جواہر زواہر نام کتاب مستقل پنج ہزار بیت در مناقب آنجناب (میر غلام علی آزاد بلگرامی) بقیدِ کتابت آوردہ ام۔" اس کتاب کا ابھی تک کوئی نسخہ دریافت نہ ہو سکا اس کے بعد اس کے اُردو اور فارسی علیٰحدہ علیٰحدہ دیوان ہیں اس طرح اس کی تصانیف کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

چمنستانِ شعرا[1]، گلِ رعنا[2]، شامِ غریباں[3]، مآثر آصفی[4]، مآثرِ حیدری[5]، بساط الغنائم[6]، مرآت الہند[7]، حقیقت ہائے ہندوستان[8]، تحقیقِ شگرف[9]، حالاتِ حیدرآباد[10]، خلاصۃ الہند[11]، امرت کندہ[12]، تحفۂ احباب[13]، تذکرہ بابا گرو نانک[14]، نخلستان[15]، سوسنِ دہ زبان[16]، مثنوی اقسام نسواں[17]، چمنستانِ اشعار[18]، خرقۂ صد پارہ[19]، جواہرِ زواہر[20]، دیوانِ فارسی[21]، دیوانِ اُردو[22]، شامِ غریباں[23] میں ایسے شعرا کا تذکرہ ہے جو ایران سے ہندوستان آئے اور بابر بادشاہ سے لے کر محمد شاہ، شاہ عالم تک کے درباروں میں باریاب ہوئے اور دکن میں بہمنی دربار میں اور پھر اس کی جانشین سلطنتوں یعنی نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں سے متوسل رہے۔ بعض ایسے شعرا بھی ہیں جنھیں کسی دربار میں باریاب ہونے کا موقع نہ ملا یہ شعرا یا تو یہاں رہ بس گئے یا واپس چلے گئے۔

اس مخطوطہ کے دو اور نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک علی گڑھ میں انجمن کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا اورنٹیل کالج لاہور کے کتب خانے میں۔ انجمن کا نسخہ اوّل و آخر ناقص ہے اور لاہور کا نہ صرف اوّل و آخر ناقص بلکہ آب زدہ بھی ہے اور اکثر جگہ پڑھنا مشکل ہے اس طرح میرے پیشِ نظر جو نسخہ رہا وہ مکمل اور نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ اس کی کوئی نقل بانکی پور، رام پور اور بمبئی میں یا حیدرآباد کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اس تذکرہ میں جملہ ۲۸۲ شعرا کا ذکر ہے یہ تعداد مکمل نہیں کہلائی جا سکتی اس لیے کہ دکن ہی میں کئی ایسے شعرا کے نام ملتے ہیں جو دکن کے درباروں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ لیکن اکثر تذکرے ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ شفیق نے اس کمی کو دور کرنے کے لیے یہ تذکرہ تالیف کیا۔ اس کی تالیف کے وقت متعدد تذکرے اور کتب تواریخ زیر مطالعہ رہے ہیں جن کا اس نے نہایت دیانت داری سے حوالہ دیا ہے۔ چند تذکرے اور تاریخ کی کتابیں حسبِ ذیل ہیں۔

تذکرہ طاہر نصیرآبادی، مجمع النفائس۔ آرزو۔ تذکرہ صبح صادق میرزا صادق۔ تذکرہ نظم گزیدہ ناظر تبریزی، میخانہ قزوینی، مرآۃ الخیال، شیر خان لودی، کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش، عرفات العاشقین تقی الدین اوحدی اور اپنے استاد میر غلام علی آزاد کے تذکرے ید بیضا، خزانۂ عامرہ، سروِ آزاد اور غزلان الہند، یہ سب تذکرے آج ہندوستان کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ان میں بعض طبع ہونے

کے باوجود بھی بعد کمیاب ہیں۔ تاریخی کتب میں امین رازی کی ہفت اقلیم اور ابوطالب کلیم، محمد صالح اور عبدالحمید لاہوری کے شاہ جہاں ناموں یا شاہجہاں ناموں کا ذکر ملتا ہے۔

مندکرہ بالا تذکروں کے علاوہ اس میں ایک اور تذکرہ "مراتب واردات" کا حوالہ موجود ہے اس کا مصنف شاہ محمد شفیع نگینی ہے۔ یہ نگینہ ڈاکٹر نذیر احمد خاں کا وطن ہے۔ اس تذکرہ کا نہ کسی اور تذکرہ نگار نے حوالہ دیا ہے نہ کہیں اس کا نام مخطوطات کی فہرست میں نظر سے گذرا۔ غالباً یہ ناپید ہو چکا ہے۔ اس کے حوالے سے جو باتیں شفیق نے بیان کی ہیں وہ کسی اور تذکرہ میں نہیں ملتیں۔

شفیق نے ایک خاص اہتمام یہ بھی کیا ہے کہ شعراء نے جو کتابیں تصنیف و تالیف کیں، ان کے نام دے دیئے اگر انھوں نے کہیں سفر وغیرہ کیا ہو تو اکثر بقید سن اس کا ذکر کیا ہے۔

ہمارے محققین نے شفیق کے حالات بیان کرتے ہوئے چمنستان کے بعد شامِ غریباں ہی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد گلِ رعنا کا۔ اس سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ شامِ غریباں گلِ رعنا پر مقدم ہے لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ چمنستان کو شفیق کے لڑکپن کی کارگزاری سمجھئے کہ وہ ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۱۷۵ھ میں لکھا اور اس کے چھ سال بعد یعنی اپنی عمر کے چوبیسویں سال ۱۱۸۱ھ میں گلِ رعنا لکھا اور شامِ غریباں اس کے سولہ سال بعد ۱۱۹۷ھ میں تصنیف کیا۔ اس نے اپنی اکثر کتابوں کے نام تاریخی رکھے اور جن کا نام تاریخی نہیں خاتمہ پر ان کا قطعۂ تاریخ دے دیا ہے۔ چنانچہ شامِ غریباں کا نام متن کے اعتبار سے نہایت موزوں تھا لیکن اس میں تاریخ نہیں نکل سکی اس لیے قطعہ لکھ کر "اتمام نسخہ" ۱۱۹۷ھ سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔ تذکرہ کی تکمیل کے بعد اس نے اپنے استاد آزاد بلگرامی کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور بہت طول طویل انتخاب کلام دیا ہے۔ حالات کے بعد آزاد بلگرامی کے چند قطعات تاریخ دیئے ہیں جس سے مزید اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۹۷ھ میں مکمل ہوا ہے۔ آزاد نے میرزا مظہر جان جاناں کی شہادت پر تاریخی قطعہ لکھا ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے شفیق لکھتے ہیں کہ مظہر جان جاناں کو کسی نامعلوم شخص نے ۷ محرم ۱۱۹۵ھ کو جہاں آباد میں زخمی کر دیا اور اسی زخم سے وہ یوم عاشورہ کو انتقال کر گئے اور اپنے گھر کے صحن میں مدفون ہوئے۔ آزاد نے تاریخ کہی:

میرزا مظہر سخن تیغ شہید   حشر او با نور چشم فاطمہ

روز عاشورہ از جہاں مظلوم رفت   گفتہ شد تاریخ "حسین الخاتمہ"

اسی سال نورالعین واقف بٹالوی نے بھی جہاں آباد ہی میں رحلت کی[۱] اور آزاد نے اس طرح تاریخ کہی۔

۱؎ ریاض اور ... نے نسخۂ عندلیب کے حوالے سے اور سرور صاحب قاموس المشاہیر نے تاریخ وفات ۱۱۹۰ درج کی ہے۔ ایسر نگر نے ۱۱۹۵ انہیں کا اتباع کیا ہے۔

افسوس کہ واقفِ سخن سنج طومارِ حیاتِ خویش پیچید
تاریخ وفاتِ او خرد گفت "واقف بجہانِ خلد گردید"
۱۱۹۵ھ

اس کے بعد شفیق لکھتے ہیں " سرآمدِ شعرائے ریختہ " میرزا رفیع سودا نے بھی ۱۹ رجب کو رحلت کی تو آزاد نے حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ کہا۔

مرزا سودا رفیع عالی فطرت آرام گرفت در جوارِ رحمت
تاریخ وفاتِ او رقم زد آزاد ، سودا آسود شادماں در جنّت

اور ان قطعات کے بعد آزاد نے ان تینوں کے لیے ذیل کا ایک قطعہ کہا ہے :-

سہ سخن سنج ہند در یک سال کوچ کردند باہم از دنیا
میرزا مظہرِ خدا آگاہ سخن او تمام درد و صفا
نادرِ العصر شیخ نور العین یک قلم کرد شعر را احیا
میرزائے بلند رتبہ رفیع در سخن صاحبِ یدِ بیضا
ہر سہ با بندہ آشنا بودند حیف رفتند در مقامِ فنا
بہرِ تاریخِ فوتِ ایں یاراں کرد آزاد مطلعی انشا

جانِ جاناں و واقف و سودا ۴۲۹
وارثِ آشیانِ مُلکِ بقا ۷۶۶
۱۱۹۵

ان قطعات کی روشنی میں ۱۱۹۷ھ " اختتامِ نسخہ " کی صحت مُسلّم ہے۔

شفیق کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے بزرگ استاد میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ یہ آزاد ہی کی تصانیف ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں جب ہم شامِ غریباں کا مطالعہ کرتے ہیں تو منجملہ ۴۸۲ کے صرف ۳۳ شعرا میں بعض شعرا کے کلام کا انتخاب شفیق کا اپنا ہے اور بعض شعرا کا آزاد سے لیا ہوا اور حالات کی عبارت میں قدرے یکسانیت نظر آتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شفیق جو نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے اور پھر ان کے بیٹے عالی جاہ کے دربار سے متوسل رہے اپنے مربی کے ساتھ ۱۱۷۷ھ میں اورنگ آباد چھوڑ کر حیدرآباد آئے اور پھر حالات کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہیں اورنگ آباد جانے کا موقع نہ ملا۔ اور ۱۲۲۳ھ میں یہیں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ البتہ آزاد مختصر سے قیام کے لیے ایک دفعہ ۱۱۸۴ھ اور دوسری دفعہ ۱۱۹۵ھ میں

جب کہ ان کا سن اسّی سال کا ہو چکا تھا حیدرآباد آئے اور پھر اورنگ آباد واپس ہو کر ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔

شامِ غریباں اور گلِ رعنا اور آزاد کے تذکروں کا مقابلہ بھی اس فرق کو واضح کر دے گا جو استاد اور شاگرد کے اندازِ بیان اور زبان میں موجود ہے۔ اس میں استاد اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ ادیبانہ شان میں نظر آتے ہیں اور شاگرد شاگردی میں۔

شامِ غریباں کا آغاز آدم علیہ السلام کے تذکرے سے ہوا ہے اور توجیہ یہ کی ہے کہ وہ جنت سے ہندوستان آئے۔ اسی تعلق سے مختلف مذاہب میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کے حوالے دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ علماء اور شعراء نے بھی جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں بھی پیش کر دیا ہے۔ ان میں شیخ جلال الدین سیوطی، ناصر علی سرہندی، شیخ علی رومی صاحب، محاضرۃ الاوائل اور شعراء میں امیر خسرو، میرزا صائب، اور آزاد بلگرامی کے اشعار دیئے ہیں۔ حرف الف میں (۵۱) شعراء کے حالات ہیں جن میں حکیم صدر الدین عالی، ابوالفتح گیلانی اور قزلباش خاں امید وغیرہ شامل ہیں۔ میر رضی شوستری اقدس کے حالات بیان کرتے ہوئے متعلقہ تاریخی واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اکثر شعراء کے انتقال کی تاریخیں یا معاصرین کے قطعاتِ تاریخ بھی دیئے ہیں۔

حرف ب کے تحت صرف میرزا عبدالقادر بیدل کا ذکر ہے اور شفیق خود ہی معترف ہیں کہ ان کا شمار واردانِ ہند میں نہیں۔ ان کا حال دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے اور گلِ رعنا میں بھی خود انہوں نے لکھا ہے لیکن یہاں ان حالات کو شامل کرنے کا مقصد یہ بیان کرتے ہیں۔

> "درین ایام "مرآت واردات" تالیف شاہ محمد شفیع تکینی متخلص بہ وارد طہرانی بہ نظر رسیدہ۔ درین کتاب بعضی احوال میرزا سوای آن است کہ در تذکرہ ہا بہ نظر نہ رسیدہ۔ تالیف شاہ وارد غیر مشہور است لہٰذا بہ خاطر رسید کہ میرزا صاحب کمال عمدہ است۔ ترجمہ او را بہ احوال زاید کہ شاہ وارد آوردہ، باید نوشت تا بر صفحۂ روزگار باقی ماند۔"

تمام تذکرے بجز ایتھے اور قاموس المشاہیر[۱] کے اس امر پر متفق ہیں کہ بیدل عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور اعظم شاہ کے دربار سے متوسل رہے اور جب اس نے اپنی مدح میں قصیدہ کہنے کے لیے کہا تو ملازمت ترک کر دی، لیکن وارد اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

> "طائر خوشنوای وجود میرزا از گلستان عدم در اکبرنگر عرف راج محل از ممالک

ح۱ : ایتھے نے اکبرآباد اور صاحبِ قاموس نے بخارا لکھا ہے۔

بنگالہ پر پرواز کشود و مدتی دراں سرزمین معاش بہ جمعیت بسر برد و در کمال جوانی رو بہ ہندوستان آورد و نخست در صحبت میرزا سلیمان، خالوی حقیقی سلطان محمد معزالدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر سالہا بسر برد و بعد فوت میرزا سلطان در سلک ملازمان اعظم شاہ بن عالمگیر ــــ منسلک گشتہ بہ بیت الغزل دیوان اعتبار گردید۔"

اس بیان کو اس لیے غلط نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد کا بیان اور تعجب خیز نظر آتا ہے جب اعظم شاہ نے بیدل سے اپنی مدح میں قصیدہ لکھنے کے لیے کہا تو بیدل نے ملازمت ترک کر دی اور شاہ وارد لکھتے ہیں کہ:

"پس از قطع منازل در بلدۂ متھرا برکنار دریا سہ جمن اقامت گزید۔ لعل محمد نامی حاکم آن مکان نائب حسن علی خاں بہادر بلہ دردی خانی از قدوم میرزا اطلاع یافتہ در دل جوئی و خاطرداری کوشید۔ میرزا نیز دلدادۂ صحبت اوشد، اتفاقاً سلطان عالمگیر کہ در دکن بود لعل محمد را بحضور خود طلبید۔ لعل محمد موجب حکم بادشاہ جبراً و قہراً رو براہ سفر دکن آورد و در عرض راہ سمند عزیمت را اقلیم عدم جلوریز ساخت۔ میرزا تا مدت یک و نیم سال در خانۂ راقم این اوراق بی تشویش معاش اصل اقامت افگند۔"

غرض اسی طرح اس تذکرہ کے مطالعہ سے بعض نئی معلومات ملتی ہیں۔

کلیات علی عادل شاہی میں ایک غزل کا عنوان چار در چار ہے۔ یہ اصل میں سولہ رکنی بحر ہے اس کا نام بھی شاہ وارد کے تذکرہ میں موجود ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"در بحر کامل چار در چار اول شاعری کہ شعر موزون کرد ادیب صابر است و او غزلی بیش از ہفت بیت مرقوم نہ ساختہ و بعد از ادیب صابر مولانا عبدالرحمٰن جامی غزل ہفدہ بیت ایجاد نمودہ میرزا بیدل در بحر کامل چار در چار دیوانی مشحون بہ معانی خاص و مضامین عالی تصنیف کردہ۔"

صابر کا شعر حسب ذیل ہے:

چنیں شنیدم کہ لطف یزداں بردمی جوئندہ ورنہ بندد   دری کہ بکشاید از حقیقت براہل عرفان دگر نہ بندد

شفیق اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاہ وارد خبر ندارد کہ مطلعی کہ از ادیب صابر نقل کردہ بحر کامل نیست بلکہ از فروغ بحر متقارب است۔ تقطیعش فعول فعلن، فعول فعلن" اس قسم کی تنقیدیں تذکرہ میں اکثر مقامات پر ہیں کہیں الفاظ کی تحقیق پر بحث کی ہے اور کہیں معانی و بیان کی نزاکتوں کو پیش کیا ہے۔ اس سے شفیق کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جس طرح شفیق نے آدم علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہندوستان آئے اسی طرح شیخ سعدی

کے بارے میں بھی لکھا اور ثبوت کے لیے دو شعر پیش کیے ہیں۔

تبی دیدم از عاج در سومنات مرصع چو در جاہلیت منات
بہ ہند آمدم من ازاں رستخیز وز آنجا براہ یمن تا حجیز

تاریخی واقعات کے اظہار کے لیے ایسے شعرار کے حالات جن کا شاہی درباروں سے تعلق رہا ہے مطالعہ کیا جائے تو بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں میر جملہ روح الامین، سلیم، سرمد، ظہوری، اینی شاملو، میر جملہ محمد سعید، شہرستانی، تقی اوحدی، میر یحییٰ، دانش وغیرہ شامل ہیں، اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی زندگی بالکل سپاہیانہ گزاری لیکن بیس بائیس شعرا ایسے ہیں جو عالمگیری امرار یا خود عالمگیر کے دربار سے وابستہ رہے۔ نعمت خان عالی جیسا شاعر اور ادیب اسی دربار میں رہا۔

شفیق نے بعض شعرار کی قبروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ چنانچہ سلیم کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"درسالی کہ اسلام خاں (وزیر شاہ جہاں) فوت شد، سلیم، ہم در کشمیر چشم از زندگانی پوشید و در دامن کوہی کہ مشہور بہ تخت سلیمان مشرف بر تالاب دل بہ رخ وال جلہ مدفون گردید۔"

طغرائے مشہدی کے متعلق لکھتا ہے کہ:

"اواخر حال گوشہ انزوا در کشمیر گرفت و ہماں جا در گزشت و نزدیک قبر ابوطالب کلیم مدفون گشت۔"

لیکن پتہ نہیں کہ قدسی کے بارے میں شفیق نے کون سا تذکرہ پیش نظر رکھا غالباً ملا عبدالحمید لاہوری کا شاہجہاں نامہ ہوگا کیوں کہ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

"در لاہور سنہ ست و خمسین والف بعالم قدس خرامید۔"

حالانکہ غنی کشمیری کا قطعہ تاریخ قدسی، سلیم اور کلیم کا مدفن ایک قرار دیتا ہے اور سرو آزاد میں یہ موجود ہے۔ اس کے آخری تین شعر یہ ہیں:

عمر باد یاد اُو نہ بر زمین! خاک بر سر کردہ قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاق یک دگر گشتہ اند ایں ہر سہ در یکجا مقیم
گفت تاریخ وفات او غنی طور معنی بود روشن از کلیم

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شفیق نے تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی اور جہاں سے جو اور جیسا مواد ملا جمع کر کے پیش کرتا چلا گیا۔ چمنستانِ شعرار کے مواد کے بارے میں بھی مولوی عبدالحق صاحب کو شکایت ہے کہ اس نے ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ کو جو بلحاظ صحت واقعات معتبر نہیں،

اہمیت دی اور اسی کو ماخذ بنایا لیکن چمنستانِ شعراء کا مصنف صرف اٹھارہ سال کا لڑکا ہے اور شامِ غریباں کا مصنف تقریباً ۷۰ سال کو پہنچ چکا ہے اس لیے اس سے تحقیق و تلاش کی توقع کی جا سکتی تھی۔

کلیم کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"وفات کلیم پانزدہم ذی الحجہ سال ہزار و شصت و یک ہجری واقع شدہ و در نزدیکی قبر محمد قلی سلیم مدفون گردید۔"

نعمت خان عالی کی قبر کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"اتفاقاً نعمت خان بعد وصول حیدرآباد در رکاب شاہ عالم بہادر در سنہ احدی وعشرین و مائة والف رحلت کرد و در دائرہ میر محمد مومن مدفون گردید و بر سر قبرش مسجدی ساختہ اند کہ بالفعل موجود است۔"

میر رضی اقدس شوستری کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"آخر الامر در بلدۂ حیدرآباد گوشۂ انزوا گرفت و متاہل شد و بست و دوم جمادی الاولیٰ سنہ اربع و تسعین[۱۱۹۴] و مائة والف رحلت نمود و در دائرہ میر محمد مومن استرآبادی مدفون گردید۔"

میر ابو تراب فطرت والد میر رضی دانش کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ :

"ابو تراب در سنہ ستین والف در نقاب تراب رفت۔ میر آزاد در سرو آزاد گوید کہ قبر او در دائرہ میر محمد مومن استرآبادی کہ گورستان مقرری ایرانیان است و مردم بسیاری ازان ولایت دران بقعہ خوابیدہ اند دیدہ شد۔ بر لوح مزار او کندہ اند کہ این رباعی را دم آخر بنظم آورد .... و رباعی دیگر است میر رضی کہ در فراق والد خود گفتہ ہم بر لوح مزار تحت رباعی مذکور نقش است۔"

پھر اس کے بعد شفیق نے لکھا ہے کہ :

"میر آزاد سلمہ اللہ تعالیٰ با بندہ فرمودند کہ در سنہ خمس و ستین[۱۱۶۵] و مائة والف در حیدرآباد اتفاق افتاد و بدلالت میر رضی اقدس شوستری قبر میر ابو تراب در دائرہ میر دیدہ شد۔ دران وقت دایرہ مذکور ویرانہ بود و اثری از آبادی نداشت پس ازان بعد سی سال در سنہ خمس و تسعین[۱۱۹۵] و مائة والف باز بندہ در حیدرآباد وارد شد و دائرہ میر بملاحظہ در آمد اثری از قبر و لوح میر ابو تراب پیدا نشد و ہم چنین اکثر

قبور کہ در آں قطعہ زمین بود با خاک برابر گشت۔ سبیش ایں کہ در زمان حال ما برسکونت والیٔ ملک نواب نظام الدولہ آصف جاہ ثانی خلف الصدق نواب نظام الملک آصف جاہ خدیو دکن آبادیٔ حیدرآباد بحد کثرت رسیدہ و ایں دائرہ کہ تمام خوابگاہ موتی بود آرام گاہ احیا گردیدہ"

شفیق نے اپنی زبان کو نہایت سلیس اور عام فہم رکھا ہے۔ مقفیٰ اور مسجع لکھنے کی کوشش نہیں کی البتہ شاعروں کے تخلص کی مناسبت سے ان کا کلام دیتے ہوئے عبارت آرائی ضرور کی ہے مثلاً: روغن استر آبادی کے لیے روغن قاز بروی سخن می مالد۔ رونقی کے لیے او سخن را رونق می دہد۔ شالور کے لیے او تصویر سخن می کشد۔ سیف الملوک شجاعی دماوندی کے لیے۔ این جواہر الدیان شمشیر است۔ مولانا صادق حلوای کے لیے او حلوای سخن می فرو شد اند غزالی مشہدی کے لیے این چند شگوفہ از غزالی است۔

اس اسلوب سے قاری کا ذہن بار محسوس نہیں کرتا اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

اس کی تنقید میں ابتدار سے آخر تک کہیں دل آزاری نہیں پای جاتی۔ بلکہ جو واقعہ جس انداز میں بیان کرنا چاہیے اسی انداز میں پیش کر دیتا ہے ورنہ اکثر تذکرہ نگاروں نے تلخ گوئی کو اپنا شعار بنایا ہے یہ تلخی بعض جگہ آزاد کے تذکروں میں بھی نظر آجاتی ہے۔

یہ تذکرہ مذکورہ بالا پیش کردہ خصوصیات کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت ہے کہ بیرونی شعراء کا حال یا ماخذ کا پتہ اس میں بہ آسانی مل جاتا ہے

اعلان بہ حکم پریس رجسٹرار حکومتِ ہند

فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر کا نام : سید علی اکبر

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد ۔ ۴۔۔۔۔۵

نام اور پتہ مالک : ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد ۔ ۴۔۔۔۔۵

میں سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

سید علی اکبر
(دستخط)

یکم مارچ ۱۹۸۴ء حیدرآباد

عزیز قیسی

دو غزلیں

کرتے ہو زخموں کا بیاں کون سُنے گا
ویرانے میں پھولوں کی زباں کون سُنے گا

تھا جن سے گلہ تم کو وہ سب ہو گئے پتھر
اب کس کو سناتے ہو میاں کون سُنے گا

اب تو یہ لاشوں کے ہے اک جشن کا عالم
اک نامۂ بربادیٔ جاں کون سُنے گا

آفاق ہیں ظلمات میں گم خود کو پکارو
کیا جانے یہ آواز کہاں کون سُنے گا

دل اپنا ہی جب دور ہے خود اپنی زباں سے
قیسی سے غمِ دل زدگاں کون سُنے گا

ہر حسیں شخص کو کب چاہتے ہیں
جس میں ہو کچھ تری چھب چاہتے ہیں

دردِ جاں صبر طلب چاہتے ہیں
کوئی جینے کا سبب چاہتے ہیں

اک تمہیں ہم سے کھنچے ہو ورنہ
چاہنے والوں کو سب چاہتے ہیں

حیرتِ غم سے یہ خالی شب و روز
سانحہ کوئی عجب چاہتے ہیں

ہم بھی کچھ اپنا تکلف چھوڑیں!
وہ بھی کچھ سوءِ ادب چاہتے ہیں

عفران احمد

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد اس صدی کے آغاز میں ایک تابندہ آفتاب بن کر ابھرے اور تقریباً نصف صدی تک برصغیر بلکہ تمام عالمِ اسلام کو اپنے روشن افکار سے فیض پہنچاتے رہے، علم و ادب، صحافت، اسلامیات اور سیاسیات، غرض کہ زندگی کا وہ کون سا اہم شعبہ ہے جسے آزاد کی پردقار اور عظیم شخصیت نے متاثر نہ کیا ہو۔ ان کی شخصیت بیک وقت مقامی بھی ہے ملی اور آفاقی بھی۔ وہ ایک دوراندیش سیاستداں، جلیل القدر عالم، بلند پایہ انشاپرداز اور شعلہ نوا صحافی تھے۔ ان کی تحریروں نے قوم کے تنِ مردہ میں جان ڈالی اور اسے حیاتِ نو کا پیغام دیا۔ ان کے انتقال پر اگرچہ پچیس برس بیت گئے لیکن ان کے سیاسی نظریات اور علمی و ادبی افکار آج بھی تازہ ہیں اور موجودہ دور کے لیے ان میں بہت کچھ ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کی زندگی میں ان کے بارے میں لکھا تھا: "اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالمِ دین اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ و شارح ہیں اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انہوں نے مطلقاً دقت محسوس نہیں کی۔ ان سے کم علم لوگوں کو ہندوستانی زندگیوں کے اتحاد میں ایک باہمی آویزش نظر آتی ہے، لیکن مولانا اس عام سطح سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں اور انہوں نے نہ صرف اس تنوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یک جہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ہندوستان اور اس کی قومی زندگی کی مختلف سمتوں کی نجات اس یک جہتی و اتحاد سے وابستہ ہے۔"

مولانا غلام رسول مہر نے آزاد کی نادر روزگار شخصیت کے بارے میں لکھا ہے۔ "ایسے گوناگوں اوصاف اور محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں انہوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا۔ جن کا حساب مشکل ہے۔ ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے، علم و فضل، حقائقِ دین، فلسفہ و حکمت،

شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری، غرض کہ کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ تھی۔

مولانا آزاد ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے والد مولانا خیرالدین جو ایک صوفی، بزرگ اور جیّد عالم تھے۔ ۱۸۷۰ء میں مکہ معظمہ منتقل ہو گئے تھے، وہاں ان کا مکان باب الاسلام کے سامنے واقع تھا۔ اس جگہ ۱۸۸۸ء میں مولانا آزاد نے جنم لیا۔ ان کی والدہ عرب تھیں۔ والد کی خشک مذہبیت اور اصول پرستانہ زندگی کے برخلاف ان کی والدہ بڑی مہربان اور حلیم طبع خاتون تھیں۔ مولانا آزاد نے غیر معمولی حافظہ پایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی و فارسی کے رسمی علوم کی تکمیل انہوں نے نوعمری ہی میں کر لی تھی۔ ان کے گھرانہ میں عزت و شہرت کی کمی نہ تھی۔ مولانا آزاد چاہتے تو اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پیری مریدی کا طریقہ اختیار کر لیتے۔ یہ راستہ جیسا کہ خود انہوں نے تذکرہ میں لکھا ہے ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔ اصل میں قدرت نے ان کو کسی اور مقصد سے اس دنیا میں بھیجا تھا۔

جب مولانا آزاد چار برس کے تھے تو ان کے والد علاج کی غرض سے کلکتہ واپس آ گئے تھے اس کے بعد طویل مدت تک کلکتہ ہی مولانا کی ادبی، سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ابتدائی زندگی میں مولانا کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں انہوں نے داغ اور امیر مینائی جیسے اساتذہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور ۱۸۹۹ء میں ایک گلدستۂ شاعری "نیرنگ عالم" نکالا۔ اسی برس کلکتہ سے ایک ادبی ماہ نامہ "المصباح" جاری کیا۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ سے ایک نیا ماہنامہ لسان الصدق نکالا۔ اس کے مقاصد میں سماجی اصلاحات، اردو کی ترقی، علمی ذوق کی اشاعت اور تنقید شامل تھی۔ اس کا شمار فوراً صف اول کے رسائل میں ہونے لگا لیکن اٹھارہ ماہ میں اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے بعد مولانا آزاد نے لکھنؤ میں علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ "الندوہ" کی ادارت سنبھالی لیکن چھ ماہ بعد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں امرتسر کے سہ روزہ اخبار وکیل کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی۔ ۱۹۰۸ء میں اس سے الگ ہو گئے۔

مولانا آزاد کی انقلاب آفریں صحافت اور سیاست کا آغاز "الہلال" سے ہوتا ہے۔ ہفت روزہ "الہلال" کا اجراء ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا تھا اس وقت ہندوستان میں آزادی کامل کا دور دور تک تصور نہ تھا اور نہ ہی آزادی کے حصول کے لیے کوئی طاقت ور تحریک موجود تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ اس کے بعد سے لے کر ۱۹۱۲ء تک جتنی بھی تحریکیں ہندوستان

میں ابھریں وہ اصلاحی اور تعلیمی زیادہ تھیں اور سیاسی کم۔ ہندستان پر مکمل غلبہ کے بعد ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک برطانیہ اور یوروپ کی دوسری بڑی طاقتوں کے زیر اثر آگئے تھے؛ ان کا مقابل کوئی نہ تھا۔ اس صورت حال میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ جمال الدین افغانی اور منشی محمد عبدہ خلافت ترکیہ کو سامراج کے مقابلہ میں ایک بڑا قلعہ تصور کرتے تھے۔

سامراج کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں یہ قلعہ جب کمزور ہونے لگا تو اس کے خلاف عالم اسلام کو متحد کرنے کی تحریک شروع کی گئی۔ اس مرحلہ میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا۔ ادھر خلافت ترکیہ کے مقابلہ میں جنگ بلقان چھیڑ دی گئی۔ اس سے سارے عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اس صورت حال میں ہندستان میں برطانوی استعمار کے خلاف ایک خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے جس صور اسرافیل کی ضرورت تھی وہ 'الہلال' نے فراہم کیا۔

'الہلال' نے پہلی بار ہندستانیوں کو احساس دلایا کہ وہ کس خواب غفلت میں پڑے ہیں اور یہ کہ ایشیا میں سامراج کے خلاف انھیں کیا کردار انجام دینا ہے۔ 'الہلال' کی شعلہ نوا تحریروں نے دلوں کو گرمادیا اور آزادی کے طویل سفر کے لیے انھیں آمادہ عمل کردیا۔ 'الہلال' کا یہی ایک کارنامہ انھیں سیاسی رہنماؤں کی صف اول میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے متعلق شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی جیسے عالم دین نے کہا ہے: "ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے۔ جو ہمیں 'الہلال' نے یاد دلایا۔" الہلال کا پہلا دور ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ختم ہوا۔

۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو 'البلاغ' نکالا گیا۔ یہ اخبار ۳۱ر مارچ ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ ۲۰ر جون ۱۹۲۷ء کو پھر 'الہلال' کا اجرا عمل میں آیا اور اسی برس ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہمیشہ کیلئے بند کردیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے تحریر و تقریر اور اپنی سرگرمیوں سے آزادی کی تحریک میں جان ڈال دی۔ اور اس کے لیے متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا شمار ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں میں رہا۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے دلی میں کانگریس کے خاص اجلاس کی صدارت کی۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۶ر جولائی ۱۹۴۶ء تک صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ سیاسی لحاظ سے یہ ملک کا نازک ترین دور تھا۔ برطانیہ سے کرپس مشن اور بعد ازاں کابینہ مشن اس دوران میں آئے اور اپنے ساتھ سیاسی تجاویز لائے۔ ان پر معرکتہ الآرا بحثیں ہوئیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کا ۵۳واں اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ (بہار) میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کے لیے

دستور ساز اسمبلی اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں آزادانہ غور کرنے کی دعوت دی اور اس پر زور دیا کہ ہندوستان کا دستور اساسی' وفاقی اور جمہوری ہوگا۔ جس کے تمام حلقے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے۔ اسی اجلاس میں کانگریس نے جنگ میں برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو زبردستی جھونکنے کے خلاف تاریخی قرارداد منظور کی۔ ۹ اگسٹ ۱۹۴۲ء کو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک مولانا کے دور صدارت کا اہم واقعہ ہے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں تمام قومی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کے ساتھ احمد نگر جیل میں رکھے گئے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سے فروری ۱۹۵۸ء یعنی اپنی وفات تک وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم رہے۔ کابینہ کے تمام اہم سیاسی فیصلوں میں ان کا مشورہ شامل رہا۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا نے کئی تاریخی اصلاحات کیں۔ تعلیم کے معاملے میں وہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے مخالف تھے اور مشرق و مغرب کے تعلیمی نظریات میں ہم آہنگی لانا چاہتے تھے۔ ان کے دور میں متعدد تعلیمی بورڈ یا کمیشن تشکیل دیئے گئے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن' یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی (کھڑگ پور) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ فنون لطیفہ کی ترقی کے لئے ساہتیہ اکاڈمی' سنگیت ناٹک اکاڈمی اور للت کلا اکاڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مولانا آزاد نے ہریجنوں' قبائلی اور پسماندہ طبقوں کے لیے تعلیمی وظائف کی اسکیم جاری کی۔

الہلال اردو صحافت کی آبرو ہے۔ الہلال نے اردو صحافت کو زبان دی۔ دراصل اردو میں جدید صحافت کا آغاز الہلال ہی سے ہوتا ہے اس سے پہلے بھی رسائل اور اخبارات کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان کا دائرہ محدود تھا۔ الہلال اگرچہ ہفت روزہ تھا لیکن اسے مکمل اخبار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ادب' مذہب' سائنس' عمرانیات اور سیاست پر اس کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کا ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہے۔ بے شمار نئی اخباری اصطلاحات اور علمی الفاظ "الہلال" کی دین ہیں اور یہی ایک اخبار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ الہلال کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مدیر کی عصری مسائل پر گرفت ہے۔ ان تحریروں کا امتیاز جوشِ خطابت ہے۔ یہ تند و تیز اور طوفانی لہجہ "الہلال" کے مشن کے لیے ضروری تھا۔ تاہم الہلال کے پہلے دور اور دوسرے دور کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے اسلوب نے ارتقا کی منازل طے کی ہیں۔ اس میں دھیما پن' نکھار' فکر انگیزی اور خیال آفرینی آ گئی۔ ۱۹ ویں صدی کے آخر میں علامہ جمال الدین افغانی نے پیرس سے رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" نکالا تھا۔ اس نے مشرق کو استعمار کے خلاف جھنجھوڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مولانا آزاد کی تحریروں پر اس کا اثر محسوس ہوتا ہے۔" خود مولانا آزاد الہلال کے بارے

میں "ہماری آزادی" میں لکھتے ہیں۔ "الہلال کی اشاعت سے اُردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ پبلک کے لیے باعث کشش صرف اس کی اعلیٰ طباعت نہیں تھی بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔ الہلال نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی۔"

کچھ نقادوں کو شکایت ہے کہ مولانا آزاد کی تحریروں میں عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ ملتے ہیں۔ جن الفاظ کو ثقیل کہا گیا ہے وہ مولانا کے مزاج میں شامل تھے اور اس دور کے پڑھے لکھے طبقے کی روزمرہ کی زبان میں شامل تھے۔ یہ الفاظ صوتی و فضائی لحاظ سے عبارت کا حسن بڑھاتے ہیں اور اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ان کے ہاں طلسم سرائے ہستی، نشۂ نیم شبی، الائے شب، جلوہ یوسفی، شمیم پیراہن جیسی دلکش تراکیب ملتی ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہر ہفتہ ان کی ادبی اور علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے۔"

مولانا آزاد نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ہی ہندو مسلم اتحاد سے کیا تھا۔ ان کی سیاسی فراست نے اس صدی کے آغاز ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ برطانوی سامراج سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد اور خود ملک کی فلاح و بہبود تمام تر ہندو مسلم اتحاد پر منحصر ہے۔

تحریک خلافت کے نتیجے میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے اور زیادہ نزدیک آ گئے تھے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندو مسلم اتحاد کا زریں دور تھا۔ وہ بار بار مسلمانوں کو جھنجھوڑتے تھے اور آزادی کی مشترکہ جنگ میں شرکت کی دعوت دیتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد بھی جب کہ فرقہ وارانہ سیاست نے ملک کی فضا کو مکدر کر دیا تھا اور مسلم لیگ کی طرف سے تقسیم ملک اور جداگانہ انتخابات جیسے مطالبات کیے جا رہے تھے، مولانا آزاد اپنے خیالات پر سختی سے قائم رہے اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی طرف بلاتے رہے۔ ایک موقع پر فرمایا۔

"اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی سے دست بردار ہو جاؤں گا لیکن ہندو مسلم اتحاد کو نہیں چھوڑوں گا، کیونکہ اگر ہمیں آزادی

نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد نہ رہ سکا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔"

الہلال (دور جدید) میں ایک طویل مضمون میں مولانا آزاد نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام اور نیشنلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان کے لئے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رام گڑھ اجلاس ۱۹۴۰ء کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت سے بتایا کہ وطنیت اور اسلامیت کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

انہوں نے اعلان کیا " ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی تعمیر سامانیوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں ہماری شاعری' ہمارا ادب' ہماری معاشرت ہمارا ذوق' ہمارا لباس' ہمارے رسم و رواج اور ہماری آزاد زندگی کی بے شمار حقیقتیں' کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔

یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔

مولانا اسلامی علوم کے ایک جید فاضل تھے۔ 'الہلال' کے بعض گراں قدر مضامین سے اسلامیات پر ان کے عبور کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم اسلامیات میں ان کا امتیازی کارنامہ تفسیر ترجمان القرآن ہے جو ان کی مصروف ترین زندگی کے باعث نامکمل رہی۔ اس تفسیر سے اسلامی علوم میں مولانا کے علمی مقام کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ سورۂ فاتحہ میں خدا کے تصور پر ان کی معرکتہ الآراء بحث الہیات ہر طالب علم کی توجہ اپنی جانب کھینچے گی۔ تفسیر میں وہ ایک طرف اسلاف کی تمام تشریحات کو سامنے رکھتے ہیں اور دوسری طرف دور جدید کا لحاظ کرتے ہوئے معانی و مطالب کی وضاحت کرتے ہیں یہ ایک ایسا نازک کام ہے جس سے بہت ہی کم لوگ سلامت نکال لے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے قلم سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ تفسیر میں جو اسلوب مولانا نے اپنایا ہے وہ عام فہم اور اثر انگیز ہے۔

سرکردہ مصنف مالک رام نے ترجمان القرآن کے اسلوب کے متعلق لکھا ہے۔

" جو لطف زبان و بیان اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ملی وہ کسی پیشرو یا پیرو کے ہاں دیکھنے میں نہ آئی۔"

یوں بھی مولانا آزاد میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ موضوع کے مطابق اسلوب بیان اختیار کرتے تھے۔ ادبی موضوع ہو تو ان کا قلم ادبی گل افشانیوں کے لیے وقف ہوتا تھا۔ مذہبی یا علمی موضوع ہو تو ان کا اسلوب یکسر متین' سنجیدہ اور گہرا ہو جاتا' برصغیر کے کسی اور قلمکار میں یہ

خوبی نہیں ملتی۔

مولانا آزاد نے ادبی موضوع پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن قلعہ احمد نگر میں لکھے گئے خطوط " جو "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہوئے، خود نوشت سوانح حیات تذکرہ اور الہلال کے بعض مضامین ہمارے ادب کا ایک وقیع سرمایہ ہیں اور اردو کی ادبیاتِ عالیہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

" غبارِ خاطر" میں مولانا کی جامع صفات شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے اگر یہ خطوط نہ لکھے جاتے تو اس تہہ در تہہ شخصیت کی ذہنی زندگی کے کئی پہلو ہمیشہ کے لیے ہماری نگاہ سے اوجھل رہ جاتے۔ مولانا کے خطوط کے دوسرے مجموعے بھی شائع ہو گئے ہیں لیکن جو انداز "غبارِ خاطر" کا ہے وہ کہیں اور دیکھنے میں نظر نہیں آتا۔ مولانا غلام رسول مہر "غبارِ خاطر" کے اسلوب پر یوں خیال آرائی کرتے ہیں۔

" غبارِ خاطر" پڑھ کر وادیٔ کشمیر کی ایک نرم رو جوئبار کا احساس ہوتا ہے جس کے دونوں طرف سفید رنگ کے سیدھے سیدھے اور خوشنما درخت ہیں۔"

قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں: " جس طرح غالب نے اپنی نظم میں، اسی طرح مولانا نے اپنی نثر میں کسی دوسرے کے اسلوب نگارش کی تقلید کو گناہ سمجھا ہے یہ کوئی مصنوعی انداز نہیں ہے بلکہ ایک قدرتی انفرادیت ہے اس میں نہ تو کوئی دوسرا ادیب مولانا کا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ان کی انفرادیت اور نہ ان کے آرٹ کو اپنا سکتا ہے۔"

" غبارِ خاطر" میں مولانا کے اسلوب نگارش کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

" انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ (فلسفہ کا ایک مکتبِ فکر) سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور غور کیجئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سروسامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے ہیں اگر یہ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہے۔"

"تذکرہ" میں جو مولانا کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ بلا کی روانی اور دلکشی ہے۔ اس کی تصدیق ذیل کے اقتباس سے ہو سکتی ہے:

" جس حال میں رہے نقص اور ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید اور روشِ عام سے پرہیز جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقشِ قدم رہنما چھوڑا۔"

صاحب حیدرآبادی

دو غزلیں

ہر فسانے کا ہوں عنواں جب جہاں لکھنا مجھے
جلنے والی ہر عمارت کا دھواں لکھنا مجھے

کب وفورِ گُل کے باعث تھی نشیمن کی جگہ
ذکر ہی مقصود ہو تو بے نشاں لکھنا مجھے

مُہر برلبِ شیشۂ مئے کی طرح ہوں ساقیا
جب بھی لکھنا میکدے کا رازداں لکھنا مجھے

مثلِ اشکِ رائگاں اشک رواں بہتے رہے
وقت کے ماتھے پہ عمرِ رائگاں لکھنا مجھے

میری قسمت کا لکھا جیسے کہ پتھر کی لکیر
شوخیٔ تحریر کا رنگِ رواں لکھنا مجھے

آئینہ در آئینہ در آئینہ ہوں فطرتاً
داستاں در داستاں در داستاں لکھنا مجھے

ہوں ہلاکِ خنجرِ بیدادِ ہر دجّالِ دہر
پیش دستِ مہدیٔ آخر الزماں لکھنا مجھے

ہر زمانے نے برابر قتل کے ساماں کئے
راہِ حق میں جادۂ پیغمبراں لکھنا مجھے

کتنے ہی قرطاسِ ابیض سرخ صاحب ہو گئے
کربِ طوفاں کا بحرِ بیکراں لکھنا مجھے

تو نے بھُولے سے کبھی پھینک دیا تھا پتھر
وہ بنا اپنی محبت کی بِنا کا پتھر

کس لیے مجھ کو لگاتا ہے زمانہ ٹھوکر !
کب کسی کے لیے میں راہ کا ٹھہرا پتھر

آپ کی یاد نے جب ہم کو بہت تڑپایا
ہم نے سینے پہ رکھا اور بڑا سا پتھر

محترم جس کو خُدا چاہے کرے اس کی خوشی
بوسہ گاہِ بشرِ پاکاں ہے حرم کا پتھر

اپنی محرومیٔ قسمت کا گلہ کیا کیجیے
موم ہے دستِ ہنرمند میں کیسا پتھر

مجھ کو حیرت ہے تری سنگدلی پر صاحب
پھول سے جسم میں پیدا ہوا کیسا پتھر

عابد صدیقی

سکندر علی وجد

ارضِ دکن کے جن شعراء نے دنیائے ادب کو اپنے شعری اور فکری سرمایہ سے مالا مال کیا ہے ان میں حضرت سکندر علی وجد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

سکندر علی وجد کا شمار اردو شاعری کے باکمال اور منفرد انداز کے شاعروں میں ہوتا ہے وہ گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر روایات کے علمبردار اور عظیم محبِ وطن تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ بھی اس ملک کے وقار کو بلند کیا ہے اور یہاں کے تہذیبی آثار ان کی شاعری کے پیکر میں ڈھل کر زیادہ خوبصورت اور لافانی بن گئے چنانچہ وجد کی شاعری میں اجنتا کا حسن، ایلورہ کا جمال، عثمانیہ یونیورسٹی کا وقار اور ہندوستان کی عظیم تہذیب و تمدن کی سبک اور خوبصورت علامات ملتی ہیں۔

سکندر علی وجد کی موت سے اہلِ دکن ہی کو نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ وجد نے اپنی شخصیت اور شاعری کے ذریعہ ہمارے ادب، تہذیب اور رویوں کو متاثر کیا ہے۔

سکندر علی وجد ۲۲ فروری ۱۹۱۴ء کو بیجاپور میں پیدا ہوئے اورنگ آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پائی اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کا امتحان پاس کرکے حیدرآباد سیول سرویس کے مسابقتی امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا وحیدالدین سلیم جیسے اساتذہ کے خاص شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ وجد جج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور جب ریاستوں کی تشکیل جدید کا مسئلہ آیا تو ان کی خدمات ریاست مہاراشٹر کے تفویض کی گئیں وہاں وہ سشن جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ اپنی ملازمت کے ۲۷ سال کے دوران، وہ قانون کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ شاعری کیلئے اپنا لہو جلاتے رہے۔

۱۹۳۰ء سے ہی انہوں نے شاعری کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" شائع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں سکندر علی وجد مہاراشٹرا انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیے گیے۔ اردو زبان وادب کی سنجیدہ اور پُرخلوص خدمت اور ان کی شاعری نے انھیں ہند وپاک کے ممتاز شعراء کی صف میں لاکھڑا کیدیا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے "پدم شری" کا اعزاز انھیں پیش کیا۔ ۱۹۷۲ء میں سکندر علی وجد ہندستان کے ایوانِ بالا (راجیہ سبھا) کے رُکن نامزد کیے گیے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے نائب صدر اور ۱۹۷۷ء میں انھیں غالب ایوارڈ پیش کیا گیا تھا۔ اس دوران ان کے دو مجموعہ کلام "اوراقِ مصور" اور "بیاضِ مریم" شائع ہوے۔ جواہر لال نہرو نے اوراقِ مصور اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے "بیاضِ مریم" کی رسم اجرار انجام دی۔ ۱۹۸۱ء میں سکندر علی وجد ترقی اردو بورڈ کے صدر بنائے گیے۔ وجد کی شخصیت اور شاعری بڑی دلآویز تھی' گویا ان کی شخصیت' ان کی شاعری کا آئینہ اور شاعری شخصیت کا پرتو تھی۔

وجد کی شاعری میں روحِ عصر کی ترجمانی ملتی ہے۔ انہوں نے غزل کی کلاسیکی شعری روایات کو نیا حسن اور فطری بانکپن دیا اور نظم کو جمالیاتی احساس اور فکر و نظر کی وسعتوں سے مالا مال کیا۔ ان کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی تعبیر ہے۔ وجد نے اردو شاعری میں مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت سے اپنی نظموں کو ایک خوبصورت کلاسیکی انداز دیا ہے۔ تحریکِ آزادی اور ملک کے سیاسی نشیب و فراز اور ہمارے بدلتے ہوے سماجی مسائل وجد کی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے جذب ہوگیے ہیں۔

مزدوروں کا پیغام' تاج محل' مہاتما گاندھی' پیغامِ اقبال جیسی نظمیں ان کے ذہنی سفر اور فنی ارتقاء کی بلندیوں کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ خاص طور پر وجد کی شاہ کار نظم "اجنتا" ہے جو بلاشبہ اردو کی بلند پایہ نظم کہی جاسکتی ہے۔ اس نظم میں وجد نے اجنتا کے نقوش کو لفظوں کا پیرہن دے دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظم "رقاصہ" بھی ان کے احساسِ جمال اور فنی عظمتوں کی دلیل ہے۔

سکندر علی وجد نے محمد قلی قطب شاہ' ولی دکنی' سراج' امجد' مخدوم کے بعد اردو شاعری کو حرکت و انقلاب سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری ہمارے شعر و ادب کا انمول سرمایہ ہے۔ وہ نظموں کے ساتھ ساتھ غزل کے بھی شاعر ہیں اور اپنی غزلوں میں بھی زندگی کا حسن بانٹتے نظر آتے ہیں۔ وجد کی شاعری میں ہمارے عہد کے تصورات اور شعری رویوں کی تصویر ملتی ہے۔ چنانچہ ان کی شاہکار نظم "اجنتا" میں خیال اور معنی آفرینی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ لفظوں کی تراش خراش' لہجہ کی خوبصورتی اور طرزِ اظہار کی نیرنگی' اجنتا کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

چھالوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں
زمانے کی جبیں پہ عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد نے اپنی شاعری کو زندگی کی صداقتوں سے قریب تر کیا تھا۔ انہوں نے شاعری کو ترقی پسند، رجعت پسند اور جدیدیت کے خانوں میں تقسیم کرنے سے احتراز کیا تھا بلکہ ان کے خیال میں شاعری جو فکر کو جھنجوڑ دے اور دل میں ایک شاداب امنگ پیدا کر دے، وہی اچھی شاعری ہے اور ایسی شاعری جو زندگی کے سوز و ساز سے محروم ہے شاعری نہیں لفاظی ہے۔ انہوں نے شاعری کو زندگی کا آئینہ قرار دیا تھا۔ سکندر علی وجد کے افکار پر مخدوم محی الدین کا گہرا اثر موجود تھا چنانچہ ان کی بعض نظموں پر تحقیق کی جائے تو ہمیں مخدوم کے شعری لب و لہجہ کا پر تو صاف طور پر ملتا ہے۔

سکندر علی وجد نے اپنے شاعری کے اظہار کے لیے ایک منفرد انداز اختیار کیا تھا۔ ورنہ اس دور کی شاعری میں یکساں طرز اظہار کی روایت چل پڑی تھی۔ اس ہجوم میں وجد کی اپنی ایک منفرد اور چونکا دینے والی آواز نے ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان کی شاعری احساس زمانہ سے عبارت ہے۔

وجد کی زبان بڑی شگفتہ ہے اور الفاظ کی خوبصورتی دل کی گہرائیوں تک پہونچ کر فکر و احساس کو مسرت و بصیرت فراہم کرتی ہے۔ وجد کی شاعری زندگی کی سچائیوں اور صداقتوں کی تعبیر ہے اس میں ہمیں وہم و خیال نہیں بلکہ حقیقت اور سچائی پوری آب و تاب کے ساتھ ملتی ہے وجد کا قوت مشاہدہ بڑا گہرا اور تیز تھا۔ ان کا ذہن انسانی شعور کا پورا پس منظر سمیٹے ہوا تھا اس لیے ان کی شاعری میں زندگی کی کشاکش کے ساتھ ساتھ تسخیر کائنات کے لیے زمین سے اٹھتا ہوا انسانی ہاتھ، فلک کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ

پیغمبر برحق ہوں جمال ازلی کا!　　ہر شعر میں ایک معجزہ خوش نظری کا

سکندر علی وجد کی شاعری میں وضع داری اور تہذیب کا بانکپن ملتا ہے یہی بانکپن وجد کی

شاعری کے مزاج اور لہجہ کی اساس بن کر ان کی شاعری کو عظمت اور رفعت عطا کرتا ہے۔ وہ احتجاج بھی نہیں کرتے اور نہ ہی انہوں نے پروپگنڈہ کا طریقہ اپنایا ہے بلکہ ان کا جذبۂ تشکیک اور تذبذب انھیں نئی جہانوں کی تلاش پر اکساتا ہے۔

وجدؔ مادرِ جامعہ کے سپوت تھے اور انہوں نے اسی جامعہ سے شعور و فکر کی روشنی حاصل کی۔ ان کے ساتھیوں میں مخدومؔ، اشفاق حسین، شہابؔ، راج بہادر گوڑ اور دوسرے کئی عثمانین شامل تھے۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بے پناہ محبت کی اور اس کے پرستاروں میں شامل رہے۔ چنانچہ اپنی نظم "مزدوروں کے پیغام" میں آرٹس کالج کی خوبصورت عمارت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اسے فن کاری کا ایک عظیم نمونہ قرار دیا۔

مزدوروں کی فن کاری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہم نے نقشِ بوسِ خام نہیں چھوڑا ہے　　کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

سکندر علی وجدؔ اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی نفاستیں اور لطافتیں سمٹ آئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ اپنی شاعری پر ناز بھی کیا ہے کہ

دو سو برس میں وجدؔ "سراج دکنی" کے بعد　　اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ وطن سے ہم

بلاشبہ وجدؔ ارضِ دکن سے جھوم کے اٹھے تھے اور انھیں اس سرزمین پر بھی ناز تھا اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک قطعہ میں کیا تھا ؎

فضا جانفزا، ذرہ ذرہ حسین ہے　　حقیقت میں ملکِ دکن گل زمین ہے
اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے　　تو بے شک یہیں ہے، یہیں ہے، یہیں ہے

سرزمینِ دکن کا یہ قادر الکلام شاعر ۱۶/ مئی ۱۹۸۳ء کو اردو کے لاکھوں پرستاروں کو داغِ مفارقت دے گیا لیکن اس کی شخصیت کے ان مٹ نقوش ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ذہن و دل پر مرتسم رہیں گے۔ جب تک انسانیت، دوستی، شرافت، اخلاص اور وضعداری کی اعلیٰ قدریں ہمارے سماج میں باقی ہیں، وجدؔ کا نام تابندہ رہے گا۔ اور ان کی یادیں تڑپاتی رہیں گی، جب تک اردو زبان رہے گی، وجدؔ کی شاعری زندہ رہے گی جب تک اجنتا کے نقوش کی دلنوازی اور دلبرائی باقی رہے گی۔ "اجنتا" کے شاعر کے فکر و فن کی شمع جلتی رہے گی۔ "آفتابِ تازہ"، "لہو ترنگ"، "بیاضِ مریم" اور "اوراقِ مصور" ہمارے ادب اور شاعری کے وہ صحیفے ہیں جو شعراء کی آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ کا کام کریں گے۔

وقار خلیل

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم فروری: نئے لہجے کے جواں فکر اُردو شاعر جناب محمد مجیب اللہ صدیقی لکچرار ہندی، جو بزمِ اُردو ادب عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر رہ چکے ہیں ان دنوں جی یم سنگھی کالج حیدرآباد کے وائس پرنسپل مقرر ہوئے ہیں۔

• کُل ہند اُردو کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بین نے ایک قرارداد کے ذریعہ وزارتِ تعلیم حکومت ہند سے اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ترقی اُردو بیورو کی ایک شاخ برائے جنوبی ہند کا حیدرآباد میں قیام عمل میں لایا جائے۔ مسٹر جلیل پاشاہ صدر کانفرنس نے اجلاس کی صدارت کی۔

۶/ فروری: ممتاز ترقی پسند صحافی اور ادیب جناب احسن علی مرزا سب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کا بعارضہ قلب اچانک انتقال ہوا جلوسِ جنازہ میں ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں نے شرکت کی، اور مرزا صاحب کی وفات پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا گیا۔

۷/ فروری: ممتاز دانشور پروفیسر سید عالم خوندمیری مرحوم کے مجموعۂ مقالات "پیام عشق" کی رسم اجرا انجمن مہدویہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک علمی اجلاس میں مولانا سید محمد گیلانی نے انجام دی۔ پروفیسر مغنی تبسم، مولوی خدا بخش خوندمیری اور جناب ظہیر الدین احمد صدر اقبال اکیڈیمی نے پروفیسر عالم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر عالم کی فکر اور یاد کو باقی رکھنے کی میں میموریل کیشن اور ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا جانے والا ہے۔

۱۰/ فروری: روزنامہ سیاست کے انتظامیہ اور اسٹاف کی طرف سے جلسۂ تعزیت مرحوم احسن علی مرزا کے موقع پر ان کو ماہ جنوری کو گریجویٹی اور ایک ماہ کی تنخواہ پیش کی گئی اور فیملی ویلفیر ٹرسٹ کے بارے میں فیصلہ لیا گیا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور جناب ذہانت علی بیگ صاحبان نے مرزا مرحوم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

۱۱/ فروری: ریاستی انجمن ترقی اُردو اور ترقی پسند مصنفین کی طرف سے اردو ہال میں منعقدہ جلسۂ تعزیت میں احسن علی مرزا کو معززین نے خراج ادا کیا۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے صدارت کی۔ جناب سید رحمت علی (ایم پی)، ڈاکٹر حسینی شاہد، جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف نے مخاطب کیا۔

• ریاستی اُردو اکیڈمی نے احسن علی مرزا کی وفات پر اظہار الم کرتے ہوئے پسماندوں کو ڈھائی ہزار روپے کی امداد پیش کی۔

• ریاستی اُردو اکیڈمی نے ۱۹۸۳ء کا مخدوم ادبی ایوارڈ برائے صحافت جناب سید وقار الدین ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن کو دینے کا اعلان کیا۔

• ادارۂ معراج ادب اور بزم شاب کی طرف سے صفی اسکول کے شاعر حکیم مرزا سرفراز علی ناوک

مرحوم کے شعری مجموعہ "فرہنگ غزل" کی رسم اجرا کے سلسلے میں ادبی اجلاس اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو اوپن یونیورسٹی حیدرآباد نے رسم اجرا انجام دی۔ جناب صادق نقوی اور مبشر احمد نے ناوک کی شاعری پر مقالے سنائے۔ جناب محمد منظور احمد نے مشاعرہ کی صدارت کی۔ قدیم اور جدید دبستانِ سخن کے شاعروں نے کلام سنایا۔ خورشید جنید نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۲ر فروری: ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۲۲ ویں سالانہ یوم محمد قلی قطب شاہ دو روزہ تقاریب کا افتتاح مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل مسٹر پی شیو شنکر نے گنبد محمد قلی کے وسیع و عریض چبوترہ پر اپنی تقریر سے کیا۔ ابتداً فائن آرٹس اکیڈمی کے فنکاروں امیر محمد خاں، اطہر اور ستیش نے محمد قلی کی مناجات سنائی۔ پھر کرشنا لکھم نے "تلگو قلی" ترانہ سنایا۔ جناب رحمن راج سکینہ معتمد عمومی ادارہ نے استقبالیہ تقریر کی۔ اور جناب حامد علی عباسی صدر ادارہ نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ مسٹر وی۔ نرسمہا راؤ ڈپٹی کمشنر میونسپل کارپوریشن جناب صلاح الدین نیر، محترمہ عزیز النسا صبا نے بانیٔ شہر کو خراج ادا کیا۔ جسٹس محمد رفیع الدین انصاری چیرمین ریاستی اقلیتی کمیشن نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ معزز مقررین نے محمد قلی کے عہد، اس کی شاعری اور حیدرآباد کے روایتی گنگا جمنی کلچر کے تناظر میں اس مقبول عوام تقریب کو قومی یکجہتی کا موثر ذریعہ قرار دیا اور ادارۂ ادبیات اردو کی علمی ادبی اور ہمہ مقصدی سرگرمیوں کو خراج ادا کیا۔ ممتاز حیدرآبادی شعراء کا کلام سازوں پر سنایا گیا۔ عزیز احمد خاں وارثی اور ان کے ساتھیوں نے قوالی کا آئٹم پیش کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم شریک معتمد ادارہ نے شکریہ ادا کیا۔

● یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر گنبد محمد قلی پر سالانہ اجتماعی ظہرانہ اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب علی احمد جلیلی نے صدارت کی۔ ابتداً جناب رحمن راج سکینہ اور جناب سرینواس لاہوٹی شریک معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے خطاب کیا۔ مشاعرہ میں جس کے کنوینر جناب بشیر وارثی تھے، مسرز عابد قادری، منیر الزماں منیر، مسعود عابد، اکبر یوسفی، حبیب علی حبیب، راحت عزمی، راجہ لال راجہ، منوہر لال بہار، صادق نقوی، عباس متقی، اقبال حسین اقبال، اسد انصاری، محمد منظور احمد، قاسم موسوی، شہاب ثاقب، داؤد نصیب، ستار چشتی، بو علی شریف، عشرت سعید شہیدی، قمر رضا، اعظم شفیقی اور معتمد مشاعرہ وقار خلیل نے کلام سنایا۔

۱۳ر فروری: یوم محمد قلی قطب شاہ کا ادبی اجلاس ½ ۵ بجے شام ایوانِ اردو میں منعقد ہوا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو اوپن یونیورسٹی حیدرآباد نے صدارت کی اور کہا کہ یوم محمد قلی تقاریب علمی ادبی اور لسانی اہمیت رکھتی ہیں جنوبی ہند کے ان حکمرانوں نے تصادم کی صورت حال سے گریز کی پالیسی کو اپنا کر انسانی اقدار کو فروغ دیا اس تناظر میں ان کی یاد کو تازہ کرنا اور ماضی کی روایات کو حال پر منکشف کرنا ثقافتی فریضہ کی ادائیگی کے مترادف ہے پروفیسر عمر خاں نے ڈاکٹر زور کی دکنیات

شناسی کو خراج ادا کرتے ہوئے کلیات محمد قلی کی ترتیب و تدوین کو اہم کارنامہ قرار دیا۔ ادبی اجلاس میں قطب شاہی تمدن و ثقافت پر ڈاکٹر دھریندر پرشاد نے جامع اور بسیط مقالہ سنایا۔ پروفیسر گوپال کرشنا صدر شعبۂ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی نے قطب شاہی دور کے جاگیردار امین خان کی مذہبی و ثقافتی و رفاہی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے محمد قلی کی شاعری کے سماجی پہلو پر اظہار خیال کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے محمد قلی معانی کی شاعری اور قطب شاہی کلچر پر سیر حاصل مقالہ سنایا۔ جناب راحت عزمی نے عہد قطب شاہیہ کے آخری پیشوا علامہ ابن خاتون کی شخصیت اور علمی و مذہبی کارناموں پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر سید رحمت علی نے قطب شاہی عہد کے فارسی ادب پر مقالہ پڑھا۔ جناب صادق نقوی لکچرر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے نظامت کی۔ اس جلسہ میں، ابتداً جناب لطیف الدین قادری، مینجنگ ایڈیٹر رہنمائے دکن اور ممتاز ترقی پسند ادیب و صحافی جناب احسن علی مرزا کی وفیات پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

● یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا اختتام ایوانِ اردو میں ۱/۲ ۹ بجے شب منعقدہ یادگار مشاعرہ پر ہوا جس کی صدارت جناب ایم ایل نگم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم نے کی اور جناب رئیس اختر نے نظامت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ وقار خلیل نے محمد قلی پر اپنا سانیٹ سنا کر شعری محفل کو روشن کیا پھر علی الترتیب رئیس اختر، میر الزماں منیر، راجہ لال راجہ قاسم موسوی، راحت عزمی، صلاح الدین نیر، انور ہاشمی، رشید شہیدی، جوہر ہاشمی، علی الدین نوید، سریواستیو عالم اکبر یوسفی، کنول پرشاد کنول، بشیر وارثی، منوہر لال بہار، بانو طاہرہ سعید ڈاکٹر اشرف رفیع، راز عابدی محمد منظور احمد منظور، فیض الحسن خیال الہام واحدی، صادق نقوی، رحمن جامی عزیز النساء صبا، راشد آذر، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی اور ڈاکٹر نگم نے اپنی شاعری سے شائقین کو متاثر کیا۔

۱۴ر فروری: قدیم شعری سرکل کے شاعر جناب کنسراج حیدرآبادی کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوا مرحوم برسوں ادارہ کی شعری محفلوں میں شرکت کرتے رہے۔ خدا مغفرت کرے۔

۱۸ر فروری: گولکنڈہ سوسائٹی کی طرف سے گنبدان قطب شاہی گولکنڈہ پر ایک شعری محفل جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوئی پروفیسر سعید اختر درانی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے علاوہ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر ایم ایل نگم، امیر احمد خسرو، رئیس اختر اور صلاح الدین نیر نے کلام سنایا

۱۹ر فروری: نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبی اجلاس میں برمنگھم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سعید اختر درانی نے "اقبال اور یورپ" کے موضوع پر لکچر دیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جناب محمد منظور احمد نائب نے شکریہ ادا کیا۔

● اقبال اکیڈیمی کی طرف سے پروفیسر درانی کو استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر سعید اختر نے

اقبال پر قیام جرمنی کے تعلقات پر عالمانہ اظہار خیال کیا۔

۲۰ ر فروری : بزم اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کی طرف سے ممتاز ادیب اور محقق جناب کالی داس گپتا رضا (بمبئی) کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے گپتا رضا کی علمی و تحقیقی صلاحیتوں اور اردو شعر و ادب سے ان کی والہانہ رفاقت پر اظہار خوشنودی کیا اور کتب خانہ رضا کو ادبیات کا اہم مرکز قرار دیا جناب حبیب شاکر صدر بزم نے تقریب کی صدارت کی۔

۲۳ ر فروری : ڈاکٹر افضل اقبال لکچرار سکندرآباد کالج کی نئی تحقیقی کتاب "اردو کا پہلا نثری ڈرامہ" شائع ہوئی۔

۲۴ ر فروری : عثمانیہ یونیورسٹی کے خبرنامہ کے مطابق ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر یوسف سرمست کو پروفیسر کے عہدہ پر ترقی دی گئی ہے اور ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کو ریڈر شعبۂ اردو مقرر کیا گیا ہے ادارہ ان اصحاب کو مبارکباد پیش کرتا ہے

۲۵ ر فروری : عثمانیہ یونیورسٹی نے نامور سخنور جناب سید مصلح الدین شاذ تمکنت کو "مخدوم حیات اور کارنامے" پر اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر شاذ نے یہ مقالہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔

● اردو سبھا کا ادبی و شعری اجلاس جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے حضرت شمس الدین محمد فیض کی شاعری پر مقالہ سنایا۔ مسرز یعقوب عمر، داؤد نصیب، جیلانی بیگ صادق، راجہ لال راجہ، وحید الحسن ہاشمی، عبدالقدیر عزم، عابد قادری، دلاور حزیں، سعید فیضانی اور اسمٰعیل ظریف نے کلام سنایا۔

۲۶ ر فروری : اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر گیان استھانہ صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ مسٹر اوم پرکاش نرمل سکریٹری ہندی اکیڈمی نے "جدید ہندی شاعر دشینت کمار کی غزلیں" پر مقالہ اور مسٹر سری نواس لاہوٹی نے "پنڈت ونشی دھر ودیالنکار" پر مضمون سنایا۔ اوم پرکاش نرمل، سری نواس لاہوٹی، منوہر لال بہار، صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد، رؤف خیر، مدن چند مشتی اور حامد مجاز نے کلام سنایا۔



CH 1984

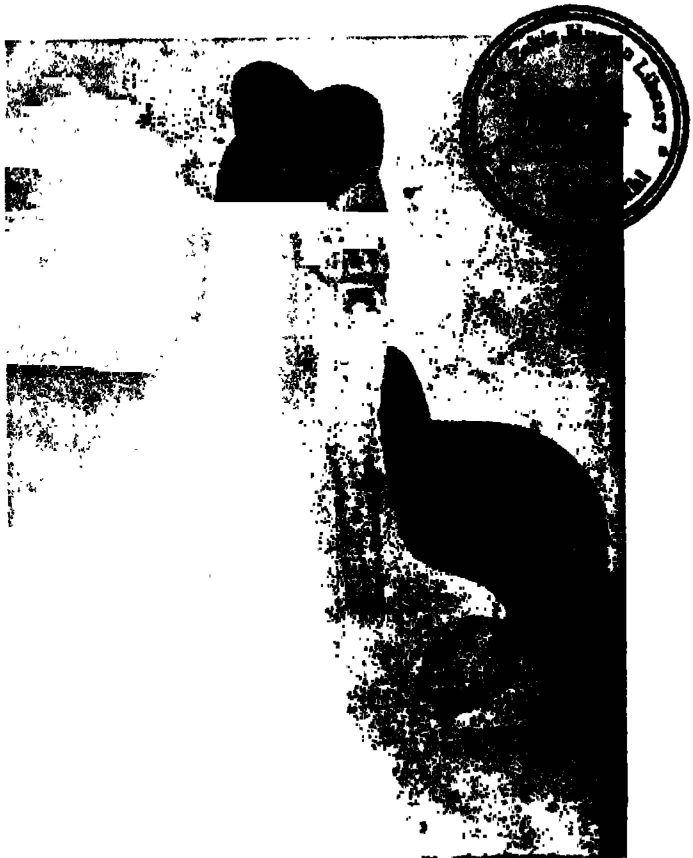
R. N. 10922
Regd. H/HD.

The "SABRAS" Urdu Monthly

gan of "Idara-e-Ad...-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

اسلوب اور ابعاد

... Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد ۴۷ شمارہ ۴ سن اجراء ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

اپریل ۱۹۸۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مجلس مشاورت

صدر: حامد علی عباسی

نائب صدر: ہاشم علی اختر

معتمد: ڈاکٹر مغنی تبسم

ارکان:

پروفیسر سید علی اکبر

عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ

محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ

محمد منظور احمد

مدیر اعزازی: مغنی تبسم

معاون مدیر: وقار خلیل

شریک مدیر: محمد منظور احمد

قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرسالانہ: ۲۰ روپے کتب خانوں سے: ۲۵ روپے

بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے:

ہوائی ڈاک سے:		بحری ڈاک سے:
مشرق وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۱۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان

میں چھپوا کر،

حیدرآباد۔۲ (اے۔ پی)

سے شائع کیا۔

کتابت: رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

سرورق: حضرت میر محمد مومنؒ

ترتیب

اپنی بات

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام حسب روایت قدیم ' یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب ۱۲ر فروری اور ۱۳ر فروری ۱۹۸۴ء کو شاندار طریقے پر منعقد کی گئیں ادبی اجلاس میں جو مضامین پڑھے گئے تھے ان میں سے چند مضامین زیر نظر اشاعت میں شامل ہیں دیگر مضامین آیندہ شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ رام بابو سکسینہ نے محمد قلی کو دکن کا شکسپیئر کہا ہے۔ اس تاجدار شاعر کے کلام کی اہم خصوصیت ' موضوعات کا تنوع ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی رواداری اور رعایا پروری جہانگیر کا انصاف اور شاہجہاں کی طرح فنِ تعمیر کے اعلیٰ ذوق نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ پُر گو شاعر تھا اس کے کلام میں ہندوستان کی فضا ہے۔ اس نے اپنی رعایا کے دلوں پر حکومت کی۔ ادارۂ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر زورؔ نے تقاریب یوم محمد قلی کے ذریعہ محمد قلی کی یاد کو تازہ رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ یہ تقاریب ہر سال پوری سنجیدگی ' دلچسپی اور نہایت سلیقے کے ساتھ منعقد کی جاتی ہیں۔ جن سے اردو دنیا میں محمد قلی کے نام اور کلام کا چرچا ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں "گوشۂ محمد قلی قطب شاہ" کے علاوہ منظومات ' فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں بیگ احساس کی کہانی "بے سورج آسمان" بھی دعوتِ مطالعہ دے رہی ہے۔ نقد و نظر کے عنوان کے تحت چند تبصرے معیاری تصانیف کا تعارف ہیں۔ زبان و ادب کی خدمت " سب رس " کا نصب العین رہا ہے۔ اس ماہنامہ کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں ہمیں قارئین کرام کے گراں قدر اور پرخلوص تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

——— محمد منظور احمد

صادق نقوی

دکھن کی تہذیب و تمدن

قطب شاہوں کی تاریخ کا روشن باب

شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے بانی محمد قلی قطب شاہ کی یاد کو تازہ رکھنے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ عظیم الشان پیمانے پر منایا جاتا ہے۔

تقاریب کے سلسلے کا ایک اہم حصّہ ادبی اجلاس ہے۔ اس سال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ادبی اجلاس کو دکھنی ادب تک محدود رکھنے کے بجائے اسے وسعت دے کر قطب شاہی تہذیب و تمدن کے مختلف ابواب کو اجاگر کیا جائے۔

اسی مناسبت سے اس سال اجلاس میں مختلف مضامین سے تعلق رکھنے والے صاحبانِ قلم و دانشوروں کو مقالے پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ ادبی اجلاس میں جن اسکالرس نے اپنے مقالے پیش فرمائے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ پروفیسر دھرمیندر پرشاد — صدر شعبہ جغرافیہ نظام کالج
۲۔ پروفیسر کرشنا مورتی — صدر شعبہ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی
۳۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی — لکچرار اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۴۔ ڈاکٹر رحمت علی خان — کیپر انچارج شعبہ مخطوطات سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد
۵۔ جناب راحت عزمی ۶۔ جناب منظور احمد

محترم ڈاکٹر [illegible] خان صاحب صدر شعبہ اردو اوپن یونیورسٹی نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ قابل مقالہ نگاروں کے مقالے اسی رسالے میں شائع کئے جا رہے ہیں اس لئے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا ہے۔ آپ خود ہی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ان میں کا ہر مقالہ علمی حیثیت سے بڑا قیمتی اور معیاری ہے۔ لیکن قطب شاہوں کی دکھن دیس کے لئے عظیم خدمات کا احاطہ محال نہیں

کا مشکل ضرور ہے۔ دکھن میں قطب شاہی سلطنت کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب دکھن سیاسی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے کشمکش کی منزل میں تھا۔ بہمنی سلطنت کے زوال اور دکھن میں ابھرنے والی نئی ریاستوں کے قیام نے دکھن کے سیاسی نقشے میں واضح تبدیلیاں لائی تھیں۔ سلطنتوں کے حدود ابھی بنے نہیں تھے اس لئے کشمکش جاری تھی۔ پھر وجے نگر کی ریاست ان ابھرتی ہوئی طاقتوں کے لئے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس سیاسی کشمکش کے ساتھ ساتھ دکھن میں سماجی کشمکش بھی واضح تھی۔

دکھن کا سماج عمودی اور محاذی دونوں سمتوں میں منقسم تھا۔ مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم کے ساتھ ساتھ خود مسلم کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح غیر مسلموں میں کئی ذاتیں اور قبیلے تھے۔ سماج کی دوسری تقسیم ملکی اور غیر ملکی امراء کے درمیان تھی۔ اس ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے سماج کو ایک اکائی میں بدل دینا آسان کام نہ تھا۔ لیکن شاہوں کا دکھن کو سب سے بڑا عطیہ ان کی عطا کی ہوئی تہذیب ہے جس نے بکھرے ہوئے اس سماج میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی۔

قطب شاہوں نے دکھن میں ایک ایسی تہذیب کی بنا ڈالی جو بھائی چارگی، مذہبی رواداری، کشادہ ذہنی پر مبنی تھی۔ انہوں نے اس تہذیب کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس کے فروغ کا اتنا واضح کیا کہ یہ دکھن کے رہنے بسنے والوں کی فطرت بن گئی۔

اس تہذیب کو پھر سے اجاگر کرنا اور دکھن کے رہنے والوں کو پھر سے ان کی روایات کی پاسداری کی طرف راغب کرنا آج کے دور میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یوم محمد قلی قطب شاہ میں جو مقالے پڑھے گئے، ان کا رجحان یہی رہا۔

اجلاس میں حیدرآباد کے صاحبانِ علم، ادیب، شاعر اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور ادبی اجلاس کو ہر طرح سے سراہا۔

اختتام ادبی اجلاس کے بعد "ایوان اردو" میں ۹ بجے شب یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا سالانہ مشاعرہ جناب یم یل نظم، ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ جناب رئیس اختر نے نظامت کی۔ وقار خلیل نے محمد قلی پر اپنے سانیٹ سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ علی الترتیب رئیس اختر، منیر الزماں منیر، راجہ لال راجہ، قاسم موسوی، راحت عزمی، صلاح الدین نیر، انور ہاشمی، رشید شہیدی، جوہر ہاشمی، علی الدین نوید، سریواستوعالم، اکبر یوسفی، کنول پرشاد کنول، بشیر وارثی، منوہر لال بہار، ڈاکٹر ثریا ہر طاہرہ سعید، ڈاکٹر اشرف رفیع، راز عابدی، محمد منظور احمد، فیض الحسن خیال، الہام احمد، صادق نقوی، رحمن جامی، عزیز النساء صبا، راشد آذر، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی اور ڈاکٹر نظم نے کلام سنایا۔

ڈاکٹر رحمت علی خاں

قطب شاہی دور کا فارسی ادب

باعظمت و باوقار قطب شاہی بادشاہوں نے جس خوبی و دانشمندی سے اس سرزمین دکن پر حکومت کی وہ فقید المثال ہے۔ میدان کارزار ہو کہ تہذیب و تمدن، قومی یک جہتی ہو کہ نظم و نثر، ہر میدان میں انہوں نے اپنی بزرگی و برتری کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ میرا آج کا موضوع ہے، قطب شاہی دور میں فارسی زبان و ادب کی ترقی لیکن اپنا مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ اعتراف ضروری و لازمی ہے کہ مندرجہ بالا عنوان پر سب سے اچھا کام ڈاکٹر نجمہ صدیقہ صاحبہ لکچرار فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی نے کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس خاندان کے بانی اور پہلے بادشاہ سلطان قلی قطب الملک ہوا کی کے متعلق مورخ فرشتہ رقمطراز ہے کہ سلاطین بہمنی ہمیشہ اپنے فرامین میں اسے "صاحب السیف والقلم" لکھتے تھے۔ تواریخ میں اس کی بہادری و بلند حوصلگی و عالی ظرفی کے نمونے تو مل جاتے ہیں لیکن کہیں اب تک اس کی نظم و نثر یا فرمان وغیرہ کے نمونے دستیاب نہ ہو سکے۔

حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ سلطان قلی کے بعد اس کا تیسرا لڑکا جمشید قلی قطب شاہ تخت سلطنت پر رونق افروز ہوا۔ اس کی فارسی شاعری اور تاریخی حالات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں فارسی زبان و ادب نے بھرپور ترقی کی ہوگی۔ حضرت علی کی منقبت میں اس نے جو نظم لکھی ہے اس کے چند معرکتہ الآرا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

ای بتو ختم ملک زیبائی   کار عشق از تو یافت بالائی
کاکل و چین زلف و خال رخت   ہر یکی در کمال رعنائی
در رہ عشق ہر کہ پای نہید   آخر او سر کشد بہ رسوائی
من بہ دیوانگی شدم مشہور   تو بخوبی و عالم آرائی

تو ہمان آفتاب سبے ہمتا! من ہمان عاشق تماشائی

ذہنِ عالی میں یہ بات تازہ رہے کہ مندرجہ بالا شوخ و سادہ اشعار ایک منقبت کی تمہید کے ہیں۔ جمشید کے کئی شعر اور قطعات اور بھی ملتے ہیں جن سے اس کی فارسی سے دلبستگی روشن ہے۔ باوجود شاہی مصروفیتوں کے ادبی و علمی کاموں میں حصہ لینا اور خود شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ چہ جائیکہ اتنی سلیس اور عمدہ شاعری کرنا۔ جمشید کے کلام کی ایک خوبی اس کی خودداری و بہادری ہے۔ ادبی دنیا کی دو معروف شخصیتیں مُلّا قاسم طبسی اور شریف قوتی بھی اسی کے دور میں گولکنڈہ آئے۔ مگر ان کی کامیابی کا آفتاب ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہدِ زریں میں بامِ عروج پر آیا۔

جمشید کے بعد کچھ ماہ کے لیے اس کا لڑکا سبحان قلی قطب شاہ نے بادشاہت کی لیکن جلد ہی اس کے چچا ابراہیم قطب شاہ نے جو وجیانگر میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہا تھا، واپس آکر تختِ شاہی پر قبضہ کر لیا۔

یہ بڑا سیاست داں، دانشمند اور بہادر بادشاہ تھا جس نے ادبی حلقوں میں بھی گولکنڈے کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ابراہیم قطب شاہ کے نظم و نثر کے نمونے تو نہیں ملتے مگر اس کی سرپرستی میں فارسی کی جو ترقی ہوئی اس کے کئی ثبوت جا بجا مل جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تلگو زبان و ادب کا اثر و نفوذ بھی اسی کے زمانے سے زیادہ ہوا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشترکہ تہذیب نے بھی اسی دور میں جنم لیا ہو جس نے آگے چل کر محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں معراج پائی۔

اس کے دور کا سب سے اہم کارنامہ "تاریخ قطب شاہی" کا آغاز ہے جو "تاریخ ایلچی نظام شاہ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس فارسی تاریخ کا بہت بڑا لائحہ عمل مرتب کیا گیا اور خیال یہ تھا کہ خورشاہ بن قباد الحسینی اسے دو ضخیم جلدوں پر ترتیب دیں گے۔

جلد اوّل میں آغازِ کائنات تا ختمِ سلطنتِ بہمنی کی عام تاریخ ہوگی اور جلد دوم صرف پانچ دکنی سلطنتوں اور خصوصاً قطب شاہی دور کا احاطہ کرے گی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ پہلی جلد جو بڑے سائز کے زائد از چھ سو اوراق پر مشتمل تھی تیار کر لی گئی مگر کسی وجہ سے جلد دوم منظرِ عام پر نہ آسکی۔ یہ تفصیلی تاریخ بڑی سلیس و فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے اور بہمنی سلاطین کے عہد تک حاوی ہے۔ اس کا قدیم ترین شاہی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں بڑی اچھی حالت میں موجود ہے جو عبداللہ قطب شاہ کی شاہی

لائبریری کے لیے لکھا گیا تھا۔ اسی دور کا دوسرا اہم کارنامہ "انشائے قاسم طبسی" کی ترتیب و تدوین ہے اس مجموعے میں ایسے خطوط اکٹھا ہیں جو یا تو ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے لکھے گئے ہیں یا پھر اس کے نام معنون ہیں۔ یہ نسخہ بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اعلیٰ درجے کی فارسی نثر میں لکھا گیا ہے۔ اس مخطوطے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ملا قاسم طبسی اس کے درباری دبیر رہے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا نسخہ بھی کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

شاعر شریف و قوعی گمان غالب ہے کہ پہلے اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ میر شاہ بھی اسی کا درباری شاعر تھا۔ ان شعراء کا کلام کمیاب ہے۔ ادب و تاریخ سے قطع نظر مذہبیات پر بھی اس دور میں کام ہوا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ خالص شیعہ تھا اور ان ہی علماء کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔ شیعہ مذہب کی تائید میں ایک فارسی رسالہ آج بھی کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تواریخ اس بات پر بھی شاہد ہیں کہ دکھنی اردو کا نشو و نما بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔

ابراہیم قطب شاہ کے فرزند و جانشین محمد قلی قطب شاہ سے عہد قطب شاہی کا سنہری دور شروع ہوتا ہے۔ سیاست، ادب، تعمیرات اور تہذیب و تمدن کے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے جس کی مختصر سی یاد آج بھی شہر حیدرآباد، چار مینار اور دکھنی کلیات محمد قلی قطب شاہ سے تازہ و معطر ہے۔ یہ جہانگیر قطب شاہ آج بھی کئی عشقیہ افسانوں کا مرکزی کردار بنا ہوا ہے خصوصاً حیدرآبادیوں کے لیے تو وہ مثالی بن کر امر ہوگیا ہے۔ یہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا ہم لوگوں پر احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں اس کی یاد تازہ رکھنے کا ایک طریقہ بتلا دیا۔ اس کا فارسی کلام ابھی تک نایاب ہے اور جو کچھ ملتا ہے وہ اتنا ہے کہ اس پر تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے فارسی کلام میں حسن کی دلفریب خوشبو، عشق کی چاشنی اور رنگِ حافظِ شیرازی کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔

چند اشعار دیکھئے —

لطفے نمود و سوے خود آن نازنین بخواند — مارا ز بے وفائی او این گمان نبود

گہے تغافل و گاہے سلام می سوزد — چہ گویمت کہ ظلم و اکرام می سوزد

دلے کز دوست نالان شد پریشان گشت ویران شد　　مسلمانان! مبادا ہیچ کس از دوست فریادی
اے قطب شاہ از عہدِ دلِ خویش چہ گوییم!　　مشتاق ترا ز خویش ندیدیم ندیدیم
من غم عالم ندارم، عاشقی کار منست　　بادشاہِ کشورِ عشقم خدا یار منست
چون محمد قطب شاہ از عشق می گوید سخن　　عاشقان را آرزوے طرزِ گفتارِ منست

قلی قطب شاہ کے عہد میں کئی جید علماء، اطبا، شعرا دربارِ گولکنڈہ و حیدرآباد آئے، ان سب میں مشہور ترین حضرت میر مومن استرآبادی ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے۔ طلب میں "اختیاراتِ قطب شاہی" اور ہیئت و ریاضی میں "رسالہ مقداریہ" آج بھی موجود ہیں "اختیاراتِ قطب شاہی" دراصل مشہور طبی کتاب "اختیاراتِ بدیعی" کی تشریح و تنقید ہے اور سلیس فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اس کا قدیم ترین مطلّا و مذہب شاہی نسخہ اب کتب خانۂ سالار جنگ میوزیم کی زینت بڑھا رہا ہے۔ رسالۂ مقداریہ ریاضی و طب وغیرہ کا ملا جلا رسالہ ہے جو گمان غالب ہے کہ ان ہی کے تحریر میں ہے۔ دو قطب شاہی مواہیر بھی اس پر ثبت ہیں۔ ان کی سیاست دانی و سوجھ بوجھ سے متاثر ہو کر قلی قطب شاہ نے انھیں اپنا وزیر خاص بنایا تھا۔ ان کا مقبرہ آج بھی پرانے شہر میں مرجوعِ خواص و عوام ہے۔

دوسری اہم شخصیت جو گولکنڈہ کے لیے باعث افتخار بنی وہ میرزا محمد امین شہرستانی کی ہے۔ یہ بڑے ماہر ریاضی و محاسب تھے۔ کئی سال بعد یہ حیدرآباد سے ایران واپس گئے لیکن ہندوستان کی کشش نے انھیں دوبارہ شمالی ہندوستان پہنچا دیا جہاں شہنشاہ جہانگیر اور شاہ جہاں نے ان کی بڑی قدر افزائی کی اور بالآخر وہ مغلیہ سلطنت کے میر جملہ ہو گئے۔ ان کا ایک فارسی دیوان اور کئی مثنویات دستیاب ہیں۔ مثنویات سے تصوف اور فلسفہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے دیوان کا تاریخی نام "گلستانِ ناز" ہے۔ نمونے کے لیے دو شعر عرض ہیں، ملحوظ رہے کہ ان کا تخلص "روح الامین" تھا۔

سرفرازی اگر خواہی چو زلفش بر زمین سر نہ　　کہ با افتادگی ہا راہ دارد سرفرازی ہا

در رقص بہ بین قامتِ آن سرو روان را　　داری ہوسِ دیدن اگر جلوۂ جان را

آتش را تیز تر کن آب را بر خاک ریز　　شعلہ مرہم می شود داغِ دلِ پروانہ را

جز طریق عاشقی سوے حقیقت راہ نیست کافرے گر عشق ورزد پیش من گمراہ نیست

اس کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہند ایرانی سبک ہندی کا ایک مایہ ناز شاعر تھا۔ اس دور کے دیگر ممتاز شعراء ہیں: حسین الفرسی، حاجی ابرقوی، شریف کاشانی اور محسن ہمدانی۔ اسی دور میں کئی نامور فارسی علماء و شعراء جیسے کرنسائے میحا کاشی اور کاکی شیرازی وغیرہ بھی چند ماہ کے لیے حیدرآباد آکر واپس چلے گئے۔

چونکہ محمد قلی قطب شاہ اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لیے اس کا جانشین و وارث اس کا بھتیجہ محمد قطب شاہ بن محمد امین ہوا۔ قطب شاہی دور کا یہ واحد بادشاہ ہے جس کا مختصر ہی سہی مگر فارسی دیوان دستیاب ہے۔ اس ناقص الطرفین دیوان کی جو سالار جنگ میوزیم کا ایک انمول رتن ہے اور شاید قدیم ترین بھی، کتابت اوائل سترھویں صدی عیسوی میں ہوئی ہوگی۔ اس دیوان میں اس نے اپنا تخلص "ظل اللہ" اور "سلطان" استعمال کیا ہے۔ اس کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کا پیرو ہے اور رنگ حافظ کو سبک ہندی میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بستہ دارم گر از ابلش شراب زندگی بارد — ز گلبرگ رخ رنگینش آب زندگی بارد
گفتی کہ از غم سلطان چہ باک ... دارد — بیدرد ہمچو خویشم پنداشتی ورفتی
مست از بادہ نیست ... ظل اللہ — سرخوش از بادہ ہائے محبت اوست
از التفات دلبر عالی مقام ما — گردون زد است سکہ شاہی بنام ما
لالہ رویان زخم دہر نجا تم دادند — وز شراب لب خود آب حیاتم دادند

اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکھنی میں بھی شعر کہتا تھا۔

اس کے دور آخر کی مشہور شخصیت ہیں علامہ محمد ابن خاتون عاملی جو محمد قطب شاہ کے دور میں ایران سے گولکنڈہ آئے۔ دبیری کے فرائض انجام دیئے اور بالآخر بہ حیثیت سفیر ایران روانہ کیے گئے اور عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں وزیر اعظم بنے۔ یہ جید عالم اور مدبر اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ادیب و شاعر بھی تھے۔ آپ نے اپنے استاد علامہ بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب کا فارسی ترجمہ کیا، جو حدیث امامیہ کا ایک مستند شرح ہے۔ اس کے بعد آنجہانی نے "کتاب الامامت" سلیس و رواں فارسی

میں لکھی۔ یہ دونوں مخطوطے آج بھی موجود ہیں۔ شاعری کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

یافت تا رتبۂ گدائی تو ! عالمی را خیال شاہی شد

دلا با نیک و بد در ساز و خو کن با شکیبائی که شاخ گل گہے با گل گہے با خار می سازد

بے جہالت کئے دل تاریک ما روشن شود پرتو خورشید باید ظلمت ویرانہ را

محمد قطب شاہ کے دور کا ایک اور یادگار کارنامہ "تاریخ محمد قطب شاہ" کی تالیف ہے۔ مولف کا نام معلوم نہیں لیکن اس میں ابتدائے سلطنت قطب شاہی تا ۵ جلوس محمد قطب شاہ تفصیلی حالات دیئے گئے ہیں۔ تاریخی اور ادبی اہمیت کے قطع نظر اس مخطوطے کی خصوصیت یہ ہے کہ محمد قطب شاہ کے کلام کا کافی انتخاب دیا گیا ہے اور سب سے آخر میں مراد اصفہانی کا ایک قصیدہ در مدح حیدرآباد بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اس دور کے دیگر مشہور فارسی شعرا میں حسینی طبسی، ادای یزدی، عشرتی یزدی اور کوکبی۔

عبداللہ قطب شاہ کے دور سے عہد زوال کا آغاز ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی وجہ صرف عبداللہ قطب شاہ تھا۔ حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ یہ علم و ہنر کا شیدای اور علما اور شعرا کا سرپرست کچھ بھی نہ کر سکا۔ مرہٹوں اور مغلوں کی یورش اور اندرونی پھوٹ نے بالآخر اس سلطنت کو ختم کر دیا۔ عبداللہ قطب شاہ کا دکھنی دیوان تو موجود ہے مگر اس کا فارسی کلام نہیں ملتا۔ البتہ اس دور کے چند مشہور نام پیش کیے جاتے ہیں جنھوں نے فارسی زبان و ادب کی اس دور میں خدمت کی۔

ابن خاتون کا ذکر گذر چکا ہے، دوسری اہم شخصیت محمود حسین تبریزی کی ہے۔ جنھوں نے حیدرآباد میں پہلی مرتبہ فارسی کی ایک ضخیم و جامع لغت مرتب کی۔ یہ وہی لغت ہے کہ جس پر آگے چل کر مرزا غالب نے کئی اعتراضات کئے اور اسے متنازعہ فیہ قرار دیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے ایما ہی پر یہ لغت ترتیب پای تھی۔

ایک اور اہم نام حاجی عبدالعلی طالقانی ہے جو درباری دبیر تھے۔ ان کی کتاب "انشائے طالقانی" دراصل فرامین و خطوط تاریخی کا ایک مجموعہ ہے جو نثر فصیح فارسی میں سمو دیا گیا ہے۔ اسی زمانے کی ایک مشہور تاریخ حدیقۃ السلاطین ہے جس کے مصنف مرزا نظام الدین احمد الصاعدی شیرازی ہیں۔ مخطوطہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھی دو حصوں پر مشتمل رہی ہوگی حصہ اول تو شائع بھی ہوگیا ہے مگر حصہ دوم ہنوز لاپتہ ہے۔ مرزا احمد بھی اسی زمانے کا ایک طنز نگار

تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور کا مشہور شاعر فرج اللہ شوستری ہے جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

مغان کہ زدانۂ انگور آب می سازند　　ستارہ می شکنند' آفتاب می سازند

بے رخت از رنگ خود' گل چون گیاہ افتادہ است　　بو' میان غنچہ چون یوسف بہ چاہ افتادہ است

اسی عہد میں محمد شاہ حمامی شاعر نے "کوک شاستر" کا فارسی ترجمہ کیا۔

ان شعراء و ادباء کے علاوہ فارسی کے کئی شاعر مثلاً میر رضی دانش مشہدی' رونقی ہمدانی' سالک یزدی' حمزہ استرآبادی اور سعید کاشانی یہاں رہے اور ترقی کی۔

آخری تاجدار گولکنڈہ ابوالحسن تاناشاہ کا دور بڑا پُرآشوب رہا لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ اسی دور میں ایک ایسا تذکرہ لکھا گیا جس نے رہتی دنیا تک قطب شاہوں اور ان کے امراء کے نام کو بقائے دوام بخش دی۔ ہمارا اشارہ "حدائق السلاطین فی کلام الخواقین" کی طرف ہے جسے علی بن طیفور بسطامی نے ترتیب دیا۔ اگر یہ تذکرہ نہ ہوتا تو ہم دکن کے کئی سلاطین و امراء کے فارسی کلام سے محروم رہ جاتے۔ یہ عام ہندوستانی فارسی طرز میں لکھا گیا ہے جس کا اصلی نسخہ اب نہیں ملتا۔

کتب خانہ سالار جنگ کا نسخہ تقریباً ۱۹ ویں صدی عیسوی کا ہے۔ علی بن طیفور کی دو اور تصانیف آج بھی دستیاب ہیں۔ اسی دور کے دو اور شاعر ہیں:

وحشی کاشانی و تجلی اصفہانی۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

محمد قلی کی شاعری کا سماجی پہلو

ویسے شاعری خصوصاً اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا اس وجہ سے نہیں کہ وہ ایک عالی مرتبت حکمران تھا بلکہ اُردو زبان و ادب کے اولین معماروں اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل شاعروں، ادیبوں کا مربی و سرپرست ہوتے ہوئے خود بھی ایک قادر الکلام شاعر تھا جس نے لشکری زبان کی بُن بنیاد ہی سے اس کی ترقی و ترویج میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی اور اس زبان کے سرمایہ میں اپنے جواہراتِ تخیل کے وہ گہر آب دار جمع کر دیے کہ اس زبان و ادب کا دامن اس گرانبہا دولت سے مالا مال ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان ہمہ گیر آفاقیت کی حامل ہو گئی۔

کسی بھی زبان کی توسیع و اشاعت میں جہاں داخلی تحریکیں کام کرتی ہیں وہاں بیرونی عوامل بھی سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ پھر انفرادی حیثیتیں، فعال شخصیتیں اس کے سنوارنے، نکھارنے میں، بڑی کارگر، موثر اور ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اُردو زبان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ اس زبان کی شروعات اور پھیلاؤ سے متعلق مختلف نظریات کے باوصف دکن میں جب اس کو شاہان عادل شاہیہ و قطب شاہیہ کی سرپرستی حاصل ہوئی تو اس نے اپنے جوہر نکالے۔

دکن میں یہ زبان عوام و خواص اور خود شاہوں کی چہیتی، من پسند زبان تھی۔ ان لوگوں نے اس زبان ہی میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اور اس میں ایک طرح کی طمانیت، سکون و آسودگی محسوس کی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو تو اس زبان سے ایک والہانہ عشق تھا۔ حسن و عشق کے متوالے اس بادشاہ نے اس زبان کے ذریعے اپنے عشق اور حسن پرستی کو دوامی رنگ بخشا۔ اس کی شاعری کا سب سے اہم پہلو اس کے شاعرانہ خیالات ہے۔ جمالیات

کے ہمراہ سماجیات کا اظہار ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ، علم و فضل میں یگانہ، روزگار کھیل کود کا شائق تھا جس نے مطالعہ و مشاہدہ کا خوگر تھا۔ اظہارِ خیال کی آزاد مشربی سے واقف بیار نویس بھی، اصنافِ شاعری میں شاید ہی کسی صنفِ سخن پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو بالخصوص اس قدیم زبان یا دکنی شاعری میں مشابہات کے موضوع پر اس سے قبل کوئی اور ایسی شخصیت نہیں دکھائی دیتی، جس نے زبان و بیان کے ان ابتدائی مرحلوں میں نغماتی (LYRIC) اور موضوعاتی (SUB-JECTIVE) نظموں کی فراوانی میں تغزل کا رنگ، جمالیاتی حسیات، حقیقت پسندانہ پیرائے کے دوش بدوش رسم و رواج عوامی تقریبات پر بڑی چابکدستی و مہارت سے قلم اٹھایا ہے اس ضمن میں کلیاتِ محمد قلی کے اولین مرتب ڈاکٹر زور تحریر کرتے ہیں:

> اس عظیم الشان شاعر کے کلام میں غریبوں کی زندگی عوام کے معتقدات، عقیدوں اور تہواروں، کھیل کود اور تماشاؤں، بازاروں اور بیوپاروں ہندوؤں، مسلمانوں سبھی عام رسموں اور رواجوں کی جھلکیاں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں اس نے ایسے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، جن پر مسلم شاعر مشکل نظر نہیں پڑتی۔ (کلیاتِ محمد قلی صفحہ ۲۰)

دراصل شاعری میں قوتِ متخیلہ اور محاکات کا معاملہ ہمیشہ وجدانِ طبع اور مذاق سخن کا مرہونِ منت رہا ہے اور یہ باتیں راست احساس اور مشاہدے سے متعلق رہی ہیں نیز زبان و بیان پر کامل دسترس اس کا خاصہ ہوگا۔ شاعر کے ہاں انفرادی جذبہ یا خیال یا تاثر کا قرینہ بڑی حد تک ذاتی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے جذبات اجتماعی حسن و خوبی سے مبرا بھی نہیں ہوتے۔ سماجیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ فرد کی حرکات و سکنات، اس کی سرگرمیاں، اس کے جذبات اور تاثرات سماجی ماحول ہی کے پروردہ ہوتے ہیں۔ اس کے خالص شخصی، نجی اور ذاتی رجحانات بھی اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ ان تمام معاملات میں ترقی یا تنزل کا باعث بھی یہی ماحول ہوگا یعنی فرد کی جسمانی ذہنی کیفیات و خصوصیات کی نشوونما راست سماج ہی سے متعلق رہی ہے۔

گویا تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت کی اساس انسانی طرزِ معاشرت، رہن سہن، نشست و برخاست، زبان و ادب کا سماج سے گہرا بلاواسطہ تعلق ہے اور اگر کوئی فرد اپنی ذات کو ملک و قوم کیلئے وقف کر دے اس کی تمام اعلیٰ قدروں کو اپنا سرمایہ افتخار بنا لے تو یہ اس کی زندگی کا واضح سماجی پہلو ہوگا۔ گو یہ ساری باتیں ہمیں تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہو جاتی ہیں، لیکن جہاں تک

تاریخ نویسی کا معاملہ ہے، مورخین نے اسے واقعات کی کھتونی سے سوا نہ رکھا اُن پر تنقید یا تنقیص کو کبھی اپنا منصب نہ جانا' بالفاظ دیگر تاریخ انسانی اعمال و افعال کے ایسے داخلی اور خارجی تذکرہ کا نام ہے جس میں حقیقت نگاری اور افسانوی دونوں طرح کے اسلوب ملتے ہیں' ان پر جذباتیت کی بھی چھاپ ہوتی ہے مگر ادب و شاعری تاریخ نہیں' یہ فکری ہیجانی سے مملو تہذیبی تہذیب و تمدن کی سچی داستان کے اعلیٰ ترین اظہار کا دوسرا نام ہے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ان ہی سچی داستانوں کو اپنی شاعری کا میڈیم (MEDIUM) واسطہ اور ذریعہ بنایا ہے۔ اپنے تیس سالہ دورِ حکومت میں اس نے قدیم اردو یا دکنی زبان کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ وہ بامِ عروج پر پہنچ گئی۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری میں جن موضوعات کو نظم کے دائرہ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے' وہ خالصتاً زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور ان کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ عوامی رسم و رواج سے ہے۔ اس کی نظموں میں جہاں موضوعات کی رنگینی ہے وہیں ان موضوعات کی مناسبت سے الفاظ کا برتاؤ' جذبات کا رچاؤ ملتا ہے۔ شاید وقت' مزاج اور موقعہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے موزونیت سے اپنے تخلص بھی بدلے۔ چنانچہ کلیاتِ محمد قلی میں اس کے کوئی (۱۷) تخلص بتلائے گئے ہیں۔ اتنے سارے تخلص کا اختیار کرنا ایک لایعنی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ محمد قلی نے اتنے سارے تخلص استعمال کئے ہوں یا نہ کئے ہوں' قطب شاہ معانی اور ترکمان جیسے تخلص یقیناً اس کے اندازِ فکر' اسلوب' آہنگ اور اس کی ہمہ رنگ طبیعت کے آئینہ دار ضرور ہیں۔

محمد قلی کے کلام میں سادگی اور اپنائیت کا جو تلازمہ (ASSOCIATION) ملتا ہے وہ انوکھا ہی نہیں بلکہ بڑا متنوع بھی ہے۔ عیش و عشرت کی فراوانی انسان کو مختلف مشاغل کا عادی بنادیتی ہے۔ ایسے وقتوں میں انسان کا جمالیاتی و روحانی ذوق و شوق بڑی شدت سے اُبھر آتا ہے' اس منزل پر مختلف طبائع' مختلف جہتوں میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں' ان میں شاعری بھی ایک ایسے ہی جذبہ کا نام ہے جو لذت و آسودگی اور تسکین سے عبارت ہے اس میں کسی جذبہ اور احساس کا بار بار اعادہ ممکن ہے یہ تہذیب النفس اور شائستگی آفاقیت سکھاتی ہے چنانچہ محمد قلی نے شاعری کو اپنے مزاج بلکہ اپنی روح سے ہم آہنگ کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں اگر ایک طرف جدت طرازی معنی آفرینی کا تیکھا پن ملتا ہے تو دوسری جانب

شاہانہ طمطراق' جمالیاتی ذوق وشوق بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے سارے کلام پر ریختہ شریفیت کے ساتھ ساتھ مقامی تہذیب و معاشرت کے واضح نقوش دکھائی دیتے ہیں جس کو دیکھنے سے اس دور کے طور طریق' عوام اور ان کا مزاج شاہانہ سرپرستیوں کا ایک مرقع نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی کو اپنے احساسات' مشاہدات اور تجربات کی اساس بنایا ہے اس کے کلام کا بیشتر حصہ خارجی موضوعات کا حامل ہے لیکن اس میں بھی جو داخلیت ملتی ہے وہ انوکھی اور دلاویز ہے۔

مثلاً شادی بیاہ کے موقعے پر رسموں' رواجوں کی دھوم دھام اور اس کی کیفیتوں کو محمد قلی نے بڑے چاؤ سے برتا ہے۔ یہ رسمیں دکن کی تہذیب میں کچھ اس قدر قبول عام کی سند پا گئی ہیں کہ ان چیزوں سے چشم پوشی کر لی جائے تو خوشیوں اور مسرتوں میں کسی شے کے کھو جانے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ محمد قلی نے ان خوشگوار لمحوں اور کیفیات کی ادائگی میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں دکھائی دیتا بلکہ ان موضوعات کے اظہار میں نسوانی خواہشات' حسن و رعنائی اور اس کی تمام تر خوبیوں' نزاکتوں کا خیال رکھا۔ جلوہ کی رسم سے متعلق اس کا خیال دیکھئے ۔

پرم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے ۔۔۔ اسے چند سور سوں پیاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھل مسک پکلے ہیں ۔۔۔ سہیلیاں آرتی تارے سے نوارے
رچیا' وو تخت جلوے کا خوشی سوں ۔۔۔ کہ چوندھر چدرک موتیاں سوں سنوارے
چڑا و تیل اب ساتو سہاگاں ۔۔۔ مشاطہ ہو کے زہرہ ہت نگارے
پلا شربت دیلو و ہاتاں میں بیڑے ۔۔۔ بندا و ساڑیاں موتیاں کنارے

سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کے اولین شاعروں میں بھی مہتم بالشان تھا اور آج بھی اس کی یہ انفرادیت باقی ہے زمانہ کے بُعد و قدامت کے باوجود آج بھی وہ اپنے کلام کے ذریعہ داد و تحسین حاصل کرتا ہے۔ محمد قلی کی شاعری اصل میں جذبات و احساسات کی زبان' روشنی دل و نگاہ کی ترجمان ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز' فکر کی گہرائی' درد و غم کی فراوانی ہے نہ قنوطیت بلکہ اس کا کلام عیش و نشاط' راگ و رنگ کی رعنائی اور تازگی' سیرابی و سرمستی کا نمائندہ ہے۔

گو تہذیب و تمدن کی وہ جھلکیاں جو ہمیں ماضی کی عظمت اور اس عظیم ورثہ کی جانب توجہ دلاتی ہیں' اس کے کلام میں جا بجا بکھری پڑی ہیں جس سے یگانگت' بھائی چارگی' ہمدردی' پاس و لحاظ' ادب و احترام اور ایسے ہی لا تعداد جذبوں کی تصویر ابھرآتی ہے دراصل محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا رسیا

اسلام پرستار تھا۔ اس کی رگ و پے میں ہندوستانی تہذیب رچی بسی تھی وہ ایک تلنگی "بھاگیہ رتی" کا بیٹا تھا اتحاد پسندی اور رواداری اسے ورثہ میں ملی تھی اسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب سے وہی مناسبت تھی جو کبھی اکبر اعظم اور امیر خسرو کو تھی اگر ہم پچھلی تہذیبوں کے متعلق کچھ بات کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ ان سے ہمارا تہذیبی اور ثقافتی رشتہ ہے اور ہم اس دور کی عظیم شخصیتوں، ان کے کارناموں سے زیادہ ان کی اعلیٰ تخلیقی وتنظیمی قدروں، اصولوں و ضوابط سے استفادہ کرتے ہیں، چنانچہ محمد قلی نے اسلامی عیدوں کے متوازی ہندوستانی عوام کے طور طریقے، رسومات، معتقدات اور توہمات کے ساتھ ساتھ ان کے عیدوں، تہواروں، کھیلوں، تماشوں، موسموں وغیرہ کے بارے میں بیشتر نظمیں کہی ہیں جیسے بسنت، نوروز، آمد برسات، دیوالی، سالگرہ جلوہ وغیرہ۔ یہ نظمیں ملک میں بسنے والے مختلف طبقوں اور گروہوں کی خوشنودی کیلئے بھی ہوتیں اور طبیعت کی سرخوشی کے لئے بھی۔ ان نظموں کے ذریعہ غیر مذہب کے عوام سے روادارانہ سلوک، رسم و راہ، ان کے خوشیوں غموں میں شرکت، ان کے تحفظ کا خیال، غرض بہت سازی ایسی باتیں ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد قلی عوام و خواص کے مابین کوئی حد فاصل نہیں رکھنا چاہتا تھا وہ اس مشترکہ تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا جو صحیح معنوں میں بہمنی بادشاہوں کی دین تھی دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین یگانگت، اتحاد اور اخوت پیدا کرنے کی جو مثبت کوشش شاہان بہمنیہ نے کی تھی وہ گولکنڈہ میں پروان چڑھی، علی الخصوص محمد قلی نے اس کو کمال واوج پر پہنچایا۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک بیدار مغز بادشاہ بھی تھا جس نے ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا۔ وہ ملک کو امن و آشتی، علم و ادب کا گہوارہ بنانا چاہتا تھا، جس سے قومی یکجہتی کا جذبہ ابھرا ہو، اس کی شاعری میں مذہبی رنگ ہوتے ہوئے بھی تنگ نظری، عصبیت نام کو نہیں تھی بلکہ مذہبی عقائد کے قطع نظر رحم دلی، عفو درگذر، بےلوث چاہت، جذبۂ ایثار و قربانی، سچائی، نیکی اور محبت، رواداری کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک انسان دوست، آفاقی فکر و نظر کا حامل شاعر اور حکمران رہا، جس کے ہاں انسانی جذبات کا احترام ان کی قدر و منزلت ہے۔ احترام آدمیت کا وصف، محمد قلی کی شاعری کا نقطۂ عروج ہے، اس نے اپنے دور کے علمی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی، ذہنی، نفسیاتی پس منظر اور پیش منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کے شعور و احساس کی فنکاری کو پیدا کیا۔ محمد قلی گولکنڈہ یا قطب شاہی تمدن و معاشرت کا ایک ایسا عظیم تعمیرکار ہے جس کے عہد میں عوامی رسم و رواج کو غیر معمولی بڑھاوا ملا اور یا تو رسوم تو اس کے بعد بھی،

صدیوں تک باقی رہے اور بعض خالص ہندوستانی تہواروں کو اس نے بین قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا۔ اس سے اس کی رنگا رنگ شخصیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس تہذیب کو آج دکنی تہذیب و معاشرت کہا جاتا ہے وہ اسی متوالے حکمراں شاعر کی دین ہے۔ قدیم زمانے میں سماجی زندگی دو الگ الگ گروہوں یا جماعتوں میں تقسیم تھی ایک اعلیٰ طبقہ جس کا تعلق بادشاہ وقت سے ہوتا، دوسرا [illegible] گروہ جو علاقائی رہن سہن اور زبان کا عادی ہوتا تھا اپنے جذبات و احساسات کو اپنے مخصوص طرز و انداز کے ذریعے ظاہر کرتا تھا۔ محمد قلی نے ان دونوں طبقوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مشترک انداز و لہجہ میں خواص کی روایت کو عوامی سطح پر لے آنے کی کامیاب کوشش کی جہاں عوام اور خواص دونوں فکر و اظہار میں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس سماجی میل جول اس کی ترویج و توسیع سے اس کا منشا یہ تھا کہ اہل ملک کو سال بھر میں مختلف مواقع حاصل ہوں جن میں وہ خوشی و انبساط کے جذبات کا اظہار کر سکیں اس کے لئے محمد قلی نے سرکاری طور پر سال بھر کے لئے بارہ چودہ ایسی تقریبوں کو مقرر کیا جو سرکاری اہتمام سے منائی جاتی تھیں۔ ان میں عید میلاد، عید بعثت نبی، عید مولود کعبہ، عید غدیر، شب برات، شب معراج، عید رمضان، عید الضحیٰ یا بقرعید، مرگ سال یا آغاز برسات، نوروز، بسنت، سالگرہ وغیرہ۔ ان تقریبات میں موخرالذکر چار تقریبوں میں لوگ بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوتے تھے۔ ان عوامی جشنوں کے بارے میں اس کے کلیات میں متعدد نظمیں ملتی ہیں یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی شاعری کو صرف ادب کے مخصوص اصناف تک محدود نہ رکھا بلکہ حیات و کائنات کی ہر چھوٹی بڑی اہم اور بسا اوقات غیر اہم بات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ اس کا یہی انداز و اسلوب فکر و نظر کے اعلیٰ تخیلاتی عمل نے اسے سرزمین دکن ہی نہیں، بلکہ اردو کا عظیم شاعر بنا دیا۔ بسنت سے متعلق شعر دیکھئے ؎

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا　　　تمہیں میں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجناں یوں　　　کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نچھل کندن کے تھالے رنگ جھوٹا　　　بندی ہوں چھند بند سوں کر سنگارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ　　　رنگیلا ہور ہیا ترلوک سارا

جت مانگ ہوں بسنت کے گل کھلے عالم منے　　　پھل بسنت تھے سب فلک لال رنگ چھایا بسنت
کریں جل رقص آ حوراں ہر ایک نرل چند سوداں　　　جھلکے ہر طرف نوراں سو تن ابھرن کے جو ہر سوراں

(باقی صفحہ ۳۵ پر دیکھئے)

سب رس

عہدِ قطب شاہیہ کے پیشوا

علامہ ابنِ خاتون

قطب شاہوں کا مزاجِ حکمرانی سب سے جدا تھا۔ وہ جسموں کے بجائے دلوں پر حکومت کرتے تھے اس لئے ان کا مسلک یہ تھا کہ ان بیروں کو تراشے جن اللہ کے نیک بندوں نے اپنا حق لوٹ لیا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ قدرت نے ان بادشاہوں کے سینے میں محض دل نہیں رکھے تھے بلکہ پیار اور محبت کی شراب سے چھلکتے ہوئے پیمانے جڑ دیئے تھے۔ ان کے گدازِ قلب کا یہ عالم تھا کہ کسی کے چوٹ لگتی ان کی آنکھ بھر آتی۔ ان سب کی آرزو یہی تھی کہ ان کے ممالکِ محروسہ میں ہر طرف انسان ہی انسان نظر آئیں جیسا کہ محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد کے لبوں پر اس طرح دعا بن کر آئی ہے

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر رکھیا جوں توں دریا میں مِن یا سمیع

یہ بادشاہ اپنے اور عوام کے درمیان راجا اور رعایا کے مقابلے میں ماں باپ اور اولاد کے رشتہ کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ فطرتاً انسان دوست تھے۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کون کس فکر و خیال اور عقیدہ و مذہب کا ہے۔

سلاطینِ قطب شاہیہ کٹر مذہبی تھے۔ اسی لیے وہ زیادہ سیکولر ذہن کے حامل تھے۔ انسانوں سے محبت کرنا اور انہیں ٹوٹ کر چاہنا بھی دراصل اسی مذہبی کٹرپن کا ایک رخ ہے کیونکہ انہوں نے مذہب کی روح کو ایسی بلندی اور وسعتِ نظر سے دیکھا تھا، جس بلند نگاہی اور وسیع النظری سے وہ دیکھے جانے کا مستحق تھا۔ "سب اللہ کے بندے ہیں" یہ حقیقت ان کے ذہنوں میں پیوست تھی۔ "جس کا دین اس کو پیارا" ان کی فکر کا بنیادی اصول تھا۔ اسی لیے ان کے ابرِ کرم کی بارش سے بارانِ رحمت کی طرح سب ہی یکساں طور سیراب ہو رہے تھے۔ وہ انسانوں کو خانوں میں بانٹنے کے کبھی قائل نہیں رہے۔

چونکہ یہ سلاطین اونچے درجے کے صاحبِ علم تھے انہوں نے دکن کی تہذیب وثقافت

کو پیار کے رس سے گوندھ کر سنوارا تھا اسی لیے آج بھی دکنی تمدن میں شائستگی کے ساتھ پیار کی خوشبو بھی ہے۔

ان بادشاہوں کی نگاہیں نفسیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر بڑی گہری تھیں۔ وہ سماج کے نازک، حساس اور پیچیدہ مسائل کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرتے تھے انہوں نے تمام مذاہب کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا جائزہ لیا۔ ان کے برتاؤ کے سلیقہ کو سمجھا۔ اس کے بعد اپنی منصوبہ بند تمدنی قدروں کو ان مذہبی اقدار کی روشنی میں رائج کرنے کے عملی پہلو بڑی خوبصورتی سے وضع کیے۔ دکنی تمدن کا جائزہ لیجئے۔ یہاں سب لوگ اپنے اپنے عقیدوں پر سختی سے قائم رہتے ہوئے بھی باہم شیر و شکر نظر آئیں گے۔

تمدنی اقدار کو جاوداں بنانے کے لیے انہوں نے غم کو مرکزی حیثیت دی کیوں کہ دل کا گداز غم سے عبارت ہوتا ہے۔ اس گداز میں وہ مقناطیسیت ہوتی ہے جو ہر انسان دوست ذہن کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہاں کے عہدوں، تہواروں، جاتراؤں اور عرسوں میں ہندو مسلم یگانگت کے جو مظاہرے نظر آتے ہیں وہ قطب شاہی تہذیب کا حاصل ہیں۔

روزمرہ زندگی میں بھی دکن دیس میں میل ملاپ، اخوت و برادری، دوستی اور بھائی چارگی جس بلندی سے یک قومی نظریہ پر ایقان کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ آج کے قومی یکجہتی کے فلسفے سے زیادہ متاثر کن ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں کی پیچیدہ دیواروں، شیر سنگھ اور شیر خان، محبوب نارائن اور محبوب حسین جیسے ناموں کے اشتراک سے یک قومی جذبہ کی جو روشنی پھوٹ رہی ہے، اس کی چکاچوند اتحاد کے کسی اور نقطۂ نظر میں دکھائی نہیں دیتی۔

یہ صحیح ہے کہ جوہر کی عطا قدرت کے ہاتھ ہے۔ "خدا کی دین [illegible] ہے جسے دے" لیکن الماس خلقی کو تراشش کر جگمگا دینا، ماہرینِ فن کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ چنانچہ ان سلاطین کے جوہرِ انسانیت کو چمکانے میں حضرت میر محمد مومن استرآبادی علیہ رحمۃ اور علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی بڑی کاوشیں رہیں۔ یہ قلندر صفت بزرگوار وہ تھے جن کے قدموں پر دنیا لوٹ لوٹ کر ان کی طرف دیکھنے کی آرزومند تھی اور وہ اسے ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتے تھے۔

[illegible] حضرت میر محمد مومن جیسی [illegible] شخصیت کے [illegible] شاگرد تھے انہوں نے علم و فن کی خاموش خدمت کی ہے۔ خصوصاً علم کی ترویج اور نشر و اشاعت میں زندگی بھر سرگرم رہے۔ [illegible] کا ابتدائی تعارف کرایا [illegible] بہت ہی محدود ہے۔ [illegible] کرتے ہیں ہی ہوگی۔

[illegible] شمس الدین [illegible] ابن خاتون [illegible] ہے۔ سنہ پیدائش تو

کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا البتہ اتنی صراحت کردی ہے کہ آپ جبل عامل (عراق) کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے۔ "شمس الدین ابوالمعالی محمد معروف بہ علامہ ابن خاتون در قریہ جبل عامل در دنیا آمد۔"

(نظم و نثر در زمان قطب شاہی ص ۱۷۷)

آپ اونچے اور علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی والدہ مجتہد عصر علامہ شیخ بہاؤ الدین آملی کی بہن تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنی والدہ کی نسبت سے آپ ابن خاتون کہلاتے ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ

سبب نسبت بہ خاتون آنست کہ یکی از سلاطین دختر خود
را بہ یکی از آبار ایشان داده بود و ایشان از نسل آن خاتون اند } ایضاً ص ۱۷۷

صاحب حدایق السلاطین یوں رقم طراز ہیں: "گویند کہ چون جد بزرگوار شیخ عالی مقدار یکی از خواتین قبیلۂ نامدار بحبالہ نکاح داشتند از آن زمان در میان آن تازیان آن طبقہ با بن خاتون ملقب گشتند۔" (مخطوطہ ورق ۱۹۴ ل)

علامہ ابن خاتون نے اصفہان یا مشہد میں علوم متداولہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ آپ اپنے ماموں علامہ شیخ بہاء الدین کے خاص شاگرد بھی تھے اور چہیتے داماد بھی تھے۔ تحصیل علم کے بعد آپ گولکنڈہ آئے۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر نے لکھا ہے کہ "در اصفہان تحصیلات را تمام کردہ و در سنہ ۱۰۰۹ ہجری بہ گولکنڈہ رسید۔"

حدایق السلاطین میں ہے: "از زمرہ علمای دانشور و فرقۂ فضلای بلاغت گستر بود۔ علوم دینی و معارف یقینی را اکثر در مشہد مقدس منور رضویہ تلمذ از خاتم المجتہدین شیخ بہاؤ الدین .... استفادہ نمودہ .... مجملاً جناب شیخ ...... از مشہد رضویہ بجانب دکن شتافتہ در سنہ ہزار و نہ داخل بلدہ حیدرآباد بر حسب تقدیر در سلک خواص ملازمان سلسلہ ... قطب شاہیہ اختصاص یافت　　(ورق ۱۹۴ ب)

اس زمانہ میں مسند حکومت پر مجتہد بادشاہ محمد قطب شاہ متمکن تھا۔ یہ بادشاہ بڑا علم پرور تھا۔ صاحب حدایق کا کہنا ہے کہ "بادشاہی بود و دانشور و شہنشاہی عدل گستر و فضل و کمال سرآمد ...... از اقلیم علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام داشتہ ...... با ارباب فضیلت و اصحاب حکمت صحبت داشتہ .... از فنون دانش بہرہ ور ...... بارگاہش مجمع ہنرمندان کامل عیار و درگاہش مرجع والادان ہر دیار (ورق ۱۱۵ ب ۱۲۶ الف)

علامہ ابن خاتون گولکنڈہ وارد ہوتے ہی بادشاہ کی مصاحبت میں داخل ہوگئے۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں پیشوائے سلطنت حضرت میر محمد مومنؒ کی سفارش کو دخل رہا ہو بلکہ یہاں تک بھی ممکن ہے کہ علامہ آپ ہی کی ایما سے دکن آئے ہوں کیونکہ علامہ کو میر محمد مومنؒ سے نہ صرف عقیدت ہی تھی بلکہ تلمذ بھی تھا۔ "از میر مومن استرآبادی عقیدت زیادہ داشتند" (نظم و نثر در زمان قطب شاہیہ ص ۱۴۴) "شیخ ابن خاتون کہ در بعضی مطالعہ علوم تلمذ جناب میر نمود" (مخطوطہ حدایق السلاطین ورق ۱۸۸ ل)

حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ کو بھی علامہ سے بے حد محبت تھی۔ یہ جوہر قابل اس قابل تھا کہ اسے سینہ سے لگایا جاتا۔ حضرت میر محمد مومنؒ بڑے مردم شناس تھے۔ اس کے علاوہ وہ صاحبِ کشف بھی تھے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ حضرت اپنے بعد جانشینی کی تربیت خود کر رہے ہوں کیونکہ مرتضائے ممالک کا عہدہ بڑا جلیل القدر عہدہ تھا اور اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک تھیں۔ غالباً آپ ہی کی سفارش پر علامہ ابن خاتون قطب شاہ کے ایلچی بن کر ایران گئے ہیں۔

در عہد ..... سلطان محمد قطب شاہ بایلچی گری ایران رفت۔ (ایضاً ورق ۱۹۴ ب)

میر عالم حدیقۃ العالم میں لکھتے ہیں۔ "در اواسط ذی قعدہ ۱۰۲۵ھ فضیلت مآب کمالات انتساب مجمع فضائل گوناگوں شیخ محمد بن خاتون را کہ از عمدہ مجلسیان و مقربان درگاہ بود .... باتفاق حسین بیگ کہ چہار ہزار ہون جہت خرچ راہ باو مرحمت شدہ بود از راہ برہان پور روانہ جانب ایران فرمود۔ (ورق ۱۷۲ ب)

ایران میں آپ نے گیارہ سال قطب شاہی سفارت کے فرائض انجام دیئے اور ۱۰۳۵ھ میں حیدرآباد واپس ہوئے۔ اس وقت یہاں سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت میر محمد مومن قبلہ نے کمالِ تدبر سے عبداللہ قطب شاہ کو تختِ سلطنت پر بٹھا دیا تھا۔ اس وقت شہزادے کی عمر (۱۲) سال کی تھی۔ اتفاق سے اسی سال حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت کا بھی انتقال ہوگیا پیشوائی کی جگہ خالی ہوگئی تو عبداللہ قطب شاہ نے۔ "بوساطت والدہ .... شاہ محمد پیرزادہ بمنصب پیشوائی و نواب علامی شیخ محمد مرحمت نمودہ بعد از چند منصب پیشوائی (اتفاقاً نمود لشریفہ نائب پیشوائی) از میر محمد رضای استرآبادی گرفتہ بنواب علامی دادہ اند (حدیقۃ السلاطین ۷۸ تا ۸۰)

شاہ محمد اپنی پیشوائی کے زمانے میں حکومت کا وفادار نہیں رہا۔ اس نے عادل شاہ سے سازباز شروع کر دی۔ خواجہ افضل بیگ ترکمن نے راستہ میں اس کے فرستادہ کو گرفتار کرکے کچھ خطوط پکڑ لیے اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ اسی اثنا میں لشکر فیض آثار کے

والدہ علیہ شاہ قاضی کا انتقال ہوگیا۔ علامہ ابن خاتون کو اُس کے قلمدان میں سے ایک ایسا خط ملا جس کو شاہ محمد نے شاہ قاضی سے عادل شاہ کے نام لکھوایا تھا۔ علامہ نے اس خط کو بھی بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ شاہ محمد غدار قرار دیا گیا اور ــــ " خاقان زمان اورا از

منصب پیشوای معزول نمود و در نہم ماہ رمضان ۱۰۲۸ ہجری تشریف

منصب پیشوای کُل بہ نواب علامی مرحمت فرمود (حدیقۃ العالم ورق ۲۱۷ب)

اس مسرت میں نظام الدین صاحب حدیقۃ السلاطین نے جو علامہ کا دست گرفتہ بھی تھا، چھ شعر کا قطعہ تاریخ لکھا جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

"بالہام آمد این مصراع تاریخ محمد یافت از حق پیشوای" ۱۰۲۸ھ

عین اسی زمانہ میں (۱۰۲۸ھ) میں مغلیہ سلطنت کی جانب سے شیخ محی الدین بیان کا حاجب تھا۔ قطب شاہی حکومت کے ساتھ اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ وہ بے جا دباؤ ڈال کر حکومت قطب شاہیہ سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علامہ ابن خاتون مسند پیشوای پر قدم رکھتے ہی اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوئے اور مغلیہ سلطنت کے وزیر اعظم یمین السلطنت آصف خاں اور دوسرے امرا کو شیخ محی الدین کی حرکتوں سے واقف کرایا۔ یہ خبر شاہجہاں تک پہنچی۔ شہنشاہ نے حاجب کو تادیبی حکم بھیجا کہ : "شیخ محی الدین تخلف از رضائے خاطر ننمودہ۔ در جمیع امور متابعت

نماید و صلاح در رضائے ایشاں را عین رضائے بادشاہی داند"۔ (حدیقۃ السلاطین ص ۸۰)

علامہ کے تعلقات آصف خاں کے گھرانے سے بہت گہرے تھے۔ علامہ نے دونوں حکومتوں کے تعلقات کو ہموار رکھنے کے لیے اس دوستی سے جائز فائدہ اٹھایا۔ اختر حسن کہتے ہیں کہ سرحدی علاقوں پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ علامہ نے آصف خاں سے خط و کتابت کی۔ شاہجہاں نے علامہ ہی کی سفارش پر یہ علاقے عبداللہ قطب شاہ کو واپس کر دیئے۔ (قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸۴)

۱۰۴۰ھ میں دکن میں سخت قحط پڑا۔ بارش بالکل نہیں ہوئی۔ علامہ نے بادشاہ کی ایما سے شہر سے باہر نماز استسقا کا اہتمام فرمایا۔ ماثورہ دعائیں تلاوت کی گئیں۔ آپ نے غریبوں، مسکینوں اور مستحقوں میں بے دریغ روپیہ تقسیم فرمایا۔

عبداللہ قطب شاہ علامہ کی دیانت، وفاداری اور تدبر ملکی سے بہت مطمئن تھا۔ اس نے اظہار مسرت میں آپ کو خاقان الزمانی، پیشوای زمانی، نواب مستطاب کے خطابات سے نوازا۔

اور جملۃ دوازدہ علام سے قدسی محل تک پالکی میں آنے کا اعزاز بخشا۔ یہ اعزاز صرف حضرت میر محمد مومن کے لیے مخصوص تھا یا پھر ان کے بیٹے کو ملا۔ علامہ ابن خاتون کو یہ اعزاز چند گزار دو لے سے پہلے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا۔ ان کے بعد کسی کو عطا ہوا۔

اس دنیائے شر و فساد میں کسی کی محبوبیت ... محسود زمانہ ہوتا ہے۔ اسی لیے آفات سے علامہ کو بھی گزرنا پڑا۔ میر محمد رضائے استرآبادی نے بادشاہ سے علامہ کی چغلی کھائی اور عبداللہ قطب شاہ کے خوب کان بھر دیئے۔ بادشاہ کان کے کچے تو ہوتے ہی ہیں۔ عبداللہ قطب شاہ میر محمد رضا کے بہکاوے کے فریب میں آ گیا۔ اس نے آپ کو پیشوائی کے منصب سے معزول کر دیا۔ ابن خاتون جمادی الاول ۱۰۴۳ء سے ۸ ر شوال ۱۰۴۴ء تک گھر بیٹھے رہنے کے لیے مجبور کیا۔ علامہ بھی بڑی بے نیازی کے ساتھ گھر بیٹھ گئے۔ اسی عرصہ میں عادل شاہ کی بڑی بہن ... کے ساتھ حیدرآباد آئی۔ مہر ... شہزادی کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حقیقت حال معلوم ہوئی۔ اس نے حسن تدبیر سے بادشاہ کے سامنے چغلی اور حاسد کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے اس پیشوائی کے منصب کو علامہ کو گھر بٹھا دینے کے بعد میر محمد رضا ہی کے سپرد کر دیا تھا۔

میر محمد رضا کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس عہدے پر خود آ جائے لیکن جب حقیقت ظاہر ہو گئی تو بادشاہ نے یہ عہدہ میر محمد رضا سے لے لیا اور اپنے کیے پر ندامت ظاہر کی۔ اس نے نہ صرف علامہ کے سارے اعزازات بحال کر دیئے اور پیشوائی کا منصب ان کے سپرد کر دیا بلکہ علامہ کی خدمت میں ہونے کا فرمان نافذ کیا۔ اسی دن ... آراستہ کر دیا۔ سارے امراء اپنی اپنی جگہوں پر ایستادہ تھے۔ بادشاہ نے اہل دربار کے سامنے علامہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور جملۃ الملکی کا عہدہ بھی عطا فرمایا اور "جمیع مہام سلطنت و جملۂ کل امور مملکت بقبضۂ اقتدار و اختیارش سپردند ... از اعلا و غیرہ بجہت سواری نواب علامی مرحمت فرمودند" (حدیقۃ السلاطین ۱۵۰)

اسی سال علامہ کی توقیر میں اضافہ ہوا۔ بادشاہ نے چہرہ سلحداروں کے علاوہ ... بارگیر سواروں اور ہزار ہزار پیادوں کو ... حکم دیا کہ وہ ہر جمعرات کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ کے ہمراہ فاتحہ خوانی کے لیے مقبرہ جایا کریں۔

علامہ کے میر جملگی پر فائز ہونے کے بعد آمدنی میں کافی اضافہ ہوگیا۔ آپ کو پیشوائی کی تنخواہ ماہانہ ایک ہزار ہون مقرر تھی میر جملگی کے عہدے پر آنے کے بعد اس کی تنخواہ سالانہ دو لاکھ الگ سے ملنے لگی۔ اس زمانہ میں (۲) ہون آج کے (۹) روپیوں کے برابر ہوتے تھے۔

علامہ نے میر جملگی کے عہدے پر آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ تمام مجلسیوں، محل داروں، سلحداروں اور سراپردہ داروں کی تنخواہیں بڑھادیں اور جن ملازمان شاہی کی تنخواہیں سابقہ عہدے داروں نے باقی رکھی تھیں ان سب کی تنخواہیں دلوادیں۔ اسی زمانہ میں علامہ کو یہ اعزاز بھی ملا کہ بادشاہ کی والدہ حیات بخشی بیگم شاہی محل کی دوسری معزز خواتین کے ساتھ علامہ کے مکان پر ایک ایک ہفتہ مہمان رہتیں۔

علامہ نے حیدرآباد میں بڑی مصروف زندگی گذاری۔ علامہ کے رات اور دن کا ہر لمحہ کسی نہ کسی علمی مشغلے کے لئے مختص تھا۔ روزآنہ صبح کو درس و تدریس کا سلسلہ رہتا۔ علم معقول و منقول، حدیث، فقہ، تفسیر، معانی و بیان، فلسفہ و منطق، ادب و ریاضی کا درس ہوتا۔ سرکاری مصروفیت کو ختم کرکے گھر لوٹتے تو شام کو اہلِ فضل و کمال کی محفل جمتی۔ متقدمین جیسے انوری، حکیم سنائی، مولانا روم وغیرہ کا کلام زیرِ بحث رہتا۔ ان کی شرحیں ہوتیں۔ نئے نئے نکات سامنے آتے۔

قطب شاہی دور میں ہفتہ واری تعطیل منگل کو ہوا کرتی تھی۔ علامہ ان تعطیلات میں دو ایک مرتبہ شہر کے باہر جشن کا اہتمام کرتے تھے۔ ان جشنوں میں بیرونی ممالک کے سفیروں کے علاوہ شہر کے معززین کو مدعو کرتے تھے۔

علامہ کو درس و تدریس سے فطری لگاؤ تھا۔ نہ صرف خود پڑھایا کرتے تھے بلکہ علم کو عام کرنے کی غرض سے مدرسوں کو قائم کرتے اور مدرسین کا تقرر فرماتے تھے۔ میر عالم لکھتے ہیں۔ "مدارس عالی بنا نمود و مدرسین در آں مقرر فرمودند۔" (حدیقۃ العالم ورق ۱۹۵ الف)

علامہ کی مصروف زندگی کو دیکھتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ علامہ تصنیف و تالیف کے لیے وقت کب نکالتے ہوں گے۔ مگر یہ طرحی مشاعرے الگ منعقد کرتے تھے۔ آپ کو شعر و ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ عالی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا کلام فی الحال ہماری دسترس میں نہیں ہے لیکن نظام الدین نے جتنا کلام بھی اپنے حدیقہ میں محفوظ کیا ہے ان سے آپ کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تبرکاً دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سطری کہ در بیان رموزِ محبت است — ہر نقطۂ بہ عالمِ فلاطون برابر است
جدولی ز خضرِ نسبت بادۂ حیات گرفت — شکستہ کشتیٔ ما ساحلِ نجات گرفت

اختر حسن نے مرزا محمد طاہر کے حوالے سے لکھا ہے کہ علامہ نے ۱۰۵۸ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ (قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸۷) نیز علی اصغر بلگرامی مآثر دکن میں صفحہ ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ۔ "پرانی حویلی کی دیوان کے اندر محاذی پورٹی قدیر جنگ بہادر میں آپ آسودہ ہیں۔"......

علامہ نے اپنے انتقال سے قبل اپنے اثاثہ کے بارے میں وصیت کر دی تھی۔ اس کے مطابق مرزا اسد عریاں علامہ کا سارا اثاثہ ایران لے گیا اور دیانت داری کے ساتھ آپ کے وارثوں میں تقسیم کر دیا۔ (قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸۷)

علامہ کا مزار ابھی پرانی حویلی کی دیوار میں ایک چوکھنڈی میں ہے جس پر برہا برس سے ایک بیل سایہ کئے ہوئے ہے یوں تو عوام فاتحہ خوانی اور منتیں مانگنے کے لیے روز آتے ہیں لیکن پنجشنبہ کو زیادہ ہجوم رہتا ہے۔ اس قلندر مزاج علامہ کے مزار پر نہ کوئی مجاور ہے اور نہ کوئی متولی۔ حال حال تک مزار راتوں کو بے چراغ رہتا تھا صرف جمعرات کو چند موم بتیاں جلتی نظر آتی ہیں۔ ابھی چند دنوں سے کسی نیک بخت نے ایک بلب لگا دیا ہے۔

علامہ نے اپنی یادگار میں چار گراں بہا کتابیں چھوڑی ہیں۔

۱۔ شرح اربعین۔ جس کے بارے میں علی بن طیفور نے لکھا ہے کہ "شرح اربعین خیلی معروف است۔ ۲۔ شرح ارشاد۔

۳۔ کتاب الامت۔

۴۔ جامع عباسی کی تکمیل۔ یہ کتاب دراصل علامہ کے ماموں اور استاد شیخ بہاؤالدین آملی نے لکھنا شروع کی تھی۔ عمر نے وفا نہ کی اس لئے یہ کتاب نامکمل رہ گئی تھی۔ علامہ نے اس کے کئی باب لکھ کر تکمیل کی۔ اس کتاب کا موضوع فقہ ہے۔

جب تک یہ کتابیں ہیں علامہ کو علمی دنیا فراموش نہیں کر سکتی اور جب تک مزار پر آتی رہیں گی عقیدت مند آپ کے مزار کا طواف کرتے رہیں گے۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۸۲ء کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا۔)

عزیز النساء حیا

حیدرآباد دکن

ضامن امن واماں، پیار، محبت کا نشاں
اس کی آغوش میں بستے ہیں فقط وہ انساں
ربطِ باہم کو سمجھتے ہیں جو اپنا ایماں
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

کبھی کرتے ہی نہیں ترکِ محبت ہم لوگ
چھوڑتے ہی نہیں دامانِ شرافت ہم لوگ
غمگساری کو سمجھتے ہیں عبادت ہم لوگ
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

یاں پہ ہندو بھی ہیں مسلم بھی ہیں عیسائی بھی
قوم کی سطح پر ان سب میں ہے یکتائی بھی
مذہب ہیں الگ اور ہیں سب بھائی بھی
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

جانِ تہذیب و ادب، مرکزِ تعلیم و ہنر
اتحاد ایسا ہے آپس میں کہ لگ جائے نظر
جگ میں ہے جو بھی مثال آپ ہے تنہا اپنا نگر
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

نصیر احمد نصیر گلبرگوی

غزل

بدلتے موسموں سے بے خبر تھا
مرے آنگن میں جو اندھا شجر تھا
شفق کی آنکھ سے ٹپکا تھا آنسو
سوا نیزے پہ جب سورج کا سر تھا
ہمارے جسم کو بخشی ہے رونق
جو کیڑا لہلہاتی شاخ پر تھا
مداوا ڈھونڈنے اپنی انا کا!
کئی صدیوں سے گھائل تیشہ گر تھا
مرے احساس کا گھائل پرندہ!
گھنے جنگل میں خائف رات بھر تھا
نصیر اک پرسکوں برگد کا سایہ
سلگتے جسم کی دیوار پر تھا

مہدی پرتاپگڈھی

غزل

ہمارے نام بھی اپنی عنایتیں لکھ دو
چلو یہی سہی، دو چار تہمتیں لکھ دو
اسی اعتماد پہ کچھ روز اور جی لیں گے
تم آنے والی سحر کی بشارتیں لکھ دو
گراں ہمیں یہ نہیں وقت کا لب اظہار
ہوئی ہیں زخمی ہزاروں سماعتیں، لکھ دو
نظر میں آئے نہ دیواروں کا برہنہ پن
یہاں پہ چند سنہری عبارتیں لکھ دو
مرے خلوص پر انگلی اٹھانے والو سنو!
تم اپنی مصلحتوں کی بھی قیمتیں لکھ دو
مجھے تو مل نہ سکی التفات اپنوں کی
خراب کیسے ہوئیں اس کی عادتیں لکھ دو
مرا ضمیر مجھے سنگسار کرتا ہے
مرے فسانے میں ایسی صداقتیں لکھ دو

پرانی قدروں کے ملبے سے نکلو اے مہدی
نئے نصاب میں زندہ روایتیں لکھ دو

۳ نظمیں

محمد سلیم انصاری

۱۔ بے بسی کا ہیں
وہ میری گردن پہ
اپنا چہرہ لگا کے خوش ہے
مگر اسے بھی
خبر نہیں ہے
کہ جب
رگوں سے رگیں نہ مل پائیں گی
تو کیسے
ان میں لہو بہے گا؟

۲۔ شکست
جگنوؤں کے قتل میں ناکام ہو کر
جب وہ اپنے ہاتھ میں
خنجر لیے لوٹا
تو اس کے گھر کے
سارے پھول زخمی ہو چکے تھے

۳۔ یہ کمرہ
میرا قاتل ہے
مجھے ہر روز مجھ سے چھین کر
خود قتل کرتا ہے مرا
اور پھر
میری ریزہ ریزہ لاش اٹھا کر
دریچوں اور دروازے سے
پھینک دیتا ہے
باہر

عبدالمتین نیاز

غزل

جب پہلی بار لوگ تری رہگزر پہ چلے
بے اعتباریوں نے کہا تھا کدھر چلے

دھرتی پہ تھے تو ہم کو اڑانوں سے خوف تھا
آئے ذرا ہوا کے مقابل تو پر چلے

سورج کا سامنا بھی ذرا کیجیے حضور
اب رات ختم ہونے کو آئی تو گھر چلے

گھر میں ہمارے ہے خس وخاشاک کا جماؤ
یہ دیکھ کر پھر آگ لگانے شرر چلے

منصف بھی کہہ رہے ہیں وہ خود کو رحیم بھی
تہمت جو اپنے ظلم کی لاشوں پہ دھر چلے

آنکھیں لہولہان لیے لوٹ آئیں گے
دُنیا کی دید کے لیے اہلِ نظر چلے

یہ سانحہ بھی دیکھ لیا ہم نے اے نیاز
جینا جو چاہتے تھے وہی لوگ مر چلے

صغرا عالم (ایم اے)

فراموشی

اک چمن اور صبا ساتھ رہی
محبت یہ وفا ساتھ رہی
وقت کب کیسے کٹا یاد نہیں

سر بہ زانو ہے جہاں کس کیلئے
سر بہ سجدہ ہے زماں کس کیلئے
اک ترے دل کے سوا یاد نہیں

ہر طرف نور کا پہرا دیکھا
چار سو ایک ہی چہرا دیکھا
کون کتنا ہے بُرا یاد نہیں

اپنی منزل پہ بہاریں بھی رکیں
ایک اک موڑ پہ تقدیریں سجیں
کب اٹھا دستِ دُعا یاد نہیں

رات خوابوں کی صداؤں میں کٹی
دن کے شعلوں نے تری بات کہی
کب ہوئی تجھ سے جُدا یاد نہیں

تیری راہوں سے گزرتی ہی رہی
ٹوٹتی اور بکھرتی ہی رہی
عکس کب چوُر ہوا یاد نہیں

غزلیں

حشمت فاتحہ خوانی

خوابوں کا سلسلہ نہ خیالِ غبار اب
یعنی ہمارے بس میں کہاں اختیار اب
یہ شہر ہے یا کہ کوئی آزمودہ خواب
تنہا لگے ہے بھیڑ میں اپنا شمار اب
تعبیر کیا بتائے گی نیندوں کی تشنگی
آموختہ پھر سے یاد کرو بار بار اب
ایسی ہی کوئی بات تھی دونوں کے درمیاں
لگتا تھا جیسے دو ہی رہے ہوشیار اب

حشمت پڑی ہے کس کو ضرورت کہ جا ملے
کرتا ہے کون شہر میں اپنا شمار اب

ایمن جعفری

ہمات کس کی آگئی یہ بات میں
کھو گیا ہر شخص اپنی ذات میں
ٹوٹ کر تڑپتا ہے پتھر کا جگر!
راحتیں ملتیں نہیں خیرات میں
وہ بھی تو انسان ہے میری طرح
فرق ہے پر اس کی میری بات میں
آفتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں
زندگی کے ٹوٹتے لمحات میں
وہ ملا تھا پچھلے چوراہے پہ کل!
سر تا پا بھیگا ہوا برسات میں
جانے کتنی راتوں سے گذرا ہوں میں
اس کی یادوں سے بھری اک رات میں
عشق ایمن اک سنہری عید ہے
ہاں مگر جب تک رہے اوقات میں

رئیس الدین رئیس

بدگماں ہو جاؤں خود سے ہی گماں ایسا نہ ہو
قد مرا اونچا ہو لیکن آسماں ایسا نہ ہو
طے سمندر کا سفر کر لوں گا طوفاں ایسا نہ ہو
سازشیں کر لے ہوا سے بادباں ایسا نہ ہو
جنگ چھڑ جائے عزیزوں میں سماں ایسا نہ ہو
اس کے ناوک کا ہدف اس کی کماں ایسا نہ ہو
تلخیوں کو بھول کر ہنسنا مرے ماضی کہیں
مسکرانے کا یہ منظر بھی خزاں ایسا نہ ہو
میں حقیقت سے تصور میں تو جا پہنچوں ضرور
اُف! یہاں جیسا اندھیرا ہے وہاں ایسا نہ ہو
موڑ تو ہر راہ پہ آتے ہی رہتے ہیں رئیس
ہم جدا ہو جائیں اک دن میری جاں ایسا نہ ہو

ک۔ یونس

وصل کی روشنی اب کہاں آنکھ میں شمعِ کشتہ کا سارا دھواں آنکھ میں
بے بسی عمر بھر اشک پیتی رہی بن گیا ایک گہرا کنواں آنکھ میں
جس کے نیچے کسی پل اماں ہے نہ خیر بھر لیا میں نے وہ آسماں آنکھ میں
آئینے میں ہوئیں جذب بینائیاں رہ گئیں چند پرچھائیاں آنکھ میں
میں تو خود اس میں چھپنے سے [illegible] اب تجھے بھی چھپاؤں کہاں آنکھ میں

ساتھ لایا ہے موسم وہ برسات کا
بدلیاں جسم میں بجلیاں آنکھ میں

غزلیں

بدر جمیل

قاتل ہے کون، کون سزاوار دیکھنا
پھر غور سے نوشتۂ دیوار دیکھنا

دیوار، کبھی سایۂ دیوار دیکھنا
کیا لگ گیا ہے دل کو یہ آزار دیکھنا

حق بولنے کا جیسے اسے خبط ہو گیا
اب کوئی دن اسے بھی سرِ دار دیکھنا

خوابوں کی چند شمعیں جلا لینا آس پاس
چہروں پہ جب بھی کرب کے آثار دیکھنا

دانشورانِ زیست کی عادت سی ہو گئی
اس پار رہ کے زیست کے اس پار دیکھنا

کر لیجیے پہلے ڈھنگ سے شیرازہ بندیاں
پھر [illegible] دیکھنا

لفظوں کے پل [illegible]
فکر و نظر کے [illegible] دیکھنا

خود برتری کا رنگ کہیں خوش قامتی کا زعم
اس شہرِ بے چراغ کے اطوار دیکھنا

بیگ احساس

بے سُورج آسمان

"پھر کیا ہوا ؟"

"آسمان پر لٹکا ہوا سورج زرد ہو کر اتنا نیچے جھک آیا کہ سمندر کے ہونٹ اسے چھونے لگے خوفناک سمندر نے سورج کی گردن میں اپنے دانت پیوست کر دیئے اور اسے بھنبھوڑنے لگا۔ سورج کے زخمی بدن سے سُرخ بوندیں ٹپک ٹپک کر لہروں میں جذب ہو رہی تھیں"

"ٹھہرو۔ تم مجھے اس علاقے کی تو نہیں لگتیں؟"

"ہاں آپ کا خیال صحیح ہے"

"پھر تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں۔" "میں سورج کا وہ گرم گرم تازہ لہو اپنے بدن میں اتارنے کے لیے گئی تھی" "پھر کیا تم ویسا کرنے میں کامیاب ہو پائیں؟"

"نہیں کیونکہ سمندر سورج کا لہو اپنے چہرے پہ مَل کر تانڈو ناچ رہا تھا۔ ہوائیں اس قدر تیز تھیں۔ مجھے خوف ہوا کہیں میرا لباس بدن کو چھوڑ کر پرندوں کی طرح فضا میں نہ اڑ جائے اور کو ملتے تھی جو شخصیت کی تہوں سے نکل کر آزاد ہونا چاہتی تھی۔"

"تم کتنے قدم چل کر سمندر تک پہنچی تھیں؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے پورے چھتیس (36) قدم میں چلی تھی۔ ریت کے سینے پر قدموں کے نشان بہت واضح تھے۔ ممکن ہے اگر لہروں کو غصہ آ جاتا تو وہ نشان مٹ جاتے لیکن اس وقت سمندر شانت تھا۔"

"تمہارا آخری قدم کہاں تھا۔"

"وہیں جہاں تک لہریں پہنچ کر ریت پہ ایک شفاف آئینہ بنا رہی تھیں۔ میں اس آئینے کے

کنارے کھڑی لہروں کی جادوگری دیکھنے لگی۔ شریر لہروں نے میرے پیروں میں گدگدی کرنا شروع کردیا اور وہ مجھے چھیڑنے کے لیے تلووں کے نیچے سے ریت کے ذرے کھینچ لیتیں۔ کبھی کبھی تو میرا توازن بگڑجاتا۔ میں نے آئینے میں جھانکا تو میرے قدموں سے جڑی میری ہی طرح ایک عورت الٹی لٹکی ہوئی تھی۔ نیچے آسمان تھا اور لہولہان سورج بھی۔۔!"

"تم شاید وہی کھیل دیکھنے آئی تھیں؟"

"جی نہیں جناب عالی، میں تو سورج کا لہو اپنے بدن میں اتارنے کے لیے گئی تھی لیکن اس کھیل میں گم ہوگئی۔ جب تلووں کی گدگدی سارے بدن میں دوڑنے لگی اور حلق تک پہنچ کر پیاس بن گئی تو حلق میں کانٹے اُگنے لگے۔ تب میں اس آئینہ پر چلتی ہوئی سمندر تک پہنچ گئی۔ چلو میں پانی سمیٹا، سمندر کا پانی نہ نیلا تھا اور نہ سُرخی مائل، ایک بے رنگی تھی۔ پھر سمندر میں بہتا سورج کا وہ لہو کہاں گیا کیا خون بھی بے رنگ ہوتا ہے؟ میں سوچ رہی تھی۔ لہروں کی جادوگرنی نے شاید سورج کے لہو کا رنگ چھین لیا ہو۔ میں نے خود ہی جھک کر سمندر سے ہونٹ لگادیئے۔ ایک لہر کسی خونخوار جانور کی طرح میری طرف غرّا کر بڑھی۔ میں پیاس کے کانٹے حلق میں سمیٹے گھبرا کر پیچھے ہٹی تو کسی کے ٹکرانے کا احساس ہوا۔"

"کون تھا؟"

"میرے قدموں سے جڑی عورت کے قریب نیم جوان سے سائے لہرا رہے تھے میں نے سوچا شاید وہ سمندر کے کنارے خالی سیپیاں چننے آتے ہوں گے۔"

"تو کیا وہ غوطہ خور تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن جب میں نے ان کے ننھے ننھے تلووں پر نظر ڈالی تو یہ اندازہ ہوا کہ وہ پہلی بار سمندر تک آئے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ان کی آنکھیں ان کے وجود کی معصومیت کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔"

"کیا تھا ان آنکھوں میں؟"

"ان آنکھوں میں سورج کا لہو اتر آیا تھا، شاید اسی لیے وہ لہریں ..."

"تمہارا مطلب ہے اسی لیے وہ لہریں بے رنگ ہوگئی تھیں۔"

"ہاں! اس لیے وہ لہریں بے رنگ ہوگئی تھیں۔ اب ان لہروں سے ہونٹ لگا کر سورج کا لہو چکھنا بے کار تھا۔ میں واپس پلٹی تو میرے قدموں کے وہ نشان غائب تھے۔"

"ارے سچ؟"

"ہاں — وہاں آڑی ترچھی لکیریں بکھری ہوئی تھیں۔"
حاکم نے بڑی سی کتاب میں کچھ لکھا۔

"ہاں تو پھر؟"

"مجھے بہت غصّہ آیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے اس وحشیانہ حرکت کے بارے میں سوال کرتی وہ میری طرف بڑھنے لگے۔ ساحل سنسان تھا۔ لمبے لمبے سائے ریت میں دفن ہو گئے تھے۔ پرندے بھی اپنے ٹھکانوں کو پہنچ کر خاموش ہو گئے تھے۔ مجھے شبہ ہوا۔"

"کیسا شبہ؟"

"کہ یہ لڑکے وہی غوطہ زن تو نہیں جو سمندر کی تہہ سے ڈوبا ہوا سورج نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"پھر؟"

"میں تیز تیز چلنے لگی۔ اب شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سمندر میں کود پڑے۔"

"تم گھبرا گئی ہوں گی۔"

"گھبراہٹ سے زیادہ مجھے غصّہ تھا۔ جناب عالی! اگر میں خود دریا کی طرح روانی سے بہتی ہوتی تو ایسے کئی چکنے پتھر میری تہہ میں پڑے ہوتے۔ اس لیے میں نے سوچا ان کے گالوں پر اتنے تھپڑ لگاؤں کہ آنکھوں میں اترا سورج کا لہو گالوں سے بہہ نکلے۔"

"تو تم دریا کی طرح روانی سے کبھی نہیں بہی تھیں۔"

"وہ الگ کہانی ہے جناب عالی میں تو کب کے کائی بھری چٹان بن گئی ہوں۔"

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس کے بعد میں اتنا تیز چلنے لگی کہ پنڈلیوں میں چھپا نسوں کا جال درد کرنے لگا۔ پھر میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ آسمان کا چہرہ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ سمندر نے سورج کا بہت سا حصّہ نگل لیا تھا۔ آسمان کے چہرے پہ سورج کے زخموں کا درد صاف جھلک رہا تھا۔ ریت اپنے خوفناک پنجوں سے قدموں کی رفتار روک رہی تھی، میں اپنے قدم چھڑا کر بھاگتی رہی۔"

"تم تو صدیوں سے اسی طرح بھاگ رہی ہو۔ قدموں کی دھمک — اور یہ تعاقب تمہارے لیے کون سی نئی بات ہے؟"

"ہاں صدیوں سے یہ تعاقب جاری ہے لیکن اس مرتبہ تعاقب کرنے والے وہ نہیں تھے

جن کے قدموں کی دھمک سے زمین دہل اٹھتی تھی، بلکہ جو قدم میرے تعاقب میں تھے، ان کے نشانات تک ریت پر نہیں بن پا رہے تھے ـــ یہ کیسا شہر ہے آپ کا؟"

حاکم نے سر جھکالیا۔

" تو سنیے ـــ ہم دوڑتے رہے ـــ آخر کوئی کنارے پر کتنا دوڑے ـــ کسی نہ کسی سرے پر سمندر سامنے آکھڑا ہوتا ہے"

" اور شاید یہی ہوا"

" ہاں بے چاری زمین کیا کرے جس کے چاروں طرف سمندر ہے۔ میرے سینے میں سانسوں کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ آخر جب کنارہ ختم ہوگیا تو میں لڑکھڑا کر گر گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے سائے میرے وجود کو ڈھکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں زور زور سے چیخنے لگی۔"

" کوئی آیا چیخیں سُن کر؟"

" کون آسکتا ہے۔ میں خود ہی بھاگتے بھاگتے اتنی دور چلی آئی تھی کہ چیخیں ماحول میں تحلیل ہوجاتی تھیں کوئی ایسی چیز درمیان میں نہ تھی جس سے ٹکرا کر یہ چیخیں بازگشت بن جاتیں۔ خود آسمان کرب میں مبتلا تھا۔ سورج اس کی گرفت سے نکلا جارہا تھا۔ سمندر کے اوپر سورج کا آخری سرا نظر آرہا تھا، باقی حصّہ سمندر نے نگل لیا تھا۔"

" تب کیا ہوا"

" اچانک ہی وہ دونوں سمندر میں کود پڑے اور لہروں سے لڑتے ہوئے کائی بھری چٹان کی طرف بڑھنے لگے، وہ ہانپ رہے تھے۔ اتنی دیر تک دوڑتے رہنے کے بعد ان کے پیروں میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ سمندر میں تیر سکتے۔ وہ کچھ وقفہ کا ہی سہی چٹان پر سستا لینا چاہتے تھے، لیکن ان کے پیر نہیں جم پا رہے تھے، وہ بار بار پھسل کر گرتے اور پھر سے کوشش شروع کردیتے، اس کوشش میں چٹان سے ٹکرا کر ان کے وجود زخمی ہوگئے۔

اسی چٹان کے نیچے سمندر نے سورج چھپا رکھا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح چٹان ہٹا کر اس سورج تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن اتنی بڑی چٹان کا ہٹانا ان کے بس کا روگ نہ تھا ـــ اس جدوجہد میں ان کے ناخن ٹوٹ گئے اور پھر وہ اتنی زور سے چٹان سے ٹکرائے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ لہروں نے انھیں ساحل پر پھینک دیا۔

سمندر کا مدوجزر کم ہونے لگا۔ لہریں پُرسکون تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا کہ کیا ہوا۔ وہ سر جھکائے واپس لوٹ رہے تھے۔"

"تو تم بچ گئیں"

"ہاں بچ گئی۔ چند لمحے میں گم سُم پڑی رہی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ گلا پھاڑ کر گالیاں بکتی رہی"

"کیوں؟ جب کہ انہوں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا تھا، تم نے گالیاں کیوں دیں؟"

"جناب عالی! لہروں کے مسلسل عمل سے جو کالی چٹان پر جمی تھی، اسے انہوں نے کھرچ دیا تھا ـــ چٹان کے نیچے چھپے سورج کی تپش اسے جھلسا رہی تھی ـــ"

"اور وہ سورج جو چٹان کے نیچے چھپا تھا؟"

"وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ چٹان کے پرخچے اُڑ گئے۔ سمندر میں بھونچال آ گیا ـــ کل جب زمین اپنا ایک چکر پورا کرے گی تو آسمان بے سورج ہو جائے گا"

"اس کے آگے کچھ مت کہو۔ مجھے معلوم ہے ..... آگ برسنے لگے گی یا پھر زمین سے سانپ اُبل پڑتے ہیں۔" حاکم نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

اس نے سر پر بڑی کتاب کا سائبان بنا لیا اور پیر زمین سے اٹھا لیے۔ وہاں پر موجود لوگوں نے دیکھا حاکم کی کرسی خالی ہے وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہاں سے بھاگنے لگے۔

محمد قلی کی شاعری

(صفحہ (۱۷) سے آگے)

غرض محمد قلی کی شاعری میں قطب شاہی تہذیب ہی نہیں بلکہ اس عہد کے لوگوں کے جذبات اور تصورات صاف نظر آتے ہیں اور شاعر نے خارجی موضوعات میں داخلیت کے حسین امتزاج سے ایک پُرکیف سماں باندھ دیتا ہے اور تمام ترقی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی شاعری میں عوامی اور سماجی پہلو کا جس انداز سے ذکر ملتا ہے وہ اگلی نسلوں کے لئے رہنمائی کا باعث بنا اور صدیوں بعد اس طرح کی شاعری کو ہندوستان کے لئے ناگزیر سمجھا گیا، جو یک جہتی اتحاد اور اخوت کی علمبردار ہو۔

(یوم محمد قلی کے ادبی اجلاس منعقدہ فروری ۸۲ء میں پڑھا گیا)

نقد و نظر

تبصرہ کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

نام کتاب: پیاسی زمین صنف: مجموعہ غزلیات مصنف: ڈاکٹر نظیر صفی پوری
ضخامت: ۱۲۰ صفحات قیمت: بیس روپے ملنے کا پتہ: ۲۲۵/۱۶۴ محمود نگر، لکھنؤ ——— ۳

اردو غزل میں بے انتہا کشش ہے اور کسی اور زبان میں غزل اتنی کامیاب اور تر و تازہ نہیں، جتنی اردو زبان میں ہے۔ ادوار کے بدلنے اور ہر نئی تقویم کے ساتھ کبھی کبھی جمود کا جو احساس ہوتا ہے وہ حیرت انگیز طور سے مضامین، لب و لہجہ اور طرزِ اظہار کے زاویوں کے بدلنے سے متحرک اور حیاتِ نو میں ڈھل جاتا ہے۔ نقاد چاہے کتنی بار دعویٰ کے ساتھ اردو غزل کے اختتام کا اعلان کرے یہ زندہ اور جمیل رہے گی۔ "پیاسی زمین" جناب نظیر صفی پوری کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے سے گذرتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے اردو کو چاؤ سے پڑھا ہے اور برتا ہے۔ نرم اور متوازن انداز میں زندگی کے شب و روز کی تلخیوں کو تبسم زیرِ لب کی طرح لطف لے کر شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے شعری اسلوب میں تصوف اور معاملہ بندی دونوں رجحانات کا بھی پر تو ملتا ہے۔ ایک اور بات جو ان کی غزلوں کو نرم و نازک کیفیت بخشتی ہے وہ ہے ترنم آمیز بحور اور سہل لب و لہجہ کا انتخاب۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ مخصوص اربابِ ادب میں مقبول ہوگا۔ جناب نظیر سے میری درخواست ہے کہ وہ مضامین میں وسعت اور عمق منتخب کریں۔

کتابت، گٹ اپ اور طباعت تینوں ہی اوسط سے بہتر ہیں۔ ان کی شاعری کے چند نمونے باذوق قارئین کی نذر ہیں ؎

پھر اندھیروں میں کچھ دیے سے چمکے — اک نیا راستہ دکھلاتے ہوئے
کاغذی پھولوں سے اچھا تھا کہ اس گھر میں نظیر — تم نے گلدان کو کانٹوں سے سجایا ہوتا
جس جگہ پہ ہے وہ وہیں جاگتا رہتے — دھرتی گذر رہی ہے خروشِ انقلاب سے
ہماری داستانِ غم میں اتنا تو اثر آیا — ہوئی وہ چشم نم لیکن بہت آہستہ آہستہ

آپ کہئے تو بیٹھوں آپ کہئے تو اٹھ جاؤں آپ کی یہ محفل ہے آپ کا اجارہ ہے

(اسلم عمادی)

نام کتاب: **وقت کا سورج** صنف: مجموعہ کلام شاعر: ساحر شیوی ضخامت: ۱۲۰ صفحات

قیمت: ۲۵ روپے ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس /۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

"وقت کا سورج" اچھی کتابت، عمدہ طباعت سے مزین ساحر شیوی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے ان کے علاوہ اس کتاب میں ان کی منتخب رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ شاعر کی یہ دوسری شعری پیش کش ہے۔ منظومات مشتملہ کے مطالعے سے یہ کھلتا ہے کہ شاعر کا بنیادی رویہ ان اقدار اور مقاصد کو زندہ کرنے کا متمنی ہے جو زندگی کی بے ترتیب دوڑ میں کریہہ اور مجہول حقائق کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں تیکھے طنز اور چبھتے ہوئے نعروں کا استعمال کرکے شاعر نے خود تنقیدی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی شاعری میں واحد متکلم کا استعمال بکثرت ہے حالانکہ یہ واحد متکلم نئی زندہ زندگی کا ایک عام شخص ہے ان کی شعری تخلیقات میں عام باتیں، عام علامات اور عام گفتگو کو پیچ دار بناکر ندرت پیدا کی ہے۔ چند مقامات میں نثریت شدید ہوتی ہوئی بھی محسوس ہوگی۔

ایک نظم قارئین بھی پڑھیں۔

"جدید علاج"

آگ دریا میں لگا دو / مچھلیاں چڑھ جائیں گی پیڑوں پہ سب / پھر جلا دو آگ پیڑوں کے تلے / مچھلیاں بھنتی رہیں گی خود بخود / مچھلیوں پر ڈال دو تھوڑا نمک / اور تم کھاتے رہو / جام سونے کا منگا کر / ڈال دو اس میں اسمگلنگ کی شراب / جام ہو سونے کا تو احساس ہی رہتا نہیں / کیا خبر ہوگی کہ یہ مے ہے حرام / زندہ مچھلی جل کے بن جاتی ہے دردوں کا علاج / مے اسمگلنگ کی بھی ہے آب حیات / بھوک بھی مٹ جائے گی / پیاس بھی بجھ جائے گی / اس طرح ہوگا بدن سے خاتمہ امراض کا ۔

(اسلم عمادی)

نام کتاب: **نوشگفتہ** (شاعری) نام مصنف: **اسحاق ملک** مجلد معہ گرد پوش صفحات: ۱۱۸

سن اشاعت: دسمبر ۱۹۸۲ء قیمت: دس روپے کتاب ملنے کا پتہ: ادبی مرکز، اعجاز پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

زیر نظر مجموعے کا نام "نوشگفتہ" ہے۔ اس نام کی لطافت اس کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی کہیں کہیں ملتی ہے۔ مثلاً ع خودی بڑھتے بڑھتے خدا ہو گئی۔ اسی طرح سے

کہیں ایسا نہ ہو وہ ہو پریشاں میں ہر غم کو چھپاتا جا رہا ہوں

بسکون بن گیا غم کو بحرِ الم میں ! تلاطم ہی خود نا خدا ہو گیا
یوں نام تو کہنے کو ہمارا ہے غزل میں بکھرا ہوا ہر رنگ تمہارا ہے غزل میں
خوشی مانگی تھی ہم نے دو گھڑی کی کرم تیرا کہ تونے غم دیا ہے

"نوشگفتہ" کی نظموں کے کچھ حصے معنوی حیثیت سے واقعی نوشگفتہ معلوم ہوتے اور باقی ناشگفتہ۔ "آزادی اور اردو" ایک اچھی سی نظم ہے۔

جناب اسحاق ملک کی یہ پہلی ادبی کاوش امید افزا ہے۔ ان کے ذوقِ سلیم اور سلامت سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ ان کی شعری تخلیقات فنی اسقام اور زبان و بیان کی فروگز سے پاک ہو کر منظرِ عام پر آئیں گی۔ (ادیب حیدرآبادی)

نام کتاب: سخنِ نامی (انتخاب کلام) مرتبہ: وقار خلیل

فکر تونسوی نے شاعر کے بارے میں ایک لطیفہ "فکر نامہ" میں لکھا ہے کہ شاعر کو خدا کے حضور پیش کیا گیا۔ خدا نے پوچھا "شاعر! تم چونکہ ہمارے خاص آزاد منش بندے ہو اس لیے تم خود تم جنت میں رہنا پسند کروگے یا دوزخ میں؟" شاعر نے کہا "جہاں سامعین کی تعداد زیادہ چنانچہ خدا نے اُسے دوزخ میں بھیج دیا۔

یہ محض لطیفہ ہے۔ اس میں کام کی بات یہ ہے کہ شاعر عموماً اپنے سامعین کا متلاشی رہتا ہے ایسے شعرا کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جو شعر کہتے ہیں اور سنانے کا شوق نہیں رکھتے اور مشاعروں شاذونادر ہی اپنا کلام سناتے ہیں۔

ابوالوقار شاہ محمد چندا حسینی کوہ سوار نامی نظامی شاہ پوری بھی ایسے ہی ایک شاعر تھے۔ نے شگفتہ اور ہمیشہ تر و تازہ رہنے والی غزلیں کہی ہیں۔ انہوں نے مرزا غالب، مولانا حالی، اکبر اور نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے اشعار پر خمسے لکھے ہیں۔ ملی اور قومی جذبے کے تحت اور خیال انگیز نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "سخنِ نامی" میں کلاسیکی رنگ کی کئی غزلیں جن میں نکھری ستھری زبان، جذبہ اور احساس کی شدت اور اسلوب کی دلکشی ہے۔ وہ حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال اور سیماب اکبرآبادی کے رنگِ سخن سے متاثر اور حضرت خواجہ نظامی دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ دکن کی سرزمین سے انہیں بیحد پیار تھا۔

نامی ۱۲/ اکتوبر ۱۸۸۷ء میں کرناٹک کے تعلقہ شولاپور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے رائچور گلبرگہ کے اسکولوں میں ایک ہردلعزیز اور لائقِ احترام استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ نامی

حیدرآباد ' دہلی ' لاہور ' امرتسر اور جالندھر کے معیاری اخباروں اور رسالوں مثلاً رہبر دکن ' اتالیق (حیدرآباد) الکمال (دہلی) صوفی ' مسلمان ' القریش اور پیسہ اخبار میں شائع ہوا کرتا تھا۔ غزل کے علاوہ ناؔی نے کئی دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان اصناف میں اپنی شعر گوئی کی صلاحیت کا لوہا منوالیا۔ انہوں نے بچوں اور نوجوانوں کے لیے بھی سبق آموز اور فکر انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ ناؔی نے حمد' نعت' قطعہ' رباعی اور واسوخت بھی لکھے۔ ان کا مجموعہ کلام پہلی بار ۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ پنجاب سے شائع ہوا تھا۔ ان کے کلام کا انتخاب "سخنِ ناؔی" ' کرناٹک اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے ناؔی کے بڑے فرزند جناب وقار خلیل نے نومبر ۱۹۸۳ء میں حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ انتخاب و ترتیب سے ان کے حسنِ سلیقہ کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجلد مجموعہ کلام کا تعارف ممتاز نقاد پروفیسر و ڈاکٹر مغنی تبسم نے سپردِ قلم کیا ہے اور پیش لفظ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی نے تحریر فرمایا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے "سخنِ ناؔی" پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناؔی کا کلام پڑھیے تو شگفتگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

فاضل مرتب جناب وقار خلیل نے اس مجموعہ میں "خود نوشت" کے زیر عنوان مخطوطہ "سرمایۂ حیاتِ ناؔی" سے چند اقتباسات بھی شامل کیے ہیں جن سے ناؔی کی زندگی' شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس قادر الکلام اور پُرگو شاعر نے ۲۷ر جولائی ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔

"سخنِ ناؔی" خوبصورت اور دیدہ زیب گٹ اپ اور ناؔی کے ایک بڑے فرزند عزیز الرحمن سائل کے سوانحی نوٹ اور "تفصیلات" کے زیر عنوان' دوسرے بڑے فرزند جناب وقار خلیل کی معلوماتی تحریر کے ساتھ اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ جناب وقار خلیل نے "سخنِ ناؔی" کا انتساب اپنی والدہ مرحومہ کے نام کیا ہے۔

مجموعہ کلام "سخنِ ناؔی" ' ایوانِ اردو پنجہ گٹہ روڈ ' حیدرآباد سے بادائی قیمت فی جلد دس روپے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (محمد منظور احمد)

نام کتاب: "مکاتیبِ نجم" مرتبہ: محمد ایوب واقف مجلد صفحات: ۱۸۴ ڈیمائی سائز
سنہ اشاعت ندارد قیمت: ۲۰ روپے ناشر: منشی دیا نرائن نگم میموریل ٹرسٹ' چکبست روڈ' لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱

غالب، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، صفیہ اختر اور فیض احمد فیض کے خطوط کے مجموعے دنیائے ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ مکاتیبی ادب کے اس تناظر میں محمد ایوب واقف کی کتاب "مکاتیبِ نگم" کی اہمیت و افادیت کا ادراک و احساس عصرِ جدید میں یوں روشن ہو جاتا ہے کہ یہ خطوط مشہور زمانہ ادبی رسالہ "زمانہ" کانپور کے ایڈیٹر روشن خیال، اردو محسن، منشی دیا نرائن نگم کے تحریر ہیں جن کا افق اردو کلچر، ادب اور ملی جلی ہندستانی تہذیب کی صیانت و پاسداری کا وثیقہ ہیں۔ آنجہانی نگم نے ایک کم پچاس برس تک خلوص و توجہ سے "زمانہ" کی باقاعدہ معیاری اشاعت کا فرض نبھایا اور صدہا ہندو مسلم اہلِ قلم اصحاب کو زحمتِ قلم کی درخواست کر کے ان کی پیدا پنہاں صلاحیتوں کو دنیائے ادب سے روشناس کیا۔ پریم چند، چکبست، نوبت رائے نظر، خالص "زمانہ" کی پیداوار ہیں جنھیں آج ہم اردو کا کلاسیکی ورثہ کہتے ہیں۔ "مکاتیبِ نگم" میں ۸۹ خطوط شامل ہیں۔

یہ سب خطوط محمد ایوب واقف نے بڑی محنت سے یکجا کیے ہیں۔ دیا نرائن نگم کے یہ خطوط "زمانہ" کی قلمی اعانت کے سلسلے میں اپنے مخصوص اور مخلصانہ اسٹائل سے سپردِ قلم کئے ہیں جن میں احسن مارہروی، منور لکھنوی، مسعود حسین رضوی ادیب، جوش ملیح آبادی، ثاقب کانپوری، جگر بریلوی، محشر بدایونی اور حیدرآباد کے تمکین کاظمی اور سوریہ پرتاپ حق گو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ فاضل مرتب نے اپنے وقیع مقدمہ، حواشی اور متذکرہ مکتوب الیہم سے اس مجموعہ مکاتیب کی شان دوبالا کر دی ہے۔

"مقدمہ" میں جناب واقف نے بجا لکھا ہے کہ منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ" دونوں ہی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں، دونوں کی عظمتیں بے پناہ ہیں۔ دونوں کی خدمتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہماری زبان ان دونوں کے احسانات تلے دبی رہے گی۔ آنجہانی نگم نے اردو کی خدمات کے سلسلے میں ایک مثالی زندگی بسر کی۔ اور اپنی بے پناہ اور عظیم قربانیوں سے انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو کے خلاف آوازیں کتنی ہی بلند اور شدید کیوں نہ ہوں، ان سے اردو کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، شرط یہ ہے کہ اردو کی خدمت کے لیے لگن سچی ہو، جذبہ پختہ ہو اور اردو کے لیے ایمان کامل ہو۔ نگم ایسے محبِ وطن اردو دوستوں کے کارناموں کو نئی نسلوں سے متعارف کرانا وقت اور عصر کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس پس منظر میں "مکاتیبِ نگم" کا مطالعہ توجہ اور انہماک چاہتا ہے اور ایسی کتابوں کو عمومی طور پر خرید کر پڑھا جانا، اردو دنیا کے ہر فرد کا فرض بن جاتا ہے۔ (ذوالفقار خلیل)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

RIL 1984

R. N, 101
Regd. H/HD

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.

N··· ··I Fir Printir · Pre·· Charkaman, Hyd.



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد ۴۴ شمارہ ۵
سن اجراء : ۱۹۳۸ء
فون : ۳۸۴۶۹

مئی سنہ ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مدیر اعزازی : مغنی تبسم
شریک مدیر : محمد منظور احمد
معاون مدیر : وقار خلیل

قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے
زر سالانہ : ۳۰ روپے
(کتب خانوں سے ۴۰ روپے)
بذریعہ رجسٹری : ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے :

	ہوائی ڈاک سے :	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۱۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۲/۱ ۳ پونڈ

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر حیدرآباد (اے پی) سے شائع کیا۔ کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو
پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

سرورق : نیک نام خان۔ اصل نام رضا قلی تھا۔ ۱۶۷۰ء میں انھیں قطب شاہی سلطنت میں دیوان کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔ وہ عالم اور

ترتیب

اپنی بات

پروفیسر سید علی اکبر کے سانحہ ارتحال سے تعلیمی، تہذیبی، سماجی اور ادبی اداروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۸۴ء کو ان کے سانحہ ارتحال نے علمی حلقوں کو افسردہ و غمگین کر دیا۔ پروفیسر سید علی اکبر ایک ممتاز ماہرِ تعلیم تھے۔ بیس سال سے کچھ زیادہ عرصے تک وہ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد کے فعال صدر رہے۔ ان کی سرپرستی اور رہنمائی کی بدولت کام کرنے والوں کے حوصلے بلند ہوتے تھے۔ سررشتہ تعلیمات کے ناظم اور نظام کالج، حیدرآباد ایوننگ کالج اور انوار العلوم کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انوار العلوم کالج کو انہوں نے صحیح معنوں میں نئی زندگی عطا کی۔ ان کالجوں میں انھوں نے تاریخ، معاشیات، سیاسیات اور انگریزی کی تدریس کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیئے اور طالب علموں کے دلوں پر اپنی قابلیت و صلاحیت کے گہرے نقوش چھوڑے۔ انہوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تعلیمی مسائل علمی و ادبی موضوعات اور بعض اہم اور ممتاز شخصیتوں پر گراں قدر مضامین لکھے ہیں کئی برس تک وہ "ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد" کے ماہنامہ "سب رس" کے نگران بھی رہے۔

ان کی ہمہ جہتی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں "ایوانِ اردو" میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام کئی تعلیمی، تہذیبی، سماجی اور ادبی اداروں کی طرف سے ایک تہنیتی جلسہ زیرِ صدارت جناب حامد علی عباسی، صدر ادارۂ ادبیاتِ اردو، ۶ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو منعقد ہوا تھا جس میں ان کی خدمات کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔

حالاتِ زندگی ـــ علی احمد جلیلی

تاریخ پیدائش : ۲۱ رجون ۱۹۱۵ء ۔ مقام پیدائش : بلدہ حیدرآباد ۔ اپنے والد فصاحت جنگ جلیل کی نسبت سے نام کے ساتھ جلیلی لکھتے ہیں ۔ ایسے شاعرانہ ماحول میں پرورش پائی جس کا سکہ رائج الوقت تھا ۔ شاعری ورثہ میں ملی اور خاندان کے دیگر چشم و چراغ کے مقابلہ میں یہ ترکہ ان کے حصہ میں زیادہ آیا ۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزا بازار نور خاں میں پائی جو اس زمانے میں صاحبزادوں کا مدرسہ کہلاتا تھا ۔ وسطانی جماعتوں کی تکمیل ہائی اسکول دارالشفا میں ہوئی ۔ مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم کالی کمان سے میٹرک کیا انٹرمیڈیٹ کی تعلیم سٹی کالج میں پائی ۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور بی ایڈ کی سند بھی ملی ۔ پیشہ تدریس میں داخل ہوئے ۔ گزیٹیڈ انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ سے وظیفہ حسنِ خدمت حاصل کیا ۔ ملازمت کا زیادہ حصہ حیدرآباد میں کم محبوب نگر میں زیادہ گذرا ۔ وظیفہ لینے کے بعد تین چار سال تک آرٹس اینڈ سائنس کالج محبوب نگر میں اردو لکچرر کی حیثیت سے کام کیا پھر ذاکر حسین میموریل کالج محبوب نگر میں بھی کچھ عرصہ تک لکچرار رہے ۔

تیس سال بعد محبوب نگر سے حیدرآباد آئے ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک ہوئے ۔ مختلف عنوانات پر مضامین لکھتے رہے اور انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین کے ترجمے بھی کیے ۔ بعد ازاں ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ ہی میں ' اسسٹنٹ ایڈیٹر (اردو ادب) کی پوسٹ پر ان کا تقرر ہوا ۔ تین سال تک بحیثیت اسسٹنٹ نہ صرف اردو ادب سے متعلق مضامین کی اصلاح جانچ اور ترتیب و تنظیم کا کام انجام دیا بلکہ زبان کے نقطۂ نظر سے مختلف شعبوں کی جانچ بھی کی یہ سارا کام اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تدوین سے متعلق تھا ۔ اس انسائیکلو پیڈیا کی ۱۲ جلدوں کی تکمیل تک اپنے فرائض کی ' انجام دہی بڑی ذمہ داری کے ساتھ کی ۔

بعد ازاں حیدرآباد سے نکلنے والے مشہور فلمی رسالہ " فلمی تصویر " میں ادبی سکشن کی ترتیب و تدوین کے انچارج بنائے گئے دو سال تک ادبی سکشن کے انچارج رہے پھر جب جناب عابد علی خاں صاحب مدیر سیاست نے اردو گھر مغل پورہ کا تعمیری کام مکمل کروالیا تو ان سے خواہش کی کہ وہ اس عمارت کا چارج لیں ۔ چنانچہ جناب جلیلی نے فلمی تصویر سے قطع تعلق کر کے اردو گھر کے مہتمم بن گئے ۔ ان کی نگرانی میں آج یہ اردو گھر کئی مصروفیتوں کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ اس گھر کی تمام مصروفیات زبان اردو کے گرد گھومتی ہیں ۔ مثلاً اردو مطالعہ گھر ۔ اردو کتب خانہ اردو ماڈل اسکول اور اردو تعلیمی کلاسیس وغیرہ ۔

علی احمد جلیلی

زندگی یوں مرے ہمراہ رہا کرتی ہے
جیسے جینے کی فقط رسم ادا کرتی ہے

جانے کیوں میری ہی دہلیز پہ آ کر اکثر
گردشِ وقت تھکن دور کیا کرتی ہے

راہبر دیکھ کے ہو جاتے ہیں انجان مجھے
گمرہی دور سے پہچان لیا کرتی ہے

ہر بلا وہ گزرتی ہے مری بستی سے
نام چپکے سے مرا پوچھ لیا کرتی ہے

ہم وہ برباد زمانہ ہیں کہ اب تو ہم سے
مشورہ گردشِ ایام کیا کرتی ہے

حق کا اظہار کروں میں تو یہ دنیا بڑھ کر
میرے ہاتھوں سے قلم چھین لیا کرتی ہے

حیثیت عصر کی جو وقت کی ہے ذہن علی
شعر کے فن کو نیا موڑ دیا کرتی ہے

عجیب شہر کا منظر ہے کیا کیا جائے
ہر ایک ہاتھ میں پتھر ہے کیا کیا جائے

سلگتے لوٹ کا بازار سمجھنے والا ہے
ہر اک نظر میں مرا گھر ہے کیا کیا جائے

وہ خواب جس کا مقدر نہیں کوئی تعبیر!
وہ خواب میرا مقدر ہے کیا کیا جائے

میں اس کے ساتھ بصد احتیاط رہتا ہوں
وہ شخص کانچ کا پیکر ہے کیا کیا جائے

وہ جس کے پاس مری زندگی امانت ہے
اسی کے ہاتھ میں خنجر ہے کیا کیا جائے

قلم اٹھاؤں تو کاغذ سلگنے لگتا ہے
نظر میں جلتا ہوا گھر ہے کیا کیا جائے

علی کھڑا ہوا اپنی انا کے ٹیلے پر!
سمجھ رہا ہے قد آور ہے کیا کیا جائے

علی احمد جلیلی

روکے سے کہاں حادثۂ وقت رُکا ہے
شعلوں سے بچا شہر تو شبنم سے جلا ہے

کمرہ کسی مانوس سی خوشبو سے بسا ہے
جیسے کوئی اُٹھ کر ابھی بستر سے گیا ہے

یہ بات الگ ہے کہ میں جیتا ہوں ابھی تک
ہونے کو تو سو بار مرا قتل ہوا ہے

ہر شخص ہے ہاتھوں میں صلیب اپنی اٹھائے
جینا ہی مرے دور میں جینے کی سزا ہے

پھولوں نے چرالی ہیں مجھے دیکھ کے آنکھیں
کانٹوں نے بڑی دور سے پہچان لیا ہے

مانا کہ نہیں آپ کو کچھ مجھ سے تعلق!
لیکن وہ مرا شعر جو تکیہ پہ لکھا ہے

اس رنگ تغزل پہ علی چھاپ ہے میری
یہ ذوقِ سخن مجھ کو وراثت میں ملا ہے

فریبِ نکہت و گلزار سے بچاؤ مجھے
کرم کرو کسی صحرا میں چھوڑ آؤ مجھے

وہ جنس ہوں میں جسے بیچ کے مدتیں گزریں
جو ہو سکے تو کہیں سے خرید لاؤ مجھے

میں کون ہوں مجھے چہرہ بھی اپنا یاد نہیں
کہیں سے لا کے کوئی آئینہ دکھاؤ مجھے

کسی پہ اپنے سوا اب نظر نہیں پڑتی
مری نگاہ سے اے دوستو بچاؤ مجھے

مچل رہی ہے نظر جھک کے دیکھیے اس کو
سمٹ رہا ہے بدن ہاتھ مت لگاؤ مجھے

کسی طرح ان اندھیروں کی عمر تو کم ہو!
جلانے والو ذرا دیر تک جلاؤ مجھے

وہ لاش راہ سے جس کو اٹھا کے لائے ہو
کہیں وہ میں تو نہیں ہوں ذرا دکھاؤ مجھے

بکھر چکا ہوں علی میں غزل کے شعروں میں
بساطِ عارض و زلف سے سمیٹ لاؤ مجھے

علی احمد جلیلی

خشک پتوں پہ کر نگاہ نہ کم
ہیں بہاروں کے ان پہ نقشِ قدم
جی رہے تھے بڑے سلیقے سے
آ گیے وقت کی نگاہ میں ہم
زخم جتنے ملے سمیٹ لیے
رکھ لیا دامنِ تہی کا بھرم
مشعلِ جاں جلائے بیٹھے ہیں
کب سے اس شہر بے چراغ میں ہم
بارشیں ہو رہی ہیں پتھر کی
کانچ کے گھر بنا رہے ہیں ہم
روشنی وہ مرے ضمیر کی تھی!
دیپ کا تھا دیا نہ شمعِ حرم
منتظر تھی غریب تنہائی
رات گھر دیر سے جو لوٹے ہم
وہ تو کہیے کہ ہم ذرا سا رُکے
کائنات آ گئی تھی زیرِ قدم

آنچ آئی نہیں کسی پہ علی!
جل گیے ہیں اس احتیاط سے ہم

پھونکوں سے بجھا ہوں نہ مٹانے سے مٹا ہوں
میں وقت ہوں تاریخ کے ماتھے پہ لکھا ہوں
میں دھوپ سے بچ کر نکل آیا تو ہوں لیکن!
گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہوں
دُنیا ہے کہ پھولوں کی خوشامد میں لگی ہے
اک میں ہوں کہ کانٹوں میں لہو بانٹ رہا ہوں
آئے ہیں وہی گھر کو مرے آگ لگانے
میں جن کے چراغوں میں لہو بن کے جلا ہوں
اس دور کے انساں کو کس انداز سے جانچوں
ذرّے کو یہ دعویٰ ہے کہ سورج سے بڑا ہوں
سب جشنِ چراغاں کے تماشے میں لگے ہیں!
میں بجھتے چراغوں کی طرف دیکھ رہا ہوں
وہ لاش مری پاؤں تلے روند رہے ہیں
میں جن کو بچانے کے لیے قتل ہوا ہوں
آنچ آئی کسی پر نہ علی اپنی طرف سے
سلگا ہوں سلیقے سے قرینے سے بجھا ہوں

علی احمد جلیلی

شاد — کشن پرشاد

شاد کا نام زبان پر آتے ہی ایک مثلث میری آنکھوں کے سامنے اُبھرتا ہے جس کے تین گوشوں پر تین نام لکھے نظر آتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی، شاد کشن پرشاد اور شاد نریش کمار۔ یہ تینوں اپنے اپنے وقت کے معروف و منفرد شاعر تھے اور ان میں کشن پرشاد شاد کا نام نمایاں اس اعتبار سے ہے کہ بحیثیت محسنِ اردو ان کا حلقۂ اثر اتنا وسیع تھا کہ شمال و دکن کے بیشتر مشاہیر ادب انہی کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ امتیاز صرف اسی شاد کو حاصل ہے جو تمام عمر شعر کہتا رہا، نثر لکھتا رہا اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی فرماتا رہا۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد حیدرآبادی تہذیب کی پہچان تھے۔ مشرقی آداب کی وہ آبرو تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں نے انھیں قریب اور دور سے دیکھا ہے۔ ان کی صدارت میں مشاعرہ پڑھے ہیں اور ان کی غزلوں پر والد مرحوم فصاحت جنگ استاد جلیلؔ کی دی ہوئی اصلاحیں اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ ویسے جناب شاد سے ہمارے خاندانی مراسم رہے ہیں۔ والد مرحوم استاد جلیل کے وہ مربی اور سرپرست بھی تھے۔ ترکِ وطن کر کے استاد جلیل جب حیدرآباد آئے اس وقت مہاراجہ شاد وزیر افواج و پیشکار سلطنتِ آصفیہ تھے۔ اس غریب الوطنی میں جب کہ تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے شاد نے نہ صرف آسرا دیا بلکہ جناب جلیل کو اپنے مصاحبین میں شریک فرمایا پھر دکن میں قدم جمانے کی راہ یوں نکالی کہ اپنی ادارت میں نکلنے والے رسالوں دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام کی ادارت کے فرائض ان کے ذمّے کر دیئے۔ یہ سلسلہ جلیل کے استاد شاہ ہوجانے کے بعد بھی تادمِ آخر قائم رہا۔

کشن پرشاد شاد خانوادۂ آصفی کے قدیم متوسلین میں تھے۔ وجاہت خاندانی ورثہ میں ملی تھی۔

مہاراجہ چندولال کے پوتے اور نریندر پرشاد کے نواسے۔ نانا کے انتقال کے بعد موروثی خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوئے ایک عرصہ تک ریاست کے مدار المہام اور صدر اعظم کے جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے اور اپنی گراں قدر خدمات کے صلے میں راجہ راجگان، مہاراجہ بہادر اور یمین السلطنت کے القاب پائے۔ سلطنت انگلشیہ نے سی آئی۔ ای اور جی سی آئی ای سے نوازا۔ ایک عرصہ تک وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دے کر ۷۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مہاراجہ شادؔ کی شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ وہ شاعر تھے۔ نثار تھے۔ خطاط تھے۔ مصور تھے۔ مربی تھے۔ سرپرست تھے، صوفی تھے، فقیر تھے اور ایک سلطنت کے سربراہ بھی۔ ایسی جامع ہستی ایک کتاب کا موضوع بن سکتی ہے۔ لکھنے پڑھنے اور شعر و شاعری کا شوق جنون کی حد تک تھا جو آخر عمر تک جاری رہا۔

یوں تو انہوں نے تمام اصناف سخن قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور نظم و غزل پر قلم اٹھایا لیکن غزل سے انھیں طبعی لگاؤ تھا۔ شادؔ نے نہ صرف غزل کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ غزل کے مزاج، موضوع اور فن کے تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہوئے۔ غزل گوئی میں جس اہتمام فن کی ضرورت ہے، وہ ان کے پاس ملتا ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ مہاراجہ جیسے امیر کبیر چونکہ نشیب و فراز سے کم دوچار ہوئے اس لئے ان کے کلام میں سوز و گداز کم اور معاملہ بندی زیادہ ہے۔ یہی ان کی زندگی کا تقاضا بھی تھا۔ ابتدائے شاعری میں انھوں نے میر محبوب علی خاں آصفؔ کی شاگردی اختیار کی جب کہ وہ خود لکھتے ہیں

گو شاعری سے مجھ کو سروکار کچھ نہیں   پر فخر کیا یہ کم ہے کہ شاگرد شاہ ہوں

اسی زمانے میں بچولال تمکینؔ، عبد العلی والہؔ اور مظفر الدین معلیؔ کو بھی اپنا کلام دکھایا پھر داغؔ دہلوی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ جناب داغؔ کے بعد مستقل طور پر والد مرحوم حضرت جلیلؔ سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ شاگردی اور استادی کا یہ سلسلہ تا دم آخر قائم رہا۔ شادؔ کے ایک نجی مکتوب میں جو استاذ جلیلؔ کے نام ہے اس کا حوالہ یوں ملتا ہے۔

"حضرت استاد جلیلؔ! ایک عرصہ سے غیر حاضر رہا۔ اس کا سبب پریشانی اور کچھ علالت بھی تھی۔ ایک فارسی اور ایک اردو۔ دو غزلیں بھیجتا ہوں۔ نظر ثانی کے بعد عنایت ہوں۔ آپ کی خدمت میں عید کا تحفہ روانہ کرتا ہوں ع برگ سبز است تحفۂ درویش

فقیر کشن پرشاد شادؔ

اس تنوع پسندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شادؔ کا ایسا کلام مطالعہ کو نہیں ملتا جس پر شادؔ کی اپنی چھاپ ہو

البتہ زبان کی سلاست و سادگی، بیان کی شگفتگی و بے ساختگی اور جذبات و خیالات کی پاکیزگی شاد کے کلام کا نمایاں وصف ہے اور جو خصوصیت ان سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے وہ ہے تصوف کی چاشنی جو ان کے صوفیانہ مسلک کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کا اظہار ان کی غزلوں میں جا بجا ملتا ہے۔

میں ہوں موحد، میں ہوں صوفی   عارفِ بیخود، مجنوں صوفی !
دیکھتا ہوں وحدت میں کثرت   کثرت میں پاتا ہوں وحدت

اسی مسلک کے سبب مہاراجہ کے مذہب کے بارے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ ہر چند کہ وہ مذہباً ہندو تھے اور اپنے سودیہ ونشی ہونے پر فخر کرتے تھے لیکن ان کا طرزِ زندگی اور معاشرت مسلمانوں کی سی تھی۔ کلامِ مجید کی وہ تلاوت کرتے تھے۔ بزرگانِ دین کے وہ شیدائی تھے۔ مندروں میں قشقہ لگاتے تھے یعنی با مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام کا مسلک اختیار کر رکھا تھا۔ یہ ملا جلا گنگا جمنی مسلک و مشرب ان کے کلام میں آئینے کی طرح جھلکتا ہے۔

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں   ہر مذہب ہے میرا ایماں
مبارک شاد کا فر کو یہ جھگڑا کفر و ایماں کا   مرا مشرب فقیرانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

مختصر یہ کہ خود شاد کے قول کے مطابق ؎

شاد کا مذہب شاد ہی جانے   آزادی آزاد ہی جانے

ان ہی عقائد کے پیشِ نظر ان کے دربار کے ایک شاعر دلو رام کوثری نے مہاراجہ شاد کے سامنے ہی یہ مصرع بڑے اعتماد کے ساتھ پڑھا تھا ؎ گنگا سے جو پھسلا سو لبِ کوثر آیا

مہاراجہ بہادر نے شاعری کے ساتھ ساتھ بڑے پایہ کی نثر نگاری بھی کی۔ انشا پردازی کا وہ سلیقہ جانتے تھے۔ انہوں نے مقالے لکھے، ناول تصنیف کئے، سفرنامے مرتب کئے، مکتوب نگاری کے جوہر دکھلائے۔ اس طرح نثری تصانیف کی خاصی تعداد اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

جنابِ شاد کی حیات کا سب سے قابلِ ذکر پہلو ان کی سیرت ہے اور سیرت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سخاوت و داد و دہش ہے جس نے دکن میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی ہے وہ اپنی جیبیں خالی کرنے کے لئے بھرتے تھے اور سوچتے تھے آج کس کو دوں اور کس طرح دوں۔ سواری پر باہر نکلتے تو سڑک کے دونوں جانب چھوٹے بڑے سکے بکھراتے جاتے۔ یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا ہے کہ پیسے لوٹنے والوں کی ایسی بھیڑ ہوتی کہ ٹریفک جام ہو جاتی۔ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی سرپرستی اس کے علاوہ تھی اور یہ زبانِ اردو کے

اہل قلم کی ایسی عظیم جماعت تھی کہ تاریخ ادب میں شاید ہی کوئی ایسی نظیر ملتی ہو۔ مشاہیر ادب عہد مہاراجہ دکن کے اس شاد رستے والے، ورسے اور سخنے فرمائی ان کی فہرست بڑی طویل ہے جو سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ایک اندازہ ان کے حلقۂ ادب کا اس سے ہوتا ہے کہ دکن کے اہل قلم کے علاوہ شمالی ہند کے بھی مشاہیر ادب نے ان کے شخصی مراسم قائم ہوگئے تھے، ان میں اقبال، امیر مینائی، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، عبدالحلیم شرر، شیخ عبدالقادر، سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری، عبدالماجد دریابادی، ظفر علی خان اور مولوی عبدالحق کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شخصیتوں سے مہاراجہ شاد کے ادبی حلقے کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شاد کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو ان کی سیرت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر میں بطور خاص کرنا چاہوں گا جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے حسن اخلاق کا استحصال بھی کیا جاتا تھا۔ دیکھا تو نہیں معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ قوالی کی محفلوں میں بعض اشخاص بناوٹی حال خود پر طاری کر کے رقص فرماتے اور اپنی پرانی شیروانی پھاڑ ڈالتے تھے تاکہ مہاراجہ کے توشک خانے سے دوسری مل جائے۔ جناب شاد سب کچھ جاننے کے باوجود شیروانیاں تقسیم کرنے میں دریغ نہ کرتے۔

شخصیت و سیرت کا ایسا بلند مقام حاصل کرنے کے باوجود منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بڑائی کا کہیں اظہار ہونے دینا انھیں پسند نہ تھا۔ اس کا صحیح اندازہ آپ شاد کے ان الفاظ سے کریں جو مکتوب کی صورت میں استاد جلیل کو لکھے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"حضرت جلیل۔ نظم پہنچی۔ اصلاح کا شکریہ۔ آپ کا وجود دنیائے شاعری کے مغتنمات سے ہے مگر ہر بار میرے دل میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ شاد نے تمام عمر خاکساری کا پیرو رہنے کی کوشش کی۔ اس فن کے لئے تعلی اس عمر میں مناسب نہیں۔ اس لئے فقیر نے ان دونوں اشعار کو بدل دیا ہے۔

فقیر کشن پرشاد شاد

یہ بھی تحریر جو شائع ہونے کے لئے نہیں لکھی گئی تھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مہاراجہ شاد نے قصر امارت میں رہ کر بھی فقیری کے منازل طے کئے اور تادم واپسیں اس میں ذرہ برابر فرق آنے دینا گوارا نہیں کیا۔ ایسی مثالیں اب نہ دیکھنے کو ملتی ہیں اور نہ سننے کو۔ شاعر ہونے سے قطع نظر سیرت کے یہ نقش ہی شاد کا نام باقی رکھنے کے لئے بہت کافی ہیں۔

آخر میں ایک بات اور ———— یعنی مہاراجہ بہادر اور شاعری ـ حیدرآباد

میں اُردو کو سربلند کرنے میں جو عوامل کارفرما رہے ہیں ان میں سب سے زیادہ طاقتور عامل شاد کے وہ خاص مشاعرے تھے جو ان کی نگرانی اور ان کی سرپرستی میں منعقد ہوتے تھے۔ ان مشاعروں نے اُردو کے فروغ میں کیا حصّہ لیا اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاعروں کا اہتمام دیکھا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے ان مشاعروں میں پڑھنے کا موقع بھی ملا ہے اور سننے کا بھی۔ وہ مناظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں جب مہاراجہ شاد مسندِ صدارت پر متمکن ہوتے اور شمع گردش کرتی ہوئی ایک ایک شاعر کے سامنے آتی۔ ان مشاعروں میں شرکت کو شعرا باعثِ فخر اور اپنی شاعری کی سند سمجھتے تھے۔ اب نہ وہ مشاعرہ رہا اور نہ مشاعرہ کا وہ صدر جس نے زندگی تمام اپنے اطراف اُردو کی شمعیں جلا رکھی تھیں

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

اپنی بات

(صـ۲ سے آگے :) جناب رحمن راج سکینہ معتمد اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اس جلسہ کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" (حیدرآباد) نے پروفیسر سید علی اکبر کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ پروفیسر سید علی اکبر صاحب مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

۲۶ اپریل ۱۹۸۸ء کو مشہور و مقبول اور ممتاز طنز و مزاح نگار، قابل ایڈمنسٹریٹر مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کے سکریٹری، مہاراشٹرا گورنمنٹ کے سابق ایڈیشنل چیف سکریٹری اور اُردو زبان کے پُرخلوص خدمت گذار جناب خواجہ عبدالغفور کا حیدرآباد سے بمبئی جاتے ہوئے ٹرین میں قلب پر شدید حملہ کی وجہ سے اچانک انتقال ہوگیا۔ وہ مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کے سہ ماہی مجلہ "امکان" کے مدیر اعلیٰ اور پندرہ روزہ "قومی راج" (بمبئی) کے نگران تھے۔ مرحوم خواجہ عبدالغفور، ماہنامہ "شاداب" (حیدرآباد) اور ماہنامہ "شگوفہ" (حیدرآباد) کی مجلس مشاورت کے رکن بھی تھے۔ وہ نظامس اُردو ٹرسٹ کے ٹرسٹی کے علاوہ آندھرا پردیش اور مہاراشٹرا کی کئی علمی، ادبی اور سماجی تنظیموں کی روحِ رواں تھے ان کی حرکیاتی شخصیت نے ہمیشہ طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں کے حوصلے بڑھائے۔ وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب میں بھی حصّہ لیا کرتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں "قہقہہ زار"، "شگوفہ زار"، "لالہ زار"، "سمن زار" اور "گل و گلزار" دلچسپی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اُن کے تحقیقی مقالہ "طنز و مزاح کا تحقیقی جائزہ" پر بمبئی یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل اُن کا پی ایچ ڈی کا یہ مقالہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔

دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے ضعیف والدین، ان کی بیگم صاحبہ محترمہ حبیبہ صاحبہ اور صاحبزادوں کے علاوہ دیگر رشتہ داروں اور قدردانوں کو اس صدمہ کے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ (آمین)

پروفیسر دھریندر پرشاد

قطب شاہی تمدّن و ثقافت

محمد قلی قطب شاہ نے شہر حیدرآباد کی بنیاد ۱۰۰۰ھ م ۱۵۹۱ء میں رکھی تھی لیکن اس شہر کے تمدنی پس منظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں قطب شاہی خاندان کے ابتدائی حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قطب شاہی خاندان کا بانی اور سب سے پہلا بادشاہ 'سلطان قلی قطب شاہ تھا جو سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہمدان سے براہِ خلیج فارس وارد دکن ہوا تھا۔ محمود شاہ بہمنی کے انتقال پر جب دکن کے سب صوبہ داروں نے اعلانِ خود مختاری کیا تو ۹۲۴ھ م ۱۵۱۸ء میں قطب الملک، نے "قطب شاہ" کے نام سے والیٔ گولکنڈہ ہونے کا اعلان کیا۔ وہ دوران صوبہ داریٔ گولکنڈہ ہمیشہ اپنے بادشاہ محمود شاہ بہمنی کا وفادار رہا۔ سلطان قلی قطب الملک کو دکن کے عوام پیار سے 'بڑے ملک' پکارتے تھے۔ ۲ر جمادی الثانی ۹۵۰ھ م ۱۵۴۳ء بروز دوشنبہ' نماز عصر میں ایک ترکی غلام' محمود ہمدانی قلعہ دار نے گولکنڈہ کی قدیم مسجد صفا میں سلطان کو شہید کر دیا۔ بعد اس کے بعد اس کا بیٹا یار قلی جمشید جو غالباً اس کے قتل کی سازش میں شریک تھا' تخت نشین ہو گیا۔

اس بیان کے سلسلے میں اگر مسجدِ صفا کی تعمیر کے بارے میں ذکر کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا قلعہ گولکنڈہ کی سب سے قدیم جامع مسجد' مسجدِ صفا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بالا حصار کے دروازہ سے تھوڑے فاصلے پر سیدھی جانب واقع ہے۔ سلطان قلی نے ۹۲۴ھ م ۱۵۱۸ء میں اس مسجد کی تعمیر کروائی تھی۔ اسی مسجد میں ۲۵ سال کے بعد سجدہ کرتے وقت سلطان قلی کا قتل کروا لیا گیا تھا۔ اس مسجد کا دروازہ گنبدی ہے۔ اس میں ایک بڑا ہال ہے جس میں چھ چشمے ہیں

اس کے سامنے کے رُخ پر پانچ کمانیں ہیں اور عمارت کے دونوں رُخوں پر چار چار چھوٹے مینار گلدستہ کی طرح کے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے دروازہ پر سنگِ سیاہ پر ایک کتبہ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر ۹۲۴ھ میں سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ بہمنی کے عہد میں ہوئی تھی۔

۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء میں جب جمشید قلی قطب شاہ کی مرضِ دق سے وفات ہوئی تو اس کے کمسن (۷) سالہ لڑکے ' سبحان قلی کو تخت پر بٹھایا گیا ' لیکن جب گولکنڈہ کے امراء نے سبحان قلی کو قید کر دیا تو ۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء میں ابراہیم ' بحیثیت بادشاہ ' سلطنتِ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ سلطان ابراہیم جمشید قلی کا چھوٹا بھائی تھا۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد ' اس نے علاقہ تلنگانہ میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس زمانے میں چور ڈاکو اور سرکش زمینداروں کا دور دورہ تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے سختی سے اس کا انسداد کیا جس کی وجہ سے رعایا کو ایک مقام سے دوسرے مقام کو جانے میں بڑی سہولتیں میسر ہوئیں۔ غیر ممالک سے تجارت ' جو عرصۂ دراز سے ناساز گار حالات کی وجہ بُری طرح سے متاثر ہوئی تھی ' پھر سے شروع ہو گئی۔ دکن کا یہ خطہ دوبارہ خوشحال اور دولت سے مالا مال ہو گیا۔

ابراہیم قلی اپنے دور کا زبردست معمار تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں اچھی سڑکوں اور سراؤں کی تعمیر عمل میں آئی اور بڑے بڑے ذخائرِ آب بنوائے گئے۔ جیسے تالاب حسین ساگر ' تالاب ابراہیم پٹن تالاب پانگل (نلگنڈہ) ' عیسیٰ اور موسیٰ ندیوں پر اپنی گٹ ' ذخیرۂ آب کانکور و ذخیرۂ آب کوئیلکنڈہ۔ ذخیرۂ آب دیورکنڈہ جس سے نلگنڈہ کے قحط سالی علاقہ کو پانی فراہم ہونے لگا تھا۔ ان تمام تعمیری کاموں کی وجہ سے تاریخ داں نے ابراہیم قطب شاہ کو " آب پاشی کے بادشاہ " کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ان تمام تالابوں کی تعمیر میں ' بالخصوص تعمیرِ حسین ساگر میں ' جو شہر حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان واقع ہے ' بادشاہ نے اپنے داماد حضرت حسین شاہ ولی سے امداد حاصل کی تھی۔ یہ نہ صرف ایک صوفی منش تھے بلکہ ایک لائق و فائق انجینئر بھی تھے۔ حضرت کا مزار شریف ' گولکنڈہ کے قریب واقع ہے جسے لوگ ' درگاہ حضرت حسین شاہ ولی ' کہتے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں کی بنی ہوئی شکر ' درگاہ کی شکر ' کے نام سے مشہور تھی ' جو خاص مزہ کی وجہ سے پسند کی جاتی تھی۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کے دورِ درخشاں میں قلعہ گولکنڈہ کی نئی فصیل ' برج ' مساجد اور مدرسے باغ گلشنِ ' باغ ابراہیم شاہی ' کٹورہ بندوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ موسیٰ ندی پر اس پل کی تعمیر ہوئی جسے ہم آج کل " پرانا پُل " کہتے ہیں۔ اس کے آغازِ تعمیر کا مادۂ تاریخ " صراط المستقیم " اور تکمیلِ تعمیر ۹۸۱ھ

کی تاریخ نکلتی ہے

'زہے تخت پل' گذر دمار و ما' برو گذریم۔ ازیں سبب شدہ تاریخ 'او گذر گہ مار'

اس پل کی تعمیر ۹۸۶ھ م ۱۵۷۸ء میں مکمل ہو گئی۔ یہ ۶۰۰ فٹ لانبا' ۳۶ فٹ چوڑا اور ۴۲ فٹ اونچا ہے۔ اس میں (۲۲) کمانیں ہیں۔ کئی دفعہ ندی میں طغیانی آئی۔ اطراف و اکناف کی عمارتیں غرقاب ہوئیں بعد ٹوٹ گئیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا لیکن اس پل نے ان سب کا مقابلہ کیا اور آج تک موجود ہے۔ دور قطب شاہی میں اس پل کا نام 'پل نرشدہ' تھا۔ چونکہ رود موسیٰ پر یہ سب سے پہلا پل تھا اس لئے اس کو 'پل کہنہ' یا 'پرانا پل' بھی کہتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں تلنگانہ ملک مصر کی طرح تجارت کی منڈی بن گیا تھا اس دور میں یہاں ترکی' عرب' ایرانی تجار آنے جانے لگے تھے۔ کیونکہ گولکنڈہ ہیروں اور فولاد کی تجارت کا مرکز بن گیا تھا جس کی وجہ سے چار دانگ عالم میں اس علاقہ کی بڑی شہرت ہو گئی تھی۔

ابراہیم قطب شاہ نے تلگو ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ وہ خود زبان تلگو کا بڑا ماہر تھا' جسے وہ اچھی طرح سمجھتا اور بولتا تھا کیونکہ وہ اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد میں سات سال تک وجیانگر میں رہا تھا' بلکہ وہاں اس نے جمشید قلی سے بچنے کے لئے پناہ لی تھی۔ اس دوران ابراہیم نے وجیانگر کی تہذیب و تمدن کا اچھی طرح سے جائزہ لیا اور تلگو زبان کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا تھا چنانچہ جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے تلگو شعرا کی بڑی آؤ بھگت کی اور بڑی فراخدلی سے ان کو نوازا۔ اس لئے سلطان ابراہیم کے دور کو 'تلگو زبان کا زرین دور' کہا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں فارسی اور اردو کے باکمال شعرا کے علاوہ تلگو زبان میں بھی کئی بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔
اس طرح تلنگانہ میں ایک ایسی ملی جلی تہذیب کو تقویت حاصل ہوئی' جس کی بنیاد فیروز شاہ بہمنی نے دکن میں رکھی تھی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ قطب شاہی حکمراں جمہوری طرز حکومت کے علمبردار تھے اور عوام کی خدمت گذاری کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لہٰذا عوام کی بہبودی اور بھلائی کے لئے ابراہیم نے جو کام انجام دیئے وہ ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں یاد رہیں گے۔

ابراہیم قطب شاہ' جسے لوگ پیار و محبت سے "ایبھارام" کہتے تھے' کا انتقال ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں ہوا۔ اس کا تیسرا بیٹا محمد قلی قطب شاہ اس کا جانشین ہوا جو رعایا میں بہت مقبول تھا۔ یہ حکمراں ہونے کے تقریباً دس سال بعد نئے شہر حیدرآباد کا بانی ہوا۔ سن بلوغ کو پہنچنے پر سلطان ابراہیم نے اپنے بیٹے

کو جو کام سونپے تھے، وہ انھیں بڑی جانفشانی سے انجام دیتا تھا، جس کی وجہ سے سلطان اس سے بہت خوش رہتا تھا۔ سچ ہے۔ ' ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات '

اپنی تخت نشینی کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے اپنے مرحوم باپ کے نقشِ قدم پر عدل وانصاف کو اپنا شعار بنایا، چنانچہ اس کے زمانے کے ایک تعمیر کردہ محل کا نام ' داد محل ' تھا۔ اس وجہ سے رعایا، بلا امتیاز مذہب و ملت اس کی شیدا تھی۔ محمد قلی ایک علم دوست بادشاہ ہونے کے علاوہ فارسی اور دکھنی زبان کا اچھا شاعر تھا بلکہ اس کو دکنی اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تصور کیا جاتا ہے اس کا دور امن و شانتی اور اتحاد کا دور تھا۔ اس نے اپنے باشندوں کی طرح دکنی لباس پہنا۔ تلگو زبان سیکھی، تلگو کے شعرا کی ہمت افزائی کی اور دکن کے قدیم راجاؤں کی طرح اپنی زندگی کو ڈھالا۔ اور مندروں کو گراں بہا عطیات دے کر اپنی رواداری کا ثبوت دیا۔ محرم کا مہینہ قومی یکجہتی کا مہینہ بنا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک رہتے اور اسے مناتے۔ تلگو بولنے والی رعایا محرم کو ' پیرلا پنڈوگا ' کے نام سے یاد کرتی اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو احتراماً آشنا اور اوشنا سے یاد کرتی۔

محمد قلی قطب شاہ کو حضرت میر مومن جیسے مدبّر، عالم و فاضل پیشوا سے سلطنت کی خدمات حاصل ہوئی تھیں، جنھوں نے اپنی قابلیت اور حسنِ انتظام سے سلطنت کو بڑی ترقی دی اور شہر حیدرآباد اور گولکنڈہ کو علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً دس سال بعد شہر حیدرآباد کی نیو رکھی گئی۔ سنہ ۹۹۹ھ م ۱۵۹۰ء میں شہر حیدرآباد کی تاسیس عمل میں آئی۔

جس سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ اس شہر کی بنیاد رکھی گئی وہ قرون وسطیٰ کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ شہر کا ایسا اچھا پلان بنایا گیا کہ قرونِ وسطیٰ میں اس کی نظیر نہ تھی۔ دریائے موسیٰ کی خوبصورت وادی میں شہر کی داغ بیل ڈالی گئی جس سے نہ صرف پانی کی سہولت بہم ہوئی بلکہ شہر کی خوبصورتی اور رونق میں بھی چار چاند لگ گئے۔ چار مینار کی تعمیر سے اس شہر کی ابتدا ہوئی، جو شہر کے وسط میں واقع ہے۔ چار مینار تعمیر کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ ایسی یادگار ہے جو دکنی تمدن کی بہترین مثال ہے۔ دنیا میں چار مینار جیسی خوبصورت عمارتیں بہت کم ہیں، جن کو دیکھنے کے لئے دور دور سے سیاح آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک مربع کور عمارت ہے جو ۱۸۹ فٹ بلند ہے۔ اس کے پہلے درجے میں چاروں جانب چار عظیم الشان بلند کمانیں ہیں، جو ۲۲ فٹ بلند اور ۳۰ فٹ عریض ہیں۔ ان کمانوں کے،

مقابل چار سمت چار شاہراہیں ہیں۔ چار مینار کے چاروں جانب جو بازار تعمیر کئے گئے تھے ان میں دکانوں کا یہ انتظام تھا کہ ہر دکان کے سامنے ایک ہی وضع کا برآمدہ بنایا گیا تاکہ خوشنما بھی معلوم ہو اور تاجروں اور گاہکوں کو دھوپ اور پانی سے نجات ملے۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کو بھی ملحوظ رکھا کہ اس میں متمدن زندگی کی ساری ضرورتیں مہیا ہوں۔ چنانچہ اس شہر میں چار بازار بنائے گئے جن میں چودہ ہزار دکانیں بنائی گئیں، جن کی اتنی بڑی تعداد سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے متمدن معاشرے کی بے شمار اشیاء یہاں فروخت ہوتی ہوں گی۔

چار مینار کے علاوہ، جس کی 'یا حافظ' سے تاریخ اخذ ہوتی ہے، مدرسے، مسجدیں، لنگر خانے، مہمان خانے اور کاروان سرائیں بنائی گئیں۔ چار مینار کے شمال مشرق میں جو جامع مسجد تعمیر کی گئی، وہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ شہر کی سب سے پہلی مسجد ہے جو تعمیر کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ مسجد کا وسیع دالان، ستونوں کی قطاریں، خوبصورت محرابیں اور مینار، عمارت کے بانی کی اولوالعزمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس مسجد کی چھت کی منڈیر پر بہمنی طرز کی محراب دار جالی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں ایک قدیم ترکی حمام بھی تھا، جو اب باقی نہیں ہے۔

مسجد کا ایک کتبہ بہ زبان فارسی بہت ہی خوبصورت نستعلیق خط میں ہے جس میں سید میر محمد امین استرآبادی کا نام ہے جن کی زیر نگرانی یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ اس مسجد کے علاوہ تقریباً ایک میل شمال مشرقی جانب اور موسیٰ ندی کے قریب ایک بڑا ہسپتال 'دارالشفا' کے نام سے ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۵ء میں تعمیر کیا گیا اس میں حکماء، مسافروں اور بیماروں کے رہنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے [illegible] دیوار آج بھی شہر حیدرآباد کی تمدنی عظمت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ علاوہ بریں، شہر میں شاہی بود و باش اور امور سلطنت کے سرانجام کے لئے بڑی تعداد میں محلات بنائے گئے تھے۔ جن کی بہت بڑی تفصیل ہے۔ چار مینار کے شمالی جانب، مساوی فاصلوں پر چار بلند کمانیں آج بھی قطب شاہی دور کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کے درمیان 'چار سو کا حوض' بنایا گیا، جسے آج 'گلزار حوض' کہتے ہیں۔ اس کے مغربی جانب شاہی محلات تعمیر ہوئے۔ 'دادمحل' جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، کئی منزلہ عظیم الشان عمارت تھی۔ اس کی ہر منزل میں بڑے بڑے ایوان تھے۔ 'ندی محل'، رود موسیٰ کے کنارے بنایا گیا تھا۔ جہاں سے سامنے ندی کا اچھا نظارہ ہوتا تھا۔ دادمحل کے قریب ایک اور محل 'خداداد محل' تھا، جو بلند ترین تھا۔ اس کی سات منزلیں تھیں۔ ہر منزل کا علیحدہ نام تھا۔ پہلی منزل [illegible] محل'، دوسری جعفری محل'، تیسری حسینی محل'، چوتھی حسنی محل'، پانچویں حیدری محل'، چھٹی محمدی محل بلند

ساتویں "الٰہی محل" سے موسوم تھی۔ نبات محل شہر کے شمال میں تعمیر ہوا تھا جہاں نوبت پہاڑ واقع ہے اور باغ محمد شاہی ندی کے کنارے واقع تھا جہاں آج میر عالم کی بارہ دری پائی جاتی ہے اور ملکوہ کا محل اس پہاڑی پر واقع تھا، جہاں آج کل قصر فلک نما ہے۔

میر ابو طالب جو محمد قلی قطب شاہ کا ناظر تھا، بیان کرتا ہے:

"حیدرآباد اور اس کی عمارتوں کی تعمیر میں ستر لاکھ ہون صرف ہوئے تھے۔"

گولکنڈہ کے امرا نے بھی شہر کو سجانے میں کوئی دریغ نہ رکھا۔ ہر جگہ خوشنما عمارتیں بنوائیں اور باغ لگوائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال کے اندر حیدرآباد دنیا کا ایک بارونق شہر ہو گیا۔

فرانسیسی سیاح تھیونو نے جو گولکنڈہ کو کئی مرتبہ آیا تھا، شہر کی بڑی تعریف کی ہے۔

"شہر نہایت سلیقہ سے بنایا گیا ہے اور اس میں بڑے بڑے راستے ہیں۔"

ولیم میتھولڈ لکھتا ہے:

"شہر حیدرآباد اپنی خوشگوار آب و ہوا اور پانی کی بہتات کی بدولت ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔"

۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء میں محمد قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کی اکلوتی لڑکی (حیات بخشی بیگم) کا شوہر اور محمد قلی کے بھائی محمد امین کا لڑکا، سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ اس کی تربیت علمی فضا میں ہوئی تھی۔ یہ بادشاہ علم دوست اور پرہیزگار تھا۔ حیدرآباد کی مشہور "مکہ مسجد" کا سنگ بنیاد، جس کے تعمیر کی تاریخ "بیت العتیق" سے نکلتی ہے، اسی بادشاہ نے رکھی تھی۔ رنگیا میستری اور ہنرمند خاں چودھری اور فیض اللہ بیگ انجنیئر نے اس مسجد کی تعمیر کا ۱۰۲۳ھ م ۱۶۱۴ء میں آغاز کیا تھا لیکن (۷۷) سال میں اس مسجد کی تعمیر ختم ہوئی۔ اس وقت ابوالحسن تانا شاہ بادشاہ تھا۔ جب کہ بیرونی صدر دروازہ اور صدر دروازہ کے مینار کی تعمیر باقی رہ گئی تھی۔ جس کو اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۸۷ء میں قلعہ گولکنڈہ کی فتح کے بعد مکمل کروایا تھا۔ شہنشاہ سے جب مزید آرائش کے لئے عرض کیا گیا تو ارشاد ہوا کہ:

"کار دنیا کسے تمام نہ کرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید"

اس مسجد کی جسامت ۲۲۵ فٹ طویل، ۱۸۰ فٹ عریض اور ۷۵ فٹ بلند ہے۔ مسجد میں ۳۶۰ فٹ مربع چبوترہ ہے۔ چھت کے نیچے ۱۵، ۱۵ کمانوں کی تین قطاریں ہیں۔ ہر قطار کے آخر میں شمالی اور جنوبی گوشوں میں سو سو فٹ بلند دو گنبد ہیں۔ مسجد کے صحن میں ایک حوض ہے جو ۶۰ گز مربع ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ نے مکہ معظمہ کی مٹی منگوا کر اس کی اینٹیں بنوائیں اور

مسجد میں نصب کروایا اس لئے اس مسجد کا نام 'مکہ مسجد' مشہور ہوا۔

محمد قطب شاہ کا انتقال ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۵ء میں ہوا۔ اس کا لڑکا 'عبداللہ' تخت نشین ہوا۔ اس کا ابتدائی دور سیاسی الجھنوں میں گزرا، جب ذرا اس طرف سے یکسوئی ہوئی تو اس نے علم و فن کی ترقی کی طرف توجہ کی۔ دکنی اردو کو اس کے زمانہ میں ترقی ہوئی اور خود بادشاہ بھی دکنی زبان میں شاعری کرتا تھا۔ مُلّا وجہی نے جو محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں قطب مشتری کی تصنیف کے بعد محمد قطب شاہ کے دور میں گوشۂ عافیت اختیار کیا تھا، 'سب رس' جیسی بلند پایہ ادبی تخلیق ۱۰۴۵ھ م ۱۶۳۵ء میں کی۔ اسی طرح غواصی نے بھی اپنی مشہور مثنویاں لکھیں ابن نشاطی کی مشہور مثنوی 'پھول بن' بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں تلگو ادب کو بھی ترقی ہوئی۔ خود بادشاہ کے فرمان تلگو اور فارسی میں ہونے لگے۔ محرم کے لوک گیت تلگو میں لکھے جانے لگے۔ جو زبان زد عام ہوئے۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ میں 'چھتریا' نامی مشہور موسیقار کی بھی بڑی قدر ہوئی۔ اس لحاظ سے عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بڑا یادگار ہے جس میں علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی۔

عبداللہ قطب شاہ نے نبی باغ اور باغ لنگم پلی بنوایا۔ اس باغ میں تین منزلہ محل بنوایا گیا، جس کے آثار آج تک موجود ہیں۔

کاروان ساہواں سے تھوڑے فاصلہ پر ٹولی مسجد، موسیٰ خاں محلدار و سپہ سالار و وزیر، سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعمیر کردہ ہے۔ موسیٰ خان کے نام سے گولکنڈہ کا موسیٰ برج منسوب ہے اس مسجد کا مادہ تاریخ یہ ہے:

'بنا کرد مسجد بنام خدا'
۱۰۸۲ھ

گلزار آصفیہ میں اس کا نام 'دمڑی مسجد' لکھ کر وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ موسیٰ خاں مکہ مسجد کی داروغگی پر مامور تھے۔ تاریخ تعمیر میں سے فی روپیہ ایک دمڑی ان کے لئے بطور تحریر مقرر تھی ایسی تحریر کی رقم سے انہوں نے یہ مسجد بنوائی۔ یہ نہایت ہی خوبصورت مسجد ہے جس کی نمایاں خصوصیت اس کی آرائش ہے اور اس میں ہندو فن تعمیر پوری طرح سرایت کر گیا ہے۔

گوشہ محل کی تعمیر بھی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں شروع ہوئی تھی جو سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس محل میں ایک ہزار حجرے تھے اور اس کے سامنے ایک عظیم الشان حوض تعمیر کیا گیا تھا جہاں آج کل گوشہ محل اسٹیڈیم واقع ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء میں ہوا۔ اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تخت نشین ہوا۔ یہ حیدرآباد کے صوفی بزرگ شاہ راجو کا مرید تھا اور چودہ سال اس نے ان کی خانقاہ میں گذارے تھے۔ بستان آصفیہ کے مصنف کے مطابق 'مورخین کا بیان ہے کہ تاناشاہ نے چودہ سال بچپن' چودہ سال تحصیل علم' چودہ سال حضرت شاہ راجو کی خدمت' چودہ سال سلطنت اور چودہ سال قید میں گذارے جس کا مجموعہ ستر سال ہوتا ہے۔ وہ عوام میں تاناشاہ کے نام سے مشہور تھا۔ قلعہ گولکنڈہ کی فتح کے بعد وہ ۱۰۹۹ھ م ۱۶۸۸ء میں قلعہ دولت آباد میں قید کیا گیا۔ جہاں انہوں نے زندگی کے پورے دن گذارے اور ۱۱۱۲ھ م ۱۷۰۲ء میں انتقال کیا۔

تاناشاہ نے اپنے عہد میں باغ املی محل اور چار محل بنوائے۔

گولکنڈے کے قطب شاہی گنبد بھی قابل دید ہیں۔ بالخصوص گنبد محمد قلی قطب شاہ رفیع الشان گنبد ہے جس کی بلندی ۱۸۰ فٹ اور گنبد کی اندرونی چھت ۶۰ فٹ اونچی ہے۔ اس کے چبوترے بہت بلند اور وسیع ہیں۔ اس گنبد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سے چارمینار کا نظارہ کیا جا سکتا ہے اس گنبد میں ہندو مسلم طرز تعمیر کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔

قیام آندھرا پردیش کے بعد سے ہر سال اردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر' محمد قلی کی وفات کے دن ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے یہاں' شاندار یادگاری جلسہ منعقد کیا جاتا ہے' جس میں کئی لوگ شریک ہوتے ہیں۔

پس' قطب شاہی عہد کے لاتعداد زریں کارناموں میں تشکیل شہری اور تعمیرات کو ایک خاص مقام حاصل تھا اس لئے تعجب نہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے بلند مرتبت شہنشاہ نے جب اس سرزمین پر قدم رکھا تو حیرت سے دریافت فرمایا:

'این بلند بلند چیست۔'

جس کے جواب میں ان کے ندیم خاص نے برجستہ عرض کیا:

'بلند ہمت بلند ند عمارتہائے بلند ساختند۔'

قطب شاہی عمارات جو ہماری میراث ہیں' ان کے ہم پاسبان ہیں۔ حیدرآبادی ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا فرض ہے کہ انہیں ہم زمانے کے دست و برد سے محفوظ رکھیں۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس منعقدہ ۱۳ر فروری ۱۹۸۴ء میں پڑھا گیا)

پروفیسر کے گوپال کرشنا راؤ

امین خان

قطب شاہی دور کا ایک جاگیردار

دورِ قطب شاہی تلگو ادب کی تاریخ میں زرّیں دور ہے۔ اس دور میں نئی اصناف کا تلگو شاعری میں اضافہ ہوا۔ اس وقت اس دور کے ادبی رجحانات کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ یہاں صرف ابراہیم قلی کے زمانے میں لکھی گئی ایک نظم اور خاص کر ایک مقدمہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

ابراہیم قلی کو تلگو ادب سے دلچسپی جیسا کہ آپ جانتے ہیں ورثہ میں ملی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انہوں نے گولکنڈہ کے دورِ وجیانگر میں چند سال گذارے تھے۔ تلگو شعرا اور ادب سے اسی زمانہ میں ان کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ واپسی کے بعد ۱۵۵۰ء میں جب انہوں نے گولکنڈہ کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اپنی اس دلچسپی کو اور روشن کر دیا۔ تلگو شعراء اور عالموں کی سرپرستی کی۔ اُن سے نظم لکھوائی ان کی ادبی دلچسپی اور رواداری سے تلگو شعرا بہت ہی متاثر ہوئے۔ ان کی تعریف میں بہت سے شعر اور نظم لکھی گئی ہیں۔ تلگو شعرا کی نظریں یہ ملک ابھ رام بن گئے۔

ابراہیم قلی کی حکومت اور دربار کے عہدہ دار بھی اپنے آقا کے نقش قدم پر چلنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کے دور کے جاگیرداروں اور فوجی حکام میں امین خان کا ذکر اولین طور پر کیا جاسکتا ہے۔ امین خان ایک فوجی عہدے دار تھے اور پیٹھاپورم کے جاگیردار بھی۔ اردو اور فارسی نظموں اور تواریخ میں ان کا تذکرہ کہاں تک ہوا؟ اس کا مجھے علم نہیں لیکن تلگو کی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ صرف ایک ہی نظم میں ان کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ امین، ابراہیم کے عہدے داروں میں بہت ہی مقبول رہے۔ انہوں نے اپنے دربار میں تلگو شعرا اور عالموں کی سرپرستی کی ہے۔ ان

میں پونّاگنٹی تلیگنّا (PONNAGANTI TELAGANNA) کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعر کی ایک طویل نظم یایاتی چرترمو (YAYATI CHARITRAMU) ۱۵۸۴ء میں لکھی گئی۔ یہ امین خان سے منسوب ہے۔ مہابھارت کے ایک قصہ کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

اس نظم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ خالص تلگو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس موقع پر خالص تلگو زبان کی تشریح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تلگو ایک دراوڑی زبان ہے اور اس پر صدہا سالوں سے سنسکرت اور پراکرت کے اثرات پڑے اور سنسکرت اور پراکرت کے ہزاروں الفاظ اس میں داخل ہوئے۔ تلگو زبان میں ان الفاظ کا عام طور سے استعمال ہوتا ہے۔ ان کے بغیر تلگو میں شاعری کرنا ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔ ان کے علاوہ تلگو میں دیسی الفاظ بھی ہیں۔ ان میں سنسکرت اور پراکرت کے ترجمہ الفاظ یعنی ان کے بنے ہوئے الفاظ شامل ہیں۔ ایسے دیسی الفاظ کی زبان کو خالص تلگو زبان کہتے ہیں۔ صرف ایسی زبان میں شاعری کرنے کی روائت یوں تو ۱۶ ویں صدی عیسوی سے پہلے سے رہی ہے لیکن کوئی طویل نظم نہیں ملتی۔ ایسی خالص تلگو زبان کی پہلی نظم امین خان کے درباری شاعر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا تلگو کی ادبی تاریخ میں سنہرے حروف سے تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ فخر کی بات یہ ہے کہ قطب شاہی دور کو ہی یہ رتبہ حاصل ہوتا ہے تلگو ادب کے مسلمان سرپرستوں میں ابراہیم قلی کے بعد امین خان کو ایسا مقام حاصل ہوتا ہے۔

یہ یاتی چرترمو کا مقدمہ اس دور کی زبان، ادب اور سماجی حالات کا آئینہ ہے۔ ادبی سرپرست امین خان کے شخصی اور خاندانی حالات کا ذکر صرف اسی نظم میں تفصیلی طور پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تلگو نظم کی یہ روایت ہے کہ اس کا مقدمہ ایک خاص نمونہ پر لکھا جاتا ہے۔ اس میں ادبی سرپرست، ان کے خاندانی حالات، اس عہد کے سیاسی سماجی اور ادبی رجحانات اور مختلف امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کے تاثرات بھی اس میں ملتے ہیں۔

یہ یاتی چرترمو کا مقدمہ اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ تلگو نظم کے مقدموں میں یہی ایک پہلا مقدمہ ہے جس میں مریگنٹی خاندان کے شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ مریگنٹی خاندان (MIRINGANTI FAMILY) شعرا اور ادیبوں کا خاندان ہے۔ سولھویں صدی سے اس خاندان کے افراد کے ادبی کارنامے ملتے ہیں۔ ابراہیم کے دربار میں سنگراچاری نامی شاعر تھے اور امین خان کے دربار میں مریگنٹی اپنّا (MARINGANTI APPANA) ان کی امین خان کے نزدیک خاص اور باعزت رسائی

تھی۔ انہوں نے تلنگانہ شاعر کا تعارف امین خان سے کروایا اور ان کی ایماء پر یہ نظم لکھی گئی اور امین خان سے منسوب ہوئی۔ امین خان کی تعریف کرتے ہوئے شاعر نے ان کے خاندانی حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔ امین خان کے آباو اجداد (تقریب قریب تین پشت) گولکنڈہ کے حکمران کی خدمت کر چکے ہیں۔ امین خان اور ان کے فرزند بھی اس وقت کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لئے۔ امین خان پٹن چرو کے جاگیردار تھے یہ تلگو میں پوٹلہ چرو (POTLA CHERUVU) کے نام سے مشہور ہے۔ اور آج ایک مشہور صنعتی علاقہ ہے۔ امین خان کے پردادا ہمایاں تھے۔ بڑے میاں ان کے فرزند تھے جن کے محل کے نام میں سیلار بی بی (SELARBIBI) اور سربن بی بی (SURBANBIBI) سیلار بی بی کے بطن سے امین خان پیدا ہوئے۔ امین خان کے تین بیویاں ہیں۔ بڑی بی بی BADEBIBI، سکر بی بی SEKKAR BIBI اور شمع بی بی (SHAMABIBI) جن سے گنات خان، فاضل خان، عبدالنبی اور شیخ ابراہیم نامی فرزندوں کا تولد ہوا۔

امین خان کے نام سے ایک گاؤں امین پورہ (AMEEN PURA) آباد ہوا۔ باؤلیاں، تالاب، باغ اس گاؤں کی زینت تھے ان باغوں میں آم، انار، لیمو اور کھجور کے درخت تھے۔ اس علاقہ میں ایک مسجد کی بھی تعمیر ہوئی تھی۔

امین خان بارتبہ عہدیدار تھے۔ خدا پرست اور مذہبی آدمی تھے غریب برہمن لڑکیوں کی ہر طرح امداد کرتے تھے اور ان کی شادی کروانے میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ یہ ایک مسلمان جاگیردار کی انسانی برادری ہمدردی فراخدلی اور مذہبی رواداری اور عظمت کی عمدہ مثال ہے اس سلسلہ میں ابن امر کی شاعر نے مزاحیہ انداز میں تشریح کی ہے وہ بیان کرتا ہے کہ ہنومان جی اس طرح کی شادی کے ڈر سے گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے اور جنگل میں پناہ لی۔ ہندو پران کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ ہنومان جی برہمچاری ہیں اور ان کا مندر ہمیشہ گاؤں سے باہر رہتا ہے گاؤں جلے ہنومان باہر کا محاورہ اسی پر مبنی ہے۔ امین خان کے محلات میں اس ہمدردی کی جھلک پھیل چکی تھی۔ شاعر کے بیان کے مطابق بڑی بی بی لکشمی دیوی تھی۔ شادی کے گاؤں سے سسرال جانے والی نئی دلہنوں کو بڑی بی بی گرانقدر تحفے دیتی تھی۔ ان کے حکم پر مختلف محلوں کے کم سن بچوں کو دودھ کی تقسیم ہوتی تھی اور غریبوں اور مزدور تمندوں میں کھانا بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ امین خان کے جیسے ان کے فرزند بھی عالم تھے۔ فارسی، گجراتی، قنوجی، مراٹھی اور خالص تلگو زبان میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ اس نظم کے مقدمہ کے اشعار کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امین خان علم دوست۔ عالم اور ادبی سرپرست تھے اور خالص تلگو ادب کی سرپرستی میں ان کا خاص مقام تھا۔ ان امور کے لحاظ سے اس نظم کا مقدمہ تلگو ادب میں ایک مخزن ہے۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس منعقدہ ۱۲ فروری ۱۹۸۷ء میں پڑھا گیا)

وامق جونپوری

غزل

مئے نے یہ تلخیِ کچھ افکارِ جہاں سے پائی
باقی کچھ بدہمیِ پیرِ مغاں سے پائی

تندیِ نشہ و احساسِ گل و نغمہ و خلد
ہم نے مئے میں یہ صفت قربِ بتاں سے پائی

جان پر بن تو گئی تجھ کو مگر پا گئے ہم
روشنی! تو نے یہ رفتار کہاں سے پائی؟

کاٹ دیتا ہوں غلطیات کو خاموشی سے
میں نے تلوار کی یہ کاٹ زباں سے پائی

تشنگی ہو تو نظر آتا ہے صحرا دریا
سنگ نے تاب و تواں شیشہ گراں سے پائی

بے ستوں بٹ گیا نہروں میں بفیضِ محنت
تیشے نے دھار رگِ سنگِ گراں سے پائی

شام ہوتے ہی ٹھہر جاتے ہیں دریا کے قریب
راہگیروں نے تھکن عکسِ مکاں سے پائی

یاد وہ پیاس ہے جو بجھتی نہیں مرنے پہ بھی
یاد نے عمرِ دوام آبِ رواں سے پائی

فن سے حق گوئی کی تحریک ملی، وامق کو
شامِ مزدور، حیاتِ مگساں سے پائی

ڈاکٹر انور معظم

ایک نظم

پھر سوچ کیا رہے ہو
دروازے بند کر لو
اپنی تمام دولت
احساس، عقل، حکمت
امید اور حسرت
جو سہہ چکے وہ صدمہ
جو آئے گا وہ لمحہ
جو بجھ گیا وہ سورج
جو رہ گئی وہ شبنم
خاکسترِ نظر میں
جو بھی ملے اٹھا لو
دل میں اسے چھپا لو
دیوار پہ ہے سایہ
تو آدمی بھی ہوگا

ڈاکٹر شاذ تمکنت

غزل

تنہائیوں کی دل شکنی چاہتا نہیں
گھر سے قدم نکالوں یہ جی چاہتا نہیں

ہنس ہنس کے میں نے آنکھ سے دریا بہا دیا
اب اس قدر بھی زندہ دلی چاہتا نہیں

اپنے سوا کسی کا گذر ہی نہیں وہاں !
وہ کون ہے جو تیری گلی چاہتا نہیں

ہر بات پر تو دہر سے جھگڑا ضرور ہو
میں لاکھ چاہتا ہوں وہی چاہتا نہیں

چاہوں تو میرے پاس ہے ہر بات کا جواب
چاہوں گا ایک روز ابھی چاہتا نہیں

گویا وہ شخص اپنے وطن میں ہے بے وطن
ہے دھوپ سر پہ، چھاؤں گھنی چاہتا نہیں

سب کو یقیں ہے شاذ وہ جی سے اُتر گیا
کیسے کہوں کہ ملنے کو جی چاہتا نہیں

وقار لطیف

غزل

ثواب کے بھی کئی رُخ مرے گناہ میں تھے
سفید حاشیے کچھ نامۂ سیاہ میں تھے

نہ پوچھ عشق میں اس دل کی خانہ آبادی
نہ پوچھ کیسے محل اس دلِ تباہ میں تھے

ہزار کوس پہ اس واسطے تھی منزلِ موت
کہ چند میکدے بھی عاشقوں کی راہ میں تھے

نیا زمانہ دِکھاتا ہے سب کو فخر کے ساتھ
نظارے وہ جو ازل سے مِری نگاہ میں تھے

بنا تھا نورِ جہاں[1] سے وقار کا بھی خمیر
کبھی زمیں پہ کبھی رقصِ مہر و ماہ میں تھے

ع[1] نور جہاں : میری والدہ کا نام

تمنائیں سب ہیں . . . !

تمنائیں سب ہیں مگر
اسی اک تمنا کی بدولت سے تمناؤں کا سبزہ زار :
زمیں کا کماں جسم بوسیدگی کی قبا سے نکل آئے

تمنا ہے یہ بھی
پھر اک بار برسے
دیدۂ آسماں سے
اشکِ خوں کی گلابی پھوار
پھلے اور بھی یہ تمناؤں کا لالہ زار
کہ شہرِ مراسم کے بھولے شکستہ گھروں سے پرے
اور عشرت گہہ رسم و رہ کے یہ قحبہ خانوں سے آگے
ہے وہ

مری انقلابی تمناؤں کا خار زار
عجب شعلہ زار

ڈاکٹر اختر بستوی

دو نظمیں

کچی سڑک

زندگی ہے یا کوئی دیہات کی کچی سڑک
اونچی نیچی ٹیڑھی میڑھی، بدنما آخر تلک
رونقیں مفقود، ویرانی کے سائے ہر قدم
نصب ہر ہر موڑ پر دہشت کے نادیدہ علم
ایک ہی صورت ہمیشہ، ایک ہی عالم مدام
ایک ہی ڈھرے پہ قائم صبح سے تا وقت شام

گاہے گاہے بس کسی بارات کا کچھ جمگھٹا
یا کسی ارتھی کے پیچھے گریہ و آہ و بکا

اے بسا آرزو

آئینہ خانے میں رہ کر یہ کہاں ممکن ہے
کوئی دیکھے نہ کسی وقت بھی صورت اپنی
کوششیں لاکھ کرے چشم گریزاں لیکن
آہی جاتی ہے نظر شکل و شباہت اپنی
خود شکن بننے کی خواہش تو مجھے بھی ہے مگر
آئینہ بندی کے احساس سے گھبراتا ہوں

چاہے جس طرف بھی لے جاؤں نگاہیں یارو
ہر طرف اپنے ہی چہرے کی جھلک پاتا ہوں

یوسف اعظمی

قطعات

منزل ہی بن سکے نہ کوئی راستہ بنے
قلب و نظر کے واسطے اک فاصلہ بنے
کیا بجھ گئے ہیں دیدۂ تر کے سبھی چراغ
اسلاف تیرے وقت کا کیوں سانحہ بنے

مسرتیں بھی کبھی نیوز بن کے آتی تھیں
ملی ہیں سڑکوں پہ بچھڑی ہوئی سکھی کی طرح
ہر ایک روز گذرتی ہیں منہ چھپائے ہوئے
غموں کے بیچ امیدیں ہیں اجنبی کی طرح

مسرتوں کی خریدی کے واسطے کچھ لوگ
وطن سے دور ہیں گمنام اجنبی کی طرح
گھروں میں زخم کی سوغات ہی ملی ان کو
جو لوٹ آتے ہیں بھٹکی ہوئی ہنسی کی طرح

خیر و شر کے فاصلے گھٹ گئے ہیں اس طرح
دھوپ اور چھاؤں میں فرق اب رہا نہیں
جسم و جاں کی سرحدوں پہ آگہی بھی سو گئی
موت سانحہ نہیں، قتل حادثہ نہیں

تمہاری آنکھیں جہاں مسکرانے لگتی ہیں!
سہانی دھوپ کا منظر اجال دیتی ہیں!
دمکنے لگتا ہے احساس و آگہی کا بدن!
لہو کو نورِ مجسم میں ڈھال دیتی ہیں!

اختر جہاں

ماحول

سنسنی خیز حالات چاروں طرف
خشک سالی قحط اور کہیں لوٹ مار
کہیں سیلاب اور زلزلے ہیں کہیں
اور
کہیں ژالہ باری ہی آفت بنی
ہر قدم تیرگی ہر طرف تیرگی
زندگی بددلی بے بسی کی گھڑی
تنگ و تاریک گلیوں کے بے نور سایوں میں گم
یہ سسکتے جواں اور لاغر تڑپتے بدن
جن کے ماتھے پہ تہذیب حاضر کلنک بن گئی
دست حیوانیت میں یہ جکڑے پتنگ
وقت کی تیز چبھتی ہوئی دھوپ میں
دشت گمراہ کی اجنبی اک صدا
خود فراموشی انسانیت کو بلاتی رہی
پھر اسی دم جو آواز ابھری تھی گھٹنے لگی

اور
خموشی کے دریا سے طوفان اٹھنے لگے
سنسنی خیز حالات چاروں طرف ...

مومن خان شوق

ارے اجنبی سہی لیکن وہ جانتا ہے مجھے
خیال پڑتا ہے پہلے کہیں ملا ہے مجھے

اب آ گیے ہو تو بیٹھو زباں نہ کھلواؤ
میں جانتا ہوں ہر اک بات کا پتا ہے مجھے

وہ جس کے بارے میں اتنی حکایتیں پھیلیں
اسی کا خط ہے اسی نے اسے لکھا ہے مجھے

عجیب شخص ہے تنہا ملے تو کچھ نہ کہے
نظر بچا کے جو محفل میں دیکھتا ہے مجھے

نئی غزل کے در و بام کتنے روشن ہیں
کبھی کبھی تو یہ احساس بھی ہوا ہے مجھے

جناب شوق کا کہنا بجا سہی لیکن
میں پوچھتا ہوں کہ دنیا نے کیا دیا ہے مجھے

وزیر آغا

ہینڈ بیگ

فطرت کی نظروں میں کفرانِ نعمت سب سے بڑا گناہ ہے چنانچہ جب وہ دیکھتی ہے کہ کسی نعمت کا کفران ہو رہا ہے تو اسے واپس لے لیتی ہے۔ انسانی جسم کو اس نے بڑی محبت اور شفقت سے ایک کارآمد عضو عطا کیا تھا مگر جب انسان نے "ہمچو ما دیگرے نیست" کے نشے میں سرشار ہو کر اسے استعمال کرنے ہی سے انکار کر دیا تو فطرت نے نہ تو غیض و غضب کا مظاہرہ کیا نہ شکوہ و شکایت تک ہی نوبت آنے دی۔ اس نے کیا تو بس یہ کہ انسان سے یہ عضو ہی واپس لے لیا۔ آج صورت یہ ہیکہ اس کا ٹُنڈ تو انسانی جسم میں موجود ہے لیکن اصل عضو کبھی کا غائب ہو چکا ہے مگر انسان بھی بڑا کائیاں ہے۔ اس نے اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس عضو کے چھن جانے کا تو خیر مقدم کیا مگر اس کی افادیت کا اقرار یوں کر لیا کہ اپنے جسم کے ساتھ ایک ایسی چیز چپکالی جو کسی صورت بھی چھن جانے والی شئے سے کم مفید اور کارآمد نہیں تھی۔

میرا اشارہ ہینڈ بیگ کی طرف ہے جو انسانی تہذیب کی ابتداء ہی سے انسان کے ساتھ منسلک رہا ہے۔ کبھی اس کا نام "بورا" ہوگا مگر پھر وہ "تھیلا" کہلایا جانے لگا۔ اس کے بعد زنبیل مشہور ہوا۔ جدید دور میں اسے ہینڈ بیگ کا نام ملا ہے۔

آغازِ کار میں تو انسان نے اسے صرف ضرورت کے موقعوں پر استعمال کیا تھا مگر پھر جب مرد و عورت نے اسے اپنے زیرہ بکتر کا حصّہ بنالیا تو یہ ہماری تہذیب کا بھی حصہ بن گیا۔ اب صورت یہ ہے کہ انسان نے اسے اپنے بدن کی توسیع قرار دے لیا ہے۔ "ہینڈ بیگ" کا لفظ ہی اس بات کا گواہ ہے کہ یہ انسان کا تیسرا ہاتھ ہے مگر ایک ایسا ہاتھ جس کے آخری سرے پر پانچ مخروطی کھمبوں کے بجائے ایک ایسی شئے باندھ دی گئی ہے جس کے اندر اس کی پوری تہذیب بند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہینڈ بیگ انسان کا ایک اضافی عضو ہی نہیں، اس کی یادداشت، اس کا ڈاکٹر، اس کا ضمیر اور پی اے بھی ہے۔ ہینڈ بیگ کے بغیر آج کا انسان ایسے ہی ہے جیسے وہ شخص جس کا ایک بازو کٹ گیا ہو۔

میں جب سفر پر روانہ ہوتا ہوں تو کئی بار اپنی ٹوپی گھر پر بھول آتا ہوں، اس طرح کئی بار مجھے خیال تک نہیں رہتا کہ تھرماس کے بغیر سفر کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوہان کے بغیر صحرا عبور کرنا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے ہینڈ بیگ کے بغیر ہی سفر پر جانے کی جرأت کر لی ہو۔ بھلا کوئی شخص اپنے جسم کے کسی عضو کو ساتھ لے جانے میں کوتاہی برت سکتا ہے؟ مگر جسمانی اعضاء کا تو یہ قصہ ہے کہ آپ کو تو کبھی نہیں رہتا کہ یہ پُرزے آپ کے بدن پر کس دیئے گئے ہیں۔ دوسری طرف ہینڈ بیگ کا معاملہ یہ ہے کہ ہرچند یہ آپ کو اپنے جسم کا ایک عضو دکھائی دیتا ہے تاہم آپ اسے خود سے الگ اور جُدا بھی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی آپ بڑے معروضی انداز میں اس کے پُراسرار باطن میں جھانکنے اور اس کے مندرجات کو طشت از بام کرنے میں ایک عجیب سی خوشی بھی محسوس کرتے ہیں ——— مگر میرا قصہ یہ ہے کہ مجھے ہینڈ بیگ کو بے نقاب کرنے میں خوشی بھی ہوتی ہے ساتھ ہی خوف بھی محسوس ہوتا ہے خوشی اس لئے کہ ہینڈ بیگ کھولنے پر مجھے بہت سی ایسی چیزوں سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے جو عرصہ ہوا داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ خوف اس لئے کہ بعض اوقات بیگ میں سے کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہو جاتی ہیں جنہیں دیکھتے ہی میں ایک اعصابی تشنج میں مبتلا ہو جاتا ہوں مثلاً کسی انشورنس ایجنٹ کا کارڈ، کسی رشتہ دار کا "محبت نامہ" یا کسی کہنہ مشق شاعر کی تازہ ترین تصویر وغیرہ۔ تاہم اکثر و بیشتر خوشی کا عنصر خوف کے عناصر پر غالب ہی رہتا ہے۔ ویسے بھی ہینڈ بیگ ایک پردہ در پردہ اور نقاب اندر نقاب شے ہے۔ بالکل ایک نظم کی طرح!

آپ جب اسے کھولتے ہیں تو سب سے پہلے اس کے اندر کی اشیاء کے وجود کو محسوس کرتے ہیں۔ پھر اس کی مخصوص خوشبو آپ کا سواگت کرتی ہے۔ اس کے بعد آپ کے بھیتر کا غوطہ خور اس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے (ATLANTIS) کو تلاش کرنے کے لئے اترتا ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک اقدام ہے کیونکہ اس کے دوران اگر ایک آدھ سانس کا بھی ہیر پھیر ہو جائے تو پھر سطح پر آنا بہت مشکل ہے۔ مگر غواصی کا یہ عمل اس قدر مسرّت افزا اور خیال افروز ہے کہ انسان بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے جب کبھی کوئی بہت اچھی نظم پڑھنے کو ملی ہے تو میں نے سب سے پہلے اس کے بدن کو چھوا ہے اور مجھے محسوس ہوا ہے کہ تشبیہیں، استعارے، تلازمات، مناظر، کردار، واقعات اور اشیاء یہ سب نظم کے اعضا ہیں۔ جب میں انہیں چھوتا ہوں تو دراصل نظم کے جسم کو مس کر رہا ہوتا ہوں۔ یہ عمل بجائے خود انتہائی لذت بخش ہے، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سطح پر بکھری ہوئی یہ تمام اشیاء تو پانی کی تہہ میں بیٹھی ہوئی اشیاء کا محض عکس ہیں۔

وہ سطحیں مزید دکھائی دیتی ہیں جب کہ حقیقتاً کہیں اور ہیں۔ اس اعتبار سے ہر اچھی نظم ایک سراب ہے پہلی نظر میں آپ کو پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ دوسری نظر میں ذرات ہی ذرات دکھائی دیتے ہیں لیکن دراصل یہ سونے کے ذرات ہیں جو ہزاروں، لاکھوں برس کے فطری عمل سے وجود میں آئے ہیں۔ ایک بڑے شاعر کا یہی سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ اپنے قاری کو بہت کے لق و دق سراب میں [illegible] کرتا ہے وہ بظاہر اسے پانی کا منظر دکھاتا ہے لیکن بباطن ایک ادبی جہانِ معنی کی جھلک دکھاتا ہے۔

میں جب اپنے ہینڈ بیگ کو کھولتا ہوں تو اس توقع کے ساتھ کہ یہ بھی ایک اچھی نظم کی طرح مجھے چوتھے کھونٹ کی سیر کرائے گا مگر خود کو ریاضی کے سوال کی طرح حل نہیں ہونے دے گا اور اکثر و بیشتر مجھے اپنے اس اقدام میں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ہینڈ بیگ کے اندر کئی خانے ہوتے ہیں۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی! تنگ بھی اور کھلے بھی! بعض پر تالے اور بعض پر ZIP ہوتے ہیں جو دیکھنے والے کے تجسس کو برانگیخت کرتے ہیں۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہر چھپی ہوئی شے کو طشت از بام کرنے کا آرزو مند ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ شے مستور تو ہو مگر پوری طرح چھپی ہوئی نہ ہو، انسانی تجسس کے لئے ایک تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ مقفل اور مہر بند چیزوں میں دل چسپی تو صرف چوروں ہی کو ہو سکتی ہے مگر کوئی شے جس کا تالہ سہواً یا عمداً کھلا چھوڑ دیا گیا ہو ایک عام سے انسان کو بھی مائل بہ تجسس کر سکتی ہے اور وہ اپنی اولین فرصت میں اس پر جھپٹنے کی آرزو میں سرشار ہو جاتا ہے۔ میرے لئے بھی ہینڈ بیگ کی سب سے بڑی کشش یہ ہے کہ اس کے متعدد نیم وا خانے مجھے دعوتِ نظارہ تو دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی نظارے سے محروم بھی رکھتے ہیں۔ وہ تجسس کو ابھارتے ہیں لیکن پُراسراریت کو ختم ہونے کی اجازت نہیں دیتے اور سچ پوچھئے تو نظم ہو یا ہینڈ بیگ، اس کی اصل خوبی ہی وہ تجسس ہے جو سدا تشنہ لب رہتا ہے اور جس کے لئے سیرابی موت کے مترادف ہے۔

یہ نہیں کہ میں ہینڈ بیگ کی کاروباری حیثیت سے آشنا نہیں ہوں بلکہ مجھ سے زیادہ اس کی کاروباری حیثیت سے اور کون آشنا ہوگا کیونکہ نہ صرف یہ کہ ہینڈ بیگ سے میری رفاقت دو چار برس کی بات نہیں پوری نصف صدی کا قصہ ہے بلکہ یہ بھی کہ میں نے کبھی اپنے ہینڈ بیگ کو مردہ کاغذوں کی لحد نہیں بننے دیا جیسا کہ اکثر پروفیسر حضرات کرتے ہیں۔ میرے لئے تو میرا ہینڈ بیگ اتنا ہی وسیع اور پیچیدہ ہے جتنا کسی ملک کا سکریٹریٹ، جس میں صحت، معاشیات، تعلیم، ثقافت، سیاحت، رفاہ اور تعلقاتِ عامہ ایسے متعدد محکموں کے مرکزی دفاتر انتہائی ذمہ داری سے اپنے سارے فرائض پورا کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً اکثر ایسے ہوا کہ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے جب میرے عزیز ترین

دوست ہیں۔ ا۔ مسلسل پانچ گھنٹے بے تکان بولتے چلے گئے تو میں نے اپنے ہینڈ بیگ کے شعبۂ صحت سے پیرا سیٹامول کی درجن بھر گولیاں حاصل کر کے ان میں سے ایک دو تو اپنے دوست کے کھلتے اور بند ہوتے ہوئے منہ میں ڈال دیں اور باقی گولیاں خود نگل لیں۔ اسی طرح کسی ریستوران میں کسی ادبی موضوع پر گرم گرم گفتگو کا آغاز ہوا اور پہلو میں بیٹھے ہوئے میرے کسی کرم فرما نے میری پسلی میں ایک معنی خیز ٹہوکا دیا تو میں نے فوراً ہینڈ بیگ کے شعبۂ معاشیات سے مدد طلب کی اور اپنے پہلو سے بلائے ناگہانی کو رخصت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ہینڈ بیگ کے شعبۂ علم و ادب پر ہمیشہ سب سے زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ میرے اکثر کرم فرما مجھے اپنا تازہ کلام بذریعہ ڈاک بھجوا دیتے ہیں لیکن میرے بعض کرم فرما ایسے بھی ہیں جو ڈاک پر روپیہ ضائع کرنے کے بجائے ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ میں کسی تقریب میں یا ویسے ہی سر راہے ان کی گرفت میں آجاؤں اور وہ مجھ پر اپنے مضامین نظم و نثر لاد دیں اور میں اکثر ان کے قابو میں آجاتا ہوں۔ چنانچہ میرے ہینڈ بیگ کا شعبہ علم و ادب ہمیشہ پھولا ہی رہتا ہے۔ رہا "تعلقاتِ عامہ" والا خانہ تو وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس میں لوگوں کے وزیٹنگ کارڈ، ان کی تازہ ترین رنگین تصویریں، ایڈریس اور سجانے کیا کچھ بھرا رہتا ہے۔ جب کچھ عرصہ گزر جاتا ہے تو میں قطعاً بھول جاتا ہوں کہ وزیٹنگ کارڈ پر جن صاحب کا پتہ درج ہے، وہ کون ہیں اور انہوں نے مجھے کیوں اپنا کارڈ عنایت کیا تھا۔ اسی طرح مجھے یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تصویر میں جن صاحب کا چراغِ رخِ زیبا، مجھے انتہائی پیار سے دیکھ رہا ہے وہ کس سلسلے میں میرے ہینڈ بیگ میں تشریف لائے تھے مگر اس سب کے باوجود نہ تو میں نے آج تک ان انتہائی خوبصورت وزیٹنگ کارڈوں کو ضائع کیا ہے اور نہ ان جاذبِ نظر تصویروں کی جدائی ہی برداشت کی ہے۔

اور اب تو میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید میرا ہینڈ بیگ بھی محض ایک سراب ہے۔ یہ شاید عکس ہے اس ہینڈ بیگ کا جسے میں نے سر کے اندر کہیں چھپا رکھا ہے اور جس میں پوری نسلِ انسانی کی کامرانیاں اور شکستیں، نیکیاں اور خباثتیں اپنے اپنے شعبوں میں نہایت قرینے سے براجمان ہیں اگر یوں ہے تو پھر کیا یہ مناسب نہیں کہ میں سراب اور حقیقت میں حدِ فاصل قائم کروں۔ نقلی ہینڈ بیگ کو ترک کر کے اصلی ہینڈ بیگ کی طرف آؤں اور دوسروں سے ملاقات کرنے کے بجائے خود سے معانقہ کروں؟ مناسب تو یہی ہے مگر ذرا ٹھہریئے مجھے لمحہ بھر کے لئے اپنے ہینڈ بیگ میں جھانک لینے دیں۔ کیا خبر اصلی ہینڈ بیگ بھی اس کے اندر ہی کہیں موجود ہو!

(بشکریہ ماہنامہ "اوراق" لاہور نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء)

محمد منظور احمد

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں)

نام کتاب: "چند کلیاں نشاط کی" (طنز و مزاح) مصنف: برہان حسین
قیمت: آٹھ روپے ناشر: زندہ دلان حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

محمد برہان حسین پیشے کے اعتبار سے ریجنل ریسرچ لیباریٹری حیدرآباد میں سائنٹسٹ ہیں بہ الفاظ دیگر وہ ایک انتہائی سائنٹفک اور خشک مشغلہ میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں لیکن دست بکار دل بہ یار والی بات ان پر صادق آتی ہے وہ اپنے پسندیدہ اور محبوب ادبی مشغلہ سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ غالب کا یہ شعر ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

برہان حسین کے ادبی مشغلہ کا صحیح ترجمان ہے۔ وہ ہائی اسکول کی اپنی طالب علمی کے زمانے میں فٹ بال کی ٹیم کے کپتان رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے تو انھیں ہاکی، کرکٹ، پیراکی اور موسیقی سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کے مزاج میں خاکساری انکساری ہے۔ وہ سعادت مندی کی مجسم تصویر اور پُر خلوص انسان ہیں۔ تاریخ ہند ان کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ اہل ہند کی سیاسی اور سماجی حالت اور اخلاقی کمزوریوں پر ان کا طنز تیکھا اور مزاح زندگی بخش اور حیات آفریں ہوتا ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع شدہ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "چند کلیاں نشاط کی" اس وقت پیش نظر ہے۔

(۱۵) مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ دلکش گٹ اپ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ انہوں نے بقول جیلانی بانو "آج کے اعصابی تناؤ والے ماحول اور دکھے ہوئے دلوں کے لیے اپنی شوخ اور دلچسپ تحریروں سے آکسیجن پہنچانے کا کام لیا ہے"۔

میں نے انھیں زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ ادبی اجلاسوں میں اپنے مزاحیہ مضامین پڑھتے

ہم نے دیکھا اور سنا ہے۔ حیدرآباد کے ماہنامہ "شگوفہ" کے علاوہ بعض اور اہم ادبی رسالوں میں ان کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ ان کی نگارشات میں خاص کردار "شرفو میاں" ہے۔ عصر حاضر کے سماجی، تہذیبی اور اخلاقی مسائل یعنی انسان اور انسانیت کے مسائل، ان کے طنز و مزاح کے موضوعات ہیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ بے باکی سے سماج پر طنز کرتے ہیں۔

ان کا مزاح چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ ان کی اپنی منفرد آواز ہے جس کی ان کی شناخت ہوتی ہے۔ زبان و بیان کی دلکشی اور اسلوب کی سادگی، قاری کے ذہن کو بیدار کرتی ہے، قوتِ مشاہدہ، جزئیات نگاری، موضوع پر مضبوط گرفت کی بدولت، انہوں نے کامیابی کے ساتھ زندگی کی ترجمانی اور رہنمائی کی ہے۔

ان کے مزاح میں لطافت ہے۔ ان کا چہرہ متانت کی تصویر ہے لیکن ان کی تحریر میں پھلجھڑیاں سی چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے مضامین میں بعض جگہ دکنی لب و لہجہ کی جھلکیاں بھی مزہ دے جاتی ہیں۔ وہ ایک اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ روزنامہ رہنمائے دکن کا مزاحیہ کالم لکھ رہے ہیں۔ مزاح نگار ادیب اور کالم نگار کی حیثیت سے ان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

نام کتاب: "چنانچہ" (طنز و مزاح) مصنف: مسیح انجم صفحات: ۱۲۸
ناشر: زندہ دلانِ حیدرآباد۔ قیمت: مجلد بارہ روپے سن اشاعت ۱۹۸۲ء

ممتاز طنز و مزاح نگار مسیح انجم پیشہ تدریس سے وابستہ اور حیدرآباد کے ایک ہائی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ اب تک ان کے مزاحیہ مضامین کے تین مجموعے "سائنڈ سے چلئے"، "در پردہ" اور "چنانچہ" زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ "سائنڈ سے چلئے" جنوری ۱۹۷۲ء میں، دوسرا مجموعہ "در پردہ" ڈسمبر ۱۹۷۶ء میں اور تیسرا مجموعہ "چنانچہ" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے سائنڈ سے چلئے کا انتساب شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے نام کیا تھا۔ جہاں کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو شعلہ بنا کر بھڑکایا ہے۔

مزاحیہ مضامین کے تین مجموعوں کے مصنف مسیح انجم کے چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی کی نقاب پڑی رہتی ہے۔ شاید انھیں اپنے "مدرس" ہونے کا شدید احساس ہے اور اسی لیے اپنے طالب علموں کی خاطر حزم و احتیاط کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ البتہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں کھلتے ہیں اور تب ہی ان کے انداز گل افشانی گفتار سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے۔ بی ایڈ کی ڈگریاں لی ہیں وہ ایک مرنجاں مرنج اور

نیک نفس انسان ہیں۔ ان کے موضوعات میں زندگی کی طرح رنگارنگی اور تنوع ہے۔ ان موضوعات سے ان کی نظر کی وسعت اور مشاہدہ کی قوت، دُور بینی اور درون بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زندگی اور ان کی نگارشات میں سلیقہ اور نفاست ہے۔ بقول کرشن چندر، ان کے دلچسپ مزاح کی اساس زیادہ تر حرکی اور واقعاتی ہے۔

زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ ادبی اجتماعات میں مزاحیہ مضامین سنا کر انہوں نے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ حیدرآباد سے باہر ہندوستان کے بعض مشہور ادبی مراکز میں مزاحیہ مضامین سنانے کے لیے انھیں مدعو کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے مزاج اور زندگی کے نشیب و فراز پر ان کی نظر گہری ہے ان کے مضامین میں دیہات کی فضا ہے۔

مسیح انجم کے تیسرے مجموعہ "چنانچہ" میں (۱۴) مزاحیہ مضامین ہیں۔ یہ مجموعہ زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ "تعارف نما" کے عنوان سے ایڈیٹر ماہنامہ "شگوفہ" جناب سید مصطفیٰ کمال نے مسیح انجم کی مزاح نگاری کا مختصراً جائزہ لیا ہے اور انھیں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

مسیح انجم نے "پیش لفظ" میں اپنے فن پر روشنی ڈالی ہے۔

"چنانچہ" اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی ہے۔

موضوع اور مواد کے علاوہ مسیح انجم کا پیشکش بھی متاثر کن ہوتا ہے۔ وہ خاکہ نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کی شگفتگی، مزاحیہ ادب کی تاریخ میں ان کے نام کو زندہ اور پائندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ (م۔م۔ا)

اردو نامہ

(صفحہ ۲ سے آگے:) جناب معین فاروقی ایڈیٹر روزنامہ "انگارے" نے صدارت کی۔ ڈاکٹر سید اختر احمد، جناب صادق نقوی اور محترمہ سعادت جہاں رضوی تحر نے اس کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ • نامور ترقی پسند شاعر حضرت وامق جونپوری نے ادارۂ ادبیات اردو اور ایوان اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر ادارہ میں جناب محمد منظور احمد رکن مجلس انتظامی ادارہ، وقار خلیل اور جناب سید موسیٰ کلیم بمقام آشیانوی موجود تھے۔ ۲۶ اپریل: ممتاز طنز و مزاح نویس ادیب ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور آئی ایس (ریٹائرڈ) ممبر سکریٹری جائز انسٹرا اُردو اکیڈیمی کا بعارضہ قلب بمبئی جاتے ہوئے ٹرین میں انتقال ہوگیا۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں خواجہ صاحب کی اچانک رحلت پر اظہار الم کیا گیا۔ ۳۰ اپریل: کُل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام، ترقی اردو بیورو حکومت ہند کی طرف سے خواتین کے لئے مرکز خوشنویسی کا افتتاح ستی آئیر اسپشل آفیسر برائے محکمہ تعلیمات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جناب جلیل پاشاہ صدر کمیٹی نے خیر مقدمی تقریر کی۔

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

۲ر مارچ : مخدوم محی الدین کے ۷۶ ویں یوم پیدائش کے موقع پر مخدوم سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی یکجہتی کے موضوع پر ایک سیمینار ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر انور معظم، ٹی انجیا سابق چیف منسٹر، کے ایل مہندرا سابق ایم ایل سی اور کالوجی نارائن راؤ نے حصہ لیا۔

۳ر مارچ : نواں کل ہند شنکر جی یادگار مشاعرہ جناب خورشید عالم خان مرکزی وزیر سیاحت کی صدارت میں آراستہ کیا گیا۔ مرکزی وزیر قانون مسٹر پی شیو شنکر، صدر سیاسی قانون ساز کونسل، جناب سید بکشر شاہ اور صدر سیاسی سرکاری زبان کمیشن ڈاکٹر سی نارائن ریڈی مہمانان خصوصی رہے۔ چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے ہندوستانی زبان میں افتتاحی خطاب کیا اور اردو شاعروں کو قومی یکجہتی کا سنگ میل قرار دیا۔ مہمان اور میزبان شعراء نارش پرتاب گڑھی، خمار بارہ بنکوی، فنا نظامی، کیف بھوپالی، آزاد گلاٹی، اختر نظمی، ایکتا، شبنم، نور اندوری، قاضی معین، شاذ تمکنت، علی احمد جلیلی، سید شہیدی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، رحمٰن جامی، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر نظم، علی الدین نوید، رئیس اختر اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ جناب ثقلین حیدر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۵ ایچ ای ایچ دی نظام ٹرسٹ اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل

حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس سالار جنگ میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایم ایل نگم کی صدارت میں منعقد ہوا جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ، عثمانیہ یونیورسٹی نے مہدی نظمی کی منظوم تصنیف "بھارت درشن" پر تبصرہ سنایا۔ جناب نظمی نے اس موقع پر بھارت درشن کے اقتباسات سنا کر داد پائی۔ جناب محمد منظور احمد معتمد اعزازی حلقۂ ارباب ذوق نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۰ر مارچ : محفل خواتین کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس محترمہ گلشی دیوی راج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ عظمت عبدالقیوم نے چوڑیاں کے زیر عنوان مضمون، محترمہ فاطمہ عالم علی خان نے کہاوتوں کی کہانیاں پر مضمون اور محترمہ فریدہ زین نے افسانہ پیش کیا۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید عظمت قیوم، مظفر النساء ناز، نسیم نیازی، حفیظ النساء حزیں اور بشیر جعفری نے کلام سنایا۔

۱۵ر مارچ : جناب حسن الدین احمد آئی اے ایس (ریٹائرڈ) ڈائرکٹر ولا اکیڈیمی کو

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف سے ان کے تحقیقی مقالہ "انگریزی شاعری کے اردو منظوم تراجم : تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کی تکمیل پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر احمد نے پروفیسر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر محمد ذاکر کی نگرانی میں یہ مقالہ تحریر کیا تھا۔

۱۷ مارچ : حیدرآباد لٹریری فورم (حلقہ) کی ادبی محفل میں رؤف خلش، باذل عباسی اور ذکی بلگرامی نے نثری تخلیقات پیش کیں جن پر علی الترتیب ڈاکٹر یوسف کمال، علی ظہیر اور سید بشارت علی نے اظہارِ خیال کیا اور شعراء نے کلام سنایا۔ جناب غیاث متین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹ مارچ : ریاستی اسمبلی میں کمیونسٹ ایم ایل اے مسٹر رجب علی نے حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ریاست میں اردو بولنے والی آبادی کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کی طرف حکومت اپنی توجہ مرکوز کرے۔ مسٹر صلاح الدین اویسی (ایم ایل اے مجلس) نے ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کی حالتِ زار پر توجہ دلاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ حکومت اردو کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لیتے ہوئے اردو والوں کے دیرینہ مسائل کا حل نکالے۔

۲۰ مارچ : ریاستی وزیر تعلیم مسٹر آنند گجپتی راجو نے اسمبلی میں بتایا کہ حکومت اردو یونیورسٹی کے قیام کی مجوزہ تجویز پر غور کرے گی اور اردو پنڈتوں کی مخلوعہ جائیدادوں پر نئے تقررات عمل میں لائے گی۔

۲۴ مارچ : جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے پروفیسر سیدہ جعفر کو ڈاکٹر زینت ساجدہ صدر شعبہ اردو کی رخصت ماقبل وظیفہ کو منظور کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو مقرر کیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ڈاکٹر زینت ساجدہ سے اپنے عہدے کا جائزہ حاصل کر لیا ہے۔

۲۵ مارچ : پاکستان کے جوان شاعر جناب نصیر ترابی کے خیر مقدم میں ایک محفل شعر جناب اختر زیدی کی صدارت میں آراستہ کی گئی۔ علی جاوید، آغا سروش، ذکی بلگرامی، رشید شہیدی، علی ظہیر، ڈاکٹر یوسف کمال، خیرات ندیم، ڈاکٹر وحید اختر، مضطر مجاز، رؤف خیر اور نصیر ترابی نے کلام سنایا۔

۲۸ مارچ : ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس جناب حامد علی عباسی صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ موازنہ سال ۸۶ء کی منظوری کے بعد ادارہ کی طرف سے مطبوعہ اور نایاب کتابوں کی دوبارہ اشاعت اور نئی مطبوعات کی تصنیف و تالیف نیز ان کی طباعت کے بارے میں غور کیا گیا۔ مجلس انتظامی نے جناب محمد منظور احمد کو شریک مدیر سب رس منتخب کیا۔ اسی اجلاس میں عملے کی تنخواہوں میں اضافہ بھی منظور کیا گیا۔ جناب حامد علی عباسی، جناب سید ہاشم علی اختر، جناب محمد اکبر الدین صدیقی، جناب سراج الدین احمد، محترمہ بلقیس علاؤ الدین، جناب محمد منظور احمد، جناب ضیاء الدین انصاری اور معتمد ادارہ جناب رحمن راج سکسینہ نے شرکت کی۔

۳۰ مارچ : حیدرآباد لٹریری

مقدم کی طرف سے پاکستانی شاعر جناب نصیر ترابی کے خیر مقدم میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ابتداً جناب غیاث متین سکریٹری حلقہ نے مہمان شاعر کا تعارف کراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا جناب راشد آذر نے صدارت کی۔ رؤف خلش، علی ظہیر، غیاث متین، رؤف خیر، حسن فرخ، مسعود عابد، علی الدین نوید، رضا وصفی، اقبال طاہر، ماجد حلیم، جاوید مقصود، یوسف کمال، ذکی بلگرامی، بشارت علی اور مظہر مہدی نے کلام سنایا۔ جدید لہجے کے سخنور نصیر ترابی نے اپنا نمائندہ کلام سنا کر داد پائی۔

● بزم خاصان ادب کی شعری محفل جناب محبوب حسین جگر جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نصیر ترابی اور اختر زیدی صاحبان مہمانان خصوصی تھے شاذ تمکنت، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، راشد آذر، خیرات ندیم، خورشید جنیدی، صلاح الدین نیر، بشیر وارثی، واحد نصیب، علی الدین نوید، رؤف خیر، راز علیمی، آغا سروش، علی رفیع، رشید شہیدی اور باقر حسن نے کلام سنایا۔

۳۱ مارچ : جشن خواجہ شوق کا کل ہند مشاعرہ جناب خیر الدین آرکیٹکٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حضرت خمار بارہ بنکوی نے جناب خواجہ شوق کے مجموعۂ کلام "چشم نگراں" کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف نے ساونیر ریلیز کیا۔ جناب محمد ہاشمی پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو دہلی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ مہمان اور میزبان شعرا خمار بارہ بنکوی، عزیز قیسی، نصیر ترابی، اختر نظمی، عنوان چشتی، فضل المتین اجمیری، انجم جبلپوری، سیدہ شان معراج، شاذ تمکنت، خواجہ شوق، سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، راشد آذر، علی احمد جلیلی، تاج مہجور، وقار خلیل، رضا وصفی، رحمن جامی، علی الدین نوید اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔

اپریل ۱۹۸۴ء

یکم اپریل : جشن خواجہ شوق کا ادبی اجلاس اردو گھر میں بصدارت پروفیسر غلام عمر خان صدر شعبۂ اردو آندھرا پردیش اوپن یونیورسٹی، منعقد ہوا۔ پروفیسر سیدہ جعفر، سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور جسٹس سردار علی خان مہمانان خصوصی تھے۔ جناب خواجہ شوق کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر، جناب عزیز قیسی، جناب محمود ہاشمی، صدر جلسہ اور مہمانان خصوصی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب شوق نے کلام سنایا۔ جناب عابد صدیقی نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔

۱۶ اپریل : اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۳ء کی مطبوعات کے متعلق انعامی مقابلہ کا اعلان جاری کیا جس کے بموجب حیدرآباد کے چار مصنفوں پروفیسر سیدہ جعفر ان کی تصنیف یوسف زلیخا پر ۲ ہزار روپے، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی تالیف "دیوان لطف" پر ایک ہزار روپے اور جناب صلاح الدین نیر کے مجموعۂ کلام "خوشبو

کا سفر" پر ایک ہزار روپے کے علاوہ ڈاکٹر غیاث صدیقی کی کتاب "گونگا درد" پر ۷۵۰ روپے کے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

۱۱ اپریل : مسٹر رام لال گورنر آندھرا پردیش نے راج بھون میں راجہ گردھاری پرشاد باقی کی فارسی کتاب "گوشۂ عافیت" کے اردو ترجمہ کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے تراجم کے ذریعہ مختلف زبانوں کے مابین لسانی رشتوں کے استحکام کی اہمیت ظاہر کی اور مترجم ڈاکٹر مسز شیلا راج کو مبارکباد دی کہ ایک اہم کتاب کا انہوں نے ترجمہ کیا ہے۔

● حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب اختر حسن صدر معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب علی احمد جلیلی نے شاہد رشیدی کے مجموعۂ کلام "وقت کا سورج" اور جناب یوسف اعظمی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سفرنامہ "ہمسفر آشنا" پر تبصرہ کیا جناب محمد منظور احمد منظور نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۳ اپریل : ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو کی قیادت میں ایک وفد نے اسپیکر اسمبلی اور چیرمین لیجسلیٹو کونسل سے ملاقات کر کے ایک یادداشت حوالے کی جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ریاست میں اردو کے حل طلب مسائل کی جلد یکسوئی کی جائے۔

● اقبال اکیڈیمی اور حیدرآباد لٹریری فورم کے زیر اہتمام "اقبال سیمینار ۸۴" کا افتتاحی اجلاس جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ آقای مصطفیٰ قنادہا قونصل جنرل اسلامی جمہوریہ ایران حیدرآباد نے افتتاحی خطاب کیا۔ جناب طالب خوندمیری کے تیار کردہ اقبال پورٹریٹ کا نیلام بھی کیا گیا۔ قونصل جنرل ایران نے ۳۰۵۰ روپے کی بولی دے کر اسے حاصل کیا۔ اس موقع پر جناب یوسف اعظمی نے اقبال کو منظوم خراج بھی ادا کیا۔ جناب علی ظہیر نے نظامت کی۔ مدینہ منشن میں نمائش نوادر اقبال و اقبالیات کا رسمی افتتاح جناب سید خلیل اللہ حسینی کے ہاتھوں انجام پایا۔

۱۴ اپریل : اقبال سیمینار کا اول بعنوان "فکر اقبال" پروفیسر سراج الدین کی صدارت میں ہوا ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر سلیمان صدیقی، جناب یوسف اعظمی نے مقالے پڑھے۔ دوسرا اجلاس پروفیسر گیان چند جین صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر غیاث متین، جناب مضطر مجاز اور علی ظہیر نے حصہ لیا۔ جناب مصطفیٰ سعدی نے نظامت کی۔

● محترمہ حفیظ النساء حزیں کے مجموعہ کلام "اشک بھر ہونے تک" کی رسم اجرا ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے انجام دی۔ محترمہ عظمت عبداللہ صدر محفل خواتین نے صدارت کی۔ سیدہ طیبہ بیگم اور محترمہ وزیر النساء نے حزیں کی شخصیت اور شاعری پر مضامین سنائے۔ خواتین شاعرات نے کلام سنایا۔

۱۵ اپریل : اقبال سیمینار کا اجلاس "اقبال اور عالمی ادب" کے موضوع پر پروفیسر لارنس گیلپ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر تقی علی مرزا، پروفیسر سراج الدین

جناب طالب خوندمیری نے مقالے سنائے۔ جناب یوسف اعظمی نے نظامت کی۔ سیمینار کا چوتھا اور آخری اجلاس ڈاکٹر انور معظم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ڈاکٹر عبدالقادر عمادی اور جناب ظہیرالدین احمد نے مقالے پیش کئے جناب غیاث متین کنوینر نے شکریہ ادا کیا۔ اسی شب ڈاکٹر شاذ تمکنت کی صدارت میں محفل مشاعرہ آراستہ ہوئی۔ علی احمد جلیلی، روحی قادری، تاج مہجور، رضا وصفی، مضطر مجاز، غیاث متین، علی ظہیر، حامد مجاز، یوسف اعظمی، حسن فرخ، علی الدین نوید اور رؤف خیر نے کلام سنایا۔

۱۶ اپریل : ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ سابق ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی نئی تصنیف "نقوشِ حیات" (سوانح) شائع ہوئی۔

۱۷ اپریل : مسٹر ین ٹی راما راؤ چیف منسٹر نے اسمبلی میں بتایا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کیلئے درکار ۱۲ سے زائد آبادی کا ریاست میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ایسے علاقے جہاں ۱۵ تا ۲۰ فیصد آبادی اردو زبان بولنے والوں کی ہے وہاں اردو میں کاروبار چلانے کی ہدایات دی گئی ہیں۔

۱۸ اپریل : نامور ماہر تعلیم اور ادارہ کے سابق صدر پروفیسر سید علی اکبر صاحب کا علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ایوان اردو احتراماً ان کی یاد میں بند رہا۔

• کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام طالبات کے لئے مرکز خوشنویسی کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو حکومت ہند اور پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے طالبات اور اساتذہ کا انٹرویو لیا۔ صدر تعلیمی کمیٹی جناب جلیل پاشاہ کی سعی سے اس مرکز کا قیام عمل میں آیا ہے۔

۱۹ اپریل : جناب حامد علی عباسی صدر ادارۂ ادبیات اردو نے پروفیسر سید علی اکبر کی وفات پر تعزیتی بیان میں ان کی دیرینہ تعلیمی اور علمی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے ادارہ ادبیات اردو کی ترقی میں پروفیسر اکبر کی رہنمائی کا ذکر کیا۔

• ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے پروفیسر سید علی اکبر کی وفات کو اردو دنیا اور حیدرآبادی روایات کا نقصان قرار دیتے ہوئے ان کی گراں قدر تعلیمی، علمی خدمات کو خراج ادا کیا۔

۲۲ اپریل : "انجمن جان نثاران امام مظلوم" کے زیر اہتمام پانچواں سالانہ کل ہند مقاصدہ "حسینیہ" میں منعقد ہوا۔ حضرت واثق جونپوری، جناب یوشیع فیضی، جناب مہدی نقلی، جناب ماہر لکھنوی، جناب شہزاد گلریز، جناب سید وقار نگری کے علاوہ میزبان شعرا مسرز سعید شہید، باقر امانت خانی، اختر زیدی، سہیل آفندی، علی جاوید مقصود، صلاح نیّر، رشید شہیدی، کیف کرمانی، علی رفیع اور دیگر شعرا نے کلام سنایا۔ جناب تقی عسکری نے نظامت کی۔

۲۴ اپریل : ڈاکٹر ایم ایل نگم، ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم نے "اردو گھر" میں جناب انور ہاشمی ایڈیٹر ہفت روزہ "شاہد" کے مجموعہ کلام "قوس قزح" کو نذرانۂ دل کی رسم اجرا انجام دی

(سلسلہ ص ۳۵ پر دیکھئے)

1984

R. N.
Regd. H

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A.

اسلوب اور انتقاد

بالِ جبریل



ضربِ کلیم

مکاتیبِ رشید

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جون ۱۹۸۴ء

جلد ۴۶ شمارہ ۶

سن اجرا ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مجلس مشاورت :
حامد علی عباسی
ہاشم علی اختر
ڈاکٹر مغنی تبسم

ارکان :
عابد علی خان
پروفیسر گوپی چند نارنگ
محمد اکبر الدین صدیقی
رمن راج سکسینہ، محمد منظور احمد

مدیر اعزازی : مغنی تبسم
شریک مدیر : محمد منظور احمد
معاون مدیر : وقار خلیل

قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے
زر سالانہ : ۲۰ روپے
کتب خانوں سے : ۲۵ روپے
بذریعہ رجسٹری : ۲۵ روپے

بیرونی ملکوں سے :

ہوائی ڈاک سے :		بحری ڈاک سے :
مشرق وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۱۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان / بنگلہ دیش	۸ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۳ پونڈ

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں
چھپوا کر حیدرآباد ۲ سے شائع کیا
کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

سرورق : مرزا محمد امین کا پورٹریٹ۔ عہد قطب شاہی میں پیشوا کے بعد دوسرا بڑا عہدہ میر جملہ ہوا کرتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مرزا محمد امین، میر جملہ کے عہدہ پر فائز تھے۔

اپنی بات

عصری حسیت، عصری مسائل کی عکاسی، عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی، معاشرہ [illegible]
اور [illegible] پہلو، سماجی اور تہذیبی گتھیاں، بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود، اچھے اور صحت مند اور [illegible]
اور عنوانات رہے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں نے ہر دور میں اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے۔
کے ذریعہ ہر وہ بات کہی گئی جو بظاہر کہی نہیں جا سکتی تھی۔

سخن گفتہ ترا، چہ قلندرانہ گفتم

والی بات اس پر صادق آتی ہے۔ اردو صحافت نے بھی کوئی ... پیشتر قلم نگاری [illegible]
کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ عوام کی نفسیات، ان کے رجحانات، وقت کے تقاضے اور عصری [illegible]
پیش کیا ہا[illegible] ادیب و شاعر ہر لمحہ بدلتی اور [illegible] زندگی کے تقاضوں [illegible]
اردو کے نئے لکھنے والے اگر اپنے ادب کے [illegible] سرمایہ [illegible] نظر سے
تو ان کے فن اور اسلوب میں [illegible] پیدا ہوگا۔

اونچے معیار کی خوبصورت تخلیقات، [illegible]
علاوہ [illegible] کے علاوہ [illegible] کی دوسری زبانوں کے ادب کا مطالعہ [illegible]
[illegible] دلچسپ اور لائق مطالعہ ہوں گے۔

[illegible]

چمنستانِ شعرا

[illegible] شفیق [illegible] تذکرہ "چمنستان شعرا" [illegible] مرتب کیا [illegible]

[illegible] شعرا کے [illegible] کئے گئے ہیں۔

[illegible] تصنیف [illegible]

[illegible] شعرا [illegible] نام و تاریخ چمنستان [illegible]

[illegible] اشعار [illegible]

[illegible]

[illegible] کہ بود افشا حال فصحا

[illegible] گفتم چمنستان شعراء ط

[illegible] شفیق [illegible]

[illegible] شفیق [illegible]

[illegible]

[illegible] اگر بعض اسماء کا [illegible] اور اشعار

[illegible] کر دیں گے

[illegible] شفیق [illegible]

[illegible] سکتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] چمنستان شعرا [illegible] شفیق [illegible]

ڈاکٹر خالدہ یوسف نے اپنے مقالے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ "چمنستانِ شعرا" میں دو سو تیرہ شعرا کے حالات درج ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:-

"یہ ریختہ گو شعراء کا تذکرہ ہے جو پانچ سو پینسٹھ (۵۶۵) صفحات پر مشتمل ہے جس میں (۲۱۳) دو سو تیرہ شعراء کے حالات اور منتخب کلام پیش کیا گیا ہے۔" ؎۱

مولوی عبدالحق کے مطبوعہ نسخہ میں صرف دو سو تیس (۲۳۰) شعراء کا حال درج ہے۔ ڈاکٹر خالدہ یوسف کے بیان سے راقمۃ الحروف کو اتفاق ہے۔ سید محمد کو اس سلسلے میں غالباً تسامح ہوا ہے۔

شفیق نے اس تذکرہ کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ جب شمالی ہند سے میر کا "نکات الشعراء" اور فتح علی گردیزی کے تذکرے ان تک پہنچے تو انھیں خیال ہوا کہ ان دونوں تذکروں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک اور جامع تذکرہ سپرد قلم کریں۔ یہ تصنیف تنہائی کیلئے ایک بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔ شفیق نے جس عہد میں یہ تذکرہ قلم بند کیا تھا اس دور میں شمالی ہند کے شعرا کا کلام جنوب کے تذکرہ نگاروں تک پہنچنا بہت دشوار تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے غنیمت جانا کہ اس کی مدد سے شمال کے شعراء کے حالات و انتخاب کو ماخذ بنالیں اور پھر دکن کے شعراء کے حالات اور انتخاب کے ساتھ اسے مدون کریں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"کہ دریں تذکرہ نکات الشعراء من تصنیف میر محمد تقی میر و تذکرہ فتح علی خاں گردیزی تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالم انداخت و جمعے را در اشتیاق اشعار ہند کہ بہم رسیدن [?] آن اہلِ دکن را بحیلہ دشوار است تہہ و بالا ساخت۔ لہٰذا بخاطر خاطر و فکر تلاش گذشت کہ خود ہم این ہمہ اشعار ہر دو تذکرہ گرفتہ و دیگر لاش را یکجا جمع ساختہ بطور سفینہ کہ انیس یکتائی و ہمدم تنہائی شود نقش پذیرفت۔" ؎۲

شفیق کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ ہے۔ وہ تذکرہ کو خشک ہونے نہیں دیتے تھے۔ ذیل

؎۱ ڈاکٹر خالدہ یوسف۔ اورنگ آباد میں اردو ادب کا ارتقاء۔ ص ۲۹۴

؎۲ لالہ لچھمی نارائن شفیق۔ چمنستانِ شعراء ص ۵۷۴ - مطبوعہ

میں چند مثالیں 'چمنستانِ شعرا' سے پیش کی جاتی ہیں جن سے رنگینیٔ بیان کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جیسے وہ آشنا، آوارہ اور سراج الدین علی خان آرزو کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان مناسبت رکھنے والے کلمات شاعروں کی تصویر کشی میں استعمال کئے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

"دودمان چراغ ہستی آوازِ چراغ سراج الدین علی خان آرزو ضیا گرفتہ"[۱]

"آوارہ دشت سخن طرازی است برادر حقیقی زین العابدین آشنا می شود"[۲]

تذکرہ نگاری کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ تذکرہ نگار تعصب اور جانبداری سے کام نہ لے۔ شفیق کے چمنستانِ شعرا کو جب ہم اس اصول پر پرکھتے ہیں تو وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ انہوں نے کہیں بھی دکن کے شعرا کی تعریف میں غلو سے کام نہیں لیا اور نہ ہی شمالی ہند کے شعرا کو کمتر جانا ہے۔ سودا، درد، تاباں، میر اور آرزو کے حالات قلمبند کرتے ہوئے انہوں نے فراغ دلی اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ جیسے وہ آرزو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"در گلشنِ ہند مثل او عندلیب ہزار داستان کم ترمی توار دپنداشت
و در مجلس دکن ہمچو آن پروانہ چراغ سخن عدیم باید انگاشت"[۳]

فتح علی خاں گردیزی کے تذکرے اور 'مخزن نکات' پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان تذکرہ نگاروں نے نکات الشعرا سے استفادہ کے باوجود کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا کہ ان کے پیش نظر میر کا تذکرہ تھا[۴] چمنستانِ شعرا پر اس قسم کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ شفیق نے جہاں کہیں گردیزی اور نکات الشعرا سے نقل کیا ہے۔ بلا پس و پیش انہوں نے تحریر کیا ہے کہ یہ مواد اس تذکرہ سے ماخوذ ہے۔ محض اپنی جدتِ طبع دکھلانے کے لئے انہوں نے دوسرے تذکرہ نگاروں کے طریقہ کار کو نہیں اپنایا۔ اس طرح تذکرہ نگاری کی ایک اور شرط یعنی دیانت داری کے اصول کو بھی انہوں نے برقرار رکھا ہے۔ مثلاً محمد صلاح آگاہ کا شعر انہوں نے گردیزی کے تذکرہ سے نقل کیا ہے۔ اس لئے وہ بلا جھجک اپنے اس استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

از تذکرہ فتح علی خاں است

۱، ۲ لالہ لچھمی نارائن شفیق۔ چمنستانِ شعرا۔ ص ۲۔ ۵۷۔ مطبوعہ

۳ لالہ لچھمی نارائن شفیق۔ چمنستانِ شعرا۔ ص ۹

۴ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ ۳۹۔ ۴۰

[illegible]

پیری میں گردوں سیر جہاں کو تو جاتا ہے [illegible]

[illegible] اس [illegible] کے مرتبے [illegible]

[illegible] سے [illegible] ہو گیا۔

شعراء عام طور پر اپنے معاصرین کی تعریف بہت کم کیا کرتے ہیں۔ عموماً ان سے معاصرانہ چشمک رہا کرتی ہے وہ ان کی خوبیوں کو بیان کرنا کسر شان سمجھتے ہیں لیکن شفیق کے تذکرے میں یہ برائی نہیں ہے۔ وہ اپنے ہم عصر غلام علی آزاد کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں انہیں اپنا عزیز دوست سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی اصلاح کے خواہاں ہیں۔

شفیق کسی کی عیب جوئی اور نکتہ چینی کو معیوب سمجھتے ہیں۔ کسی میں کوئی نقص ہو تو ان کو اس غلطی سے آگاہ کرنے کے لئے انہوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے۔ 'چمنستان شعراء' کے مقدمے میں ایسے تذکرہ نگاروں پر تنقید کی گئی ہے۔ جنھوں نے عیب جوئی اور نکتہ چینی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:-

"لیکن از سخن چیناں این زبان کہن و حرف گیران بیہودہ سخن کہ عیب جوئی اشعار خود ساختہ اند و فرد آسو گیر بخند باختہ معانستہ انگشت را بر حرف قبول می نہند۔ و در عینک احول و ضلالت برآمدہ ہمسر را بجز عیب نہ بینند"[1]

یقین کے بیان میں شفیق نے ان خیالات کا اعادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یقین کے کلام کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان کی ہر بیت کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن نکتہ چینوں نے ان کے کلام میں نقائص ڈھونڈنے ہی پر اکتفا کیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔

چمنستان شعراء کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفیق ایک محقق بھی تھے۔ شعراء کے حالات نہ صرف روایتوں کے سہارے قلمبند کئے گئے ہیں بلکہ ایک عظیم محقق کی طرح ان واقعات کی چھان بین بھی کی ہے اور ماخذ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے ان کا مطالعہ وسیع تھا اس لئے وہ مختلف ماخذوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جیسے [illegible] کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے تفصیلی حالات تذکرہ سرو آزاد میں موجود ہیں۔ [illegible] کا ذکر

---

1 - لالہ لچھمی نارائن شفیق۔ چمنستان شعراء۔ ص ۳۵

کہ قصیدہ [illegible] ولی [illegible] ان کے مصرعہ پر تضمین لکھی ہے
جعفر علی حسرت [illegible] ایک شعر کے تعلق سے فتح علی خان گردیزی نے لکھا تھا کہ وہ ولی کا ہے لیکن شفیق نے بنظر تحقیق ان کے دیوان میں اس شعر کو تلاش کیا اور بعد تحقیق نہایت وثوق کے ساتھ یہ لکھا کہ یہ شعر ولی کا نہیں بلکہ ذکی کا ہے۔ ملاحظہ کیجئے اقتباس :-

"فتح علی خان نوشتہ کہ بعضے گویند این شعر از ولی دکنی است
صاحب می گوید دیوان "ولی" بنظر در آمد این بیت در داخل نسبت تحقیق
کہ از ذکی است" [1]

"فتح علی خان نوشتہ کہ بعضے گویند این شعر از ولی دکنی است۔ صاحب
می گوید دیوان ولی بنظر در آمد این بیت درو داخل نیست تحقیق کہ از ذکی است۔"

کبھو کے دل میں کیا پہنچے ہے بے ہوشی نہایت کو … صبا آیا بھول کر قاصد کتابت جا نہایت کو

شفیق ہجو گوئی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ جعفر زٹلی کے بارے میں لکھتے ہوئے اعظم شاہ کا حوالہ دیتے ہیں جس نے لکھا تھا کہ جعفر اگر "ہجو نگار" نہ ہوتا تو ملک الشعرا کے مرتبے تک پہنچ جاتا۔ شفیق لکھتے ہیں :-

"... محمد اعظم شاہ' بادشاہ می گفت کہ اگر جعفر زٹلی نہ بودے ملک الشعرا بودے"

شفیق توارد اور سرقہ کے تعلق سے مولانا غلام علی آزاد اور علامہ تفتہ زانی کے اقوال نقل کرتے ہیں' جنھوں نے اشتراک مضامین کو توارد کہا ہے' سرقہ نہیں۔ پھر وہ حکیم کا ایک قطعہ پیش کرتے ہیں' جس کا ایک شعر توارد ہی سے تعلق رکھتا ہے ؎

دلی علاج توارد نمی توانم کرد … مگر زبان بہ سخن گفتن آشنا نہ کنم

شفیق خود اپنی ایک نظم نقل کرتے ہیں جس میں اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

وہ کون سا شاعر ہے جس کو نہیں توارد … دنیا وہ کون سا ہے جو بے حباب ہوئے [2]

---

[1] لالہ لچھمی نارائن شفیق۔ چمنستان شعرا ص ۱۱۹
[2] لچھمی نارائن شفیق "چمنستان شعرا" صفحہ ۱۷۲۔ ۱۷۳ (مطبوعہ)

جس طرح شفیق ایک محقق کی حیثیت سے ایک خاص مرتبے کے مالک ہیں اسی طرح تنقیدی [illegible] کے لحاظ سے بھی ، ادب میں وہ ایک خاص تنقیدی نقطۂ نظر رکھتے ہیں ۔ ان کی تنقید کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی کا نقص بتلاتے ہیں تو ایسا نہیں کہ وہ عیب جوئی یا نکتہ چینی کے مترادف سمجھا جائے ، جیسے وہ اپنے اس تذکرے میں اُفتوں کی ہجو کو اس کی کمزوری تصوّر کرتے ہیں ۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ اس نے اپنی اچھی صلاحیتوں کو خواہ مخواہ برباد کر دیا ہے ۔ وہ شاعر کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ جس سے ان کی پوری پوری ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کے نقص سے آگہی بھی ہو جاتی ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :-

" از شعرائے این عصر است از بسکہ ہجو بر مزاجش غالب آمید شہرہ عوام گردید۔ در شعر تتبع (ذاتی) می نماید واکثر مزاح او بطرف ہزل می آید۔ شوخی طبعش از کلامش ہویدا و مزاجش از تخلص او پیداست۔ کاش کہ این خیال در دلِ او جا نیافتے و آفتاب اشعار رنگیں بر سینہ اش بتافتے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ ازین تائب شود و تخلص خود ہدایت قرار دہد۔ چنانچہ خود می گوید :- شعر موزوں کرنے کے چار طریقے ہیں ، یعنی دوسروں کے اشعار کے الفاظ و معانی کو بغیر کسی تبدیلی کے اپنے نام سے منسوب کر لیتے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کسی کے بیان معانی میں لطافت محسوس کرتا ہے تو الفاظ کے تغیّر و تبدل سے اُسے اپنا بنا لیتا ہے۔ اس کو بھی توارد کہہ سکتے ہیں لیکن لفظوں کا در و بست جس شعر کا اچھا ہوگا وہی مقبول عام ہوگا۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو کسی اور سے مماثلت نہیں چاہتا۔ اس کا نظریہ یہہ ہوتا ہے کہ اچھا ہو خواہ بُرا ، لیکن وہ اپنی محنت کا صلہ ہونا چاہیئے۔ چوتھا طبقہ ان کا ہے جو دوسری زبانوں میں پیش کیے گئے مضامین کو اپنی زبان میں باندھتے ہیں۔ جیسے فارسی کے مضامین ریختہ میں اور مضمون کتب فارسی میں ۔ وہ فارسی اور اردو کے شعرا کے ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن کے مضامین مشترک ہیں۔

شفیق کی تحقیق کا اندازہ ایک اور واقعہ سے ہوتا ہے۔ انہوں[1] نے فتح علی خان گردیزی اور میر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اول الذکر نے پیش کردہ دو بیتوں کو سودا سے منسوب کیا

---

[1] لچھمی نارائن شفیق "چمنستانِ شعرا" صفحہ ۱۸۳ (مطبوعہ)

ہے۔ میر کے تذکرے میں بھی یہہ مطلع موجود ہے جسے وہ سودا کا بتلاتے ہیں۔ لیکن شفیق کا خیال ہے کہ یہہ تینوں اشعار انھوں نے یقین کے دیوان میں دیکھے ہیں اور کامل یقین کے ساتھ کہتے کہ وہ اشعار یقین ہی کے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ دونوں کے طرز سخن سے ہم واقف ہیں۔ لہٰذا سب سے بہتر فیصلہ یہی ہو سکتا ہے دونوں کے کلام کا مطالعہ کر کے دونوں کے اسلوب کے لحاظ سے فیصلہ کریں کہ کون سا شعر کس کا ہے

ایک اور شعر کے تعلق سے میر سے اختلاف کرتے ہوئے شفیق نے اُسے یکرنگ کا بتلایا۔ لیکن لوگ اسے مرزا مظہر سے منسوب کرتے ہیں۔ شفیق لکھتے ہیں :-

" اگرچہ این بیت کہ گزشت 'میر محمد تقی میر بنام یکرنگ نوشتہ است۔ اما بنام
میرزا مظہر شہرۂ عام دارد واللہ عالم "

برگ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا   شاید کبھو تو جا لگے اس دلربا کے ہات

عموماً یہہ سمجھا جاتا ہے کہ شفیق نے یہہ تذکرہ خاص طور پر " نکات الشعرا " کی تردید میں لکھا اور انھوں نے میر کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ سچ پوچھا جائے تو سوائے چند عبارتوں کے کہیں یہہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا مقصد میر پر نکتہ چینی کرنا تھا۔ میر کی تعریف میں انھوں نے کوتاہی نہیں کی ہے بلکہ بہت ہی وسیع النظری سے ان کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

" میر محمد تقی میر اکبر آبادی نیّرِ میدانِ سخنوری شہنشاہ اقلیم معنی پروری است ....
ونازک خیالی' سرتاجِ شاعران این عصر و گلِ سرسبد "

ایک دو جگہ شفیق نے میر پر تنقید کی ہے۔ وہ ان کی نکتہ چینی پر طنز کرتے ہیں۔ شفیق رقمطراز ہیں :- " حرف گیران می نہد و برین کمالِ غریب او تذکرہ نکات الشعرا من تصنیف میر گواہ می دہد " سلہ

البتہ میر نے شفیق کے اشعار کے انتخاب کو پیش کرنے میں کوتاہی کی ہے۔

شفیق نے اس تذکرے میں اپنا حال بھی لکھا ہے۔ چنانچہ یہ تذکرہ شفیق کی سوانح کا اہم ماخذ ہے۔ وہ اپنی تاریخ ولادت وجائے پیدائش وغیرہ بتلاتے ہوئے اس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ انھوں نے عبد القادر راور غلام علی ارشد کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور بارہ سال

سلہ عبد الحق : چمنستان الشعراء - صفحہ ۱۴

[illegible] شعر [illegible] کی نہ تھے اپنے [illegible] کو [illegible]
[illegible] کیا ہے [illegible] میں اظہار خیال کیا ہے آخر میں [illegible] نے اپنے [illegible]
کئے ہیں

عبدالحق نے اس تذکرہ کی خوبیاں "چمنستان شعرا" کے دیباچے میں بیان کی ہیں۔ لکھا ہے شفیق نے بہت احتیاط سے تشبیہات اور استعارات میں باتیں کی ہیں اور جن اشعار کے بارے میں انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کے ہیں تو احتیاط کے پیش نظر ان شعروں کو تذکرہ کے آخر میں نقل کر دیا ہے۔ یقینی کے متعلق شفیق نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ عبدالحق کو مبالغہ محسوس ہوتا ہے۔ اور میر پر جو اعتراضات ہوئے ہیں انہیں وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔[1]

ڈاکٹر خالدہ یوسف نے بھی تقریباً ان ہی خصوصیات کو دہرایا ہے۔ ڈاکٹر خالدہ کے پاس ایک دو خوبیاں اضافہ پائی جاتی ہیں۔ وہ مولوی عبدالحق کی طرح شفیق کی رنگین بیانی کی تعریف کرتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار کرتی ہیں کہ شفیق کی زبان گنجلک نہیں بلکہ عام فہم ہے۔ ڈاکٹر خالدہ نے شفیق کی دو خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ا۔ بھید اور میراں ایک ہی شخص کے دو تخلص تھے۔ میر کے تذکرے میں بھید کا ذکر ملتا ہے اور گردیزی کا میراں سے متعارف کرواتا ہے۔ اصولاً شفیق کو چاہیئے تھا کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنے تذکرے میں دو علیٰحدہ مقامات پر ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ شفیق نے اپنے سے قبل کے تذکرے تحفۃ الشعرا، گلشن گفتار اور ریاض حسنی کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔[2]

ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کردیں تو یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ "چمنستان شعرا" اردو تذکرہ نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ عبدالحق نے گردیزی اور میر کے تذکروں سے مقابلہ کرکے اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

شفیق کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑا ہے اور بہت سے ایسے شعرا

---

[1] عبدالحق : چمنستان شعرا۔ صفحہ ۱۴
[2] ڈاکٹر خالدہ یوسف : اورنگ آباد میں اردو ادب کا ارتقاء صفحہ [illegible]

[illegible] پایا جاتا ہے بہت سے ایسے ہیں جو [illegible]
[illegible] اس کو ذاتی ملاقات ہے اور خود ان شاعروں سے ان کا منتخب کلام لے کر
درج کیا ہے۔ ایسے حالات خاص طور پر قابل اعتبار ہیں۔ [1]

ڈاکٹر سید عبداللہ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ میر کی تنقید میں نہ صرف تلخی ہے بلکہ وہ بڑھتے بڑھتے بے دردی تک جا پہنچتی ہے لیکن اس کمزوری کے باوجود نکات الشعراء کی بعض خوبیاں [illegible] ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ دکن والوں کی تعریف و توصیف نہیں کرتے یا ان کے بارے میں تفصیلی حالات درج نہیں کرتے تو یہ مصلحت وقت کے پیش نظر تھا۔ اس لئے کہ دکنی ادب کے خلاف بغاوت، اس عہد کا ایک اہم رجحان تھا۔ مرزا جانجاناں مظہر، سودا، میر اور درد کی تمام تر کوششیں یہی تھیں وہ اردو شاعری کو فارسی شاعری کے معیار تک پہنچائیں۔ چنانچہ وہ اسے ہندی کے اثر سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ وہ شاعری جو دکن اور گجرات میں نشوونما پائی تھی، وہ اہل شمال کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اس لئے میر نے بھی دکن کے شعراء کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔ [2]

---

[1] عبدالحق۔ مقدمہ چمنستان شعراء صفحہ ۱۶ مطبوعہ۔
[2] ڈاکٹر سید عبداللہ۔ شعرائے اردو کے تذکرے صفحہ ۲۵

صفحہ ۲ سے آگے پڑھئے:

اپنی بات

اگر ہمارے لکھنے والے،
اردو کو زندہ و پائندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اچھی اور عمدہ تخلیقات کے ذریعہ، اردو ادب کو عالمی اہمیت کے ادب کے [illegible] پہنچائیں۔

محمد منظور احمد

ڈاکٹر میمونہ بانو

پروفیسر عبدالقادر سروری

گول متبسم چہرہ، گہرا سانولا رنگ، متناسب ڈیل ڈول، سنہرے فریم سے فکر و فن کی گہرائیوں میں جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں ——— یہ تھے پروفیسر سروری، شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ، جامعہ میسور اور جامعہ کشمیر کے میر کارواں —! بہ ظاہر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے والا، ان سے کبھی متاثر نہ ہوا کہ اوسط خدوخال کے مالک تھے لیکن رفتہ رفتہ جب یہ اجنبیت کا رشتہ شناسائی سے آگاہی کی طرف بڑھنے لگتا تو خود بہ خود ان کی عظمت و بڑائی کا ملاقاتی کو احساس ہوتا اور خواہ مخواہ ہی ان سے کچھ عقیدت سی ہو جاتی۔

"ملاقاتیں ہوتی گئیں تو اندازہ ہوا کہ سروری صاحب یہاں کسی سے بھی بے تکلف ہونا ممکن نہ تھا"

وہ بہت ہی محتاط لیے دیئے رہنے والے کم سخن انسان تھے۔ علمی وقار اور رکھ رکھاؤ کو ملحوظ رکھنے والی شخصیت جیسا کہ حامد اللہ ندوی نے لکھا ہے:

"ان کی شخصیت میں رعب سے زیادہ ایک غیر مرئی کشش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بیدار ذہن، محبت بھرا دل اور دور رس نگاہ رکھتے ہیں" (سروری زبان سے ادب تک، سب رس جولائی ۷۱ء)

بسیار گوئی ان کی فطرت نہ تھی۔ انتہائی نپے تلے الفاظ میں اپنا فی الضمیر بہ قدر بادام ادا کرتے۔ 'نے' کا استعمال عام حیدرآبادیوں کے برخلاف بکثرت اور صحیح کرتے۔ سامع کا تاثر یہی ہوتا کہ یا تو دیارِ دلی سے ہیں یا دلی والوں کی صحبت اٹھائی ہے لیکن بقول غالب ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تاثر دینے والے تاثر جاتے کہ دلی آمیز "ہاں" کے پس پشت "ہو" اور "نہ" میں "نکو" پنہاں ہے۔

"سننے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا کہ وہ ٹھیٹ اہلِ زبان یعنی دہلی اور لکھنؤ کی بول چال اختیار کرنا چاہتے ہیں اور یہی خیال ہوتا کہ شاید اُدھر ہی کے ہوں، رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ ان کے جدِّ امجد کشمیر سے آئے تھے"۔

لیکن جب علامہ اقبال کی شاعری سے قطع نظر ان کی پنجابی آمیز اردو قابلِ گرفت نہیں تو سروری صاحب کی تصانیف و تالیفات سے قطع نظر ان کی دکنی کیوں قابلِ گرفت قرار پائے؟

سروری صاحب کی شہرت و ناموری اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات ان کے صرف "نام" نے وہ کرشمے دکھائے ہیں جو "کھُل جا سم سم" کی سی تاثیر رکھتے ہیں اور کئی ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ ان کے شاگردوں کی وقعت و توقیر میں در پردہ ان کا نام کارفرما رہا۔ جیسا کہ رشید قریشی صاحب نے بھی اس کا اظہار کیا ہے :-

"سروری صاحب کی شہرت حیدرآباد تک ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں آپ کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال مجھے علی گڑھ جانے کا موقع ملا، وہاں میرے ایک دوست زیرِ تعلیم تھے۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی علمی فضا میں کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب کے شاگرد ہونے کی سعادت نے مجھے جس لطفِ خاص کا مستحق قرار دیا اس سے میں آپ کی عظمتوں کا اور بھی معترف ہوا"۔[1]

سروری صاحب نے "نقوش" کے "آپ بیتی" نمبر میں اپنے آبا و اجداد کو کشمیری النسل بتلایا ہے، جس کا خاکہ حامد اللہ ندوی نے اُڑایا ہے۔ لکھتے ہیں :

"جو لوگ انھیں قریب سے جانتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ وہ صرف ایک نسل پیچھے ٹھیٹ دراویڈی تھے"۔[2]

---

[1] اردو کے خاموش خدمت گزار از : رشید قریشی، سب رس جنوری ۱۹۶۰ء

[2] سروری زبان سے ادب تک از : حامد اللہ ندوی، سب رس جولائی ۱۹۷۱ء

اس میں شک نہیں سرور صاحب کے چہرے مہرے سے کسی طرح یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کشمیری النسل رہے ہوں گے لیکن یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کے پوتے و نواسے واقعی کشمیری النسل نظر آتے ہیں۔

کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ داغ دہلوی بھی کشمیری النسل پٹھان چہرہ ملک کے بیٹے تھے جن کے سیاہ فام چہرے پر سنہری ٹوپی دیکھ کر حیدرآبادی نوجوان "کسوٹی پہ بندھ سونے کی پھبتی" کسا کرتے تھے! تمکین کاظمی صاحب نے بطور خاص اس کا تذکرہ اپنی کتاب "داغ"[1] میں کیا ہے داغ کی والدہ محترمہ کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کا شمار دنیا کی حسین ترین عورتوں میں ہوا کرتا تھا۔ ان کے نادیدہ حسن کا شہرہ سن کر ہی نواب شمس الدین خاں نے انہیں اپنے حرم میں داخل کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد وہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اکبر اولاد مرزا محمد سلطان کی منظور نظر بنیں۔ بہرحال صرف رنگت کو دیکھ کر کسی کی نسل کا تعین کرنا گمراہ کن ہو سکتا ہے

سرور صاحب کی ظاہری شخصیت کو دیکھ کر ان کی فطرت کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں محال تھا۔ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن کی شخصیت ظاہر میں کچھ ہوتی ہے حقیقت میں بہت کچھ ہوتی ہے۔ سرور صاحب کی شخصیت کا تجزیہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے بہت صحیح کیا ہے۔ وہ رشید احمد صدیقی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے ان دونوں اساتذہ ادب کا تقابل کرتے اور لکھتے ہیں:

"پہلی بار رشید صاحب کو دیکھ کر مجھے اپنے شفیق استاد سرور صاحب کی یاد آئی۔ سرور صاحب بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے، جو اپنے خدوخال سے نہیں، اپنے موضوعات کی وسعت، اپنی تحریر کی دلنوازی، گہرائی اور گیرائی سے لوگوں کو اپنا بنا لیتے، دلوں کو فتح کر لیتے۔" (چہرہ چہرہ داستان، از: ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

سرور صاحب کی طبیعت میں جتنی سادگی تھی، لباس کے معاملے میں وہ اتنے ہی نفاست پسند واقع ہوئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لباس میں "اسراف بے جا" کو جائز سمجھا ہو۔ سادگی لباس میں بھی ملحوظ رہتی۔ عموماً گھر میں سفید کرتا، پاجامہ، زیب تن کئے رہتے لیکن کالج میں سوٹ بینٹ، شرٹ، ٹوپی اور شیروانی پہنا کرتے۔ خصوصیت سے جمعہ کے دن پابندی سے شیروانی

۱۔ داغ، از: تمکین کاظمی

پہنا کرتے تھے یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کاغذات کو نتھی کرنے کے لئے وہ پن خریدنے
[illegible] کے بھی استعمال کیا کرتے۔ اس سے جہاں ان کی کفایت شعاری کا اندازہ ہوتا ہے وہیں
جاپانیوں کی طرح ہر چیز کو کارآمد کرنے کی کوشش بھی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا دھوبی کے علاوہ
'ڈرائی کلیننگ' کا ایک 'مستقل مد' بھی ان کی تنخواہ سے لگا ہوا تھا۔

انھیں اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔ شاید و باید ہی ایک آدھ دن کے لئے بستر پر پڑے ہوں
ان کی صحت دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قدر جلد لقمۂ اجل ہو جائیں گے۔ ۶۵ برس کی عمر میں
وہ زیادہ سے زیادہ ۴۵ برس کے دکھائی دیتے تھے۔ ہمیشہ چاق و چوبند رہے۔ گاہے ماہے
ہلکی سی ورزش اور روزانہ چہل قدمی بھی کیا کرتے، غذا کا خاص خیال رکھتے تھے اگرچہ غذا کے تعلق
سے ان کا ایمان تھا۔

"ایک داڑھ چلے ستر بلا ٹلے"

لیکن کبھی سیر ہو کر ضرورت سے زیادہ کھانا پسند نہیں کیا۔ مرغن غذائیں بہت کم
استعمال کرتے، سادہ غذا بہت زیادہ پسند فرماتے۔ ٹھوس غذا بعد مشروب کو ترجیح دیتے۔
چائے بُری جیسی بھی ہو ضرور پیتے لیکن کبھی حد اعتدال سے بڑھ کر استعمال نہ کی۔ اس تعلق سے
پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست نے بتلایا کہ وہ یونیورسٹی میں ہوتے تو چائے ضرور نوش
فرماتے۔ اکثر کہتے کہ گھر میں دوپہر کے کھانے کے بعد چائے کی اتنی ضرورت محسوس نہیں ہوتی
اگرچہ کم خوراک تھے لیکن چاہتے تھے کہ سلیقے سے دسترخوان لگایا جائے، سلیقے سے کھانا چنا
جائے کہ اشتہا میں اضافہ ہو۔ 'نان گرم آب خنک نعمتِ خدا و نیست' کے قائل تھے چنانچہ
یونیورسٹی میں (بقول آمنہ انصاری صاحبہ) بھی بیٹھ جاتے 'ہر اٹھے سینک کر گرم گرم
کھانا پسند کرتے تھے۔

بیگم سروری نے بتلایا کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند تھے۔ روزانہ فجر کی نماز کے بعد
تلاوتِ قرآن پاک میں مصروف ہو جاتے اور جب تک تلاوت سے فارغ نہ ہوتے کمرے سے
نہ نکلتے۔ قرآن شریف کی ۱۱۴ سورتوں میں سے بیشتر سورتیں انھیں حفظ تھیں۔ اکثر تنہائی
میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے۔ بچوں کو بھی نماز کی تاکید کرتے
لیکن کبھی کسی معاملے میں غلو نہ کیا تا آنکہ وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ زکوٰۃ بڑی پابندی سے نکالتے
اور مستحقین کی مدد کرتے، قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بہت کچھ حسنِ سلوک کیا۔ انسانی

محترمہ بیگم زبیدہ عمر خاں صدر شعبہ عربی ونیتا مہاودیالیہ نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

"طلبہ و نادار اقربا نیز جان پہچان والوں کی فلاح و بہبود سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی۔ تعلیم سے لے کر تاہل تک ان کے کاموں میں اپنا عمل دخل رکھتے اور وہ بھی انھیں اپنا سرپرست، مصلح، مُربّی اور محسن جانتے۔ چنانچہ ریڈی صاحب نامی طالب علم کو جن کا ان کے مضمون اور مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، ان کی پریشانی، زبوں حالی نیز طالب علم کی خواہش کو دیکھ کر اپنے ذاتی مکان میں انھیں بلا معاوضہ ایک کمرہ دے کر ٹھہرایا تھا۔ مالی امداد بھی مقصود تھی اسی لئے ان ہی سے اپنے بچوں کو پڑھواتے رہے اور خود ریڈی صاحب کی ٹیوشن فیس اپنی جیب سے ادا کرتے رہے۔ ہمیشہ گھر سے پکا پکایا کھانا تینوں وقت بلا کسی معاوضہ کے ان کے کمرے پر بھجوا دیتے بچے صرف "ریڈی" کہتے تو ان پر غصّہ ہوتے، کان گوشی کرتے، ریڈی صاحب کہلوانے پر مُصر ہوتے کہ انھیں شائستہ اطوار کرنا، اساتذہ کا ادب سکھانا مقصود تھا۔"

اس کے علاوہ اپنی حقیقی بہنوں کی پرورش بھی ان ہی کے ذمّے تھی جو بیوہ ہوگئی تھیں۔ نہ صرف ان بہنوں کی کفالت کی بلکہ ان کے بچوں کی پرورش و پرداخت بھی مثل اپنے بچّوں کے کی۔ اپنی صاحبزادی کے لئے جو لاتے وہی ان یتیم بچوں کے لئے بھی لاتے، کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے ہیں۔

غرض یہ کہ دامے، درمے، سخنے ہر کس و ناکس کی بساط بھر مدد کی۔ خود سادہ پہنا، لیکن دوسروں کو اچھا پہنایا، کھلایا۔ دوسروں کے لئے ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہا۔ خود ایک نوالہ کم کھایا لیکن دوسروں کو پیٹ بھر کر کھلایا۔ یہ وہ خوبی ہے جو ہر ایک کو میسّر نہیں۔

بقول میر صاحب ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

غیاث متین

پرندوں سے خطاب

پرندے
رات کی شاخوں پہ بیٹھے ہیں
پروں میں
اپنی چونچوں کو دبائے
اونگھتے جاتے ہیں
اور یہ سوچتے ہیں

وہ قاصد
جو گیا تھا
صبح کا چہرہ کہیں سے مانگ کر لانے
ابھی تک لوٹ کر آیا نہیں ہے

وہ قاصد
صبح کے ہمراہ کب آئے گا؟
کب اس آسماں کے
زرد رخساروں پہ
سرخی دوڑ جائے گی!

وہ قاصد!
کون اب اس کا پتہ لانے کو جائے!

پرندے
اونگھتے جاتے ہیں
اور یہ سوچتے ہیں

انھیں مژدہ
وہ قاصد
مر چکا ہے
انھیں مژدہ
کہ ان کے پر سلامت ہیں
وہ اتریں
رات کی شاخوں سے اتریں
خلاؤں کے سمندر پر چلیں
اور صبح کو
اپنے پروں سے باندھ کر لائیں

ڈاکٹر حمیرہ جلیلی

مکتا بائی

۱۲۷۵ء ——— ۱۳۰۱ء

ہندستان کی اُن خاتون مشاہیر کے درمیان مرہٹی شاعرہ مکتا بائی کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے جنھوں نے روایات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے سماج کی بیمار ذہنیت کے لئے حیاتِ نو کا پیام دیا۔ راستی سے بھٹکے ہوئے انسانوں کی تاریک راہوں کو فکر و عمل کے چراغوں سے روشن کیا اور اپنے کلام کی مسیحا نفسی کے ذریعہ دُکھی دلوں کے زخموں پر ہمدردی کا پھاہا رکھا اور انھیں راہ نجات دکھائی۔

مکتا بائی کا جنم وِٹھل راؤ کلکرنی کے گھر اَپے گاؤں پٹن ضلع اورنگ آباد میں ۱۲۷۵ء میں ہوا۔ وِٹھل راؤ ' یجر ویدی برہمن تھے۔ مکتا بائی کی والدہ کا نام رکمنی بائی بتایا جاتا ہے۔

مکتا بائی سن میں اپنے تینوں بھائیوں نیکورتی ناتھ ' گیان دیو اور سوپا نتھ سے چھوٹی تھیں لیکن فہم و فراست' علم و ذکاوت کے علاوہ غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔ ان کے علم و دانش کے جوہر کم سنی سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ جس کا ایک بہترین ثبوت اُن کی وہ نظم ہے جو انھوں نے اپنے بھائی گیانیشور (گیان دیو) سے مخاطب ہو کر کہی تھی۔ جب کہ گیانیشور سماج کی تنگ دلی اور ترش کلامی سے دل برداشتہ ہو کر ایک کٹیا میں بند ہو بیٹھے تھے۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ حق و صداقت کی گیرائی اور عارفانہ موشگافیوں کا حامل ہے ایک نو سال کی بچی کی زبان سے ایسی سلجھی ہوئی پُر معرفت باتیں اس کی غیر معمولی شخصیت کا مظہر ہی تو ہیں۔ مکتا بائی نے ۱۳۰۱ء میں سمادھی لی۔

یوں تو مکتا بائی نے ہمیشہ اپنے آپ کو نیورتی کی شاگرد بتایا ہے۔ جو گورکھ ناتھ

سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مکتابائی نے ایک طرف تو اپنے کلام میں بیشتر انھیں چیزوں کو پیش کیا ہے جو خود ان کے تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پوری اتری ہیں۔ دوسری طرف مکتابائی کے کلام کا مطالعہ اس بات کا بھی شاہد ہے کہ ان کا تعلق ولیوں، سنت، سادھوؤں کے اس سلسلے سے ہے جنھوں نے سماج کے کسی خاص طبقے یا مذہب کے لوگوں کو ہی اپنا مخاطب نہیں بنایا بلکہ ان کی تعلیمات دنیا کے ان سارے لوگوں کے لئے ہے جو مختلف طبقوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن جس کی " اصل " ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتابائی نے راستی وصداقت، امن ونجات کا پرچار کرتے ہوئے جن اہم اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے وہ حیرت انگیز طور پر وہی ہیں جو ہم کو قرآن مقدس اور شریمد گیتا کی تعلیمات میں ساتھ ہی ساتھ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مکتابائی کا کلام اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ یہ سب ولی، رشی، سادھو، سنت، اسی ایک سورج کی روشن کرنیں ہیں جس نے سارے عالم کو منور کر رکھا ہے۔

مکتابائی نے اپنے کلام میں جا بجا تصوّف کے ان مسائل کو بڑی سادگی و پُرکاری سے پیش کیا ہے جو ہم کو مسلمان اور ہندو صوفیہ کی تعلیمات میں بنیادی اصولوں کے طور پر نظر آتے ہیں۔ جیسے ذکر، ورید، فنافی اللہ بقا با اللہ، وحدۃ الوجود، ذات وصفات وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود مرہٹی تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ مکتابائی کا کلام کہیں بوجھل یا ثقیل ہونے نہیں پاتا ان کے کلام میں وہ فطری سادگی پائی جاتی ہے جس کا اثر قاری کے ذہن پر مستقل نقش ثبت کر جاتا ہے۔

(۱)

شکل وصورت دی گئی ہے
وجود خدا کو
اس کو نام دیا گیا ہے
جب کہ
خدا اس سے بے نیاز ہے
دل محو ہے
ہم ...

عفو سے ، رحم سے
دل موہ لے
رحم دل میں رکھو
رحم سب پر کرو
ہری کے دیدار میں ڈوب رہو
دل میں رکھو یہی نام
مادھو ، مکند ، ہری
نجات انھیں سے ہے
مکتا بائی کی دولت یہی ہے
اور اس نے
نجات حاصل کر لی ہے
اس سنسار سے

(۲)

وہ جو ذکر ہے
خدا نام کا ورد ہے
وہی جسم ہے
گنگا بھی جنت کو چلی گئی
خدا نام کے ورد سے
نجات ، نجات !
سامنے ہمارے یہی سوال ہے
شام و سحر
یہ سارے نام
ایک ہی تو ہیں
اسی نام سے
کائنات کا سمندر پار کر چلے

ہری، ہری
ہری نام کے جپ میں ہی ہم محو ہیں
اور مکتا بائی
ہری نام کے امرت کا گھونٹ لیتی ہے
اور محو رہتی ہے
ہری کی محبت میں

(۳)

یہ دل ہی ہے جس سے عبد
معبود کی پرستش کرتا ہے
اپنی شدید
عقیدت کا اظہار کرتا ہے
محبت ہی چمپک کا پھول
اس کا دل دیا
اور یہی
اگربتی
جس سے وہ پرستش کرتا ہے
اپنے پورے
جذبات کی شدت سے
ہم ان کو بھوگ چڑھاتے ہیں
یہ پنڈر پور کا جو صاحب ہے
ہری
وہی میرا مہمان ہے
مکتابائی کہتی ہے
یہ بھوگ ہے ــــــ اعلیٰ و ارفع
اسے قبول کر رہا ہے

ہیرا ہری

(۴)

دنیا
ایک سوالیہ نشان
گویا صفر
اور صفر پر صفر، صفر پر صفر
یوں ہی
ہم دیکھتے چلے جاتے ہیں
جب ہوتی ہے ——— آگہی
دیر بعد ——— بہت دیر بعد
کہ
یہ دنیا کچھ بھی نہیں
سارے موجودات کے ساتھ
اس کا کوئی
وجود ہی نہیں

(۵)

ہر جا
مسرت ہی مسرت
لیکن
میں ' خودی ———————
یہ سب سے بڑا دکھ
زہر ہیں
خواہشات اور لگن
ترک کر دو اس زہر کو
ضروری ہے فرق

خیروشر میں
____
اسے محسوس کرلو
تلاش کرلو، خرد سے اپنی
راستی کی راہ
خدا کی محبت کا پپیہا
ہم چاتکوں[1] پر آ پڑا ہے
گو ہمیں معلوم نہیں
اس کی رحمت کی راہ
لیکن وہ ________ رحیم ہے
عطا کرتا ہے ہمیں
نادر چیزیں
وید
اسی کی تعریف کرتے ہیں
شرتی اسی کی حمد گاتے ہیں
اور جو اسے سُن لیتا ہے
وہ پار ہو جاتا ہے
ملتاپا ئی کی ساری تمنائیں پوری ہو گئی ہیں
یہ جان کر کہ
تم، ________ میں ہوں
مورتی سامنے ہو
نہ ہو
کیا اہمیت
کیونکہ

---

[1] : وہ پرندہ، جو صرف بارش کا پانی پیتا ہے۔

جو ہے ـــــــــ وہ
میں ہوں ـــــــــ یہ

یہ
مکتابائی نے جان لیا ہے
اس نے سمو لیا ہے۔ اپنے آپ میں
ہری کے وجود کو

(۶)

ہری کی صفات
دائم شاداب
نقص نہیں اس میں
درمیان ہے اسی کے سراپا
یہی مقصدِ حیات
ہماری راہ بن گیا ہے
نجات ہم نے پالی ہے
مدد سے
رام اور کرشن کے
اس کی رفاقت ہم نے حاصل کرلی ہے
یہ سچ ہے
ذات کی پرستش سے
ہم نے
صفات حاصل کرلیں
مکتابائی نے پوری
نجات حاصل کرلی
اور ریاضت یہ دے دی
چانگا دیو کو

(مکتابائی کی نظموں کے یہ ترجمے میں نے پروفیسر وی۔ ڈی۔ ککرنی صدر شعبہ مرہٹی عثمانیہ یونیورسٹی کی مدد سے کئے ہیں)

اُجلے موسموں کے لوگ

وہ اُجلے موسموں کے لوگ
اندھی چاندنی کا بوجھ
لے کے دل کے آنگنوں میں
پھر سے اک نئی امید دینے آ گئے
انھیں کے ہاتھ
اپنے دل کی کائنات
اک نیا وجود پھر سے پا گئی
وہ لوگ
اجلے موسموں کے لوگ
رہ نما و رہ نورد
زرد زرد رات کو
ذات کی کتاب کو
ورق ورق تمام لکھنے آ گئے
الٰہی یہ کتاب
جس کے ہر ورق پہ ایک خواب
یوں چمک رہا ہے جیسے آفتاب
تو کرے قبول تو ہو کامیاب
اور ہم
اجلے موسموں کے ساتھ
اجلے دن کا انتظار کر سکیں
اک نئی کتاب لکھ سکیں

علی ظہیر

قتل کرنے کے بعد کی مشکلیں

کب سے قابیل پریشاں ہے
چھپائے کیوں کر
لاش ہابیل کی پھرتا ہے لئے کاندھوں پر
ڈھونڈتا رہتا ہے رستہ کہ کسی طرح وہ لاش
دفن ہو جائے
یا جل جائے
یا کچھ ہو جائے
اپنی اس دُھن میں بھلا بیٹھا
وہاں خون بھی تھا
جس کے پینے سے
زمیں نے کھلا انکار کیا
خوں مٹانا نہیں دشوار
یہ فرصت تو ملے
علم دفنانے کا مل جائے تو یہ خوں بھی دُھلے

فیروزہ جعفر

ونڈرلینڈ کی ایلس

کراؤن کورٹ میں جیوری کی سیٹ سنبھالتے ہی میری نظر جو اُٹھی تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی دکھائی دی۔ ملگجی سی ٹی شرٹ پہنے تھی اور الجھے الجھے بالوں کے گچھے سارے چہرے پر بکھر رہے تھے اور ٹی شرٹ پر چھپا ڈراکیولا اپنے بڑے بڑے دانت ایک نیم برہنہ لڑکی کی گردن میں پیوست کیے تھا۔

"پرنٹ تو دیکھو کیسا بے ہودہ ہے" میرے برابر بیٹھی دوسری جیوری ممبر نے آہستہ سے کہا۔ لڑکی نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں چمکیں۔ پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اتنے برسوں میں یہ پہلا موقع تھا جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں گیا۔

مقامی عدالتوں میں جیوری سروس کے لئے ایک شرط غیرجانب داری کی بھی ہوتی ہے۔ مقدمے میں شامل لوگوں سے اگر جان پہچان نکل آئے تو کورٹ کو آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ 'میں اسے جانتی ہوں' برسوں سے ــــ جب یہ اپنی ماں کے ساتھ (PUSH CHAIR) پر بیٹھی نظر آتی تھی۔ مجھے چاہیئے کہ میں فوراً کورٹ کلرک کو یہ بات بتادوں" میرا ضمیر مجھے ہدایتیں دے رہا تھا۔

کلرک فائلیں دیکھنے میں مصروف تھا اور جج صاحب ابھی کورٹ میں نہیں آئے تھے۔ ہر طرف ایک سنگلاخ خاموشی پھیلی تھی۔

"اس کا نام کیا ہے؟ یہ لڑکی کہاں رہتی ہے ـــ؟" میرے ذہن کے نہاں خانوں میں سوال اُبھرے "یہ سب تو میں کچھ نہیں جانتی ـــ" اٹھتے سوالوں کو خود بخود جواب مل گیا۔

"پھر کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم اس سے واقف ہو۔ نہ نام ـ نہ پتہ ـ نہ گھر والوں سے واقفیت'

آخر کورٹ کلرک تم سے یہ بھی تو پوچھے گا؟ میرے اندر سوال جواب کا سلسلہ جاری تھا۔

"پھر؟" میں نے خود سے پوچھا۔

"ہمیں تو بس چپ چاپ بیٹھ کر سننا ہی ہے"۔ برابر والی خاتون چوری سرگوشی کر رہی تھیں۔

اور میں نے خاموش تماشائی بن کر کمرۂ عدالت میں نظریں دوڑائیں۔ جج صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ جرم پڑھ کر سنایا گیا۔ اس نے کسی سپر مارکیٹ سے ایک سگریٹ کا کارٹن چوری کیا تھا۔

اسٹور ڈیٹیکٹیو نے اسے چراتے دیکھا اور سپر مارکیٹ سے باہر نکلتے ہی بس اسٹاپ پر اسے پکڑ لیا۔ سگریٹ کا کارٹن بڑے سے بیگ میں موجود تھا۔ اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ پولیس بلائی گئی اور مقامی تھانے میں لے جانے کے بعد ضروری کارروائی ہوئی۔ پھر ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

اب کوئی تین مہینے کے بعد مقدمہ کراؤن کورٹ میں لایا گیا تھا۔

اسٹور ڈیٹیکٹیو نے گواہی دی اور نگرانی کا طریقۂ کار بتایا کہ شاپ لفٹنگ کرنے والوں کی اسٹور کے اندر پکڑ نہیں ہوتی بلکہ باہر نکلنے کے بعد روکا جاتا ہے۔ ثبوت کے لئے اس نے چوری شدہ سگریٹ کارٹن عدالت کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد پولیس والوں نے بیان دیا۔ وکیل استغاثہ نے لڑکی کا جرم ثابت کرنے اور اسے ایک مکمل چور ظاہر کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

پھر وکیل صفائی کی باری آئی۔ اس نے لڑکی کو بیان کے لئے بلایا۔ وہ ملزموں کے کٹہرے سے باہر آئی۔ پولیس وومن اسے اسٹینڈ تک چھوڑ گئی۔ وہ سخت تھکی تھکی اور پژمردہ دکھائی دیتی تھی۔

"تمہارا نام اور پتہ ——؟" کورٹ کلرک نے پوچھا۔

"این ولسن"۔ وہ دھیمے سے بولی۔

"اور پتہ ——؟" پوچھا گیا۔

"کوئی مستقل ٹھکانہ ہو تو بتاؤں —— جہاں رات ہوتی ہے وہیں سو جاتی ہوں" وہ بولے بولے کہہ رہی تھی۔

"بس گرینلی گارڈن والے خونخوار گھر میں نہیں ہوں ورنہ یہاں کھڑی نظر نہ آتی"۔ اس نے طنز سے جج کی طرف دیکھا جو ہاتھ کے اشارے سے بولنے کو روک رہے تھے۔

"ڈھٹائی تو دیکھو" برابر والی خاتون نے پھر چپکے سے کہا۔

"تم جو کہو گی سچ کہو گی اور سچ کے سوا کچھ بھی نہ کہو گی"۔ کارڈ اور مقدس کتاب اس کے ہاتھوں میں

تھماتے ہوئے کلرک بولا۔

"بالکل" وہ تنک کر بولی۔

"ایسے نہیں کارڈ سے پڑھ کر کہو" وہ بتا رہا تھا۔

"ڈھکوسلے" اس نے بُرا سا منہ بنا کے کہا اور جلدی جلدی کارڈ کے چھپے ہوئے الفاظ دہرا دیئے۔

"این ولسن تم پر الزام ہے کہ چوبیس جون جمعہ کے روز، البرٹ سپر مارکیٹ سے تم نے ایک سگریٹ کا ٹن چوری کیا۔ بغیر قیمت ادا کئے باہر نکلیں۔" وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"جھوٹ ۔۔۔ میں تو بھری سٹاپنگ باسکٹ اسٹور میں ہی چھوڑ آئی تھی ۔ اتنی بھیڑ تھی وہاں، کون گھنٹوں کیو میں لگتا ۔۔۔" وہ اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

"پھر کارٹن تمہارے تھیلے میں کیسے آ گیا ۔۔۔ ؟" وکیل پوچھ رہا تھا" کود کے ۔ خود سے ۔" اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ " میں کیا جانوں ۔ اسٹور ڈیٹلیسو سے پوچھو ۔۔ جب وہ پیچھے ہی لگی تھی تو اسے پتہ بھی ہوگا۔" وہ گواہوں کی طرف دیکھتے ہوئے بے زاری سے بولی۔

اور مجھے یہ این ولسن اس ننھی منی بچی سے بالکل مختلف لگی جسے میں جانتی تھی۔ جسے اپنی ماں کے ساتھ شاپنگ سنٹر پر انگلیاں پکڑے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے دیکھا تھا۔ وہ شوخ چنچل بچی جس کے سر میں خوبصورت رنگوں کے ربن بندھے ہوتے تھے۔ جسے میں نے کھلونوں کی دکان پر ضد کرتے، مچلتے دیکھا تھا۔ اتنے برس ایک ہی علاقے میں رہنے سے آہستہ آہستہ وہاں آنے والی اَن گنت تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ پرانے گھروں کی جگہ نئی عمارتوں نے لے لی تھی اور چھوٹی چھوٹی دکانیں ختم کر کے بڑے بڑے ہائپر مارکیٹ کھل گئے تھے۔ ننھے منے بچے دیکھتے دیکھتے جوان ہو گئے تھے۔ نرسری اور انفنٹ اسکولوں کو جانے والے مانوس چہرے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ تتلا، تتلا کر، توتلی چھوٹی باتیں کرنے والے اب دنیائی سیاست اور معیشت پر بحثیں کرتے سامنے سے گزر جاتے تھے۔

اور اس وقت وہ میلی کچیلی لڑکی جو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی مجھ سمیت ساری عدالت کو حقارت اور نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس خوبصورت، ذہین لڑکی سے بالکل الگ تھی جو برسوں پہلے، لائبریری کی سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے مل جاتی تھی۔ ہمیشہ اس کے ہاتھوں میں اچھی اچھی کتابیں ہوتی تھیں اور وہ میرا راستہ روک کر اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کی باتیں کرتی تھی

"آپ نے سنڈریلا پڑھی ہے — میں ویسی لگتی ہوں نا—؟" اس نے کتاب کھول کر میرے سامنے رکھی۔

"اسنو وہائٹ ٹھیک رہے گا—" میں نے نرمی سے اس کے گالوں کو تھپتھپایا۔

ان دنوں اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ جب وہ لائبریری کے سامنے کے والے بنچ پر "ایلیس ان ونڈر لینڈ" پڑھتی نظر آئی۔ "میں نے سوچ لیا ہے — میں ایلیس بننا چاہتی ہوں — تاکہ ونڈر لینڈ گھوم آؤں — بڑا مزا آئے گا" اس کی آنکھوں میں شوق کی چمک تھی۔ جب تک کہانیوں پر ہماری باتیں ہوتی رہیں اسے ایلیس بننے ہی پر اصرار تھا۔

میں نے اسے بچپن کے معصوم دور سے جوانی میں داخل ہوتے دیکھا۔ بچپن کا کھلنڈرا پن جانے سے پہلے اس کے گالوں پر دلکش رنگ بکھر گیا۔ وہ خوب لمبی ہوگئی تھی اور پہلے جیسی ٹپ ٹپ نہیں رہی تھی بلکہ اسکول کا بڑا سا بیگ اٹھائے بہت سنجیدہ اور پڑھاکو دکھائی دیتی تھی۔ اکثر اپنے اسکول کے دوستوں کے ساتھ مزے میں بل برادوے پر چلتی پھرتی نظر آتی۔ کبھی محویت سے سوچ میں گم اور کبھی باتیں کرتے پاس سے گزرتی تو اس کی کھنکھناتی ہنسی سنائی دیتی۔ جب بھی ہم دونوں کی نگاہیں ملتیں، وہ وسش کرنا نہ بھولتی۔ اس کے ہونٹوں پر اجلا تبسم جگمگاتا اور وہ آگے بڑھ جاتی۔

پھر بہت سے سال گذر گئے — اور اس میں ایک عجیب سی تبدیلی آنے لگی۔ اس کے سنہرے بال پہلے کی طرح سلیقے سے سنورے نہ ہوتے بلکہ الجھے الجھے اور کنگھی سے بے نیاز ہوتے گئے۔ کپڑے بھی اکثر میلے ہوتے۔ گالوں کی شادابیاں جانے کہاں گم ہوتی جا رہی تھیں۔ مقناطیسی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور ان سے عجیب سی سرشاری چھلکتی — ایک بار برٹش ہوم کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے باہر نکلتے ہوئے بدبو کا ایک ناگوار جھونکا آیا — میں نے ناک بند کرنے کو رومال ڈھونڈا اور دل میں درد کی ایک لہر دوڑی — وہ چرس کا نشہ کرنے لگی تھی۔

کوئی دو سال پہلے جب وڈ گرین کے شاپنگ سنٹر میں بے روزگار نوجوانوں نے دکانیں لوٹیں اور پولیس سے تصادم ہوا تو ٹی وی کی ایک نیوز ریل میں اس کی جھلک دکھائی دی۔ پیوند لگی جینز اور پھٹے پرانے سوئٹر میں وہ کچھ زیادہ ہی کثیف نظر آئی۔ "چرس کی لت نے کیا کر دیا ہے—" میں افسوس سے سوچ رہی تھی۔

پچھلے سال سے امن کی متلاشی گرینہم کامن کی خواتین کا بہت چرچا ہے۔ وہ کروز میزائل کے خلاف مسلسل احتجاج میں مصروف ہیں۔ ایک بار ان کے مجمع میں وہ زور زور سے نعرے لگاتی

دکھای دی۔ پولیس والے اسے دھکیل کر خاردار تاروں کی باڑ سے پیچھے ہٹا رہے تھے اور وہ پوری توانای سے چیخ رہی تھی۔

" ہم انسان کی تباہی نہیں ہونے دیں گے۔ ہماری ہنستی کھیلتی بستیاں اُجاڑنے کا تمہیں کیا حق ہے۔! " میں نے چونک کر دیکھا۔ آواز بھرپور تھی اور اس سے جینے کا شعور جھلک رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔" شاید اس کی ہتھیلیاں زخمی ہوگئی ہوں گی" میں ہمدردی سے سوچ رہی تھی۔ ٹی وی کی خبریں جاری تھیں اور میری آنکھوں کے سامنے سے بیتے لمحوں کی ریل تیزی سے گزر رہی تھی۔

جب وہ بہت چھوٹی تھی ایک سہ پہر الیگزنڈرا پیلس میں بچوں کے پارک میں کھڑی رو رہی تھی۔ میرا بیٹا اس وقت جھولا جھول رہا تھا۔ میں دوڑتی ہوی اس کے پاس گئی۔

" کیا ہوا۔ ؟ " میں نے پوچھا۔

" CLIMBING FRAME سے نیچے گر گئی ہوں " وہ روتے روتے بولی۔

" فریم تو بہت اونچا ہے۔ تم اس پر چڑھیں کیوں۔ ؟ " میں نے اس کے آنسو پونچھے۔

" اچھا لگتا ہے۔ اس لئے " وہ بسور رہی تھی۔ میں نے اس کو چاکلیٹ دی۔

" اب تو خیال رکھوگی۔ "

" ضرور " وہ ہنس کے بولی۔ چاکلیٹ پانے کی خوشی میں اپنی چوٹ بھی بھول گئی اور پھر فریم کی طرف دوڑ گئی۔

" ادھر مت جاؤ " اس کی ماں کی آواز سنای دی جو کتے کو ٹہلا کر واپس آرہی تھی۔

" سلی گرل " ماں نے زور سے ڈانٹا مگر وہ ان سنی کر کے تیزی سے فریم پر چڑھتی جا رہی تھی۔ نیوز ریل میں اسے کانٹوں بھرے تار کھینچتے دیکھ کے مجھے برسوں پہلے کا الیگزنڈرا پارک یاد آرہا تھا۔ شمالی لندن والوں کا پسندیدہ پارک اور بچوں کا چہیتا "ایلی پیلی"۔ شہزادی الیگزنڈرا کا بلند و بالا پیلس جو اونچے اونچے ٹیلوں پر آن بان سے کھڑا ہے۔ جس نے صدیوں کے بے کراں لمحات کی پرچھائیاں آتے جاتے دیکھی ہیں۔ ایک الم ناک دوپہر الیگزنڈرا پیلس دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ برقی تاروں میں آگ لگ گئی تھی۔ بھڑکتے شعلے دور سے دکھای دے رہے تھے۔ بھاگتے فائر بریگیڈ کے انجن، پولیس کی کاریں، سائرن بجاتی ایمبولینس اور سر پہ منڈلاتا ہیلی کاپٹر۔

لوگ شاپنگ سنٹر سے نکل کر پیلس کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ وہ ڈیوکس ایونیو

آخری سیڑھی پر کھڑی زار و قطار رو رہی تھی ـــ

"میرا پیلس جل رہا ہے" وہ بلک رہی تھی۔

"نشے میں چور ہے نا ـــ اپنے کو شہزادی الیگزنڈرا سمجھ رہی ہے" کسی راہگیر نے چلتے چلتے چوٹ کی ـ

"میں نے الیگزنڈرا پیلس ہی میں تو پہلی بار سیڑھیوں پر چڑھنا سیکھا تھا ـــ یہاں سے ساری دنیا وَنڈر لینڈ لگتی ہے" وہ سسکیاں لے رہی تھی ـ اس کی بات میں گہرا اپنا پن تھا۔

"کیا اپنائیت کا بھی کوئی نشہ ہوتا ہے ـــ ؟" میں نے خود سے پوچھا۔

چند مہینے پہلے ہی کی تو بات ہے ـ فنچلے سنٹرل میں جیسے ہی کار پارک کر کے آگے بڑھی تو وہ جاب سنٹر سے نکل رہی تھی ـــ ہماری نگاہیں ملیں تو وہی شناسا مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی ـ جس سے شادمانی کا احساس ہوتا تھا "SAVE AS USVAL,"

"NO LUCK." وہ بولی ـ اس روز کپڑے قدرے صاف تھے اور بال بھی ایسے بکھرے نہ تھے ـ اس کی مسکراہٹ میں وہی مانوس معصومیت رچی بسی تھی جس سے میں آشنا تھی ـ ایسی دلکش تبسم کو تو میں نے بچپن کے بھولے بھالے لمحوں سے جوانی کی دل آویزی میں ڈھلتے دیکھا تھا۔

لیکن اب ملزموں کے کٹہرے میں کھڑی یہ لڑکی میرے لئے بالکل اجنبی تھی ـ اس کے ماضی اور حال سے میرا کوئی رشتہ نہیں ـ" بھلا مجرموں سے بھی کوئی ناطے جوڑتا ہے" میں نے اپنے جاگتے ضمیر کو تسلی دی جو بے اعتنائی پر مسلسل کچوکے دے رہا تھا ـــ

"تم اسے جانتی ہو ـــ"

"نہیں" میں نے اپنے دل کی آواز سننے سے انکار کر دیا ـــ

جرح ہوئی اور جرم ثابت ہو گیا ـ جیوری کا متفقہ فیصلہ اسے سنا دیا گیا ـ اسے ایک ماہ کی قید کی سزا ہو گئی ـ فیصلہ سننے کے بعد اس نے چیخ چیخ کر ساری عدالت کو سر پر اٹھا لیا ـــ

وہ جج، جیوری اور حکومت سب کو فحش گالیاں دے رہی تھی ـ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور وہیں سے سیدھا عورتوں کی جیل میں لے جایا گیا ـ بندھے مجبور ہاتھ دیکھ کے سارے جسم میں تھرتھری ہو رہی تھی ـ عدالت برخواست ہو گئی ـ دوسرے مقدمے میں دیر تھی یہ معذرت کر کے بوجھل دل لئے گھر لوٹی ـ بہت دنوں تک یہی کیفیت رہی ـ کبھی بھی

چنچل پن کو دیکھتی تو اس کا بچپن مجسم سوال بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا۔

"مجھے پہچانتی ہو —" اس سراپے سے بیگانہ ہونا آسان نہیں تھا۔

کل سہ پہر کسی نے گھنٹی بجائی۔ "کار دُھلوانی ہے؟" اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ معصوم چہرے پر زردی اور اُداسی تھی۔ ساری بشاشت چھن چکی تھی۔

"ماسٹر نے آئی ہے مجھے۔ جیودی کی نگ میں بس بھی تو شامل تھی" مارے ڈر کے میرا حال تھا مگر اس کی اُچاٹ آنکھوں میں پہچان کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔

"کہیں بھی کچھ نہیں ہے — کیا ہی اچھا ہو — میں امریکہ چلی جاؤں اور کرائے پر اولادوں کے پیدا کر کے خوب پیسے بناؤں۔ ہر سال۔ کالے، گورے، پیلے —" اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر گندا سا اشارہ کیا۔

"کار آج ہی دُھلی ہے —" میں . . جھوٹ بولا مگر وہ دروازے میں جمی کھڑی رہی۔ ڈر لگا کہ کہیں اندر نہ آ جائے۔ اسے دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ کچن کی کھڑکی سے جھانکا وہ کسی بھٹکتی روح کی طرح آہستہ آہستہ چلتی آگے بڑھ گئی۔

"کتنی نڈھال تھی اور اس نے تو میرے ہاتھوں کو جھٹکا بھی نہیں۔ اس سے کیا ڈرنا!" اپنی اس گھٹیا حرکت پر سخت ندامت ہوئی۔

"تم برسوں سے جانتی ہو، وہ ونڈرلینڈ کی ایلیس کے خواب دیکھتی تھی۔ وہ ایسی الگنت کے دریچے کھولنا چاہتی تھی جس پر رنگوں اور روشنیوں کے دیپ جل رہے ہوں — اور تم دونوں کے بیچ اردگرد پھیلی وقت کی کڑیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ گرد و پیش کا مانوس رشتہ کوئی میرے اندر پکار رہا تھا۔

"نہیں — وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔" دروازے کی حفاظتی زنجیر چڑھاتے ہوئے میں نے چپکے سے کہا۔ باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

"نہ جانے اس سردی میں کہاں جائے گی — ؟" بجلی کی طرح ایک خیال کوندا۔

"مجھے کیا —" گرم شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے میں نے بے پروائی سے سوچا اور پیلا ... کے سارے روشن دریچوں پر اجنبیت اور بیگانگی کے دبیز پردے چڑھا دے۔

غزلیں

...ب خوندمیری

...ہوا نیزہ پہ یہ سورج اُتر کر آئے گا
...سایہ بھی مرے قد کے برابر آئے گا
...کا پھیلا ہوا صحرا پڑے گا بعد میں
...نے پہلے سرابوں کا سمندر آئے گا
...پھر بننے لگیں موجیں کسی طوفان کا
...ول پھر دیکھئے اب کون بہہ کر آئے گا
...ہیں بستی میں سارے ہاتھ مصروفِ دعا
...نا ہے اب کہاں سے ہم پہ پتھر آئے گا

...لیں گے جسم کی ساری تھکن دیوار و در
...بھولا ہوا جب شام کو گھر آئے گا

علی الدین نوید

یوں سرِ شام در آئی تیری خوشبو مجھ میں
رات بھر بجتے رہے نقرئی گھنگھرو مجھ میں
صورتِ زخم مہکتا جو رہے تو مجھ میں
آ ہی جائے گی کسی روز تری خو مجھ میں
لوگ بیٹھے ہیں لگائے ہوئے آنکھیں کب سے
کوئی کمزور نکل آئے نہ پہلو مجھ میں
اے شبِ ہجر کی دوشیزہ! تری عمر دراز
چاندنی بن کے رواں ہے ترا جادو مجھ میں
آسمانوں کے سفر میں میں اکیلا تو نہیں
بھر پہ چھائیں کی جب تک رہے خوشبو مجھ میں
میں نہ ساون نہ برستا ہوا بادل' پھر بھی
جانے کیوں اڑتے ہیں سہمے ہوئے جگنو مجھ میں
مجھ کو باہر کی ہواؤں کا کوئی خوف نہیں
سر اٹھاتے ہیں کچھ آسیب گھریلو مجھ میں

میری ہر بات کو تولے ہے شب و روز نوید
ایسا بیٹھا ہے کوئی لے کے ترازو مجھ میں

محمد اقبال انجم

سگریٹ

میں ٹکٹکی باندھے اس شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ چلتی ہوئی بس میں ہر ایک اپنے کام میں مشغول تھا۔ کچھ لوگ اخبار کے مطالعہ میں محو تھے۔ بعض اونگھ رہے تھے اور اکثر آپس میں باتیں کر رہے تھے لیکن وہ شخص آنکھیں بند کئے سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔ نہ جانے سگریٹ پینے میں کیا لذت پنہاں تھی جس نے اُسے ہر چیز سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتا، دھوئیں کو کچھ دیر پھیپھڑوں اور نرخرے میں گھماتا اور پھر مرغولوں کی صورت میں ناک یا منہ کے راستے باہر نکال دیتا۔ اب پتہ نہیں یہ مرغولے کس کی زلفوں کا عکس خیال تھے یا اس کی ذہنی الجھنوں کے پیچ و خم، جن میں میں بھی الجھتا چلا گیا۔ سگریٹ مفت تقسیم کرنے میں انگریز کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو برصغیر کے لوگوں کو حقے کی تہذیبی وابستگی سے توڑنا اور دوسرے تمباکو پینے کو آسان بنانا۔ چنانچہ سگریٹ نے چوپال کی وہ رونقیں ویران کر دی ہیں جو حقّے کے دم سے قائم تھیں۔ حقہ معاشرتی زندگی میں محبت اور اتحاد کی علامت تھا۔ گاؤں کے چودھری سے لے کر مزارع تک حقّے کی گھومتی ہوئی نَے سے یکساں مستفید ہو سکتے تھے جب کہ سگریٹ نے کسی حد تک انسان کو الگ تھلگ کر دیا ہے۔ اب یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ خود غرضی نے سگریٹ ایجاد کیا ہے یا سگریٹ نے خود غرضی کو جنم دیا ہے کہ ہر شخص اپنی ڈبیہ جیب میں اٹھائے پھرتا ہے۔ حقّہ تقریبِ ملاقات کا بہانہ تھا اور سگریٹ خود مشغولی کی کوشش۔ حُقّے کی نَے اور آگ کے درمیان پانی ہوتا تھا جو آگ کی تپش کو براہِ راست حلق تک پہنچنے سے روکتا۔ جب کہ سگریٹ کی آگ بلا واسطہ حلق کے راستے پورے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان آگ کا الاؤ بنا ہوا ہے، جس میں انسانی رشتے بھسم ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے تو سگریٹ پیتا ہوا آدمی

اپنا ٹمٹما میٹ نظر آتا ہے جس کے فیتے کو آگ لگ چکی ہو۔

بعض کیفیات سگریٹ پینے کا سبب بنتی ہیں اور بعض سگریٹ پینے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً جسمانی تھکاوٹ، ذہنی افسردگی اور شکستِ خاطر کی تسکین کے لئے بعض لوگ سگریٹ کا سہارا لیتے ہیں اور شاعر، مصوّر یا تخلیق کار اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرنے کے لئے سگریٹ پیتے ہیں گویا سگریٹ کبھی اظہار کی راہیں کھولتا ہے اور کبھی خود ذریعہ اظہار بن جاتا ہے۔ ہر کش کے ساتھ، سگریٹ راکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے جب راکھ زیادہ ہو جاتی ہے تو اپنے ہی بوجھ سے نیچے گر جاتی ہے یا سگریٹ پینے والا خود انگلی کی ٹھوکر سے اسے گرا دیتا ہے۔ سگریٹ بھی ایک زندہ جسم ہے جب اس کا دھواں روح کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے تو راکھ مُردہ جسم کی طرح زمین کا حصّہ بن جاتی ہے، ہاں جب کسی کی عزت بچانا مقصود ہو تو یہی راکھ بھی اپنا چلن بدل کر اس کے تقدس کی گواہ بن سکتی ہے۔ سگریٹ عناصرِ ثلاثہ سے تشکیل پاتا ہے۔ تمباکو، کاغذ اور فلٹر سے۔ چوتھا عنصر یعنی آگ اس میں ڈبیہ سے باہر شریک ہوتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے اس کے عناصرِ ثلاثہ کو جلانے کے لئے غم و فراق کی آگ دنیا میں قدم رکھتے ہی اسے یوں نصیب ہوتی ہے کہ یہ عناصرِ اربعہ کا مرکب بن کر رہ جاتا ہے۔

میں نے اس شخص کو سگریٹ پیتے دیکھ کر کہا کہ بھئی سگریٹ نہ پیا کرو، کہنے لگا کیوں؟ میں نے کہا سُنا ہے اس سے سرطان پیدا ہوتا ہے۔ کہنے لگا پھر؟ میں نے کہا اس سے آدمی مر سکتا ہے یہ سُن کر اس نے کچھ دیر سوچا اور کہنے لگا تم مجھے سرطان کے علاوہ ہر بیماری سے بچاؤ اور دائمی زندگی کی ضمانت دے سکتے ہو؟ اگر دے سکتے ہو تو میں آج ہی سگریٹ پینا چھوڑ دیتا ہوں۔ میں نے کہا اگر تمہاری بات ٹھیک ہوتی تو نہ جڑی بوٹیوں میں شفا رکھی جاتی اور نہ ہر جاندار میں ذوقِ حفظِ زندگی پیدا کیا جاتا۔ میں نے اس شخص کو آتش و خس کا کھیل کھیلتے چھوڑ کر بس میں نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تقریباً ہر شخص سگریٹ پینے میں محو تھا۔ حیرت ہے، سگریٹ پینا مشغلہ ہے، ضرورت ہے یا خواہش۔ اگر انسان سکون حاصل کرنے کے لئے سگریٹ پیتا ہے تو بے سکونی تو ہمیشہ خواہش کی ارزانی سے پیدا ہوتی ہے اور سگریٹ پینے سے دانش سو جاتی ہے، لیکن خواہش پھر بھی بیدار رہتی ہے۔ نتیجہ ایش ٹرے بھرتے رہتے ہیں اور بے قراری بڑھتی رہتی ہے۔ میری نظر ایک شخص سے پھسل کر پوری بس پر پڑی اور بس سے اُتر کر پورے معاشرے پر پڑی۔ گھر میں، دفتر، تفریح گاہ یا سفر میں، انسان کو جہاں بھی دیکھا، سگریٹ منہ میں دبائے دیکھا

تفریح گاہ جانے سے پہلے، دفتر جانے سے قبل اور سفر پر جاتے وقت وہ زادِ راہ کے طور پر سب سے پہلے سگریٹ کی ڈبیا ضرور جیب میں رکھے گا۔ جس معاشرے میں سگریٹ انسان کی عادت بن جائے اس قوم کی نامرادی پر کس کو شک ہو سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے جب گھر لوٹتا تو مجلسِ سماع و نشاط سے اپنی تھکن مٹاتا اور ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکا دھکیل کر باہر نہ نکالتیں وہ دیوان خانے میں قدم نہ رکھتے۔ شاہانِ وقت کے مزاجوں کا یہ اختلاف حکومتوں کے عروج و زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ کبھی یہ حال تھا کہ تمام دن کے تھکے ہارے لوگ رات کو چوپال میں جمع ہو کر حقہ پیتے یا آج بیداری کا ہر لمحہ سگریٹ کی زد میں ہوتا ہے یا جب تک موت زندگی کو جسم کے باہر نہیں نکال دیتی۔ جب ترک و اختیار پر بس نہ رہے تو افراد کیا قوم کا چہرہ پہچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

آفاق کی وسعتیں تو لا محدود ہیں اگر ان میں گم ہونے والا کافر ہے تو محض سگریٹ کے ایک ٹکڑے میں کھو جانے والے کو کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ محاورۃً "انگلی پکڑنا" اقتدا کے معنوں میں لیا جاتا ہے کہ پیدل چلتے وقت بڑے چھوٹے بچوں کو انگلی سے لگا کر ساتھ لئے چلتے ہیں۔ اسی طرح بظاہر سگریٹ انگلیوں میں ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ انسان کی مکمل شخصیت پر حاوی ہوتا ہے۔ بلکہ سگریٹ انسانی مزاج اور نفسیات معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پورا سگریٹ پی کر بقیہ جلتے ہوئے ٹکڑے کو پاؤں سے بجھانے والا آدمی میرے نزدیک مخلص اور محتاط ہوتا ہے جب کہ آدھا سگریٹ پی کر پھینکنے والا کسی سے بھی تمام عمر نباہ نہیں کر سکتا۔ میرے ایک دوست کو کھٹے آم بہت پسند تھے چنانچہ جہاں لوگ مہنگے آم اس لئے خریدتے کہ میٹھے ہوں گے وہاں اس کی یہ کوشش ہوتی کہ کم سے کم کھٹے آم ملیں۔ جس لڑکی یا لڑکے کو بعض لوگ ناپسند کر جاتے ہیں کچھ اور لوگ انھیں رشتہ بندھن میں باندھ کر ان پر پسندیدگی کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ پسندیدگی کے یہی مختلف معیار ہیں کہ دنیا کی کوئی چیز فالتو نظر نہیں آتی۔ سگریٹ پینے کے مختلف انداز اور مختلف قسموں کو اپناتے دیکھ کر میں اکثر یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اگر سگریٹ کو محض سلگا کر رکھ دیا جائے تو بھی راکھ بننا اس کا مقدر ہوتا ہے۔ ہاں کش اس کے و

تیز ہو سے ختم کر دیتے ہیں۔ دنیا کے حادثات و صدمات انسانی زندگی کے سلگتے ہوئے سگریٹ کو کش لگاتے ہیں۔ کبھی تیز کبھی آہستہ۔ انسان کی امنگیں سگریٹ کی طرح جلتی رہتی ہیں اور عمر دھوئیں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں نے سنہری اور خوبصورت ڈبیہ سے ایک سگریٹ نکالا اور اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کے غور سے دیکھتا رہا۔ سفید رنگ کا نرم و نازک سا جسم۔ انسانوں کی خواہشوں کا محور، غم کی خلوتوں کا ساتھی، خوشی کی جلوتوں کا دوست، اس کے باوجود نہ پتنگے کی طرح آگے بھاگتا ہے اور نہ کم ظرفوں کی طرح شور ڈالتا ہے۔ اتنا وفادار ساتھی ہے کہ چپ چاپ جل جاتا ہے۔ پھر بھی لوگ نہ اُسے شمع کا نام دیتے ہیں نہ پروانے کا۔ سگریٹ کے ایک سرے پر بھورے رنگ کا تیسا فلٹر ہوتا ہے، جیسے ترکی ٹوپی پہنے کوئی وضع دار نوجوان ہو۔ ڈبیا میں قطار اندر قطار کاغذ کا پیرہن پہنے کتنے ہی نوجوان قربان گاہ میں کھڑے نظر آتے۔ انھیں صرف جلنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ میں جب بھی کسی بے فکرے نوجوان کو دیکھتا ہوں، جس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ، اس کے شباب کی بھرپور علامت ہو تو مجھے اس پر رحم آنے لگتا ہے کہ یہ ایک ایسا سگریٹ ہے جس کی عمر کا ایک سرا سُلگ رہا ہے، اگر یہ ناز و نعم میں بھی پلتا رہے تو بھی ایک دن اس کے بالوں میں سفیدی اور چہرے پر جھرّیاں ضرور نمودار ہوں گی۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب فطرت کا بے رحم ہاتھ اس کی راکھ کو جھٹک دے گا کیونکہ اس کی ڈبیا میں بے شمار سگریٹ موجود ہیں اور وہ کسی چین سموکر (CHAIN SMOKER) کی طرح سگریٹ پہ سگریٹ سلگاتی چلی جا رہی ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ "اوراق" (لاہور) نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء)

بقلم خلیل

اُردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی و تہذیبی خبریں۔

یکم مئی : ساؤتھ انڈیا اُردو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام پروفیسر تقی علی مرزا کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد اور پروفیسر غلام عمر خاں نے بہ حیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت کی اور ادبی مسائل پر خطاب کیا۔ جناب یوسف اعظمی لکچرار انگریزی انوار العلوم ایوننگ کالج نے اُردو شاعری پر مقالہ سنایا۔

● "بزمِ شہرادب" کی شعری محفل بصدارت جناب امان ارشد منعقد ہوئی۔ داؤد نصیب، راز عابدی، یوسف نظر، سعید فیضانی، ضیار ساحری، سرور ہاشمی، نذیر نیرّ، جیلانی بیگ صادق، خلیل صحرائی، فرید متین اور شیام لال شرما نے کلام سنایا۔

● زندہ دلانِ حیدرآباد کی طرف سے جلسۂ تعزیت میں ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کی خدمات کو قرار دادِ تعزیت کے ذریعہ خراجِ عقیدت ادا کیا گیا اور خواجہ صاحب مرحوم کی علمی و ادبی خدمات اور اُردو دوستی پر مسرز ڈاکٹر یوسف کمال، محمد منظور احمد، سید مصطفٰے کمال، ایڈیٹر شگوفہ اور سکریٹری طالب خوندمیری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب نریندر لوتھر نے صدارت کی۔

● سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے طالب علم محمد یوسف الدین (یوسف ساجد) کو ان کے مقالہ "شفیق الرحمٰن ـ فن اور شخصیت" کی تکمیل پر "ایم فل" کی ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا۔ موصوف نے یہ مقالہ پروفیسر مغنی تبسم کی نگرانی میں تحریر کیا۔

۳ر مئی : ٹیلی ویژن سنٹر (دور درشن) حیدرآباد نے اُردو مشاعرہ کی ریکارڈنگ کی اس مشاعرہ میں مسرز شاذ تمکنت، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، راشد آذر، خواجہ شوق، نریندر لوتھر، صلاح الدین نیرّ، رحمٰن جامی، شیا مہر اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ محترمہ مہ جبیں رانی نے نظامت کی اور مسٹر امتیاز علی تاج پروڈیوسر دُور درشن کیندر نے شکریہ ادا کیا۔

۴ر مئی : علی کا ٹیج میں ممتاز صحافی جناب شریف اسلم کے خیر مقدم میں ادبی محفل منعقد ہوئی۔ نواب طاہر علی خاں نے صدارت کی۔ جناب اسلم نے "ہند۔ عرب ثقافتی تعلقات" پر مخاطب کیا۔ محفلِ شعر میں حسن فرخ، صلاح الدین نیرّ، اختر واجدی، سوز عابدی، امام الدین فدا، انور ہاشمی، عابد سلطان شاہین اور رؤف رحیم نے کلام سنایا۔ جناب فکر حیدرآبادی نے شکریہ ادا کیا۔

۵ر مئی : جناب مظفر علی خاں، صاحب حیدرآبادی کی نوویں تصنیف "زبانِ شمع" (مجموعۂ غزلیات) اور رباعیات

اُردو سے شائع ہوا۔

۶ار مئی : علمی و ادبی تنظیموں کی طرف سے جلسۂ تعزیت میں ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کی ادبی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونی ورسٹی نے صدارت کی۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی۔ مہمانِ خصوصی تھے مسرز محمود انصاری ایڈیٹر منصف۔ مہدی نظمی، کنول پرشاد کنول، محمد منظور احمد سید مصطفٰے کمال، شریف اسلم، عابد صدیقی، کے شیشا چاری اور جلیل اموت نے مخاطب کیا۔ عابد سلطان شاہین نے نظامت کی۔

۷ر مئی : جناب سید مصطفٰے کمال لکچرار اُردو انوار العلوم کالج (ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ) کو عثمانیہ یونی ورسٹی نے ان کے مقالے "حیدرآباد میں اُردو کی ترقی : تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے" کی تکمیل پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر کمال نے یہ مقالہ پروفیسر غلام عمر خاں سابق صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونی ورسٹی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ادارۂ سب رس ڈاکٹر مصطفٰے کمال کو مبارکباد پیش کرتا ہے

۸ر مئی : محترمہ میمونہ بیگم لکچرار پبلک اسکول بیگم پیٹھ کو عثمانیہ یونی ورسٹی نے ان کے مقالے " پروفیسر عبدالقادر سروری حیات اور کارنامے" کی تکمیل پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ ڈاکٹر میمونہ نے پروفیسر غلام عمر خاں اور ڈاکٹر یوسف سرمست کی نگرانی میں مقالہ کی تکمیل کی۔ ڈاکٹر صاحبہ سب رس کی دیرینہ قلمی معاون بھی ہیں۔ ان کی خدمت میں ادارہ مبارکباد پیش کرتا ہے۔

۱۰ر مئی : "ایوانِ اُردو" میں ادارۂ قلم اور آواز کی طرف سے شام قوالی کا اہتمام ہوا، مولانا سید شاہ تقی الدین قادری سجادہ نشین درگاہ حضرت زلم مہمانِ خصوصی تھے۔ علماء اور علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کی بڑی تعداد نے قوالی سنی۔ محترمہ طیبہ بیگم نے شکریہ ادا کیا۔

۱۱ر مئی : معروف فکشن رائٹر جناب بیگ احساس کا عثمانیہ یونی ورسٹی میں لکچرار شعبۂ اُردو کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔

۱۲ر مئی : ریاستی اُردو اکیڈیمی کی طرف سے ایک خوشگوار تقریب میں جسٹس سردار علی خاں نے "مخدوم ایوارڈ برائے صحافت" جناب سید وقار الدین قادری ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن کی خدمت میں پیش کیا۔ مخدوم ایوارڈ ۱۱ ہزار روپے اور توصیفی دستاویز پر مشتمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی صدر ریاستی سرکاری زبان کمیشن کے علاوہ مسرز اکرام جاوید، چندر سری واستو ڈائرکٹر و سکریٹری اکیڈیمی، اعجاز قریشی اور مسز جواسس لا ہوتی نے مخاطب کیا۔ جناب مرزا وحید احمد بیگ نے صدارت کی۔

● ادارۂ فکر و نظر کا افتتاحی اجلاس جسٹس ایم آر اے انصاری صدر ریاستی اقلیتی کمیشن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد اور مسز منوہر راج سکسینہ نے ادب اور شعر کے مسائل پر مخاطب کیا۔ محترمہ خورشید نظیر کی صدارت میں محفل شعر پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ جناب راغب فاروقی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ر مئی : سٹی سیول کورٹ حیدرآباد

نے ریاستی اردو اکیڈیمی کے ڈائرکٹر کے نام ایک عارضی حکم التوا جاری کرتے ہوئے اس امر کا پابند کیا ہے کہ نامور شاعر مخدوم محی الدین کے مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" کے تیسرے مرحمہ ایڈیشن کو تا حکم ثانی فروخت نہ کریں۔ مخدوم کے فرزند مسٹر نصرت محی الدین نے عدالت سے حکم التوا حاصل کرنے کے بعد بتایا کہ بساطِ رقص کے ابتدائی ایڈیشنوں میں مطبوعہ محترمہ زینت ساجدہ کے مضمون کو اکیڈیمی والوں نے شامل نہ کرکے معاہدہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی ہے۔

۱۵ر مئی : اتیج ای آئیج دی نظامس اردو ٹرسٹ کے اسٹیڈی سرکل "حلقۂ اربابِ ذوق" کے تعزیتی اجلاس میں جس کی صدارت محامد علی عباسی صدر ادارۂ ادبیاتِ اردو نے کی، مرحوم ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کی علمی و ادبی نیز سماجی و سرکاری خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی، جناب بھارت چند کھنہ، جناب نریندر لوتھر ڈاکٹر حسن الدین احمد، جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف، محترمہ سلطانہ شرف الدین، ڈاکٹر مصطفےٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ مسز سریواس لاہوٹی اور جناب بشیر الدین احمد نے مخاطب کیا۔ جناب محمد منظور احمد معتمد اعزازی حلقۂ اربابِ ذوق نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۷ر مئی : ڈائرکٹر اسکول آف ایجوکیشن آندھرا پردیش نے مسٹر یم اے منان لکچرار کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر کو "اسپشل آفیسر اردو" مقرر کیا ہے۔ یہ عہدہ مدارس میں اردو کی تعلیم، ترقی اور ترویج کے سلسلے میں قائم کیا گیا ہے۔

۲۷ر مئی : ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحانات اردو فاضل، اردو عالم (مسلمہ عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ اردو زبان دانی اور اردو دانی حیدرآباد میں سٹی کالج کے علاوہ اضلاع کے مراکز محبوب نگر، نظام آباد، نیلور، نندیال، وی کوٹہ، نلگنڈہ، مونگلی، سرپور کاغذ نگر، ربنار کاغذ نگر، کھمم، کریم نگر، بودھن، پربھنی، دہلی، آرمور، بھونگیر، نارائن کھیڑ اور ادھونی پر ۲۷ تا ۲۸ مئی کو بیک وقت منعقد ہوئے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، کارگزار معتمد اعزازی امتحانات نے تمام امور کی نگرانی کی۔

● ابو الکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام مولانا روم کی ۸۰۰ ویں سالگرہ کے سلسلے میں منعقدہ سیمینار کو وزیر تعلیم مسز شیلا کول نے مخاطب کرتے ہوئے مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا — اور باکمال صوفی مولانا رومی کو زبردست خراج ادا کیا۔ سیمینار کو مخاطب کرنے والوں میں آقائی مصطفیٰ قریشی کارگزار قونصل ایران مقیم حیدرآباد، جناب بیرسٹر میر اکبر علی خاں گورنر اڑیسہ، ڈاکٹر مرزا محمد علی بیگ، ڈاکٹر نجمہ صدیقہ، شریف النساء انصاری، ڈاکٹر ڈاکٹر ساجدہ ادیب، ڈاکٹر شفیعہ اور جناب خواجہ حمید احمد شامل تھے۔ جناب اصغر اشرف نے نظامت

The "SABRAS" Urdu Monthly

-500 001 (A.P.)

The "SABRAS" Urdu Monthly
...an of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

Pr... Charkaman, Hyd.

سب رس



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جلد ۴۴ شمارہ ۷
سن اجرا : ۱۹۳۸ء
فون : ۳۸۴۶۹

جولائی ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے
زر سالانہ : ۲۰ روپے
(کتب خانوں سے ۲۵ روپے)
بذریعہ رجسٹری : ۴۵ روپے
بیرونی ملکوں سے

ہوائی ڈاک سے :		بحری ڈاک سے :
مشرق وسطی	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۱۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان بنگلہ دیش	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۳½ پونڈ

رحمن راج سکینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ
پریس چارکمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۲ سے شائع کیا
کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ،
حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۴

سرورق : علی عادل شاہ ثانی شاہی

ترتیب

اپنی بات

حالات ناسازگار ہوں تو بعض لوگ پست ہو جاتے ہیں اور ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کام کرنے کی امنگ بھی دل میں باقی نہیں رہتی۔ حالانکہ ایسی صورتحال میں دراصل صبر و ثبات، تحمل و برداشت کی آزمائش ہوتی ہے، [illegible] ہے اور سماج میں بہرحال اپنا باعزت مقام برقرار رکھنے کا عزم رکھنے والے، ہمیشہ حالات کا ہمت اور خندہ پیشانی سے سامنا کرتے اور سعی و جہد سے بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اُردو بولنے والوں کے مختلف مسائل ہیں۔ انھیں حل کرنے کیلئے سنجیدگی، ہوش و حواس اور تدبر کی ضرورت ہے۔ ہماری زبان اُردو کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اب یہ بین الاقوامی اہمیت کی زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ دُنیا کے مختلف ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دُنیا کی کئی یونی ورسٹیوں میں اس کی باقاعدہ تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ بھی ہماری زبان اُردو کی تشہیر ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ برسہا برس سے فلم "اس کی نشر و اشاعت اور مقبولیت کے عام کرنے میں اہم حصہ لے رہے ہیں۔ انگلستان کے بعض شہر آج کل اُردو کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا اہم مرکز بن گئے ہیں۔ ہندوستان تو اُردو کا وطن اور اس کی جنم بھومی ہے۔ اس روشن زمانے میں چراغ تلے اندھیرا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارا فرض ہے کہ اُردو کی ابتدائی، وسطانی اور فوقانی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کریں۔ تعلیم بالغان کے شعبہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ملک میں رابطہ اور قومی یکجہتی کا موثر ذریعہ ہے اور آئندہ بھی ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ اُردو کے تعلق سے ہندوستان میں بہت کچھ کام ہوا ہے [illegible] لیکن اس کے باوجود ابھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے کیونکہ بہت سے کام باقی ہیں۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ خود اُردو بولنے والے بیدار ہوں اور سرگرمی کے ساتھ اپنا فرض [illegible] کریں۔ کیونکہ

[illegible]

ڈاکٹر محمد عبدالاحد

اقبال اور عالمی یک جہتی

انسان ایک متمدن ہستی ہے۔ وہ نہ صرف اپنوں سے بلکہ دنیا بھر کے لوگوں سے مختلف حیثیتوں سے رشتے میں منسلک ہے۔ یہ تعلقات جو کبھی معاشرتی اور خاندانی بنیاد پر ہوتے ہیں، کبھی سیاسی اور معیشتی قسم کے، کبھی قومی ہوتے ہیں اور کبھی بین الاقوامی اسی وقت استوار اور خوشگوار ہوتے ہیں جب کہ بین الانسانی ضابطۂ حیات انتہائی متوازن اور فلاح و بہبود کا علم بردار ہو۔ یعنی ہر فرد اور ہر گروہ اور ہر قوم کے حقوق انصاف پر مبنی ہوں اور تمام انسان خالص انسانی برادری کے قائل ہوں۔

ہمارے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں طرزِ حکومت جمہوری ہوتا ہے مگر نظریۂ حیات جمہوری نہیں۔ کون ہے جو پچھلی دو جنگوں کی تباہ کاریوں سے واقف نہیں۔ انسانی سرمایہ و صلاحیت کا غلط استعمال اور اس کا نتیجہ دنیا نے دیکھ لیا۔ ان مصیبتوں سے دنیا کو نجات دلانے کے لئے پہلے لیگ آف نیشنس، پھر اقوامِ متحدہ وجود میں آیا۔ توقع کی گئی تھی کہ یہ عالمی ادارے امنِ عالم کے ضامن ہوں گے۔

بین الاقوامی سطح پر ابھرنے والے اختلافات کا پُرامن تصفیہ کر کے بھائی چارے کی فضاء عام کریں گے لیکن اپنی بعض اساسی کمزوریوں کی بنا پر یہ دونوں ادارے کامیاب نہ ہوسکے۔ آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ قومیں قوموں سے، ایک طبقہ دوسرے طبقے سے، ایک نسل دوسری نسل سے محض رنگ و زبان، قوم و وطن، سرمایہ و محنت کی بنا پر برسرِ پیکار ہے۔ لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں اصول و نظریہ کا بحران عام ہے۔ ایک طرف خاندانی نظام کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے تو دوسری طرف معاشرتی عدم تعاون ہے تیسری طرف معاشی بحران اور لوٹ کھسوٹ ہے تو

چوتھی طرف سیاسی کشمکش کی تمام گھناؤنی صورتیں موجود ہیں۔ یہ باتیں کسی ایک کے لئے خاص نہیں اور اسی لئے کسی ایک قوم یا ملک کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔

دنیا کے مفکر اور مدبر کوشاں ہیں کہ عالم گیر اور ہمہ گیر انتشار اور خلفشار ختم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں مذہب اور کہیں انسانیت کے نام پر بھائی چارگی کی دعوت دی جاتی ہے تو کہیں معاشی مساوات کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ کوئی چاہتا ہے کہ ایسی عالم گیر تہذیب و قومیت وجود میں آئے جو انسانی مسائل کا حل قومی و وطنی نہیں بلکہ انسانی سطح پر کرے تاکہ باہمی تعلقات کی استواری انصاف و ایثار کی بنیاد پر ہو سکے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارا وطن دنیا اور ہماری قومیت انسانیت ہونی چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ خاک و خون کے رشتے سے بالاتر ہو کر یعنی نظریاتی سطح پر انسانوں کو ایک رشتے میں پرو کر جمہوریت کا بہترین تصور پیش کیا جا سکتا ہے یہ ایک طرز حکومت ہے جس میں انسانی عظمت و شرافت، یعنی ہمدردی اور بھائی چارگی کا لحاظ رکھ کر جمہور کے باصلاحیت نمایندے اکثریت سے حکومت چلاتے ہیں۔ بے شک علیکم الناس، علی الناس، للناس، (GOVT OF THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE, BY THE PEOPLE) والا تصور نہایت حسین لگتا ہے لیکن مادی نقطۂ نظر کے حامیوں نے اس کی صورت مسخ کر رکھی ہے حالانکہ اس کے لئے ذیل کی شرطیں لازمی تھیں۔

۱۔ پوری انسانیت کو اکائی تسلیم کرنا ۲۔ نظریۂ حیات کی وحدت۔ ۳۔ لائحۂ عمل کی پابندی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریت کا دامن ان خوبیوں سے خالی ہے۔ اس کے نزدیک وطن بس ایک نہایت محدود دائرہ ہے۔ تمام روئے زمین کو وطن کے دائرے میں لے آنا اس نے سیکھا ہی نہیں۔ اس کی مصلحت بینی اور عقل پسندی اجتماعی امور میں اس لئے دلچسپی لیتی ہے کہ عوام کے فائدے سے زیادہ اپنے مفاد کو محفوظ کر لینے کا بہترین طریقہ یہی ہے

اس کے برخلاف مذہب ایک تہذیبی قوت ہونے کی وجہ سے اتحاد خیال کی ایک ایسی مستحکم بنیاد ہو سکتا ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو۔ غالباً اسی لئے اس میں تمام قوموں کو ایک رشتۂ وحدت میں لے آنے کی اور عالمگیریت کی بڑی صلاحیت موجود ہے۔

سب سے پہلے بدھ مت پھر عیسائی مذہب نے قومیتوں کی حدود کو توڑ کر تمام عالمِ انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی روشنی میں عالم گیریت کی طرف قدم بڑھایا۔ مگر یہ دونوں اخلاقی اصولوں سے آگے بڑھ کر ایسے اجتماعی فلسفے کو وجود نہیں دے سکے جس کی مدد سے کسی تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بن سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عالمگیر قومیت کی بجائے ایک برادری تک بات سمٹ کر رہ گئی۔ پھر جب اسلام کی باری آئی تو اس نے ایک مثالی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد مارکسی اشتراکیت نے عالمگیر قومیت کا دعوا کیا مگر خود اس کے جارحانہ طرزِ عمل نے اس کے اپنے موقف کو کمزور کر دیا۔ سب سے آخر میں سائنٹفک تہذیب کی بدولت جدید قومیت وجود میں آئی لیکن یہ وطنی اور سیاسی قومیت کا مقدمہ تھی۔

جس قومیت کا اس وقت چرچا ہے مانا کہ اس کی ابتدا نہایت معصوم جذبے سے ہوئی (یعنی ایک قوم کے افراد اپنے مشترک مفادات اور مصالح کے لئے مل جل کر کام کریں) مگر جب ایک دفعہ جذبۂ قومیت میں شدت آجاتی ہے تو طبیعتیں قدرتی طور پر اپنے اور پرائے میں فرق کرنے لگ جاتی ہیں۔ اسی کو قومی عصبیت کہتے ہیں[1]۔ اس طرح کی کیفیتوں نے نہ صرف انسانوں کو بلکہ مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے محبت کے بجائے نفرت کا خوگر بنا دیا ہے۔

یورپ کی اصلاحی تحریک (REFORMATION MOVEMENT) کے جہاں بہت سارے فائدے ہوئے وہاں ایک خرابی یہ ہوئی کہ جو ممالک متحد تھے مذہبی بنیادِ اتحاد کو ختم کر کے الگ الگ ہو گئے۔ جب اپنے اپنے علاقوں میں ہمہ جہتی ترقی کی ابتدا ہوئی تو معاشی اور معاشرتی دونوں حیثیتیں کسی قدر مختلف ہو گئیں۔ پھر آپس میں مسابقتیں، مخالفتیں اور ان کی بنا پر پڑوسیوں سے جھڑپیں ہونے لگیں۔ ایک نے دوسرے کا حق چھیننے کی کوشش کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ

---

[1] مطلب یہ ہے قومی افتخار، قومی حمیت، قومی تحفظ اور قومی استیلا و استکبار جیسے جذبات کے تحت لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ خود غرضی کا بول بالا ہو جاتا ہے۔ مثلاً دوسروں کے مقابلے میں اپنے کو بلند و برتر سمجھنا، اپنوں کی مدد پر کمر باندھنا، چاہے وہ حق پہ ہوں یا ناحق پر۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرتے کرتے جارحیت پر اتر آنا،
اپنے ترقی یافتہ ہونے کے زعم میں اپنے کو اس کا مستحق سمجھنا کہ دوسروں
پر ہم حکومت کر سکتے ہیں۔

کہیں سے نعرہ بلند ہوا GERMANY OVER ALL اور کہیں سے ITALY IS RELIGION کسی نے دعوا کیا TO RULE IS BRITANIA تو کسی نے کہا AMERICA IS GOD'S OWN COUNTRY گویا ہر ایک ملک کے لئے جواز نکل آیا کہ علی الاعلان کہے MY COUNTRY RIGHT OR WRONG (میرا ملک لوٹیا رہے چاہے حق پہ ہو یا ناحق پہ) جو چیز انفرادی زندگی میں بے انصافی اور خود غرضی تھی' وہی اجتماعی صورت میں قومیت بن گئی تھی۔ دراصل نوآبادیات کے فروغ کے پیچھے کام کرنے والا یہی جذبہ تھا۔ دوسروں کو غلام بنانا یا ان کی نکیل پکڑ کر چلانا متمدن قوموں کا حق بن گیا۔ کپلنگ نے اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے "سفید آدمی کے بوجھ" کی اصطلاح گڑھی تھی۔

اگرچہ قومیت کا جذبہ ایک حد کے اندر مستحسن ہے یعنی ہر ملک کا مجموعی طور پر اپنے حدود میں بڑھنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ یہ آرزو قدرتی بھی ہے لیکن جیسا کہ کہا گیا جب یہ جذبہ شدید بن جاتا ہے تو اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ نتیجتاً دوسروں سے نفرت اور دشمنی کے جذبات ابھرے بغیر نہیں رہتے۔

یہ واقعہ ہے کہ آج انسانوں کی داخلی زندگی میں توازن نہیں ہے۔ اس کی اصلی وجہ آزاد خیالی ہے اور نتیجہ ہے مذہب بیزاری کا۔ سائنس کی امکانی قوتوں سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیئے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سائنس کی باگ ڈور عقل و شعور کے ہاتھ میں ہو۔ اسی طرح انسان کی معاشی آسودگی اور روحانی کیفیت میں ہم آہنگی رہے گی۔ نئے ذہن کے لوگ کہتے ہیں کہ اخلاق کا سرچشمہ صرف عقلیت (RATIONALITY) ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کے جوہر ذاتی کے نکھارنے اور اسے ذمہ دار بنانے میں مذہب کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اجتماعیت کے اعتبار سے بھی یہ ایک شاندار نظریہ ہے جس میں محدود قومیت کے برعکس کسی نسل اور سرزمین تو درکنار' کسی چیز سے بھی خاص نسبت ضروری نہیں رہ جاتی۔ ایک شخص اپنے وطن میں رہتے ہوئے نظریاتی طور پر ساری دنیا کا شہری (آفاقی) ہے۔ اسی لئے مذہب کو بجا طور پر نسلی کے بجائے عقلی اور اصولی (RATIONAL AND IDEAL) اور جامد کے بجائے نامی قومیت EXPANDING AND DYNAMIC NATIONALITY) کہا گیا ہے۔ یہی چیز دنیا کے مشہور ترین انسانوں کا مطمح نظر رہی۔ رسل نے یہ کہا تھا کہ اپنے ملک سے محبت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے لیکن صرف اپنے سے' کسی اور سے نہیں۔

ان حالات میں مشرق اور اردو کے ایک ایسے نمایندہ شاعر کا ذکر بے محل نہیں ہے جس
نے اپنی طرف سے ایک سوچے سمجھے نظریہ کو دنیا کے سامنے رکھا اور پوری بصیرت کے ساتھ انسانیت
فلاح کے لئے تجویزیں پیش کیں۔

علامہ اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ وطن، رنگ و نسل کے اختلافات قدرتی ہیں، ان سے مفر
ہیں، البتہ ذہنی، اخلاقی اور تہذیبی اختلافات جو عموماً اعتقادات اور اغراض کی بنا پر ابھرتے
ہیں اختیاری ہیں۔ ان پر مفاہمت اور مصالحت، درگزر اور ایثار کے ذریعے قابو پانا ممکن ہے
نھوں نے دنیا والوں سے سوال کیا کہ آخر وہ کون سا ذریعہ ہے کہ جس پر عمل کر کے سارے انسان
ملی اور جغرافی، لسانی و لونی، معاشی و معاشرتی اختلافات کے باوجود ایک قوم ہو سکتے ہیں یا یوں
ہیئے کہ وہ کون سی قومیت ہے جو کل انسانیت کو اپنے دائرے میں لینے کی قوت رکھتی ہے جو
س معیار پر پوری اُترے

وہ بڑی دیانت داری اور دردمندی سے ان لوگوں کے شبہ کا ازالہ کرتے ہیں جو
س دور میں انسانی یک جہتی کو خواب و خیال کی بات کہتے ہیں۔ وہ اپنے وثوق کی بنا پر کہتے
تھے کہ " اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کو ان کی موجودہ ہیئتوں کو بدل کر واحد اجتماعی نظام
نا قرار دیا جائے تو اسلامی نظام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا " ان کی یہ بات
ظاہر ہے جذباتی ہرگز نہ تھی بلکہ عقل اور تاریخی شواہد کی روشنی میں کہی گئی تھی۔ عریف اقبال کے
منے پر خود ان کی یہ عبارت نقل ہوئی ہے:

" میں نے اپنی زندگی کا عزیز ترین حصہ اسلامی ثقافت، قانون، تاریخ و تہذیب
کے مطالعے میں صرف کیا ہے "

اسی بنا پر انھوں نے کہا کہ اسلام کے سوا جتنی قومیں وجود میں آئیں ان میں اشتراکِ
رنگ و نسل، اشتراکِ زبان، وطنیت، معاشی اغراض کا اشتراک، نظام حکومت کا اشتراک جیسے
عاملوں نے بنیاد کا کام دیا ہے۔ مگر دنیا نے اس کا انجام بھی دیکھ لیا کہ انسانیت ایسے چھوٹے
چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی جو ختم تو ہو سکتے ہیں مگر ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ ایک نسل
دوسری نسل نہیں بن سکتی۔ ایک کا وطن دوسرے کا وطن نہیں ہو سکتا، ایک کی زبان دوسرے کی

زبان نہیں بن سکتی۔ ایک کا رنگ دوسرے کا رنگ نہیں بن سکتا' ایک قوم کے معاشی مفادات دوسری قوم کے مفادات نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان بنیادوں پر کھڑی ہونے والی قومیں ایک صحت مند انسانی اجتماعیت پیدا نہ کر سکیں۔

اقبال کے مطابق اسلام کا مطمح نظر ایک ایسا صحت مند سماج ہے جس میں سچا انصاف اور عملی مساوات ہے' فرقہ واریت کا شائبہ نہیں اور جو ایسے اصولوں اور سماجی قدروں کا قدردان ہے جو ہر دور کے لوگوں کے لئے مفید اور پسندیدہ ہیں۔ ان کے الفاظ میں قرآن صرف اخلاقی اصلاح کی دعوت نہیں دیتا بلکہ عالم بشریت کا (اجتماعی زندگی میں) ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو دین کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو بدل کر ایک وسیع تر بلند اور آئیڈیل سوسائٹی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس طرح اس کی "قومیت" تنزیہی تصور پر منحصر ہوگی جس کی تجسیمی شکل میں بے انتہا ترقی پانے کی گنجائش ہے۔ ان کی نظر میں تمام بنی نوع انسان اپنی اصل اور نسل کے اعتبار سے بھائی بھائی ہیں۔ یہ جو طرح طرح کے امتیازات و اختلافات نظر آتے ہیں وہ واقعی اور حقیقی نہیں ہیں بلکہ رفتہ رفتہ مخصوص جغرافیائی اسباب و تاثرات کے نتیجے میں پیدا ہو گئے ہیں۔

گروہوں' قبیلوں' نسلوں اور قوموں کے اس ظاہری اختلاف میں بھی قدرت نے کئی مصلحتیں رکھی ہیں جن پر ہماری نظر ہونی چاہیئے۔ مثلاً ایک مصلحت یہ ہے کہ ایک دوسرے کا تعارف اور پہچان ہو (سورۂ احزاب) دوسری مصلحت یہ ہے کہ زبانوں اور رنگتوں کا فرق بھی خالقِ کائنات کی نشانیوں میں سے ایک ہے جن سے لوگوں کو سبق ملتا ہے (سورۂ روم)۔ ان اختلافات سے ہمارے آپس کے ازلی انسانی رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اقبال اس نظریئے کو بنیادی اہمیت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کے اپنا لینے سے انسانیت کو قوموں اور قوموں کو فرقوں میں بانٹنے والے تمام اسباب کی جڑ کٹ جائے گی۔ سب کا مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر ایک صالح سماج میں انصاف و رواداری کے ساتھ رہنا ممکن ہو جائے گا۔

اس سے انکار نہیں کہ وطن' نسل' زبان اور ان جیسی دوسری چیزیں بھی لوگوں کو ایک رشتے میں باندھ سکتی ہیں لیکن ان کا اثر محدود اور فائدہ غیر یقینی ہے۔ مثال کے طور پر ایک زبان والوں کا اپنے خیالات اور افکار میں اختلاف ممکن ہے اس لئے کہ اظہارِ خیال کے ذریعہ (زبان) کا اشتراک' خیالات کے اشتراک کے لئے ہرگز لازم نہیں۔ اصل چیز وحدتِ خیال ہوا کرتا ہے

باتیں الگ الگ ہوں۔ رنگ کوئی سا ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس میں آدمی بے اختیار ہے۔ تبار اختیاری رنگ کا ہونا چاہیئے۔ یہ رنگ وحدتِ کلمہ کا رنگ ہے، خالق کائنات کا رنگ ہے۔ ر وہی بہترین رنگ ہے۔ اس یک رنگی جو یک جہتی اور ہم آہنگی آسے گی وہ یقیناً پائیدار اور بلند ترین ہوگی۔ اسی لئے اقبال زبان کے علاوہ اور دوسرے اجزائے قومیت کے بہت زیادہ ئل نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ تراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض بلکہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا رچشمہ ایک ہے اور جتاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں، وہ سب کے لئے ساں ہیں۔

اقبال کی مراد ہمیشہ اُس اسلام سے رہی ہے جو ایک ضابطۂ حیات ہے اور ایک مانے میں جیتا جاگتا نظام رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ جس طرح مٹی کی زمین ساری انسانیت کے لئے ایک وسیع دسترخوان ہے اور کل بنی نوع انسان ایک خاندان اور اس زمین کو جس کے وارث وامین انسان ہیں، (مالک نہیں) تصرف میں لانے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی ساری دنیا کے لئے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے۔

یہاں ایک بار اور واضح کرنا ضروری ہے کہ اقبال نے اپنے مذہب کی برتری عقیدتاً نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے دنیا کے بیشتر مذاہب کا اسلام کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرتے وقت تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہوکر ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر کسا ہے، پھر اسلام کی ساری تفصیلات کا بہ حیثیت ایک نظام کے اصولی جائزہ لیا اور قطعی نتیجہ نکالا ہے۔ ذیل میں ان چند خیالات کو من وعن پیش کیا جارہا ہے تاکہ شاعر کا نقطۂ نظر کھل کر سامنے آسکے۔

اقبال کہا کرتے تھے کہ فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں مذہب کا نہایت اہم مقام ہے جو انہیں حق وانصاف کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ بات اگر حکمرانوں میں موجود ہو تو اس کی حکومت وقیادت لوگوں کے لئے رحمت بن جائے اور جماعت کے اندر ہو تو معاشرہ امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے۔ یقینی ضروری اور لازمی ہے، خلوص اور بے غرضی ایمان ویقین کے بغیر ممکن نہیں۔ اقبال کا

یہ شعر کس نے نہیں سنا! ـــ

ولایت پادشاہی علم اشیا کی جہاں گیری یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

طبعی دنیا کی ہر چیز کی طرح انسان بھی بڑی حد تک اپنے بنانے والے کے قانون کے تابع ہے لیکن اگر یہ زندگی کے اختیاری پہلو میں سوچ سمجھ کر قدم نہ اٹھائے تو طبعی اور اخلاقی زندگی کی ہم آہنگی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ سماج میں اعتدال و توازن کے بجائے کشمکش اور بے انصافی جگہ پا جائے گی۔ آج انسان کی اسی من مانی روش کی بنا پر قومی، وطنی، نسلی اور لونی امتیازات کی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔ سماجی استحصال اور بین الاقوامی رقابت کا دور دورہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ دورِ جدید میں انسان نے بے انتہا ترقی کر لی ہے لیکن اسی نسبت سے اس کی اخلاقی اٹھان نہیں ہو پائی۔ اس میں عالی ظرفی نہیں آئی۔ اس نے کائنات کو تو مسخر کر لیا مگر اپنے نفس کے غیر معتدل رجحانات پر قابو پانے کی کوشش نہیں کی۔ ان غلط تربیت یافتہ جذبات سے مغلوب ہو کر اُلٹے خود غرضی، بدخواہی، کمینگی کی پستیوں میں جا گرا ہے۔

اس صورتِ حال کے ذمہ دار بڑی حد تک وہ نظریات ہیں جو دورِ جدید کی دین ہیں۔ بقول اقبال کے جب تک لوگ اپنے کو روحانی ضابطوں اور اخلاقی قدروں کے پابند نہیں کر لیتے اور ایک نصب العین آئیڈیل کی خاطر جینے کا عہد نہیں کر لیتے اس وقت تک سماج کو راحت و سکون اور اعتدال کی دولت نہیں مل سکتی۔

اقبال کی نگاہ میں اسلام کا یہ خصوصی امتیاز تھا کہ وہ دین کو شخصی دائرے میں محدود نہیں رکھتا بلکہ پوری سوسائٹی میں جاری و ساری دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ حقیقی سیاست کی اصل انسانی زندگی میں پیوستہ ہوتی ہے اس کے برخلاف جدید سیاست کی نامعقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ اخلاقی معیار کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ ہمارا آئے دن کا تجربہ بھی یہی ہے کہ اخلاقیات اور قومی مفاد کے ٹکراؤ کے موقع پر لازماً اخلاق کی شکست ہو کر رہتی ہے۔ اسی سیاست کے اثر سے لوگوں کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ دراصل روحانی زندگی کے بجائے سیاسی گروہ بندی اور دینی وحدت کے بجائے وطنی قومیت کو اختیار کر کے مغرب نے بہت بڑی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ آج پوری دنیا بھگت رہی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں وطن کا سیاسی تصور لازماً جارحیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ٹیگور نے بھی اپنی کتاب نیشنلزم میں اس برائی کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عالمگیر جنگوں کا بڑا سبب یہی قومیت اور

اس کی جارحانہ روش ہے۔

"بانگِ درا" کی نظم وطنیت کا دوسرا تشریحی عنوان "یعنی وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے" ہے جس سے ان کے خیال کی مزید توضیح ہو جاتی ہے۔ تصورِ وطنیت کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے پیدائشی مقام یا سرزمین سے محبت رکھے اور اس کے لئے اپنی بساط کے مطابق ہر قربانی کے لئے تیار رہے۔ لیکن جب سے میکیاولی نے تاریخ میں سیاست کا پیوند (اخلاقیات سے الگ کر کے) وطن سے لگایا ہے یہ سیاسی تصورِ وطن قوموں کے حق میں معاشی، تمدنی اور سیاسی آویزش کا سبب بن گیا ہے ؎

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "قومیت کوئی بری چیز نہیں، برائی اس تنگ نظری اور خود غرضی میں ہے جس کا زہر نئے زمانے کی قوموں میں سرایت کر گیا ہے۔ ہر قوم چاہتی ہے کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ حاصل کرے۔" (گاندھی جی کا ہندوستان ص۲۴)

پر سچ یہ ہے کہ اس قومیت کو پروان چڑھانے کے لئے ایک طرف خلاف اور دوسری طرف نفرت یا بیک وقت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں ایک انسان دوسرے سے محض اس لئے نفرت کرتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ صرف یہ بات کہ یہ کالا ہے یا ایشیا کا رہنے والا ہے اسے ایک گورے کی تحقیر کا مستحق ٹھیراتی ہے۔ مولانا ابوالحسن ندوی کی سوچ بھی وہی ہے کہ قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک قوم کے لئے نفرت کرنے یا ڈرانے کے لئے کوئی چیز نہ ہو۔ اس کی تائید میں موصوف نے اپنے ایک مقالے میں سی ای ایم جوڈ کی کتاب (GUIDE TO MODERN WICKEDNESS) سے یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

"وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں۔ جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لئے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لئے

کوئی ایسی چیز تلاش نہ کرلیں جس سے وہ نفرت کریں اور اس کے لئے کوئی ایسی شخصیت یا قوم پیدا کرلیں جس سے وہ ڈریں" (منقول از: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ ۹۲)

اقبال بھی مغربی قومیت کے تصور کو قوموں کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں سمجھتے تھے انھیں یقین تھا کہ اسی کے اثر سے جنگ عظیم کے موقع پر اسلامی ممالک میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی ہوئی تھی ظاہر ہے یہی بات قومیت اسلام کی جڑ کاٹ کر رکھ دینے کا باعث بن گئی۔

اقبال جس جمہوریت کے قائل تھے وہ مغربی جمہوریت سے کچھ الگ چیز تھی۔ ان نگاہ میں اس جمہوریت کی مشہور دین اکثریت و اقلیت کا فتنہ ہے جس سے گروہ بندی او فرقہ پرستی کو سہارا مل رہا ہے۔ یہاں اہل رائے کو رہنمائی کا موقع ملنے کے بجائے زیادہ گنـ والے بازی لے جاتے ہیں ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جب معیار قابلیت کے بجائے مقبولیت بن جائے تو یہ جاننا مشکل نہیں کہ اقتدار کس قماش کے لوگوں کے ہاتھ میں آئے گا۔ نیز چونکہ حالات کے بدلتے رہنے سے انسان ذہن و فکر میں بتدریج تبدیلی کا آنا قدرتی ہے اس لئے جمہور کی قانون سازی کا معیار بھی بدل جائے گا۔ لہذا دنیا آئے دن یہ نظارہ کر رہی ہے کہ ایک عوامی حکومت کا بنایا ہوا قانون بـ آنے والی حکومت قلم زد کر دیتی ہے بلکہ بعض دفعہ سابقہ قانون کے برعکس قانون بنا لیتی ہے اقبال کا ایمان تھا کہ صحیح نظریۂ جمہوریت "الملک للّٰہ الحکم للّٰہ" (ملک اللہ کا اور قانون اللہ کا)۔ اور اس قانون الٰہی کا نفاذ جمہوریت کے اہل ترین، ایماندار اور بے غرض نمائندوں کے ذریعہ وہ رہ نما محلوں اور درباروں کے شائق نہ ہوں بلکہ سادگی کے پیکر ہوں ؎

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

ان کی نظر میں حاکم عوام نہیں بلکہ خالق عوام ہے جس کا قانون ازل سے ابد تک ہے۔ بہرحال ایک نظام حکومت کے مفید خلائق ہونے کے لئے اسے خدا ترسی، راستی اور جمہور کے مفاد پر استوار ہونا ضروری تھا لیکن افسوس ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کما حقہ خوبیوں سے خالی ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ بعض صدیوں میں اس وطنی قومیت کی وجہ سے خوفناک آفت

اور یک جہتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ مذہب کا دائرہ اس کے مقابلے میں بہت وسیع ہے اور یہ کہ یہ عقیدہ اس محبت سے بھی بڑھ جائے گا جو مجھے ہندوستان سے ہے۔" (گاندھی کا ہندوستان صہ ۹۸)

اقبال کو یہ خوبی سب سے زیادہ اسلام میں نظر آئی۔ مضامین اقبال کا یہ اقتباس دیکھئے:

"یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔"

انھیں اسلام کی اس خصوصیت پر اعتماد کامل چند ارشاداتِ نبویؐ کی روشنی میں ملا تھا۔

ابو داؤد میں ہے کہ عصبیت کی دعوت دینے والا، عصبیت کی پاس داری میں لڑنے والا اور ایسی حالت میں مرنے والا مسلمان ہی نہیں۔ ابو مسلم اور نسائی میں اس کی مزید صراحت آئی ہے کہ جو شخص اندھا دھند جتھے بندی کی جوش حمایت میں یا عصبیت و امداد میں کسی جھنڈے تلے جنگ کرتا ہوا مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ کیا آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔ اس طرح انسانیت کو ہر اس چیز سے قیمتی اور اہم قرار دیا جو عصبیت کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ چاہے وہ قوم ہو یا زبان و تہذیب۔ یہاں ابو جہل و ابو لہب (بہ لحاظ قوم) اپنے نہ بن سکے۔ سلمان فارسیؓ[1]، بلال حبشیؓ[2]، صہیب رومیؓ[3]، وغیرہ اس دائرہ میں داخل ہو کر نظریۂ قومیت وطن کے تار و پود بکھیر گئے۔ نیز سالمؓ[4] زید بن حارثہؓ[5] جیسے لوگ تعلیم اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتے تھے اور یہ سارے مختلف النوع

---

۱ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ سلمان ہم اہل بیت ہی میں سے ہیں حالانکہ ان کا سلسلہ نسب بہرام گور سے ملتا تھا۔

۲ ان کے بارے میں حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ بلال ہمارے سردار ہیں۔

۳ حضرت عمرؓ نے انھیں اپنی جگہ امام مقرر کیا تھا۔

۴ یہ حضرت حذیفہؓ کے غلام تھے جن کے بارے میں حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے موقع پر فرمایا تھا کہ اگر سالم زندہ ہوتے تو میں انھیں خلیفہ مقرر کرتا۔

۵ یہ بھی ایک غلام تھے جن سے حضورؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح کر دیا تھا۔

عناصر مل کر ایک قوم بنے تھے۔

اقبال کی ایک معرکتہ الآرا نظم " ابلیس کی مجلس شوریٰ " کے چند اشعار سے اس بات کی وضاحت ہو جائے گی :-

ایک مشیر کا سوال :-

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر　　تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے بے خبر

دوسرے مشیر کا جواب :-

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے　　جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس　　جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے　　یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو　　ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے دیکھا کیا نہیں مغرب کا جمہوری نظام　　چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیسرے مشیر کو اس جواب میں کافی معقولیت نظر آئی لیکن امیر و غریب کی طبقاتی کش مکش اور ان کے درمیان نفرت و عداوت کا بیج بونے والے مارکسی نظریے کا سوال حل طلب نظر آیا۔ پوچھا کہ

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب　　ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب　　نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز　　مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد　　توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

دراصل جس طرح ملوکیت کے خلاف رد عمل جمہوریت تھی اسی طرح سرمایہ داری کے خلاف رد عمل اشتراکیت تھی۔ مگر ایک خاص بات یہ تھی کہ دونوں کے پاس دنیا تھی، دین نہ تھا۔ مادیت دونوں کا مشترکہ مذہب تھا۔ اقبال کے الفاظ میں ملوکیت میں زندگی خراج تھی تو اشتراکیت میں خروج اور انسان چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان زجاج۔ اسی لئے ان کی نظر فطری طور پر اعتدال والے اسلام پر تھی۔ جس میں تہذیب و تمدن کے ایسے اصول ہیں جو طبقات کے مصنوعی فرق اور قوموں کے افتراق کو ختم کر کے خالص عقلی اور انسانی بنیادوں پر حسن معاملت اور ہمدردی قائم کرتی ہے۔ چنانچہ ابلیس کو خطرہ محسوس ہوا تو اسی امت مسلمہ سے جس کے خاکستر میں زندگی کے شرارے اور عزم و ہمت کے انگارے چھپے ہوئے ہیں۔ اس

کے نزدیک اسلام ہی کل کا فتنہ اور مستقبل کا اندیشہ ہے۔ اشتراکیت ہرگز نہیں۔ آگے چل کر وہ شرعِ اسلامی کی ہمہ گیری اور کارسازی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے ۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر حافظِ ناموسِ زن مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ مسلم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

پھر اس اندیشے کا اظہار کیا کہ چونکہ اس کا وطن زمینی حدود سے بے نیاز اور آفاق بے کراں ہے اس لئے یہ محض قوم کی نہیں ساری دنیا کی بیداری ہوگی ۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اقبال آفاقیت (UNIVERSALISM) کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس سے متصادم ہونے والے ہر نظریے کو ناپسند کرتے تھے۔ بالفرض اگر خود ان کے اپنے مذہب کی تعبیر میں یہ خرابی مضمر ہوتی تو اس کی مخالفت سے باز نہ آتے۔ مگر ان کو اس بات پر ناز تھا کہ یہی ایک مذہب ہے جس کا آفاقی نظریہ انسان اور انسان کے درمیان ترجیح کی ساری مادی بنیادوں سے قطع نظر پوری انسانیت کی ترقی و فلاح کا ضامن ہے۔ قرآن نے اس نظریے کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

"ہم نے تمہیں ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل میں اس لئے بنایا کہ تم آپس میں پہچانے جاؤ مگر درحقیقت تم میں معزز و مکرم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔" (سورۂ حجرات)

اس سلسلے کی بے شمار مثالوں میں سے صرف چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں ورنہ طوالت اکتاہٹ کا باعث نہ بن جائے ۔

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
مذہبِ عشق خدا است نہ دمشق نہ غزنی گوہرِ ما اندلسی نہ صفاہان نہ سمرقند

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی　　　کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

قصہ مختصر اقبالؔ زمان و مکان، قوم و وطن، رنگ و نسل جیسے فانی اعتبارات سے بالاتر وحدتِ قومی کے لئے پیغمبرانہ نصیحت کر گئے ہے

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو　　　اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی　　　تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے　　　تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس کے برخلاف اہلِ مغرب نسل پرستی میں الجھے رہے اگرچہ وہ اپنے کو عیسائیت کا پیرو کہتے رہے اقبالؔ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ لوگ بالفرض دائرۂ اسلام میں آ بھی جائیں تو ان سے یہ تمدنی اثر نہیں ہو سکتا ہے

ضمیر اس مدنیت کا ہے دین سے خالی　　　فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام

بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں!　　　قبول دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام

اگر قبول کرے دینِ مصطفےٰ انگریز　　　سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

اقبالؔ کو کسی خاص قوم سے اس طرح وابستہ دیکھ کر ان کی آفاقیت اور عالم گیریت پر اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ ادبیات سے ثابت ہے کہ شاعر کا موضوع یا چند حقائق کے مذہبی ہونے کے باوجود فنی بنیاد پر ذہنی اور وجدانی تعلق کے قائم کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ جیسے دانتے اور ملٹن کی شاعری سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ہی متاثر ہوتے رہتے ہیں سچ یہ ہے کہ کلامِ اقبالؔ کے اسلامی عناصر کے بین السطور ایک خزانہ مستور ہے۔ یہ اپنی روح کے لحاظ سے آفاقی ہے۔ جو ہر مذہب و ملت والوں کو بلند نظری دیتا ہے۔ بلکہ الفاظ و تراکیب کے پردہ اٹھا کر دیکھا جائے تو پتہ چلے بغیر نہ رہے گا کہ ان کے نزدیک اسلام اور انسانیت کی یکساں تعین اور ان میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

مردِ مومن کو تو وہ مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں ورنہ ان کے کلام میں ساری انسانی قوموں کی بیداری کا پیغام ہے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کی برادری اور آزادی کے زبردست حامی تھے۔ ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں "دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسان

میں داخل ہوسکتے ہیں۔ بشرطے کہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کردیں اور ایک مرد کی شخصیت تسلیم کرلیں۔[1]

یہ ٹھیک ہے کہ اقبال کی لَے حجازی ہے لیکن دنیا کا ہر عظیم شاعر چاہے ہومر یا ملٹن، دانتے ہو یا تلسی و اس اپنی زبان اور لہجے کو کسی نہ کسی قوم کے مذہبی اندازِ سخن سے وابستہ کرکے ہی بڑا بن سکا ہے۔

اقبال اس قاعدے سے کیوں کر مستثنیٰ رہ جاتے!

وہ اپنے ایک لکچر میں کہتے ہیں کہ:

"شاعری اور فلسفے میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کی تحصیل عملی زندگی میں کی جائے تو لا محالہ اس کا آغاز کسی مخصوص جماعت سے کرنا ہوگا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو اور جس کے حدود میں تبلیغِ عملی و لسانی سے وسعت پیدا ہوسکتی ہو۔ یہ جماعت میرے عقیدے میں اسلام ہے۔"

اختر حسین رائے پوری اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کے نام پر ایک تصور آفاق پیش کرنے والے اقبال کے نزدیک مسائلِ زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملاً اپنالے[2] اور شاعر کے مذہب میں انسانیت کی بقا کا راز صرف اور صرف احترامِ انسان میں پوشیدہ ہے[3]

چناں چہ وہ اپنے لئے ایک پابندی خود ہی تجویز کرلیتا ہے ع

سر میں جز ہمدردیٔ انساں کوئی سودا نہ ہو

۱: اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۴۶۹

۲: ادب اور انقلاب ص [illegible]

۳: اقبال — نئی تشکیل، مرتبہ عزیز احمد ص ۵۰۸

محسن شمسی

میچ

کھیل ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

گرمی تھی نہ سردی۔ سورج تھا، پر آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھی۔ دن بڑا ہی مناسب تھا۔ لوگ صبح ہی سے میدان میں آنے لگے تھے اطراف کی بستیوں سے۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ اس موقعے پر وہ موجود نہ ہو۔

بینڈ خاموش ہوا تو کھیل کمیٹی کے صدر صاحب کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اپنی تقریر میں وہ بولے: "آپ سب کو معلوم ہے۔ آج اس دن کی برسی ہے جب ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کا لائحۂ عمل طے کیا تھا اور یہ کھیل ان قدروں کی نشانی ہے جن پر ہماری مشترکہ زندگی کی عمارت بلند ہے۔ یہ کھیل اور یہ قدریں ہمیں عزیز ہیں کیونکہ انھیں کے بل بوتے پر ہم نے مقابلہ کیا تھا اس آندھی کا جو دشمنی پھیلانے والے بادلوں کی طرح کبھی ہمارے اس خطۂ زمین پر گھر آئی تھی۔"

مجمع کی تالیوں سے میدان گونج اٹھا۔ میچ کا باضابطہ افتتاح ہو گیا۔

دستور تھا کہ ٹیم کے کپتان کا چناؤ میچ سے پہلے ہو۔

وہ نہ تو سب سے اچھا کھلاڑی تھا نہ ہی بہت تجربہ کار۔ پر ان لوگوں کی خود یقینی سے بھرپور جن کے دل اپنے عقیدے اور مقصد کے بارے میں تشکیک سے کبھی دوچار ہی نہیں ہوتے۔ کپتانی حاصل کرنا اس کی خود برحق ذہنیت کا ایک اور اظہار تھا ـــ بہترین کھلاڑی سے بولا۔ "تمہاری فطری صلاحیت تو اس لائق ہے کہ شہرت اور دولت تمہارے قدم چومیں۔ بے فکر ہو کر تم اپنے کھیل کے جوہر دکھاؤ۔ تاکہ کھیل کے سارے نقد انعامات تمہیں ملیں۔ کپتانی کے چکر میں پڑ کر تمہارا دھیان کہیں کھیل سے نہ بٹ جائے۔"

پھر دوسرے اُمیدوار سے کہا۔ "بہترین کھلاڑی کے مقابلے میں تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مجھ دا...

میری مانو تو کہہ سن کر تمہیں کوئی دوسرا عہدہ دلا دوں۔ شاید ——— نائب کپتانی ..———
اور تم وعدہ کرو کہ بہترین کھلاڑی کے امیدوار کی مخالفت میں مقابلہ نہ کرو گے۔"

منتخب ہو گیا تو کھلاڑیوں سے بولا۔ " اس کھیل میں برتری ٹیم کی فلاح کے اصول کو حاصل ہے
شخصیت پرستی کسی بھی صورت میں ہو اس اصول کے منافی ہے۔ میری کپتانی میں اچھے اور عام سب
کھلاڑی برابر ہیں۔ میری ماتحتی میں ان سب کو اپنے جوہر دکھانے کے پورے مواقع بہم پہنچائے جائیں گے
اہم یہ ہے کہ یہ میچ ہماری بستی والوں کے لئے جن کی ہم ٹیم ہیں، خوشی اور فخر کا ایک موقعہ بن جائے۔ اب
میں چاہتا ہوں کہ ہر کھلاڑی مجھ سے وعدہ کرے کہ اپنی ساری قوت و اہلیت میری ہر اس کوشش
اور ترکیب کو پورا کرنے میں صرف کرے گا جو اس کھیل کو لاجواب بنانے کے لئے کی جائے گی۔"

پہلے چند اوور ختم ہوئے۔ بڑبڑایا۔ " میرا قیاس درست ہی تھا ٹاس (　　　) ہارنا
اچھا نہ ہوا۔" پچ (　　　) لکڑی کی طرح سخت۔ گیند ٹپہ کھا کر سیدھی بلے پر آتی کہ کھلاڑی
جہاں جی چاہے مارے۔ بولا۔ " اس میدان کی تو مٹی ہی خراب ہے۔ کوشش کیا کرے باؤلر،
کچھ انعام نہیں ملتا۔ اسی لئے اس پچ پر کوئی اب تک میچ نہیں جیتا۔" دوپہر کے کھانے تک اسکور
سو سے اوپر پہنچ گیا اور ایک کھلاڑی بھی آؤٹ نہ ہوا۔ بولنگ اور فیلڈنگ جارحانہ سے اب
مجبوراً مدافعانہ ہو گئی۔

کھانے پر ٹیم کے ساتھ بیٹھے بستی کے ایک دانشور بولے۔" اہم ہار جیت نہیں۔ یہ تو کوشش
کے نتیجے کے دو رخ ہیں، اہمیت تو حصہ لینے کی ہے کہ فرد پورے خلوص سے خوب تہ تک پہنچنے
کی کوشش میں لگ جائے۔"

فیلڈنگ کو واپس جاتے ہوئے وہ نائب کپتان سے کہنے لگا۔ " کہتے ہیں کہ حصہ لینے پر ہی
مطمئن ہو جاؤ۔ پر ہارے ہوئے کی بھی کوئی حیثیت۔ میرے لئے تو جیتنا اہم ہے۔"

" ہر کھیل کے قوانین ہیں۔ ان کے مطابق ہی کھیلنا درست ہے۔"

اس نے نائب کپتان کو غور سے دیکھا۔ کچھ بولا نہیں۔ پھر نگاہ پھیر لی۔

تیز گیند پھینکنے والے کو اشارہ کیا۔ اس کے لئے میدان میں مختلف جگہوں پر کھلاڑیوں کو جما
دیا۔ پھر گیند اس کو دے کر بولا۔" مجھے شک ہے کہ ان کے بیٹسمین (　　　) لیگ اسٹمپ
(　　　) پر اونچی تیز بولنگ کھیل سکیں گے۔ ضرورت یہ معلوم کرنے کی ہے کہ اچھلتی
ہوئی تیز گیند سے وہ اپنے جسم کی مدافعت کیسے کرتے ہیں۔"

"بلکہ اس طرح کی بولنگ سے تو ان کو چوٹ لگ سکتی ہے۔" بولر بولا۔
گھورا ___ پھر کہا۔ " اس طرح کی نرم روی کی بدولت فتح کو ہم نے پہلے بھی دغا دی ہے۔" تو کیا
پھر بہتر لہجے میں بولا۔ " کھیل پر پھیکا پن چھا گیا ہے۔ ایک دو بیٹسمین کے آوٹ ہو جانے سے
کھیل میں جان پڑ جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورت کے تحت اگر بولنگ خطرناک بھی ہو
تو تماشائیوں کو اس پر اعتراض نہ ہوگا ___ اب یہ تم پر ہے کہ اپنی ٹیم کے طرفداروں
کے لئے کیا کرتے ہو۔"
بیٹسمین نے بلا کر بلہ پھینک دیا اور اپنی چوٹ کو سہلانے لگا۔ گیند اس کی کہنی پر لگی تھی ___
میدان کے ایک حصے سے سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں ___ چند منٹ بعد کھیل پھر شروع
ہوا۔ نشانہ اب بھی وکٹوں ( ) کی بجائے بیٹسمین کا جسم تھا۔ گیند اچھل کر اس کی کنپٹی پر
لگی اور وہ بے ہوش گر پڑا ___ اگلا بیٹسمین آیا پر بہت دیر میدان میں نہ ٹھہرا۔
گیند اس کے بازوؤں، پسلیوں اور سینے پر لگی۔ اور ایک دفعہ جب وہ اپنے سر کی طرف آتی
ہوئی گیند سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا گیند بلے کو چھو کر اچھل گئی اور وکٹ کیپر نے
بہت ہی آسان کیچ ( ) لے لیا۔
میدان میں "شرم" اور "بہت عمدہ" کا ملا جلا شور گونجنے لگا۔
وہ بولر کو شاباشی دے چکا تو بہترین کھلاڑی اس کے پاس آیا۔ " جن پر بولنگ ہو رہی ہے
یہ کھلاڑی کی برادری سے علیحدہ نہیں۔ پھر یہ تشدد کیسا!!"
" ان سے جیتنے کے لئے ارادے سے نفرت کرنا ضروری ہے۔" "میں نے اس ڈھنگ سے یہ کھیل
کبھی نہ کھیلا نہ دیکھا۔"
" سنو۔ کرکٹ کا میدان ذاتی اخلاقیات کی جگہ نہیں۔ پھر میری حقیقت حال ہے اور حال
کے اقدام میں ماضی کی دخل اندازی کیا معنے ___ اعتراض کرنے والوں کو چاہیئے کہ میدا
ن میں گونجتے "بہت عمدہ" کے نعرے سنیں۔ میری بستی والوں کو میرے اقدام کی صحت پر کوئی شبہ
نہیں ___ لو نیا بیٹسمین آیا۔ اب اپنی جگہ جاؤ اور جیتنے کے لئے جو میری ہر طرح مدد کرنے کا تم نے
وعدہ کیا تھا اس کو یاد کرو اور اس پر اپنا دھیان لگاؤ۔"
آنے والا بیٹسمین دوسری ٹیم کا کپتان تھا۔ چند لمحے احتیاط سے کھیلنے کے بعد اس نے ایک خوبصورت
شاٹ (SHOT) مارا۔ گیند سنسناتی ہوئی باؤنڈری کی جانب لپک گئی۔ یہ عمدہ کرکٹ کا مظاہرہ تھا

سب تالیاں بجانے لگے۔ اگلی گیند ایک بیمر (BEAMER) تھی جو بیٹسمین کے سر کی سیدھ میں آ
اس کی ٹوپی کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ میدان پر خاموشی چھا گئی۔ ٹوپی ٹھیک کرکے بیٹسمین پھر مقابل کھڑا
گیند ٹپہ کھا کر اونچی اچھلی اور اس سے پہلے کہ بیٹسمین اسے ہک (HOOK) کرسکے اس کے چہرے
وہ گر پڑا۔ میدان میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف کے تماشائیوں نے میدان میں خ
بوتلیں اور ڈبے پھینکنا شروع کر دیئے۔ اس شورش کو نظر انداز کرکے وہ بولر کی طرف
بہترین کھلاڑی کو نائب کپتان سے کہتے سنا۔ "کپتان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں ——
والا لگن اور مضبوطی کی بھی اس سے کمی نہ تھی۔ جیسے کھیل کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ز
سے زیادہ مسرت پہنچانے کے اونچے نصب العین کا حامی ہو اور اقلیتوں کو بھی نظر انداز
ہو اس کے اس مقصد کی خاطر میں کچھ نہ کچھ کرنے کو تیار تھا۔ پر کیسا یہ کشت و خون؟ معاند
کھیل کی ساری اعلیٰ اقدار کی پامالی۔ یہ کرکٹ نہیں؟"

"قانون۔ عزیز من قانون —— کھیل کے قانون ہیں۔ ان کو توڑے بنا کسی بھی طرح کھیلنا ممکن

"ہو سکتا ہے ہم قانون نہ توڑ رہے ہوں۔ پھر یہ کرکٹ نہیں ہم قانون سے کھیل رہے
کھلاڑیوں کھیل کی یہ بربادی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔"

"یہ نظریاتی باتیں !!! قاعدوں ہی میں کھیل کی روح کی تشریح ہے؟"

اس نے فیلڈ (FIELD) میں "نئے" مہرے بٹھائے۔ اور بہترین کھلاڑی کو میدان کے اس حصے کی
بھیج دیا جہاں سے لوگ خالی بوتلیں اور ڈبے پھینک رہے تھے۔

بہت دیر نہ لگی جب کسی کی پھینکی ہوئی خالی بوتل بہترین کھلاڑی کے دل پہ لگی۔
وہ گر پڑا۔ گیند پاس سے نکل گئی۔ امپائر نے مخالف ٹیم کو چار رن دینے کا اشارہ کر دیا۔ ٹوپا
کر امپائر نے ہاتھ زور سے جھٹکا۔

"یہ رن نہیں گنے جائیں گے۔ جان بوجھ کر بوتل میرے کھلاڑی کے سر پہ ماری گئی ہے
گیند نہ روک سکے۔ کھیل کے قانون کے مطابق فیلڈنگ میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہے
لہٰذا یہ رن نہ گنے جائیں گے کہ ایسا کرنا کھیل کی روح کے منافی ہوگا۔ یہ امپائر (UMPIRE) کی
ذمہ داری ہے کہ کھیل کے ہر پہلو پہ نظر رکھے۔"

"کس نے تم سے ہدایت مانگی ہے۔ امپائر نے [illegible] فیصلہ کرنا میرا کام ہے اور مجھے اپنا کام
[illegible] انداز ہی کی ضرورت نہیں" [illegible]

"یہ مت بھولو کہ بستی کی ٹیم کا کپتان میں ہوں۔ اور ایمپائر کے عہدے کا تقرر میری ہی ہدایت سے ہوتا ہے میرے لئے مشکل نہیں کہ شکایت کر کے تمہیں اس میچ کی ایمپائری سے ہٹوا دوں۔ پھر جب تک میں کپتان رہوں گا آئندہ کبھی تمہیں اس میچ کا ایمپائر نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی کہیں اور تم کو یہ کام دیا جائے گا۔ کرکٹ کے قانون کے مطابق یہ رن نہیں گنے جائیں گے۔"

بہترین کھلاڑی کو اسٹریچر پر ہسپتال لے جایا جا چکا تھا جب ٹیم واپس پویلین میں آئی۔ وہ کھیل کمیٹی کے صدر صاحب کے پاس پہنچا۔" میدان میں نظم و نسق رکھنے کی ذمہ داری کھیل کمیٹی کی ہے۔ میدان میں ایسے کچھ لوگ ہیں جو بالغ انسانوں کی طرح اپنی شہری ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں، یہ الٹی سیدھی افواہیں پھیلا کر لوگوں میں فساد کرانا چاہتے ہیں ان کھلاڑیوں کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتے ہیں جن کی ساری کوشش یہ ہے کہ میچ تماشائیوں کے لئے بہتر سے بہتر بن جائے۔ لازم ہوتا ہے کہ ان شر پسندوں کو قابو میں لایا جائے۔ کھیل اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جبکہ کھلاڑیوں کو اپنے انداز سے کھیلنے کی پوری آزادی ہو اور ان کو نکتہ چینی سے محفوظ رکھا جائے۔ ٹیم کے مفاد کو بہر صورت اخبار نویسوں، ریڈیو، ٹیلی وژن اور اسی طرح کے بدعزم خود اطلاعاتی لوگوں کے ذاتی حقوق پر فوقیت حاصل ہے۔ میرے کھلاڑیوں کی حفاظت کرنا آپ کی کمیٹی کی ذمہ داری ہے۔"

مخالف ٹیم کے کپتان سے ملا تو اس کو جواب دیا۔" تمہارے چوٹ لگنے کا مجھے افسوس ہے میری ذاتی خواہش یہ نہ تھی۔ پر جب ہم میدان میں قدم اٹھاتے ہیں تو ایسے خطرے مول لینے کا جان بوجھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ پر تم جانو۔ اس چوٹ کا ذمہ دار میرا بولر نہیں ہے۔ یہ تو دو اٹل ارادوں کی ٹکر کا لامحالہ نتیجہ ہے ——— پتہ نہیں کہ تم یہ میچ جیت سکو گے یا نہیں۔ حالات کے مطابق تو اس وقت میرا پلہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تماشائیوں میں جو جوش و خروش پھیلا ہے اس کو حاصل کرنے کا سہرہ ہمارے سر بھی ہے کیونکہ عام تماشائی نہ تو کھیل کے داؤ پیچ سمجھتے ہیں نہ ہی اس کی حکمت عملی کو پہچانتے ہیں۔ انھیں تو اپنے جذبات کو مرکوز کرنے کو ایک نقطہ چاہیئے تاکہ وہ اپنی انفرادی لاچاری کو مجمع کی طاقت سے منسلک کر کے اس طاقت کے شرکت دار ہو جائیں۔ ہم پیشہ ور رہنما یہی نقطہ فراہم کرتے ہیں تاکہ اپنی ٹیم کے کپتان بنے رہ کر کھیل کو اپنے فائدہ عدو مرضی کے مطابق جاری رکھ سکیں۔ آؤ اپنے پیشہ میں اس کامیابی پر پیشہ وروں کی طرح فتح و شکست کو بھول کر آپس میں مبارکباد کے ہاتھ ملائیں۔"

پھر اپنی بستی کے نوجوانوں سے ملا۔" تعلیم یافتہ اور جو فطری عقل رکھتے ہیں صاف دیکھ سکتے

ہیں کہ ان کی مرضی یہ ہے کہ فیصلہ اچھے کھیل کی بنا پر نہ ہو ـــــ کیا ہمارے کھلاڑیوں کو زخمی کر کے سوچتے ہیں کہ ہم کو ہرا لیں۔ یا امتحان لینا مقصود ہے ہمارے خون کے ٹھنڈے پن کا۔ یا اپنی صلح پسندی میں ہم اب ان کی تضحیک کا نشانہ ہیں ـــــ نہیں کپتان یہ بھول رہے ہیں کہ اگر فیلڈنگ ان کے کھلاڑی بھی تو کریں گے اور سر پھوڑ کر ناکارہ کر دینے کی طاقت ہم میں بھی تو ہے ـــــ کیا یہ پتا نہیں ہے؟ ـــــ یا کمزوری کا ہم پر غلبہ ہے۔ بے حسی نے آ گھیرا ہے۔ ٹیم کو جتوانے میں ہر طرح کی مدد کی جو ہماری ذمہ داری ہے اس کو پورا کرنے میں ہم قدم اٹھانے سے رک جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں کوئی اور پہل کرنے کی مضبوطی دکھائے تو ہم بھی ساتھ ہو لیں۔ اور ہرا کر ہم کو ہماری عزت خاک میں ملانا چاہنے والے اس تذبذب سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ـــــ میں پوچھتا ہوں ہم کب تک برداشت کرتے رہیں گے، یا اپنی رگوں میں دوڑتے سرخ لہو کے اظہار میں اتنی دیر لگائیں گے کہ دوسری بستی والے ہمارے دشمن، ان رگوں میں لہو کی بجائے جو کچھ بھی ہے اس کو بہا کر خاک میں ملا دیں گے" ـــــ پھر اپنے کوٹ کے کاج میں لگی، گلاب کی کلی نکال کر سامنے کھڑے ایک بچے کو دے دی۔

جیتنے کے لئے دو سو پچاس رن بنانے تھے۔ جب اس کی ٹیم کی بیٹنگ (BATTING) کی باری آئی تو اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں سے بولا۔ "جو واقعات پیش آئے ہیں ان کی نوعیت سب کو معلوم ہے۔ ہمارے لئے یہ میچ بچانا بے حد ضروری ہے۔ ان غیر معمولی حالات میں درمیانہ روی کی فرسودہ پالیسی (POLICY) کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور جس طرح کی کپتانی کی ضرورت ہے اس کی ذمہ داری میں نے قبول کر لی ہے۔" رک کر پھر ایک نگاہ نائب کپتان پر ڈالی۔ مطمئن ہو گیا تو پھر کھلاڑیوں کو دیکھ کر بولا" پہلا قدم بیٹنگ میں تبدیلی ہے۔ بیٹنگ کی ترتیب اب پچھلے میچوں کی بنا پر نہ ہوگی۔ زیادہ رن بنانے والے دوسروں سے مختلف نہیں ہیں ان کو نہ تو کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہے نہ ہی کسی خصوصی برتاؤ کا حق۔ اس کا فیصلہ کہ کون کس نمبر پر بیٹنگ کو جائے گا، فقط کپتان کی مرضی پر ہے۔ یاد رہے یہ کرکٹ کی روایت ہے ـــــ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم اس مرحلے پر ہیں جہاں خیالات کی چھان بین یا عدم تعاون کی نہیں بلکہ اتحاد اور ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ ڈسپلن کا تقاضا ہے کہ کھیل کے متعلق ہر ذاتی رائے کو کپتان کی رائے سے متصادم ہو تو اس کا تابع کر دیا جائے جو کپتان کے خلاف ہے وہ پوری ٹیم کے خلاف ہے۔ یقین مجھ پر ہی رکھو مستقبل پر یقین رکھو، جیت ہماری ہی ہوگی۔"

بیٹنگ کی ترتیب الٹی اور بہترین کھلاڑی سے اکیلے میں کہنا۔ "یہ درست نہیں کہ تم دنوں کے لئے کسی [illegible] کھلاڑی کی درست [illegible] کر دیا جائے۔ لہٰذا تم ہمیشہ کی طرح پہلے نمبر پہ بیٹنگ کرنے جاؤ گے پر تیار رہو جب تمہاری ضرورت ہو گی بتا دیا جائے گا ۔۔۔ اور یہ بہتر ہی ہے کہ چوٹ کے بعد تم زیادہ سے زیادہ آرام کرو۔"

نائب کپتان نے گیند کو گلانس (GLANCE) کیا اور پھر دوڑ کر اپنا پچاسواں رن پورا کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹیم کا اسکور (SCORE) چار وکٹوں پر دو سو دس رن پر پہنچ گیا۔ نائب کپتان نے بلا اٹھا کر مجمع کی تالیوں کا شکریہ ادا کیا۔ چنگ (   ) کے دو ہوتے ہوئے بیرے سے وہ نائب کپتان کے پاس گیا۔ "بہت خوب ۔۔۔۔ جیتنے کے لئے ہمیں بس چالیس رن اور بنانے ہیں اور ابھی چھ کھلاڑی باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں اب تم ریٹائر (RETIRE) ہو جاؤ۔"

"لیکن کیوں!!"

"جیسا کہ میں نے کہا تھا اس ٹیم میں سب برابر ہیں اور کسی کا پچاس سے زیادہ رن بنانے کا مطلب برابری کے اس توازن کو بگاڑنا ہوگا۔"

"ٹیم کے افراد جتنے زیادہ رن بنائیں گے اتنا ہی ٹیم کا فائدہ ہے۔"

"میں تمہیں ریٹائر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کرکٹ کا کوئی قانون رنوں کی تعداد نہیں مقرر کرتا۔"

"قانون!! ۔۔۔۔۔۔ قانون میری مرضی ہے۔"

اوور (OVER) ختم ہو چکا تھا۔ بغیر کچھ اور کہے وہ اپنی جگہ واپس کھیلنے چلا گیا۔ شاٹ (SHOT) مارا تو گیند کور پوائنٹ (COVER POINT) کے فیلڈر کی پہنچ سے باہر نکل گئی تھی۔ آسانی سے ایک رن لیا جا سکتا تھا۔ نائب کپتان اس کی آواز پر دوڑنے کے لئے دوڑا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا پھر نائب کپتان سے واپس جانے کے لئے کہہ کر اپنی جگہ واپس آ گیا اور نائب کپتان جو اپنی کریز سے کافی باہر تھا بڑی آسانی سے پچاس رن پر رن آؤٹ (RUN OUT) کر دیا گیا۔ جیتنے کے لئے بیس رن اور بنانے تھے جب نواں کھلاڑی تیز بولر اس کے ساتھ بیٹنگ کو آیا۔ پہلی گیند بمپر (BUMPER) تھی جو بلے سے لگ کر سلپ (SLIP) کے اوپر سے نکل گئی اور انہوں نے دوڑ کر چار رن بنا لیے۔ دوسری گیند بیمر (BEAMER) تھی جو سیدھی تیز بولر کے سر پر لگی اور وہ گر پڑا۔ میدان میں شور مچ گیا اور تماشائیوں میں لڑائی ہونے لگی۔ ہاتھا پائی بڑھی تو [illegible] تماشائیوں نے [illegible] میں آگ لگا دی۔ کھلاڑی واپس پویلین (PAVALION) میں چلے گئے [illegible] کر جاری نہ رکھا جا سکا [illegible] میدان پر پڑنے والے سائے لمبے ہو گئے تھے ۔۔۔۔۔ کھیل ختم ہو گیا۔ ••

سیما شکیب

ایک نظم

جب کبھی میں
اپنے اندر جھانکتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے کہ جیسے
میرے اندر اک خلا ہے
اور میں
اس خلا میں تیرتا ہوں ——
رات دن

میرے باہر
باغ، میدان، شاہراہیں
مدرسے اور خانقاہیں
کارخانے
ہوٹلیں اور رقص گاہیں
سب کی بنیادیں ہوا میں
سب معلق
ماں، بہن، بیٹیا، برادر
سب برابر

سب شریکِ جرم ہیں
(آگہی کی)
ہم کو ملتی ہے سزا
ہے یہی اپنا مقدر
(یہ خلا)
جس کے بے پایاں سمندر میں
ہزاروں
خواہشوں، خوابوں، تمناؤں
کے پہیئے گھومتے ہیں

جب کبھی میں
اپنے اندر جھانکتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے کہ جیسے
میرے اندر اک خلا ہے
اور اس میرے خلا میں
گھومتا رہتا ہے
یہ سارا جہاں
یہ زمیں،
یہ آسماں ——!

سیما شکیب

ایک نظم

گھر کی دہلیز پر
چاندنی
آ کے
بیٹھی تھی
کل رات کو
اور میں
بے کراں
آسمانوں میں
تھا
نام
اس کا
مری
داستانوں
میں
تھا ــــــــــ!

سیما شکیب

غزل

بچھڑنا طے ہوا تیری رضا
پلٹ کر دیکھنا کیا، پھر صدا

لہو رونے لگا ہے دل ابھی سے
نجانے حال کیا ہو انتہا پر

کوئی بادل کبھی رکتے نہ دیکھا
سلگتے ریگ زاروں کی صدا پر

یہ ہم کیا مانگ بیٹھے تھے کہ آنسو
چراغاں کر گئے دستِ دعا پر

دیے اور روشنی کا ساتھ کب تک
یہ عرصہ مختصر ہوگا ہوا پر!

وقار لطیف
(لندن)

سمندروں کے خیال

O

یہ تحفۂ حیاتِ عشق ہے کہ آج
سمندروں کے نیلگوں خیال ہی پیروی کی روش پہ ہیں
رواں دواں
نشاطِ جاں!
میری یہ جستجو کہ میں سمندری ہوا کی طرح سے
بکھیر دوں چمکتی موجِ تند خرام کے بھیگے ہوئے دراز بال
مری یہ لو کہ میں حواصلوں کی طرح سے
سمندروں پہ جگمگاتی دھوپ میں لگاؤں قہقہے
ہر ایک موجِ آب کی خلاف سمت میں اڑوں
مگر ہر ایک بار ہوں میں سطحِ آب ہی پہ غوطہ زن
خدنگ کی مثال پھر بناؤں اپنے واسطے
وہ ایک رہگزار جو
تہِ سمندرِ وصال ہی پہ ختم ہو
ترے جمال ہی پہ ختم ہو
نشاطِ جاں!

طالب خوندمیری

آنکھوں کا گہن

میں نے جتنے سپنے دیکھے
سب جاگے میں دیکھے
اک سپنے میں، میں نے دیکھا
بوڑھا سورج اپنی آنکھیں کھو بیٹھا ہے
ہاتھ میں اندھی لاٹھی تھامے
پگ پگ رستہ ڈھونڈ رہا ہے
راہو، کیتو
آگے آگے رستہ بتلاتے جاتے ہیں
کچھ آگے دو چار قدم پر
اک گہرا تاریک کنواں ہے
جس کی چاروں اور دھواں ہے

•

میں نے اک سپنے میں دیکھا
راون کو بن باس ملا ہے
اور ہمالہ سے لنکا تک
بن ہی بن ہے
بن ہی بن ہے

•

مجھ کو یاد آتا ہے، میں نے
اک سپنا ایسا بھی دیکھا
دور، دور تک کھیت کھڑے ہیں جیسے
دور، دور تک رنگ برنگی فصلوں کے لشکر ٹھہرے
کچھ فصلیں خنداں چہروں کی
کچھ فصلیں روشن ذہنوں کی
کچھ بے تاب دلوں کی فصلیں
کچھ شاداب سروں کی فصلیں
لیکن
مجھ کو یوں لگتا تھا
جیسے یہ سب فصلیں پک کر
کٹنے کو تیار کھڑی ہیں

○

اقبال زیدی
(لندن)

فسادات

جب شہرِ ستم شرطِ وفا موجۂ خوں ہو
ہوں کاسۂ سر مشعلِ اظہارِ عقیدت
جب رقصِ شرر رونقِ ایوانِ سکوں ہو
نذرانۂ جاں شعلۂ رخسارِ جنوں ہو
پھر کوچۂ دل نجمِ سحر کیسے اجالے
ہو کیسے دریچے سے طلوع چہرۂ خورشید
پھر کیسے فروزاں ہو کسی بام پہ مہتاب
ہو موسمِ گل کیسے علاجِ شبِ ہجراں
پھر کیسے دھنک رنگ بکھیرے سرِ مژگاں
کس طرح سے چھیڑے گا کوئی نغمۂ شیریں
ہو رقصِ صبا کیسے سرِ گلشنِ ہستی
پر یہ بھی یقیں ہے اے میرے شہرِ ستم گر
نذرانۂ جاں، رقصِ شرر، موجۂ خوں سے
دھل جائے گا ہر داغ کدورت کا قبا سے
پھر مندمل ہو جائے گا ہر زخمِ عداوت
پھر فصلِ محبت کی امیں ہوں گی نگاہیں
اے شہرِ ستم کوچۂ جاناں کی قسم ہے
ہم ترکِ تعلق پہ نہ اصرار کریں گے
ہم وصل کی ساعت کے طلبگار رہیں گے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

غزل

(فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں)

مرا شہرِ طرب، دیکھا نہ جائے
جلے کچھ ایسے اب، دیکھا نہ جائے
کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلماں!
یہ فردِ بے نسب، دیکھا نہ جائے
اگر اک بار ہوتا، سہہ بھی لیتے
یہ منظر روز و شب، دیکھا نہ جائے
چلو، ہم دیکھ بھی لیتے ہیں اس کو!
پہ تم سے کیا عجب، دیکھا نہ جائے
مرا خنجر ہے خود سینے میں میرے
مرا مجھ پر غضب، دیکھا نہ جائے
کوئی پرساں نہیں، اہلِ وفا کا!
یہ انداز اور یہ ڈھب، دیکھا نہ جائے
پڑے ہیں سرِ راہ، مری لاشیں ادھر ہیں
سنبھالو مجھ کو اب، دیکھا نہ جائے
کسی زید و بکر کا، تذکرہ کیا!
یہاں مرتے ہیں سب، دیکھا نہ جائے
عروجِ تیرگی، دیکھوں تو کیسے!
زوالِ تاب و تب، دیکھا نہ جائے

صلاح الدین نیّر

غزلیں

ب کہاں جائے گا مجھ جیسا مسافر آخر — !
ب سے ٹھیرا ہوں میں دروازہ پہ دستک دے کر

عانے کب کون دبے پاؤں یہاں آیا تھا
رم ہے آج تلک بھی وہ اکیلا بستر

ب تو بے خانماں لوگوں میں بسر ہوتی ہے
اُنے آواز نہ دی میرے ہی گھر میں آ کر

تو برسوں سے ہیں مخمور نگاہی کے اسیر
تھی پلکوں کو جھکاؤ کہ اُٹھاؤ ساغر

ہ کو احساس کہاں ہوگا اکیلے پن کا
م تو رہتے ہو ہمیشہ کی طرح ساتھ اکثر

بس کو چھونے سے تجھے کبھی دور رہا کرتی تھی
یرا وہ لمحۂ شاداب کہاں ہے نیّر

ہم ایک ہیں تو کیوں نئے خانوں میں بٹ گئے
جن پر تھا اعتبار وہی ہاتھ کٹ گئے

اب کے برس بھی شہر میں ایسی ہوا چلی
شاہین زادے اپنے پروں میں سمٹ گئے

یک رنگی لباس نے وہ گل کھلائے ہیں
پرچھائیوں سے آپ کی ہم بھی لپٹ گئے

خود کو بچائیے گا لسانی جنون سے
طوفان زیرِ آب ہے بادل تو چھٹ گئے

ہوا کیا ہے کیسے قلندر مزاج ہو
سیاس لے کے تم کہاں دنیا سے کٹ گئے

تم ایسے کون سے ہو روایت کے پاسدار
تم بھی تو اپنے قول سے اکثر پلٹ گئے

شکلیں کچھ اُبھریں چہرۂ قاتل پہ اس طرح
نیّر جو وضعدار تھے منظر سے ہٹ گئے

غزلیں

ڈاکٹر محمد علی اثر

پہلے اس دل کو آئینہ کر دے
بارشِ غم سے پھر جلا کر دے

یا مرے دل کی آنکھ وا کر دے
یا پہاڑوں میں راستہ کر دے

ایک مدت سے دل اداس نہیں
تو اِسے درد آشنا کر دے

آرزوں کی خشک شاخوں کو
سبز پتا کوئی عطا کر دے

کب سے ہے چار دن کی یہ دنیا
پانچویں دن سے آشنا کر دے

آرزو ہے کہ تیری راہ چلوں
اپنی راہوں کو پُر ضیا کر دے

لفظ و معنی میں ہو اثرؔ پیدا
یہ دُعا ہے مرے خدا کر دے

رؤف خیر

کیسی ہوا بدل کے اچانک ہی رہ گئی
سر کھو گیا کلاہِ مبارک ہی رہ گئی

مانگی جو آفتاب سے پہچان کی دلیل
محرابِ بے چراغ میں کالک ہی رہ گئی

کیا کیا سکون لذتِ لاعلمیت سے تھا
خود آگہی کہ جان کی گاہک ہی رہ گئی

تھا شماتت بھی اشانت بھی ساغرِ سادہ بدن
یادش بخیر سینے میں ٹھنڈک ہی رہ گئی

ٹھیرا ہر ایک جرعۂ زہرابِ رائگاں
بے انت پیاس تو مرا مسلک ہی رہ گئی

بین السطور تم نے پڑھا بھی نہیں مجھے
تم سے جو بات کہنی تھی جھلک ہی رہ گئی

شاید اب اس مکان میں رہتا نہیں کوئی
پاگل بنی ہوئی مری دستک ہی رہ گئی

کل وہ ہنر چراغ کچھ دم تو ہو گیا
تحسینِ ناشناس کی کالک ہی رہ گئی

تھے سو چراغ ایک سیاہی کی بوند میں
ممنوع ہو کے خیرؔ وہ پستک ہی رہ گئی

محمد مجید اللہ صدیقی

سُرخیوں سے لِکھ لینا...!

آسمانوں سے رنگ بکھرے ہیں
سجدہ گاہوں سے نور چھن رہا ہے
رات کا رنگ کیسے بدلے گا
دولت کی خواب گاہوں میں
لوگ نیند کی دھجیاں اُڑاتے ہیں

آؤ نِکلیں کہیں ہم تم
چاند کو پھر سے ڈھونڈیں گے
زمیں کو پھر سے ناپیں گے
سورج کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر
تاروں کو پھر سے چلائیں گے
ہم کو جینا ہے ریت بن کر

گھانس کی طرح
مسکراتے ہوئے سوکھ جانا
اپنا مقدر ہے
یا پھر لہو کا آبشار بن کر
دور تک سرخیاں بکھیرنا
عزم کی آگ پر
تاپ لو
وقت کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں کو...

ہاں! ابھی تیار ہیں ہم لوگ
تناور درختوں کی طرح
عظیم طوفان میں بہنے کے لئے!

اپنے دل کے سفید کاغذ پر
میری وفا کی داستانیں
سُرخیوں سے لِکھ لینا
میں کبھی زمانے کا نہیں بن سکا
مجھ کو تو
بس یوں ہی آتے رہنا اور لوٹ جانا ہے!

مجھ سے پوچھو وجود کی گونجیں
کس طرح چیختی ہوئی
شعور کے در و دیوار سے ٹکراتی ہیں:
جس طرح
صحرا میں پھول کھلتے ہیں
ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں
ماضی کے قافلوں کے نشاں
ہاتھ سے چھوٹنے لگتے ہیں
ہم لوگ بادل کا دل ہیں
بجلی گرتی ہے ٹوٹ جاتے ہیں۔!!

صفیہ صدیقی

ادھورا انسان

اس نے کھڑکی کے بھاری پردے سرکا کر شیشے سے باہر کی دُنیا کا جائزہ لیا۔ گھنے پیڑوں میں چھپی ہوئی یہ جگہ کتنی پُرسکون تھی۔ ہر طرف خاموشی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ہرے ہرے پتوں سے لدے ہوئے اونچے درخت، سنتریوں کی مانند چپ چاپ کھڑے تھے۔ جھیل کے شفاف پانی پہ کہرے کی ہلکی سی چادر پھیلی ہوئی تھی جس میں سورج کی کرنیں چھن چھن کر جذب ہو رہی تھیں۔ فضا یوں ساکت تھی گویا وقت بھی ٹھہر گیا ہو۔ چڑیاں بھی اپنے گھونسلوں میں سوئی پڑی تھیں۔

اُسے صرف اپنا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل سنائی دے رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود اس سکوت میں مدغم ہو چکا ہے۔ یہ سناٹا راحت بخش بھی ہے اور خوفناک بھی۔ اس نے سر جھکا کر کمرے کے اندر دیکھا روزمری بے خبر سو رہی تھی۔ یادامی کمبل سے صرف اس کے بھورے بھورے بال اور گلابی شانے نظر آ رہے تھے ۔۔۔ اس کی زندگی نے جو راہ پکڑی ہے اس پر خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہیں۔ بہت مسرور اور مطمئن ہو کر اس نے سوچا۔

سورج آہستہ آہستہ اوپر کی طرف سرک رہا تھا اب اس کی کرنوں میں چمک آتی جا رہی تھی۔ ہرے ہرے پتوں پر جو بارش کے ننھے ننھے قطرے ڈھلکنے سے بچ گئے تھے وہ اب سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔

کھڑکی کے شفاف شیشے سے سر نکال کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میری زندگی اب تک کتنی بے مصرف گذری ہے۔ کیا کیا غم جھیلے ہیں۔ قدم قدم پر بندشیں، رکاوٹیں۔ معاشرے نے اتنے قوانین بنا رکھے ہیں کہ انسان [illegible] کر رہ جاتا

ہمارے سینے ایسے مدفن کی مانند ہیں جس میں ہم محبت، ارمان، ولولے، تمنائیں وقتاً فوقتاً دفن کرتے رہتے ہیں۔ ایک یہ دنیا ہے اس کا فلسفۂ زندگی کتنا حقیقت پسندانہ ہے یہاں انسان کو جنت کرنے کی آزادی ہے انھیں جینے کی آزادی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا۔

مجھے چھ ماہ سے زیادہ ہو گئے اس ملک میں آئے ہوئے لیکن میں کتابوں کا غلام بنا رہا، میں نے اور کچھ دیکھنے کی تمنّا بھی نہ کی۔ پھر اسے یکدم سے یاد آیا کہ اس کی روزمری سے صرف تین دن پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ یونی ورسٹی کے کافی بار میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، وہ خالی کرسی کی تلاش میں ان کی میز کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کافی کا کپ اور دوسرے ہاتھ میں کتابیں بھری تھیں جو پھسل کر گرنے ہی والی تھیں۔ اس نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کتابیں لے لیں اور وہ تھینک یو کہہ کر بیٹھ گئی تھی۔

دوست ایک ایک کر کے اٹھنے لگے تھے اور وہ دونوں باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ جب اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا تھا کہ اس نے اس لڑکی سے باتوں میں تین گھنٹے گذار دیئے تھے جس کا نام بھی اس کو معلوم نہیں ہے۔ البتہ یہ معلوم تھا کہ وہ امریکہ سے ایک سال کے کسی کورس کے لئے آئی ہے۔

اُسے لندن آئے ہوئے ابھی دو تین مہینے ہوئے ہیں اور وہ بہت تنہائی محسوس کر رہی ہے۔ اس کی اپنی بھی یہی کیفیت تھی حالانکہ اس کو لندن آئے ہوئے چھ ماہ گذر چکے تھے کافی بار سے باہر نکل کر دونوں باتیں کرتے کرتے فٹ پاتھ پر چلتے رہے۔ گاڑیوں اور بسوں کے شور سے بے خبر انسانوں کے ہجوم سے بے نیاز ـــــ وہ اسے جنوبی ہندوستانی کے ایک رسٹورنٹ میں کھانا کھلانے لے گیا۔ پھر روزمری کافی پینے کے لئے اس کے فلیٹ میں آ گئی تھی اور مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کی پالیسی پر جو بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو کافی کی کئی پیالیاں پی گئیں لیکن باتیں نہ ختم ہوئیں۔

اتفاق سے اگلے دن ہفتہ تھا اور دیر سے سونے اور دیر سے جاگنے کی آزادی تھی۔ دوسرے دن روزمری جا کر اپنی گاڑی لے آئی اور وہ دونوں لیک ڈسٹرکٹ دیکھنے چلے آئے تھے دو دن کے قلیل عرصے میں اس نے کتنا طویل سفر طے کر لیا تھا اسے خود حیرانی تھی کہ اس نے ایک دم سے آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا تھا اس نے اپنا سفر شروع ہی منزل سے کیا تھا۔

ایک ڈسٹرکٹ میں انہوں نے دو دن گذارے۔ ماحول کے سحر نے اسے مسحور کر دیا تھا۔ پتلی پتلی پگڈنڈیاں، سبزے کی فراوانی۔ سبز پہاڑ سبز وادیاں اور جھیلوں کا تو گویا جال سا بچھا ہوا تھا روزمری کے بے تکلف رویے نے اس کی جھجک کو بے حد کم کر دیا۔ اس کے دل و دماغ میں کتنی شگفتگی آ گئی تھی اور روزمری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے وقت اس کے قدم کتنے اعتماد سے اٹھتے تھے۔

اس کو اس بات کا اب احساس ہوا تھا کہ اس جدید زمانے میں محبت کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اس نے اپنی روایات، اپنی قدریں، اپنے اندازِ فکر کو کہنہ اور آؤٹ آف ڈیٹ سمجھ کر پرے جھٹک دیا اور اس دنیا کے عشق و محبت کے نئے اور دلنشیں اصولوں کو اپنا کر وہ خود ایک ایسا انسان سمجھ رہا تھا جس کی تکمیل ہو چکی ہو۔ اس کی ہنسی میں بے فکری کی کھنک تھی اور آنکھوں میں غرور کی چمک۔ بھیگی ہوئی نرم نرم گھاس پر چلتے ہوئے اس نے سوچا اس کے اندر کا انسان اب ایک مکمل انسان تھا۔

لندن واپس آ کر روزمری اسے اس کے فلیٹ پر چھوڑتے ہوئے چلی گئی تھی۔ اس نے بڑی اپنائیت اور شوق سے اسے رکنے کو کہا تھا مگر جب وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ اسے گھر سے ٹیلیفون آنے کا انتظار ہے تو اسے ذرا مایوسی ہوئی لیکن اس نے اپنا سر جھٹک کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

اگلے دو تین دن انتظار میں گذر گئے۔

یہ انتظار بہت جان لیوا تھا۔ اس کا دل کسی کام میں نہ لگتا۔ لائبریری بھی جاتا تو اس کی نظریں کتاب کو دیکھنے کی بجائے روزمری کی تلاش میں ہر آنے جانے والے کو تکتی رہتیں۔ اس نے کئی دفعہ فون بھی کیا لیکن وہ نہیں ملی ہر دفعہ وہ پیغام چھوڑ دیتا لیکن اس پر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ غالباً جمعہ کا دن تھا وہ کافی بار میں چائے پینے کے لئے لائن میں کھڑا تھا کہ اسے دور سے روزمری آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی باچھیں کھل گئیں وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس کے قدم خود بہ خود رک گئے۔

روزمری ایک نارنجی بالوں والے لڑکے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھیں وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی روزمری اس لڑکے کو ساتھ لئے اس کی طرف چلی آئی۔ روزمری کا والہانہ سرور دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔

"ہائے"

"ہلو۔ تم کیسی ہو؟" اس کی آواز مری مری سی تھی۔

"ثام سے ملو۔ اتوار کی رات اس نے مجھے فون کیا اور یہ پرسوں آگیا۔ اسے ایک سال کے لئے ریسرچ اسکالرشپ مل گیا ہے۔ یہ بھی لندن میں رہے گا GREAT IS'NT IT! کتنی خوشی کی بات ہے نا!"

زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ثام سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ اس نے کپ چاولی کب پیسے دیئے اور جب اس نے چار کا گھونٹ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ شکر ڈالنا ہی بھول گیا تھا۔ اپنے اوپر مسلط مایوسی اور اداسی سے اسے بہت غصہ آرہا تھا۔ میں کیوں اس کے لئے اداس ہوں۔

اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی پھر ہمارے کوئی عہد و پیمان بھی نہیں ہوئے تھے تو شکایت کس بات کی۔ پھر میں تو ایک بیحد روشن خیال انسان ہوں۔

خود کو ہزار سمجھانے کے باوجود اگلا ہفتہ بڑی مشکل سے گزرا اور موسم گرما کی طویل شامیں بہت جان لیوا تھیں۔ اس کے اندر کا آدمی خود کو بہت ادھورا ادھورا محسوس کر رہا تھا۔ بہرکیف وقت تو ہر صورت میں گزر ہی جاتا ہے۔

اس کے بعد روزمری سے اس کی کئی دفعہ ملاقات ہوئی مگر اس نے اپنی انا کو مزید چوٹ لگنے سے بچانے کی ہر مرتبہ گفتگو کو ہلو ہائے سے آگے بڑھنے نہ دیا۔ لیکن وہ اتنی خوش و خرم نظر آتی تھی کہ اس کی بے التفاتی بھی روزمری کے بشاش چہرے پر اداسی کی ایک شکن بھی نہ لا سکی کہ اس کے دل کو تکلیف ہوتی۔

وہ بہت خوبصورت سی شام تھی دن بھر سورج بڑی فیاضی سے اپنی چمکیلی کرنیں بکھیرتا رہا تھا۔ اس نے سارا دن لائبریری میں پڑھتے ہوئے گذارا تھا۔ آج ریڈنگ روم میں بھی لوگ اکا دکا نظر آرہے تھے زیادہ تر پبلک پارکوں میں اوندھے پڑے تھے۔ اس نے کئی دن بعد اتنا کام کیا تھا کہ آنکھیں دکھنے لگیں۔ تھک کر کتابیں بند کیں اور وہ باہر آگیا۔

پیلی پیلی سی دھوپ دیواروں پر پھیلی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کے ہال خالی تھے اور پارک سے اٹھتے کونے کے لڑکیوں کے غول کے غول سرخ سرخ چہرے لئے باغ کی سیر کر رہے تھے۔ سارا دن تو تنہا گذار لیے کتابوں کی صحبت میں اب ذرا انسانوں میں بیٹھنا چاہیئے یہ سوچ

وہ پیچھے بار میں جا کر بیٹھ گیا۔ آورنج جوس کا گلاس سامنے رکھے بیٹھا تھا کہ ایک لڑکا بھی گلاس ہاتھ میں لئے آکر اس کی میز پر بیٹھ گیا۔ کبھی کبھار دونوں ایک آدھ جملہ کہہ دیتے۔ اس وقت اس کا خود بولنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا البتہ دوسروں کو ہنستے بولتے دیکھ کر ایک طمانیت سی محسوس ہو رہی تھی۔

بار میں مجمع رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا پھر نتاشا ایک لڑکی کے ساتھ آئی تو صرف اس کی میز پر جگہ تھی اور وہ دونوں اجازت لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ نتاشا کو اس نے بڑی دلچسپی کی نظر سے دیکھا۔ اس کے بھورے بھورے بالوں میں گلابی رنگ کی لہر پڑی ہوئی تھی جس میں اس نے رنگ برنگے بہت سے کلپ لگا رکھے تھے۔ ایک ہاتھ میں بہت سی چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں اور دوسری کلائی میں ایک بے حد موٹا سا بریس لیٹ تھا۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتی رہیں پھر جب دوسری لڑکی اٹھ کر چلی گئی تو نتاشا نے اپنا تعارف کرایا اور اس نے رسماً ڈرنک کے لئے پوچھا تو نتاشا نے مسکرا کر اس کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اسے یہ تو یاد نہیں تھا کہ کتنا وقت گذر گیا اور نتاشا نے کتنی دفعہ مسکرا کر "یس تھینک یو" کہا۔ البتہ وقت گذرنے کا احساس جب ہوا جب آرنج پیتے پیتے اس کی طبیعت بھر گئی اور نتاشا کی حالت دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ مزید ڈرنک کے لئے پوچھنا اب خالی از مصلحت ہوگا۔

جب اس نے نتاشا سے اس کا پتہ پوچھا تاکہ وہ اسے اس کے کمرے تک پہنچا دے تو اس نے اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بڑی اپنائیت سے کہا تھا

" LETS GO TO YOUR PLACE " پہلے تو وہ جھجکا۔ نتاشا شاید ہوش و حواس میں نہیں تھی لیکن پھر لڑکھڑاتی ہوئی نتاشا کو اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں لے آیا تھا۔

ہاتھ منہ دھو کر اس نے کافی بنائی۔ اب بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ کافی کی دو پیالیاں لے کر کمرے میں آیا کہ نتاشا سے بھی کھانے کو پوچھے لیکن وہ اس کے بستر میں بے خبر سو رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر اس کی دو درجن چوڑیاں، کڑے، انگوٹھیاں اور بالوں کے کلپ کا ڈھیر دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ پھر چند دنوں تک محبت کا کاروبار بخیر و خوبی چلتا رہا۔

نتاشا کا تعلق ایک ارسٹوکریٹک فیملی سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ وہ پرانی قدروں کو اب بھی سینے سے لگائے ہوئے تھے اور روایات کے سختی سے پابند تھے۔ وہ برطانیہ کے ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جنہیں اب بھی ہر قدم پر اپنی کلاس اور کلاس کا خیال رہتا ہے ان

کے یہاں اب بھی زور سے ہنسنا یا زور سے بولنا بدتمیزی تھی۔ منی اسکرٹ اور جینز وغیرہ کو شریفوں کا لباس نہیں تصور کیا جاتا تھا اور شام کو کھانا باقاعدہ طور پر لباس زیب تن کر کے تناول کیا جاتا۔

نتاشا کی ابتدائی تعلیم کونونٹ میں ہوئی جہاں کی ساری استانیاں راہبہ تھیں۔ اسے قبول کرنے کے بعد جب اس نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور لندن میں طلبا کے ہوسٹل میں رہنے لگی تو وہ صحیح معنوں میں کھل کھیلی تھی اور بچپن سے اٹھارہ سال کی عمر تک اس کی نگہداشت جس انداز میں ہوئی تھی اس نے ہر طور پر اس سے بغاوت کر رکھی تھی۔

اس کے بھورے بھورے ریشمی بال جنہیں دو چوٹیوں میں گوندھ کر اس کے سر میں لپیٹ دیا جاتا تھا دوسرے ہی دن ہیر ڈریسر کی قینچی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اب ان بھورے بالوں میں کبھی سبز، کبھی سنہری اور کبھی گلابی لہریں نظر آتیں۔ سرمئی پلیٹوں والی اسکرٹ اور سفید بلاؤز کو اس نے تہہ کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ چھٹیوں میں شاید ہی ڈیڈی سے ملنا پڑ جائے

کونونٹ کی راہباؤں نے جتنی سختی سے اس کی معصومیت کی حفاظت کی تھی اس نے اتنی ہی بے دردی سے اسے دونوں ہاتھوں سے لٹانا شروع کر دیا اور بڑی مہارت سے تجربوں کے مختلف مراحل سے گذر رہی تھی۔ اسے وقت کی پابندی کی تعلیم دی گئی تھی اب اس نے وقت کو اپنا پابند کر رکھا تھا۔

نتاشا سے اس کی دوستی کی مدت دنوں سے ہفتوں میں منتقل ہوتی گئی۔ وقت بہت اچھا گذر رہا تھا وہ نتاشا کی شوخی اور بے باکی سے لطف اندوز ہوتا۔ اس کے ساتھ بچوں کی طرح بے فکری سے آوارہ گردی کرتا۔ اس نے اپنی پڑھائی کو بھی بھلا دیا اپنا سارا وقت گھومنے پھرنے میں صرف کرتا۔ اسے بہت مایوسی ہوتی جب اس کے اندر کا انسان دبا ہوا اداس رہتا۔

ایک دن نتاشا اسے اپنے ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی میں گھسیٹ کر لے گئی وہ اس قسم کی تقریبات سے گھبراتا تھا اس لئے اس نے بہانہ بنانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ نہ مانی اور جب وہ تیار ہو کر اسے لینے آئی تو وہ نتاشا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے شیفون کا گھیر والا ڈھیلا لباس پہن رکھا تھا جس میں رنگ برنگے لہریئے پڑے ہوئے تھے۔ لباس سینے تک تھا۔ بازو اور پشت کھلی ہوئی تھی اور لباس کے دونوں حصوں کو کندھے پر ربن سے اٹکایا گیا تھا۔

اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کم سے کم اس نے [illegible] کو ڈھک رکھا تھا۔ شوخ گلابی روز اور اسی رنگ کی لپ اسٹک سے اس کے ہونٹ اور رخسار

تھام رہے تھے۔ جب وہ ہال میں پہنچے تو موسیقی کے شور نے ان کا خیر مقدم کیا۔ لڑکے لڑکیاں بڑے زور و شور سے تھرک رہے تھے۔ اس نے کوک کا ایک ٹن اٹھایا اور دیوار سے لگی ہوئی میز پر ٹک گیا۔

نتاشا کو تو سب ہی جانتے تھے کئی لڑکوں نے پکڑ کر اسے گھسیٹ لیا وہ شال کو کمر سے باندھ کر تیز تیز لے میں بجتی ہوئی موسیقی پر رقص کرنے لگی۔

ایک دبلا پتلا سا لڑکا سنہرے فریم کا چشمہ لگائے ہوئے اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور وہ دونوں بات کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس کی نظر نتاشا کو ڈھونڈتی ہوئی رقص کرتے ہوئے لڑکے لڑکیوں پر سے ہوتی ہوئی نتاشا پر پڑی تھی تو وہ رقص کرنے میں مگن تھی اس کے شانوں کے ریشمی بال ڈھلک کر نیچے آ رہے تھے۔ اس کا ہم رقص ایک ویسٹ انڈین لڑکا تھا جو رقص کے ساتھ ایکروبیٹک کرتب بھی دکھاتا جا رہا تھا۔

جب وہ نتاشا کی کمر پکڑ کر اسے چکر دیتا تو اس کا گھیردار ریشمی لباس اس کے منہ کو چھپا لیتا تھا۔ موسیقی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور رقص کرنے والے بھی تیزی سے رقص کرنے لگے تھے۔ نتاشا کو دیکھ کر چند لمحوں کے لئے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ اپنے احساسات اور تاثر سے گھبرا گیا اور گھوم کر کوک کا دوسرا ٹن لینے چلا گیا۔

موسیقی ختم ہونے پر اس نے جلدی جلدی نتاشا کو ڈھونڈا۔

پندرہ منٹ کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ نتاشا جس لڑکے کے ساتھ رقص کر رہی تھی اسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے سناٹے میں آ گیا لیکن جب سنہرے فریم کے چشمے والے لڑکے نے اس سے پوچھا۔

"کیا وہ تمہاری دوست تھی ...۔"

تو اس نے ایکدم سے جواب دیا۔ "نہیں ہم صرف ساتھ پہنچے تھے" اور بھاری بھاری قدموں سے باہر آ گیا۔

نتاشا کا داغِ مفارقت اتنا تکلیف دہ نہ تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کی دوستی کوئی معنی رکھتی ہے۔ لیکن اس وقت وہ عجیب ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا۔ افسردگی کے ساتھ ساتھ ایک ذلت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ نتاشا نے مجھ کو بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

وہ کئی دن تک اس الزبتھ کے ساتھ اس کی لمبی سی کار میں نظر آتی رہی پھر کسی سے سنا ہے
کے ساتھ کہیں باہر گھومنے چلی گئی ہے۔ اسے لپیٹ آپ پر بڑا غصہ آتا تھا۔ میں کیوں اداس
مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری ہتک ہوئی ہے۔ اس ماڈرن سوسائٹی میں ہر بالغ
کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ جس سے چاہے ملے پھر یہ کیا بات ہے میں اتنا پریشان کیوں ہوں
وہ خود سے آئی تھی خود سے چلی گئی۔

اس تجربے کے بعد اس نے خود کو روشن خیال اور وسیع النظر بنانے میں کوئی کسر
نہیں رکھی۔ وقت گذرتا رہا۔ کبھی تنہا تنہا کبھی کسی زہرہ جبیں کی رفاقت میں۔ پھر اپنے
ٹائپ کروانے کے لئے جب اس نے نوٹس بورڈ سے ایک ٹیلیفون نمبر لے کر فون کیا تو اس کی
سوزن سے ہوئی اور جس دن اس کی تھیسس مکمل ہوئی اس نے سوزن کو کھانے کی دعوت دیا

سوزن ایک سیدھی سادھی شرمیلی سی لڑکی تھی۔ یونیورسٹی کے کسی ڈپارٹمنٹ میں
رفتہ رفتہ ان میں دوستی ہو گئی پھر جب اس نے اپنا فلیٹ خرید لیا تو اس کی آرائش سوزن نے
کے مطابق کی اور کافی زیادہ وقت اکٹھا گزرنے لگا اور سوزن کے باورچی خانے کی لگژری
میں منتقل ہوتی گئی۔ پھر کفایت شعاری کا تقاضا یہی معلوم ہوا کہ جب دو انسان اپنا زیادہ اتنی
گذارتے ہیں تو ان کے لئے ایک ہی گھر کافی ہوگا۔ اس نے سوچا اگر خانہ آبادی سے دور کے
ہو تو کم سے کم انگیجمنٹ تو ہو جانی چاہیئے لیکن حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا اس کو اپنا
کوشش کو قطعی دخل نہ تھا۔

منگنی کی اس چھوٹی سی تقریب میں صرف خصوصی احباب مدعو تھے۔ بہت اچھا
سوزن کا چہرہ اس کی مسرتوں کا آئینہ تھا۔ وہ سوزن کے کھلے چہرے سے فکری
سمجھا تا کہ میں بھی آج بہت خوش ہوں۔ جب اس نے سوزن کی انگلی میں انگوٹھی پہنا کر تا
نے خوشی سے نعرے لگائے۔

مبارکباد اور دعائیں پیش کرتے ہوئے دوستوں میں گم ہو کر رہ گئی وہ اس
رہا تھا کہ مجھے آج بہت خوش ہونا چاہیئے پھر میرے اندر کی د ۔۔۔ ویرانی اور جب
سکوت ہے میرے دل کی دھڑکن کیوں تیز نہیں ہوتی۔ من پیچھے رکھا
آج اس موقعہ پر بھی میرے اندر اوہ جوش سے پن کا احساس کیا ہے لیکن

عظیم الدین کو
نسار

سب رس ماہ

تمام

بات
لڑکے
کے وہ
ساتھ لیکر

تھا۔ موڑ
گئے تھے۔
اشارے سے

اسی کے ساتھ
کے پیچھے وا۔

تو اس نے ایکدم سے
قدموں سے باہر آگیا
تماشا کا داغ
کوئی صفحہ میں
ساتھ ساتھ لیے
کی ضرورت ہو

..Y 1984

R. N. 10922/5
Regd. H/HD. 13

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد

بالِ جبریل



ضربِ کلیم

مکاتیبِ رشید

سدرس

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد ۴۷، شمارہ ۸، سن اجراء ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

اگست ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مدیر اعزازی : پروفیسر مغنی تبسم

شریک مدیر : محمد منظور احمد

معاون مدیر : وقار خلیل

قیمت : ۲ روپے ۵۰ پچاس پیسے

زرِ سالانہ : ۳۰ روپے کتب خانوں سے : ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری : ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے

ہوائی ڈاک سے :		بحری ڈاک سے :
مشرق وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

مجلس مشاورت

صدر : محامد علی عباسی

نائب صدر : ہاشم علی اختر

معتمد : پروفیسر مغنی تبسم

ارکان :

عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ، پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپواکر حیدرآباد ۱۸ سے شائع کیا

کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو ۰۰۰

پنجہ گٹہ، حیدرآباد ۵۰۰

سرورق : ملک الشعراء طاقواصی

ترتیب

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

دکنی تہذیب کی تشکیل میں ہندی اور فارسی روایات کی کشمکش

برّاعظم ہندوستان کا سب سے قدیم علاقہ دکن ہے۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں کے عالم وجود میں آنے سے پہلے دکن کا جزیرہ دراصل ان بے شمار جزائر کا ایک حصّہ تھا جو آسٹریلیا تک پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ جغرافیائی تبدیلیاں ایسی ہوئیں کہ ہمالیہ کی پہاڑیاں سطح سمندر سے ابھر آئیں اور ایک صغیرہ اعظم ہندوستان بن گیا اور یہ برّاعظم مختلف نسلوں اور تہذیبوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ آسٹرولایڈ نسل کے لوگ جو اپنی چھپّر نما کشتیوں میں دکن سے آسٹریلیا تک مختلف ٹاپوؤں کے سہارے سمندر کا سینہ چیر کر سفر کیا کرتے تھے وہ اس تبدیلی کے باعث ہندوستان سے کٹ گئے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے مانڈو نسل کے لوگوں کا پتہ چلتا ہے جن کی زبان کے بے شمار الفاظ مختلف تبدیلیوں کے بعد ہندوستانی زبانوں میں داخل ہوئے ہیں اور اب ان کی اصلیت کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے۔ اردو کا لفظ "پینڈا" اصل میں مانڈو زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ اردو میں اس طرح داخل ہو کر گھل مل گیا ہے کہ اس کی اصلیت کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے۔ جب ہندوستان میں ناگا داخل ہوئے تو مانڈو پیچھے ہٹ گئے اور جب دریاوارٹی یا دراوڑی نسل کے لوگ آ گئے اور دریاؤں کے کنارے آباد ہو کر زراعت کے فن کو فروغ دیا تو ناگاؤں نے جنگلوں کا رُخ کیا اور دریا کی وادیاں زراعت کرنے والوں کے لئے چھوڑ دیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جب آریائی نسل کے لوگ موج در موج ہندوستان میں داخل ہونے لگے اور دراوڑی نسل والوں کے علاقوں پر قبضہ

کرنا شروع کیا تو وہ پھر جنوب کی جانب ہٹ گئے۔ کچھ تو سمندر کے راستے گئے اور مغربی ساحلی علاقوں اور ان سے متصل علاقوں میں آباد ہونے لگے اور کچھ لوگ خشکی کے راستے مشرقی ساحلوں سے ہوتے ہوئے ان سے لگے ہوئے علاقوں میں بسنے لگے۔ یہی لوگ بعد میں چل کر دکنی زبانوں یعنی تلگو، کنڑی، ملیالم، کوڑاوی اور ٹامل کی ترقی اور تہذیبوں کے فروغ کا باعث بنے۔ ان میں تامل سب سے توانائی تھی اور ان کو سمندر کا چسکا لگ گیا تھا۔ اس لئے مشرق کی طرف سمندر کے راستے نئے ملکوں کو زیر نگیں کرنے لگے۔ اس طرح ٹمل بولنے والوں نے انڈونیشیا، تھائی لینڈ جیسے دور دراز علاقوں میں اپنی حکومتیں قائم کیں اور اپنی تہذیب اور روایات کو فروغ دیا۔ گویا یہ دکنی روایات کی توسیع کا ایک وسیلہ بن گیا۔

اگر سارے تاریخی واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دکن میں بسنے والی قوموں نے نربدا کے کنارے اپنی مدافعتی چوکیاں قائم کر دیں اور شمال سے داخل ہونے والی نسلوں اور تہذیبوں کو نربدا سے آگے بڑھنے نہ دیا۔ یہ سچ ہے کہ مرہٹی بولنے والے بھی آریائی نسل کے لوگ تھے جو سب سے پہلے ہندوستان میں داخل ہوئے لیکن بعد کی آنے والی آریائی نسلوں کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے بھی دکن کا رخ کیا اور دکن کے شمال مغربی حصوں میں بس گئے۔ کہنے کو تو وہ آریائی نسل کے لوگ تھے لیکن انہوں نے اپنی بھلائی اسی میں دیکھی کہ وہ دکنی یعنی دراوڑی نسلوں کے ساتھ دکن کی مدافعت کریں اور نربدا سے آگے شمال سے آنے والوں کو بڑھنے نہ دیں اس طرح مرہٹہ قوم نے بھی اپنی شناخت دکنی روایات کی بنیاد پر کرنی شروع کر دی۔ اور وہ دکنی کہلانے لگے بلکہ وہ دوسری جنوبی قوموں کے مقابلے میں اپنے کو زیادہ دکنی سمجھتے تھے کیونکہ شمال سے جنوب میں داخل ہونے والوں کی پہلی زد ان پر ہی پڑتی تھی اور پھر وہ دکن سے اٹھ کر آخری مغلیہ دور میں شمالی ہند میں چھا گئے تھے۔ یوں بھی تاریخ میں راشٹر کوٹہ کی حکومت کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔

ایک طرف تو دکنی قوموں نے دکن کے محفوظ علاقوں میں اپنی زبانوں اور تہذیبوں کو فروغ دیا اور مشرق کی طرف توسیع کے امکانات سے فائدہ اٹھا کر ملیشیا، انڈونیشیا، اور تھائی لینڈ وغیرہ ملکوں میں اپنی حکومتیں قائم کیں اور تہذیبی قلعے قائم کئے۔ دوسری طرف انہوں نے عربوں، پھر ایرانیوں اور ان کے توسط سے یونانیوں اور رومیوں سے اپنی تجارتی اور تہذیبی تعلقات مضبوط کئے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ جب

ہندوستانیوں پر سکندر اعظم کا حملہ ہوا تھا تو اس واقعہ پہ دکن کا ردّ عمل اور سیاسی حکمت عملی کیا تھی؟ لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ توازن طاقت کی خاطر دکنی اپنے تعلقات ان قوموں سے خوشگوار رکھنا چاہتے تھے جن کی کشاکش شمالی ہند سے یقینی تھی۔ چنانچہ ایران سے دکن کے تعلقات ابتدا سے مغلوں کے زمانے تک خوشگوار رہے بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ شمالی ہند اور دکن کے تعلقات میں ہمیشہ ایرانی عنصر کو اہمیت حاصل رہی۔

اس تاریخی پس منظر میں دکنی تہذیب کے تشکیلی دور میں ہندی اور ایرانی روایات کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان واقعات و شواہد سے بحث کرنے سے پہلے چند اور تاریخی حوادث کا بھی ذکر ضروری ہے تاکہ دکنی تہذیب کی تشکیل کے تاریخی محرکات کا ہم کو بخوبی اندازہ ہو جائے۔

آخری مرتبہ ہندوستان کی تاریخ میں کلنگ کی مہم میں اشوک نے شمالی ہند کی برتری کو دکن سے منوانے کی کوشش کی تھی لیکن بدھ مت کے افکار اور روایات جو اس وقت تک دکن میں جذب ہو کر اس کا جزو بن چکے تھے "اشوک کے خیالات کے بدلنے کا باعث بنے اور وہ بدھ مت کا حامی اور مبلغ بن گیا۔ وہ ساری کوششیں جو برہمنی تہذیب کے تحفظ کے لئے آریا ورت کے قیام کے بعد شروع ہوئی تھیں یک لخت ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد پھر کوئی ہند دکن کو فتح کرنے کا باضابطہ منصوبہ علاء الدین خلجی کے زمانے تک نہیں بن سکا البتہ سنسکرت زبان کے ماہر اور سنسکرت ادب کے شہ پاروں کے توسط سے شمالی ہند دکن کی زبانوں اور تہذیب پر اثر انداز ہوتا رہا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پھر ایک مرتبہ ذرا مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر دکن کی مدافعت کے قلعے ٹوٹنے لگے۔ سلطنت دہلی کو قائم کرنے والے ترک تھے اور ان میں الباری ترکوں کو فوقیت حاصل تھی۔ رضیہ سلطان اور امیروں کی کشمکش میں الباری ترکوں کی فوقیت کو دھکا پہنچا اور جب جلال الدین خلجی نے سلطنت دہلی پر قبضہ جما لیا تو الباری ترکوں نے اس کی مخالفت کی اس لئے وہ ایک عرصہ تک شہر دہلی میں داخل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جلال الدین خلجی کے ترک خون میں پٹھان خون بھی شامل تھا اس لئے البادی ترکوں نے اس کی قیادت خوشدلی سے قبول نہیں کی۔ جب علاء الدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی سے حکومت چھین لینے کے منصوبے بنانے لگا اور دولت

جمع کرنے کے لئے دیوگڑھ پر حملہ آور ہوا اور بادشاہ بننے کے بعد اس کے جنرل ملک عالم الدین جو حسن گنگو نے دکن کا علاقہ فتح کیا تو البار ی ترکوں نے دلی سے ہٹ کر دکن کے علاقوں کو اپنا مرکز بنانے کی ٹھانی۔ ہر شق گاؤں پر جو امیر مقرر ہوئے اور امیران صدہ کہلانے لگے۔ یہ سب اصل میں البار ی نسل کے ترک تھے۔ محمد تغلق نے جب تاتاریوں کی تاخت و تاراج اور دلی شہر پر ان کی یورشوں کے دباؤ اور علماء کے شرعی تقاضوں سے بچنے کے لئے دیوگڑھ کو اپنا دارالخلافہ بنانے کا فیصلہ کیا اور سختی سے اسے رُوبہ عمل لانے لگا تو اس مہم کا سب سے قوی عنصر البار ی ترکوں کا تھا۔ چنانچہ جب تغلق گجرات والی مہم میں مارا گیا تو ان ہی البار ی ترکوں نے اپنی ایک آزاد سلطنت دکن میں قائم کر لی اور اس کے تتبع میں گجرات بھی دلی سے الگ ہو کر آزاد ہو گیا۔

جب البار ی ترکوں نے نئی آزاد حکومت قائم کر لی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی سیاسی حکمت عملی، نئی تہذیب اور روایات اور نئی زبان کو اختیار کیا۔ یہ کوئی وقتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ نئی سیاسی فکر، نئی تہذیب اور نئی زبان کا دراصل ایک عرصہ پہلے ہی آغاز ہو چکا تھا۔ سلطنت دہلی کے زمانے میں داخلی اقتدار ترکوں اور علماء کی مصالحت کی بناء پر دو گروہوں میں تقسیم تھا۔ بیرونی اقتدار یا جواز کو عباسی خلیفہ کے فرمان سے حاصل کیا گیا تھا۔ داخلی حکومت کا دارومدار فوجی تنظیم اور علماء کی شرعی ذمہ داری اور خلیفۂ وقت کے برائے نام ہی سہی جواز نے مل جل کر سلطنت دہلی کو قائم کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو سلطنت دہلی مختلف بااثر عناصر کا متوازن نظام تھا لیکن جب سلطنت عباسیہ کمزور ہو گئی اور ایران میں صفوی حکومت کا اقتدار بڑھا تو ہندوستان میں بھی ایک نئی سیاسی فکر کا آغاز ہوا۔ سب پر یہ بات عیاں تھی کہ خلیفۂ وقت کا تحفظ ہندوستانی مسلمانوں کی حکومت کو تاتاریوں جیسی وحشی قوموں کے حملوں سے نہیں بچا سکتا تھا تو انھیں اپنے داخلی حالات پر نئے انداز سے نظر ڈالنی پڑی اور ان کے سامنے ہندوستان کی عظیم آبادی اور ان کی طاقت کا جن کی تہذیب زبان اور مذہب بالکل الگ تھے احساس ہوا تو انہوں نے اپنی حکمت عملی میں پہلی دفعہ ہندوستانی عنصر کو اہمیت دی اور اس کو پیش نظر رکھ کر اپنی سیاسی فکر کی تشکیل شروع کی۔

اسی عرصہ میں ہندوستان میں مختلف صوفیائے کرام نے اپنا اثر بڑھانا شروع کیا

تھا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ چشتی طریقت نے ہندوستان کو یہ ... اس کی تمام
تفصیلات میں گئے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ (HUMANISM) یعنی انسان
دوستی یا احترام آدمیت کا ایک تہذیبی اور فکری ورثہ فروغ پا رہا تھا۔ حضرت نظام الدین
اولیاء کے زمانے تک اسی تہذیبی ورثہ نے اتنی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ بادشاہ اور
شرع پسند علماء جن کے درمیان اقتدار تقسیم تھا اس تہذیبی مزاج سے گھبرانے لگے تھے۔
صوفیوں، درویشوں کے جو قافلے دکن کی طرف گئے، وہ اسی تہذیبی ورثہ کے حامل
اور محافظ تھے۔ دلی کے برخلاف دکن میں شرع پسند علماء کا عمل دخل تقریباً نہ ہونے
کے برابر تھا۔ گو کہ چشتی خانوادے کی سیاست سے غیر جانبدارانہ روایات
حضرت خواجہ بندہ نواز کی وجہ سے قائم تو نہ رہ سکیں لیکن احترام آدمیت اور انسان
دوستی کی روایت کو بہرحال فروغ ملا۔

یہ بھی ایک مطالعہ کے قابل اہم پہلو ہے کہ اس زمانے کا شمالی ہند کا معاشرہ
چار طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طرف تو بادشاہ اور امیر تھے جن کے ہاتھوں میں فوجی
اور سیاسی اقتدار تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی انہوں نے شرع پسند علماء کو اس اقتدار میں
شریک کر لیا تھا اور ان کے شرعی احکام کی پابندی کو اپنے اقتدار کی سلامتی کے لئے
ضروری سمجھتے تھے۔ تیسرا طبقہ صوفیوں، درویشوں، دانشوروں اور عوام کا تھا، جو انسان
دوستی کے آہنگ اور لَے کے شیدائی تھے وہ شرع سے زیادہ اس کی معنویت اور روحانی
قدروں کے قائل تھے۔ وہ اصولوں کی سخت گیری کی جگہ خدا ترسی اور خدمتِ خلق،
محبت و آشتی کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ ایک چوتھا طبقہ بھی تھا جو معاشی
دھندوں اور محنت کشوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بھی عام طور پر بھگتی کے اثرات پھیل
رہے تھے۔ خدا ترسی اور انسان دوستی کے راگ گائے جا رہے تھے۔ ان چار بنیادی
طبقوں کے علاوہ چند ذیلی طبقات بھی تھے۔ مثلاً مختلف مذاہب اور فرقوں اور مذہبوں
میں بٹے ہوئے مذہب پسند گروہ تھے۔ یہ طبقے مسلمانوں میں بھی تھے اور ہندوؤں
میں بھی تھے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ دکنی زبان کے فروغ میں بھگتی تحریک کا خاصا
عمل دخل رہا ہے۔ خصوصاً مرہٹی ادب میں کئی نامور بھگت پیدا ہوئے ہیں۔ دکنی
زبان میں سب سے زیادہ بھگتی ادب کے پیدا ہونے کی ایک وجہ یہی تھی کہ درویشوں

اور صوفیوں نے جنوبی ہند میں سب سے پہلے اپنا مرکز بنالیا تھا اور شرع پسند علماء کا عمل دخل یہاں بہت کم تھا یا نہ ہونے کے برابر تھا۔

یہ بھی عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ محمد تغلق کا جانشین باوجود اس خصوصیت کے کہ اس نے شرعی پابندی پر حقیقی حصوں میں پوری توجہ دی اور صدقِ دل سے اس حکمتِ عملی کی پیروی کی لیکن اس کی انصاف پسند طبیعت نے اس عہد کی انسان دوستی کی روح اور روایت کو پوری قوت سے جذب کیا تھا اور پہلی مرتبہ ہندوستان کے شہ پارے سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے فارسی میں منتقل ہوئے بلکہ اس کی تجسس پسند طبیعت نے پرانے کتبوں کو بھی دریافت کیا اور باوجود اس کے کہ ان کتبوں کا ترجمہ نہ ہو سکا اس کے تحفظ کی فکر کی۔

انسان دوستی کی یہ سب روایات دکنی تہذیب میں جذب ہوئیں اور اس کے فروغ میں پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکنے لگیں چنانچہ جب بہمنی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے سیاسی فلسفہ میں انسان دوستی اور خدا ترسی کے عناصر پوری قوت سے شامل ہوئے اور دکنی زبان اور تہذیب کی صورت گری میں خاص کردار ادا کیا۔

جب کسی معاشرہ کا جائزہ لیا جائے اور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ طبقاتی حکمتِ عملی سیاسی فکر اور سماجی تنظیم کے پس پردہ جو تحریکات کام کرتی ہیں ان میں زبان اور اقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کبھی تو اقدار ایک نئی زبان کے بنانے کا باعث ہوتے ہیں اور کبھی زبان نئی مناہجِ فکر اور فلسفۂ حیات سے متاثر ہو کر نئے سانچوں میں ڈھلتی نئے محاوروں، کہاوتوں، کنایوں، استعاروں، تشبیہوں کے ساتھ ساتھ نئی صحت یاب کے بل بوتے نئی تہذیب کی داغ بیل ڈالتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبان گو ترکی تھی لیکن ان کی تہذیبی زبان فارسی نے ان کو اپنے رنگ میں پوری طرح رنگ لیا تھا۔ لیکن مثبت اندازِ فکر کے حامی اور علمبردار ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک نئی زبان فطرتی طور پر بنانی شروع کر دی تھی۔

اس زبان کے بننے میں جو قومی محرکات کارفرما تھے، ان میں انسان دوستی اور خدا ترسی کی روایات کو اولیت حاصل تھی ایک نئی سیاسی فکر اور حکمتِ عملی جو نئی سلطنت کے لئے ضروری تھی، ایک نئی زبان کے اشتراک سے نئی قوت کی حامل ہیں۔ فارسی زبان اس نئی مناہجِ فکر، انسان دوستی، نئی حکمتِ عملی کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ بہمنی سلطنت کا آغاز ہی نئی تہذیبی قدروں اور نئی سیاسی حکمتِ عملی اور نئی مناہجِ فکر، نئی زبان کے بل بوتے پر ہوا۔ اور ان ہی خصوصیات سے اپنی

، ذات کا تشخص ، حقیقی سیاسی مصالح کا اعتراف ، انسان دوستی ، محبت ، بھائی چارگی ، صبر و تحمل بردباری ، قناعت اور وفاداری کی نئی تہذیبی قدروں کی بے پناہ قوتوں سے نئی زبان وادب مالا مال ہوئے یہ خصوصیات ان کا طرۂ امتیاز بنے اور ان ہی تاریخی محرکات سے دکنی زبان ، ادب اور تہذیب کی آبیاری ہوئی ہے ۔

پچھلے پانچ سو سال کی تاریخ کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ کس طرح دکنی تہذیب ، افکار اور ادبیات نے دنیا کی پرانی تہذیب سے جاندار عناصر لے کر پورے خلوص سے اپنے میں سمولیا ، اور جذب کیا اور ان کو ایک متوازن سانچے میں ڈھال کر ایک نیا آہنگ دیا جس کی مثال دنیا کی تہذیبوں میں بہت کم ملتی ہے ۔ اسی دور میں خاص طور پر فارسی عناصر نے دکنی اور تہذیبی روایات پر غلبہ پانے کی کوشش کی لیکن ہر مرحلہ پر اپنی جان افروز خصوصیات ، دکھنی تہذیب وادب کو دے کر میدانِ تقابل سے ہٹ جانے پر مجبور ہوئی ۔

سلطنتِ دکن کے قیام کے ساتھ ہی بہمنیوں نے اسی زمانے کی ملی جُلی زبان جس کا آغاز نواحِ غزنی میں ہوا تھا اور پنجاب کی فتح اور غزنی سلطنت میں اس علاقے کے شمول کے بعد اپنے میں پنجابی عناصر کو جذب کر لیا تھا اور جب سلطنتِ دہلی قائم ہوئی تو دلّی اور اس کے اطراف کی بولی جانے والی ہندوستانی مقامی زبانوں سے اثرات اور سانچے قبول کر کے امرائے صدہ کے ساتھ دکن پہنچی تو اس میں اتنی تاب و توانائی پیدا ہوگئی کہ وہ فارسی کی جگہ سرکاری اور ادبی زبان کا کام دینے لگی اور اپنی علیحدہ شناخت کا نشان بنی ۔ بہمنیوں نے نہ صرف دکھنی زبان کو اپنایا اور غیر مذہبی بنیادوں پر اپنے سیاسی فلسفہ کا خمیر تیار کر کے اسلامی مرکز سے دہلی سے ٹوٹ کر مقامی آبادی کی تائید اور شراکت کے وسائل پیدا کئے بلکہ سیاسی مصلحت کی بنا پر انہوں نے دارالسلطنت کو دولت آباد سے گلبرگہ منتقل کیا ۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ دلّی کی فوجی زد سے باہر رہیں اور دوسری طرف دور افتادہ جنوبی علاقوں پر اپنی سیادت کو موثر بنا سکیں ۔ کم و بیش اسی زمانے میں وجئے نگر کی سلطنت قائم ہوئی تھی اور اس کی توسیع کی کوششیں ہو رہی تھیں ۔ پھر انہوں نے توازنِ قوت کی غرض سے ایران سے اپنے تعلقات کو بہتر کرنا شروع کیا ۔ یوں تو دکنی زبان اور تہذیب کا فروغ بہمنیوں کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو چکا تھا اور اردو درباری اور ادبی زبان بن چکی تھی اور خود ترک سردار جنہوں نے دکن آ کر اپنا سیاسی اقتدار جمایا تھا ، حبشیوں ، مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک نئی

قومیت کا تصور پیدا کیا تھا اور وہ اپنے آپ کو دکنی کہتے تھے لیکن اقتدار کا دارومدار فوجی استحکام پر تھا اس لئے ہمیشہ باہر سے آنے والے فوجیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب راست ایران سے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور سمندری راستے سے تجارت ہو رہی تھی۔ اس لئے ایرانیوں اور دوسرے بیرونی افراد کی وجہ سے فارسی یک لخت ختم نہ ہو سکی۔ البتہ اس کا استعمال اور ایرانی و بیرونی تہذیب کے اثرات خاص طور پر ان علاقوں میں یا ان گروہوں میں باقی تھے جہاں ان کی آبادیاں بسی تھیں۔ یہ بات بھی مسلم ہو چکی ہے کہ دکنی اور بیرونی افراد اور طبقوں میں تناؤ پیدا ہونے کی وجہ سے بہمنی فوجیں دو حصوں میں بٹ چکی تھیں بلکہ سلطنت کے مختلف صوبے، دکنی اور بیرونی صوبہ داروں کے تحت مختلف تہذیبی گڑھ بن گئے تھے۔ بادشاہوں میں کچھ ایسے تھے جو دکنی امیروں کے زیر اثر آئے اور غیر ملکی امیر ان کے مخالف بن گئے، اور کبھی بیرونی امیروں، صوفیوں اور درویشوں نے شاہی محلات میں اپنا عمل دخل بڑھایا اور دکنی امیروں نے ان کے خلاف بغاوت کی۔ دکنی اور بیرونی اثرات نہ صرف زبان تک محدود تھے بلکہ سنی شیعہ عقائد کی کشمکش بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ بعض صوفیوں نے سیاسی مصلحت کی بنا پر ان عقائد سے ایک طرح کا سمجھوتہ بھی کر لیا تھا ۔۔۔ بدقسمتی سے ابھی تک دکنی ادب کا تہذیبی اور تجزیاتی مطالعہ ان سیاسی محرکات کی روشنی میں نہیں ہوا اگر اسی نقطۂ نظر سے دکنی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ادبی سرپرستی اور ادبی شہ پاروں کی منہاج فکر سے اس تناؤ کا ثبوت ملتا ہے۔

جب محمود گاواں نے دکنی صدر جہاں کی جگہ لی تو سلطنت بہمنی کی تنظیم نو کی اور جگہ جگہ اپنے با اعتماد بیرونی صوبہ داروں مقرر کیا اور جہاں دکنی صوبہ دار مشتبہ تھے ان کو کمزور کرنے کے لئے اپنے اعتماد کے بیرونی قلعہ داروں کو متعین کیا۔ اس تنظیم نو کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایرانی تہذیب اور زبان نے پھر ایک مرتبہ میدان مار لیا ہے۔ لیکن بیرونی امیروں کا یہ اقتدار دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ محمود گاواں دکنی امیروں کے منصوبوں کا شکار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد بہمنی سلطنت ٹوٹ کر دکنی اور بیرونی صوبوں میں بٹ گئی اور پانچ سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ گولکنڈہ ترکی النسل شیعہ صوبہ داروں کے قبضہ میں آیا تو اس کے ایران سے خصوصی تعلقات قائم ہوئے اور گولکنڈہ کے ادب پر ایرانی اور مقامی

روایات کا غلبہ رہا۔ بیجاپور میں عثمانی ترک نسل کا شہزادہ بادشاہ بنا اور یہاں کی دکھنی زبان اور ادب میں ہندی روایات کی بہتات تھی۔

شیعہ سنی کی کشمکش یہاں بھی جاری رہی اور جب کبھی کوئی بادشاہ شیعہ عقائد کا حامی بنا تو اس نے دکھنی زبان کی جگہ فارسی کو سرکاری زبان بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح بیجاپور میں دکھنی کی بجائے فارسی کو سرکاری زبان بنانے کی چار مرتبہ کوششیں ہوئیں — لیکن بالآخر دکھنی زبان نے اپنا لوہا منوالیا۔ بیجاپور کی دکنی زبان ہندی روایات کی نمائندہ بنی اور گولکنڈہ کی دکھنی پر فارسی اثرات اور روایات کا غلبہ رہا۔ جب غواصی سفیر بن کر بیجاپور پہنچا تو بیجاپور کے ادبی سانچوں میں کچھ تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ بیجاپور کا دکنی ادب ہندی روایات سے سرشار ہو کر ایک نئی نہج اور نئے لہجے اور اسلوب کے لئے بیتاب تھا۔ اس ضرورت کی تکمیل فارسی روایات سے پوری ہوئی۔ غواصی کی دکنی شاعری میں فارسی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ بیجاپور کے شاعروں نے اس اسلوب کو اپنایا اور غواصی کی پیروی کی۔ اس طرح ہندی اور فارسی روایات میں ایک طرح کا خوشگوار توازن قائم ہو گیا۔

گجرات کی فتح کے بعد گجراتی زبان اور تہذیب کا مرکز اور طبہ تباہ ہوا تو گجری زبان کے شاعر اور ادیب زیادہ تر بیجاپور پہنچے تھے، یہاں ان کی سرپرستی ہوئی اور گجری زبان کی ساری روایات بیجاپور کے دکھنی ادب کا جزو بنی۔ اور ہندی روایات کا فروغ ۱۵۲۵ء سے ۱۶۲۷ء تک قائم رہا۔ عادل شاہ ثانی کو جو جگت گرو کے نام سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے، ان روایات کا بہترین نمائندہ سمجھنا چاہیئے۔

غواصی کی سفارت کے بعد سے بیجاپور میں نئے اثرات کا آغاز ہوتا ہے۔ ملک خشنود جو بیجاپور کی دکنی روایات کا نمائندہ تھا جب گولکنڈہ کا سفیر مقرر ہوا تو اس نے ہندی سانچوں میں فارسی آب و رنگ بھرنا شروع کیا۔ ہندی اور فارسی روایات کے خوش گوار امتزاج سے دکنی زبان میں ایک نئی دلکشی، نیا دل آویز اسلوب بیان اور نئی صنعیات داخل ہوئیں۔

دکن کی طرح گجرات میں بھی نہ صرف ایک آزاد حکومت قائم تھی بلکہ گجری زبان اور تہذیب کی داغ بیل بھی پڑی تھی۔ اکبر کی فتح گجرات کے بعد آزادی اور گجری زبان کی حیثیت ختم ہو گئی اور فارسی نے پھر اپنا سکہ جما لیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتوحات کے بعد یہاں پھر ایک بار دکنی کے بجائے فارسی کے اثرات بڑھنے لگے۔ یوں تو مغل بادشاہ سنی تھے، لیکن

ان کی سرکاری اور تہذیبی و معیاری زبان فارسی تھی۔ ترکی کا رواج رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا،
چند [illegible]وں تک محدود تھا۔ اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ مغلوں کا بخارا اور سمرقند سے کوئی
تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ کہنے کو تو شہزادہ اورنگ زیب نے شاہ جہاں کے حکم کی:
بخارا اور سمرقند کی مہموں میں کچھ کامیابی حاصل کی تھی لیکن یہ فتح دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔
دوسری خاص وجہ یہ بھی تھی کہ مغلوں نے زیادہ تر ایرانی اور ہندوستانی عورتوں سے
کیں، اس لئے مغل محلات میں ایرانی تہذیب اور زبان کے اثرات غلبہ پاتے رہے
لیکن خود مغلوں کے محلوں میں ایک خاموش لسانی انقلاب بتدریج رفتہ رفتہ پیدا ہو رہا تھا
جب اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ فتح کرنے کے بعد مرہٹوں سے نمٹنے
اورنگ آباد کو اپنا دارالخلافہ مقرر کیا تو یہاں لسانی لین دین سے دکنی اور فارسی روایات
توازن سے ایک بانکی اور رسیلی زبان کے فروغ کے وسیلے پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ ا
تمام روایات سے سرشار ولی اورنگ آبادی نے دلی کا سفر کیا اور دلی کے فارسی
پر دکنی زبان کے رچاؤ نے اثر جمایا اور فارسی گو شاعر بھی ریختہ میں شریک
تو رفتہ رفتہ سارے شمالی ہندوستان میں دکنی زبان کو مقبولیت حاصل ہوئی او
میں یہ زبان دکنی کی بجائے اپنے زمانہ آغاز کے لقب اردو سے معروف ہونے لگا
دفتری فارسی کچھ اور عرصے تک قائم رہی لیکن اردو کی مقبولیت اس تیز رفتاری سے
بڑھی کہ سرکار، دربار، شاعر، ادیب، صوفی، درویش، ٹکسالی اور عوام سب
زبان کے شیدائی بن گئے اور اردو سب کی زبان بن گئی۔

آصف جاہی دکن میں مغلوں کے جانشین بنے تو ان کی زبان فارسی تھی۔ رفتہ
اردو کے اثرات بڑھ رہے تھے۔ سالار جنگ اول نے کہا تھا کہ ان کے جیتے جی
کو نکالا نہیں جائے گا لیکن ان کے بعد بہرحال اردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ سالار جنگ
ساری مدافعت بے سود ثابت ہوئی۔ اردو نہ صرف سرکاری اور تہذیبی زبان کی حیثیت
سے فارسی کی جگہ لی بلکہ شمس الامراء کی وجہ سے اردو زبان میں علمی اور سائنسی ادب
اضافہ ہوا۔ بالآخر جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے مختلف لوگوں کی مخالفت کے باوجود اعلیٰ تعلیم
ذریعہ بنی اور اس طرح اردو بولنے والے سائنسی تہذیب سے آشنا ہوئے اور سائنس
دکنی تہذیب میں داخل ہوا۔

آزادی کے بعد ہندی کی سرکاری سرپرستی کی وجہ سے اُردو ایک نئی کشمکش سے دوچار ہوئی ہے۔ ہندی جو دراصل اُردو ہی کی ابتدائی شکل کا نام ہے اب سنسکرت کے اثرات کی وجہ سے نئے اور غیر مانوس اسلوبِ زبان کے گورکھ دھندوں میں پھنس رہی ہے۔ پھر وہ زبان جو نامانوس اور کرخت الفاظ سے بوجھل ہو جاتی ہے' عوام سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب بیجاپور کی ہندی روایات سے گولکنڈہ کی روایات کا خوشگوار امتزاج ہوا تو ہندی کے نامانوس اور دلکش الفاظ سڈول سانچوں میں ڈھل گئے' اور ایک نکھرا اور ستھرا اسلوبِ بیان پیدا ہوا۔ یہ سچ ہے کہ زبان میں عظمت و وقار کے ساتھ ساتھ کچھ حد تک تصنع بھی پیدا ہوا تھا۔ لکھنؤ والوں نے اس تحریک کو اس حد تک شہ دی تھی کہ فارسی اور عربی الفاظ اپنے اصلی لہجے میں ادا ہوں اور ان کی جمع بنانے کے فارسی اور عربی قاعدے برقرار رکھے جائیں۔ لیکن یہ تحریک کچھ زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئی۔ اسی تحریک کی وجہ سے اُردو زبان میں تراش خراش نزاکت' معنویت اور بلاغت تو پیدا ہوئی لیکن یہ سب کچھ ان الفاظ اور محاوروں تک محدود تھا جن کا چلن ٹکسال میں ہو سکا اور ان کو عوام کی قبولیت حاصل ہوئی۔ جن الفاظ اور محاوروں پر عوام کی قبولیت کا ٹکسالی ٹھپہ نہ پڑا وہ چلن سے خارج ہو گئے۔ اُردو زبان کو اپنی ذات کو تمام بیرونی اثرات سے محفوظ رکھتے ہوئے اپنے مزاج کے مطابق بڑھنے اور فروغ پانے کی قوت دراصل دکنی تہذیب کی دین ہے۔ اس لئے وہ ہر ایسی تحریک سے اپنا دامن بچا لیتی ہے جس کی وجہ سے اس کا رشتہ عوام کی بے پناہ قوت سے کٹ جاتا ہے اس کے برخلاف سنسکرت روایات جو جدید ہندی پر غلبہ پا رہی ہیں' وہ روایات اس کو عوام سے رشتہ توڑنے پر مجبور کرتی ہیں' اس لئے ہندوستان کی وہ روایات' جن میں میل ملاپ' اشتراکیت و تعاون' لین دین کی روح کار فرما ہے' ہندوستان کی عظمت' ترقی اور اس کے روشن مستقبل سے وابستہ رہیں گی۔

فلاطینوس کے افکار • صفحہ ۲ سے آگے:

بس مست و مدہوش تھا۔ عبادت و ریاضت اور وجد و بےخودی کی زندگی گزارتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ اس بات کا [illegible] [illegible] آر۔ [illegible] ہے کہ اگر کوئی فلاطینوس کے فکر و عمل [illegible] و عبادت [illegible] اس کو اس بات پر حیرت نہ ہوتی۔

قمر جمیل

حمد

میری آنکھیں میری جان
تیرا عبادت خانہ
اور اپنے لیے اک نارِ جحیم
میرا دل ہرنوں کے لئے
میدانِ عظیم
اور اپنے لئے اک خانۂ بیم
میرا دل توریت کی شان
میرا دل قرآنِ کریم

میں نے اپنی مٹی اپنا پانی
اپنا خون نہ سمجھا اپنا خون
دیکھو یہ دیوانہ شخص
جس کے لئے لایا ہے کوئی
ایک چراغِ مبین

▲

سلیم کوثر

نعت

وہی ذکرِ شہرِ حبیب ہے وہی رہ گزارِ خیال ہے
یہ وہ ساعتیں ہیں کہ جن میں خود کو سمیٹنا بھی محال ہے

یہی دن تھے جب کوئی روشنی مرے دل پہ اتر سکی تھی اور اب
وہی دن ہیں اور وہی وقت ہے وہی ماہ ہے وہی سال ہے

یہی اسمؐ ہے بجز اس کے کوئی بھی حافظے میں مرے نہیں
یہی اسمؐ میری نجات ہے یہی اسمؐ میرا کمال ہے

یہاں فاصلوں میں ہیں قربتیں یہاں قربتوں میں ہیں شدتیں
کوئی دور رہ کے اویسؓ ہے کوئی پاس رہ کے بلالؓ ہے

ترا ان کے بعد بھی ہے کوئی مرا ان کے بعد کوئی نہیں
تجھے اپنے حال کی فکر ہے مری عاقبت کا سوال ہے

وہ ابھی بلائیں کہ بعد میں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں
میں صدائے عشقِ رسولؐ ہوں مرا رابطہ تو بحال ہے

ڈاکٹر صفدر علی بیگ

فلاطینوس کے افکار

فلاطینوس (PLOTINUS) مصری نو فلاطونی (NEOPLOTONIC) مفکر (۲۰۴ء تا ۲۶۹ء) مصر کے ایک شہر لیکوپولس (LYCOPOLES) میں پیدا ہوا اور امونیئس سکاس (AMMONIUS SACCAS) سے اسکندریہ میں گیارہ سال تک فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۲۴۴ء میں اس نے روم کا سفر اختیار کیا جہاں اس نے ایک مکتب قائم کیا۔ اس نے پچاس سال کی عمر تک اپنے فلسفہ کو تحریر میں نہیں ڈھالا۔ ۲۶۹ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کے شاگرد پورفائری (PORPHYRY) نے اس کے تحریر شدہ مسودوں پر نظرِ ثانی کر کے اپنے استاد کی سوانح حیات کے ساتھ انیڈس (ENNEADS) کے نام سے شائع کیا جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ایس۔ میکنّا (S.MACKENNA) نے شائع کیا۔

نو فلاطونیت دراصل ایک مذہبی فلسفہ تھا جو یونانِ قدیم کے فلسفہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا اور ارتقا پاتا رہا۔ فلاطینوس کا خیال تھا کہ خدا وجودِ حق اور تمام مخالف قوتوں، اختلافات، ذہنی قوتوں اور اجسام، مادہ اور اشکال کا منبع اور سرچشمہ ہے لیکن وہ خود دوئی اور کثرت سے پاک اور واحد ہے۔ وہ ایک ایسی وحدت ہے جو اپنی [illegible] وحدت میں تمام اشیاء کو اپنے اندر رکھتی ہے وہ پہلا سبب ہے جو بغیر اسباب و علل کے ہے جس کے ارادے سے تمام اشیاء پیدا ہوتی ہیں، جس سے ہر [illegible] ظاہر ہوتی ہے۔ وہ [illegible] وجود سے پہلے اور اس سے ماورا ہوتی ہے۔ اس کی ماہیت ایسی ہے کہ ہم [illegible] کے تعلق سے کہیں اس سے وہ [illegible]

ہے۔ اس لئے ہم اس کو حسن یا نیکی یا خیال یا ارادہ سے متصف نہیں کر سکتے کیونکہ ہر صفت سے محدودیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے۔ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا نہیں ہے۔ ہم اس کو وجود کی تعریف میں نہیں لا سکتے۔ کیونکہ وجود وہ ہوتا ہے جو سوچا جا سکتا ہے اور جو کچھ سوچا جا سکتا ہے وہ 'ذات یا شے' مطلب رکھتا ہے' اس لئے محدودیت پر مبنی ہے۔ وہ حسن' صداقت' نیکی' شعور اور ارادہ کے تصور سے بھی بالا تر ہے کیونکہ ان سب کا انحصار صرف اسی پر ہے۔ یہ کہنا کہ خدا سوچتا یا ارادہ کرتا ہے اس کو محدود کر دیتا ہے اور یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ وہ کیا سوچتا اور ارادہ کرتا ہے۔ سوچنا اور ارادہ کرنا محدود کی صفت ہے۔ لہٰذا اس طرح سمجھنا اس کی مکمل آزادی کو لوٹ لینا ہے۔

فلاطینوس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگرچہ کائنات اس سے پیدا ہوئی ہے لیکن خدا نے کائنات کی تخلیق نہیں کی۔ کیونکہ تخلیق کا مطلب شعور اور ارادہ ہے جو محدودیت پر مبنی ہے۔ خدا نے دنیا پیدا کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ دنیا خدا سے ارتقا پائی ہے کیونکہ خدا مکمل ترین ہے۔ صرف یہ ہے کہ کائنات خدا ہی سے ظاہر ہوتی ہے اور خدا کی لامحدود قوتوں اور حقیقت و اصلیت کا ناگزیر بہاؤ ہے۔ [یہاں ایک چیز واضح ہونا ضروری ہے کہ کائنات ظاہر تھی لیکن انسان پر خود اس کے ظہور کے بعد ظاہر ہوئی۔ فلاطینوس نے ظہور کے تصور کو کئی استعاروں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ مثلاً خدا ایک سرچشمہ ہے جس سے تمام نہریں بہتی ہیں لیکن اس کے سبب سے اس لامحدود سرچشمے میں کمی نہیں ہوتی۔ خدا خود علت ہے مگر معلول میں گم نہیں ہوتا۔ معلول علت کی تکمیل نہیں کرتی۔ معلول خدا کے لئے ضروری نہیں ہے۔ کائنات خدا پر منحصر ہے لیکن خدا کائنات پر منحصر نہیں ہے' ہر ایک چیز جو ظاہر ہوئی اپنے سرچشمے کی طرف رجوع ہوتی ہے اور اپنا مقصد اور مدعا اپنے منبع سے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ایسا ہی تصور مولانا جلال الدین رومی نے بھی ظاہر کیا ہے ؂

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائیہا شکایت می کند

(سنئے سے سنو کہ وہ کیا حکایت اور فریاد سنا رہی ہے' وہ اپنے نیستاں سے جدا ہو جانے کی شکایت کر رہی ہے)

حسن کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے فلاطینوس کہتا ہے کہ عموماً لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی شے کے ایک حصے کا دوسرے حصے سے اور تمام حصوں کا اصل شے سے موزون ہونا

ذن اور خوبصورت رنگوں ہی کا نام حسن ہے جس کا ادراک آنکھوں کے ذریعہ ہوتا ہے، اس
ۂ حسین شئے کا متوازن ہونا ضروری ہے۔ اس کا خیال تھا کہ حسن نظر فریب ہونے کے ساتھ
ع نواز بھی ہوتا ہے۔ یعنی چند خاص لفظوں کی موزوں یکجائی، موسیقیت، آوازوں کی ہم آہنگی
جوش آیند امتزاج سے حسن ظاہر ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کا ہر انسان دیکھتا ہے کہ حسن و جمال کائنات کے ذرہ ذرہ
جلوہ گر ہے۔ چمن دہر کے حسین غنچہ و گل، رنگا رنگ درخت، خوبصورت اور خوش
ع طیور، گوناگوں اور بوقلموں پتھر اور سیپیاں، دلفریب و دل نواز سبزہ زار، آبشار،
سار اور جوئبار، جگمگاتا ہوا آفتاب و ماہتاب، جھلملاتے ہوئے ستارے، نظر فریب
ں قزح اور رنگین جمال و پری پیکر حسینائیں کس کے لئے جاذب نظر نہیں۔ لیکن حسن
ت آنکھوں سے نظر آنے والے مناظر اور اشیاء ہی میں نہیں ہوتا بلکہ سنائی دینے والی
وں میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ بعض ایسی
دں اور ہستیوں میں بھی حسن ہوتا ہے جو نہ دکھائی دیتے ہیں اور نہ سنائی دیتے ہیں،
حسن کردار، گفتار، عمل اور فطرت، نیکی و کمال، علم و عقل اور اسی قسم کی کئی چیزوں میں
ی موجود ہوتا ہے۔

ایسی ہی چیزوں کے حسن پر اظہار خیال کرتے ہوئے فلاطینوس کہتا ہے کہ وہ اذہان جو
سے احساس حقایق تک رسائی ہو سکتے ہیں کردار، عمل، فکر تجسس اور نیکی اور خیر کے حسن سے بھی
ہ ہوتے ہیں۔ پھر فلاطینوس سوال کرتا ہے کہ زندگی کے اطوار اور تخیلات کے اظہار میں کونسی چیز جاذبیت
ا ہے۔ کیا یہاں بھی کوئی توازن ہے۔ کیا اعلیٰ کردار، عمدہ قوانین اور فکری تجسس میں توازن ہو سکتا ہے
ہیں۔

فلاطینوس کے نزدیک ہر نیکی روح کا حسن ہے اور ایسا حسن جو قابل اعتماد ہے اگرچہ بعض حسن
لئے کوئی خاص شکل و صورت یا رنگ و روپ نہیں۔ یہ حسن اپنی ذات اور دوسرے کے اندر
ہے۔ ایسا حسن پاک روح، نیک زندگی، پاکیزگی، ہمت و جرأت، سنجیدگی، انکسار (جو کسی خوف
یعنی کسی بنا پر نہ ہو) میں موجود ہوتا اور ضو فشانی کرتا ہے۔ اس لئے ان ساری ارفع و اعلیٰ صفات
مد اور ان سے محبت ضروری ہے۔

فلاطینوس کو متذکرہ بالا صفات میں حسن اور ان کے برعکس صفات میں بد صنعی اور قبح

نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایک بدی، بداخلاقی، ہوس، خود غرضی، نفرت پرستی، بزدلی، بغض وحسد، لاعلمی، جہالت اور کم عقلی کے ساتھ ساتھ جہان فانی کی ادنیٰ اشیار کے لئے فکرمندی، خواہشات نفسانی کی پیروی، ناپاک لذتوں سے اُنس اور عیش پرستی میں مسرور رہنا روح کی بدوضعی اور قباحت کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی بدوضعی اور قباحت شر کی حیثیت رکھتی ہے اور حسن کی ضد ہے۔

انسانی فطرت اور نفسیات کا جائزہ لیتے ہوئے فلاطینوس یہ بھی کہتا ہے کہ فطرت انسانی حسن سے محبت اور بدصورتی سے نفرت کرتی ہے۔ روح انسانی بدصورتی سے گھبراتی، کتراتی، گریزاں رہتی اور اس کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ روح انسانی اصل میں پاک و پاکیزہ ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اعلیٰ حقائق اور اپنی ہی طرح پاکیزہ اشیار کی طرف راغب ہوتی ہے اور ان کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ فلاطینوس حسن کو لافانی شئے اور بدوضعی کو لافانی چیز سمجھتا تھا۔

بہر صورت عالم ظاہری اور کائنات ہستی کا سارا حسن و جمال، زیبائی و دلکشی عارضی اور فانی ہوتی ہے۔ وہ نامکمل اور زوال پذیر بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے صوفیا اور شعرار نے اس کو حسن مجازی سے تعبیر کیا ہے۔ حکما اور صوفیا کا خیال ہے کہ یہ مجازی حسن بذات خود قائم نہیں ہے بلکہ کسی لامحدود ولافانی اور بے مثال ولازوال حسن کا عکس یا سایہ ہے۔ اس کا سرچشمہ یا منبع، انسان سے پنہاں ہے جو کچھ حسن ظاہر ہے وہ باطنی حسن کے ظاہری نقوش ہیں۔ باطنی حسن اللہ تعالیٰ کی ذات باکمال میں موجود ہے اور جمال مطلق کہلاتا ہے۔ اسی چشمۂ نور نے کل مخلوقات کو آب و تاب دی ہے اس کا پرتو ہر خشک و تر پہ نمایاں ہے اور اسی حسن مکمل کے جلوؤں نے ہر ذرۂ عالم کو بقعۂ نور اور شمع طور بنا رکھا ہے۔

فلاطینوس کہتا ہے کہ ہم کو اصل سرچشمے کی طرف رجوع ہونا چاہیئے جو تمام مادّی اشیار کو حسن سے سرفراز کرتا ہے یہی ایک ایسی اصل ہے جس کو روح اپنی قدیم یادداشت اور معلومات کے ذریعے پہچانتی، اس کو خوش آمدید کہتی اور اس سے گھل مل جاتی ہے۔ سارے جہان رنگ و بو کی جاذبیت اسی حسن کے سبب سے ہے۔ ایسا ہی خیال ظاہر کرتے ہوئے افلاطینوس نے کہا تھا کہ ایسا شخص جس کا ذہن دنیاوی آلائشوں سے پاک نہ ہو وہ ماورائے کائنات کے حسن کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ صرف کائنات کے ظاہری حسن کو دیکھتا ہے اور اس کے نظارے سے متحیر اور مرعوب ہونے کی بجائے اس سے لذت اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ وحشی جانور کی طرح حصول

لذّت کے لئے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ صرف لذّت کا دلدادہ ہے۔ لذّت حاصل کرنے کے بعد اس کو برباد کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور نہ اس عمل پر پشیمان ہوتا ہے لیکن وہ شخص جس نے عالمِ بالا میں حسن کے لاتعداد کرشمے دیکھے ہیں ایسی شے کو دیکھ کر جو خدائی حسن کی حامل ہو متحیر و حیران رہ جاتا ہے۔ وہ محبوبِ مجازی میں محبوبِ حقیقی کا نظارہ کرتا اور اس کی تعظیم کرتا ہے۔ روحِ انسانی اس حسن کے مشاہدے سے تازہ و بالیدہ ہوتی اور غم و درد سے چھٹکارا حاصل کرتی ہے۔ اس وقت جو لذّت اس کو حاصل ہوتی ہے وہ تمام لذّتوں سے سوا ہوتی ہے۔ اس لئے روحِ انسانی اس میں اس قدر محو ہو جاتی ہے کہ سب کچھ بھول بیٹھتی ہے۔ ہر شخص اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے اپنی حیثیت کے مطابق کائناتِ ظاہری کی کسی ایک حسین شے کو اپنا محبوب بنالیتا ہے اور اس کی پرستش کرنے لگتا ہے۔

فلاطینوس کا خیال تھا کہ پاک و پاکیزہ حسن و جمال کی طرف روح کا رجحان ہی دراصل عشق کے جذبات کا محرک ہے۔ خالص محبت صرف حسن کی متلاشی ہوتی ہے۔ حسن ہمیشہ ایک حیرت، لطفِ اذیت، حسرت و آرزو، محبت اور ایک سرور (کیف) پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ خواہشاتِ نفسانی سے دور رہ کر انسانی حسن سے محبت کرتے ہیں، محض حسن کے سبب سے کرتے ہیں محبت کسی حد تک مادّی اور بڑی حد تک روحانی شے ہے، جو روح کی تکمیل نہ شدہ آرزوئے خیر کی ہے اور قدرت کی پیداوار بھی ہے۔

انسانی زندگی کی دو حیثیتوں کو واضح کرتے ہوئے فلاطینوس کہتا ہے کہ ایک تو عقلا کی زندگی ہوتی ہے جن کو بلند ترین اور اعلیٰ ترین کی فکر دامن گیر ہوتی اور ماورائیت کی تلاش رہتی ہے۔ دوسرے عامۃ الناس کی زندگی ہوتی ہے جو یا تو کسی قدر نیکی کی طرف مائل رہتے ہیں یا محض اپنے احتیاجِ زندگی کی فراہمی میں مصروف رہتے ہیں۔

خیر و شر پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "شر" انسان کی خود رائی سے پیدا ہوتا ہے۔ آزادیٔ تمنا اور نفس کی پیروی انسان کو گمراہ کرتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان اپنے ایزدی سرچشمے کو بھول جاتا ہے وہ نہ الوہیت کو سمجھنے کے لائق رہتا ہے نہ خود اپنی فطرت کو۔ شر انسان کو خدا کی طرف سے پھیرتا، خدا کو بھلاتا اور اس سے انکار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایسا شخص دنیا کی ہر چیز کو اپنے سے بالاتر سمجھ کر اس کی تعظیم کرتا، اس سے ڈرتا، اس کا مدّاح بنتا، خود اپنی نظر سے گرتا اور خدا سے دور ہو جاتا ہے۔ نہ وہ کائناتِ فطرت کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم

سمجھنے کے قابل رہتا ہے نہ خدا سے کائنات کی طاقتوں کے بارے میں۔

افلاطون کا خیال تھا کہ نیکی یا خیر کا علم اعلیٰ ترین علم ہے' اس کے بغیر کوئی دوسرا علم فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ فلاطینوس کہتا تھا کہ "شر" کا مکمل علم حاصل کرنے کے لئے "خیر" کا مفہوم سمجھنا اور اس کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ 'خیر' وہ ہے جس پر زندگی کا دار ومدار ہے۔ افلاطون کے نزدیک ہر ایک روح نیکی کی متلاشی ہے لیکن نیکی سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ نیکیوں سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔ رواقیئن (STOIES) جو یونانی مفکرین کا ایک گروہ تھا' اس کا خیال تھا کہ اگر انسان عمل کے نیک یا بد ہونے کا علم رکھ کر نیکی کی طرف مائل ہو تو وہ عمل صحیح معنوں میں نیکی نہیں کہلا سکتی۔ بد اعمالی یا گناہ انسان سے سرزد ہونے کی ایک وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ انسان تو صحیح رائے قائم نہیں کرسکتا یا غلط تصوّرات اور عقائد رکھتا ہے۔ فلاطینوس کا خیال تھا کہ انسان بجائے خود بد نہیں ہوتا نہ بُرائی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ روحِ انسانی شر سے پناہ مانگتی ہے' کیونکہ خدا کی طرح پاک اور مقدس بنتا اور شعور رکھنا چاہتی ہے۔ وہ دراصل جسم سے مربوط ہونے کے سبب سے "شر" کی جانب مائل ہوئی۔ جسم اور اس کی فکر نے اسے مجبور کیا۔ اس کے لئے بہتر ہوگا اگر وہ جسم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے وہ نیکی و خیر کی طرف مائل ہو۔ روح کا فطری عمل نیکی ہے۔ بُرائی دراصل روح کی کمزوری ہے جو روح بُرائی کی طرف مائل رہتی ہے اس میں استقلال نہیں رہتا۔ وہ ایک بُرائی سے دوسری بُرائی کی طرف ہی چلی جاتی ہے۔ وہ جذبات سے بہت جلد مشتعل ہوجاتی ہے۔ ہر جھونکا اسے آسانی سے اُڑا لے جاتا ہے اور ذرا سی گرمی سے وہ جل اٹھتی ہے۔

فلاطینوس انسان کو عمل کی حد تک پوری طرح مجبور نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ کچھ خیالات اور اعمال ایسے ہیں جو یقیناً ہمارے اپنے ہیں۔ وہ انسان کو اس کے عمل کا ذمہ دار ٹھیراتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انسان اپنے عمل کا ذمہ دار خدا کو ہرگز نہیں ٹھیرا سکتا۔ ہر شخص جو کچھ عمل کرتا ہے وہ اپنے ارادے سے اور ٹھنڈے دل سے غور کرکے ہی کرتا ہے۔ اس کے فلاح و بہبود کا سامان خود اس کے عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عقلمند اور نیک لوگ اپنے اعمال صالح سے اپنی قوتوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن دیگر اشخاص میں کسی ماورائی قوت کے زیرِ اثر عمل نہیں کرتے بلکہ خود اپنی اندرونی حالت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

خود فلاطینوس بے حد نیک اور پاک و پاکیزہ زندگی گذارتا تھا۔ اور خدا کے عشق

(باقی صہ۱۳ پر دیکھئے)

حامدی کاشمیری

غزل

لعلِ غیب تاب چٹانوں میں نہیں
کوئی مفہوم فسانوں میں نہیں

پھر نہ شبِ خون کا وقت آئے گا
روشنی ان کے ٹھکانوں میں نہیں

ہے تماشائیوں کا جمِ غفیر!
عکس بھی آئینہ خانوں میں نہیں

اپنے ہی سائے کی پھنکار نہ ہو
کوئی شہ مار خزانوں میں نہیں

کوہ کو دیتے ہیں آوازیں کیسے
سایہ بھی خالی مکانوں میں نہیں

آگئی ساعتِ خوش گفتاری
اب کوئی تیر کمانوں میں نہیں

شباب للت

غزل

وقتِ رخصت پھر سے ملنے کا دلاسا دے گیا
درد کی جاگیر، آہوں کا اثاثہ دے گیا

دین کو آبِ بقا خود رہ کے پیاسا دے گیا
درسِ جانبازی محمدؐ کا نواسا دے گیا

دے گیا آنکھوں کو میری چند نا تعبیر خواب
لوٹ کر صبر و سکوں، دل کو نراسا دے گیا

میں نے اس کے نام کر دی اپنی ساری کائنات
وہ گدائی کا مرے ہاتھوں میں کاسا دے گیا

اب کے لگتا تھا گھٹا بن کر برس جائے گا وہ
وہ مگر فصلِ تمنا کو نراسا دے گیا

اے مشیت کیا کہوں، تیرے نرالے کھیل ہیں
مجھ کو جیون دان میرے خوں کا پیاسا دے گیا

کٹ گیا دن زندگی کا برف و باراں میں شباب
ڈھلتا سورج دھوپ کا ٹکڑا ذرا سا دے گیا

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی

خطابت اور شعر

کسی کو متاثر کرنے کا مقصد بھی اس کو اپنا ہم خیال اور ہمنوا بنانا ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ نے نقطۂ آغاز سے آج تک اور اس وقت تک جب تک کہ کائنات میں انسانی دل دھڑکتے ہیں گے' زندگی اسی محور پر گھومتی رہے گی یعنی ایک دوسرے کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنانا متاثر ہونا' ہم خیال و ہم نوا ہونا دراصل ردِّ عمل ہے۔ کہیں کہیں یہ دونوں الگ الگ نظر آتے ہیں .رانھیں شعر اور خطابت کے خانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے' لیکن ایک منزل وہ بھی ہوتی ہے' یہاں ان دونوں کی سرحدیں اس طرح مل جاتی ہیں جس طرح سطح سمندر سے لپٹی ہوئی کہر کہ وہ سے بھی معلوم ہوتی ہے اور ایک بھی نظر آتی ہے اور یہی وہ منزل ہوتی ہے' جہاں شاعری خطابت کا کام کرتی ہے اور خطابت شعر میں ڈھل جاتی ہے۔

شاعری کے سلسلے میں مشرق و مغرب میں اپنے اپنے طور پر سبھی نے رائے زنی کی ہے۔ اگر افلاطون نے اسے نقل کی نقل کہا تو ارسطو نے اسے (MIMESIS) کی حد تک سے بڑھا کر (KETHARSIS) کی منزل تک پہنچاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شاعری صرف وہی پیش نہیں کرتی جو کچھ ہے بلکہ وہ بھی پیش کرتی ہے جو کچھ ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ جو کچھ ہونا چاہیئے۔ فن غیر متحرک کو متحرک بنانے کا نام ہے' اس طرح تخلیق شعر کی بھی وہ منزل ہے جہاں انسان خالق کائنات سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی الفاظ سے پیکر تیار کر کے اس میں زندگی کی روح اور حرارت پیدا کرنے کا تخلیقی عمل انجام دیتا ہوں۔ شعر کے سلسلے میں ابن قتیبہ نے کتاب شعر و شعرا اور قدامہ ابن جعفر نے نقد الشعر میں الفاظ اور معنی کی بحثیں کی ہیں۔ ورڈز ورتھ شاعری

کے مقصدی ہونے کا قائل ہے اور اسے حق و صداقت کی جستجو قرار دیتا ہے' ایک ایسا عمل قرار دیتا ہے' جہاں شعر کے سانچے میں ساری کائنات سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ شیلے کی نظر میں شعرا دنیا کے ایسے قانون ساز ہیں جنھیں تسلیم نہیں کیا گیا۔ برگساں کی نظر میں تخلیق کار اشیا کی اندرونی حالت کو جو اس کی ہیئت اور اس کے رنگ میں چھپی ہوئی ہے' دیکھ لیتا ہے اور جب وہ اس کے جذبہ کی تہہ میں پہنچتا ہے تو وہ شاعر بن جاتا ہے۔ فرانس کا ایک مفکر شاعری کو عقل کے قوانین کے تحت دیکھنا چاہتا ہے جو عقل کو مجروح کرنے کے بجائے اسے الہامی بنا دیتی ہے۔ لسنگ کا خیال ہے کہ مصوری اور اسی قبیل کے فنون مکانی تصور رکھتے ہیں اور شاعری زمانی عمل کو پیش کرتی ہے۔

ایلیٹ کے خیال میں شاعری جذبات سے گریز کا نام ہے۔ ایلیٹ یہ بھی کہتا ہے کہ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامعین کی مختصر سی تعداد ہی سہی' ہر نسل اور ہر زمانے میں موجود رہنی چاہیئے۔

شاعری کے سلسلے مفکرین کی ان تمام آرا کو اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ شاعری کے سلسلے میں مفکرین کی ان تمام آرار کو اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ شاعری کے سلسلے میں کچھ باتیں جو مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جاسکے۔

۱۔ شاعری بھی اظہار کا ایک سانچہ ہے۔

۲۔ اس کے لئے الفاظ ضروری ہیں۔

۳۔ شعر کے تخلیقی عمل میں تصور تخیل اور مجردات کو متشکل کرنا اور ان کی پیکر تراشی لازمی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ شاعری فن ہے۔ جو علم و آگہی و بصیرت عطا کرتی ہے۔

۵۔ اچھا شعر وہ ہوسکتا ہے جو ہر نسل اور ہر دور میں لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔

۶۔ شاعری کا تعلق ہیئت اور موضوع سے ہے۔

اردو میں خطابت (RHETORIC) کا مترادف ہے۔ خطابت کے سلسلے میں بھی نقطہ آغاز ارسطو ہی ہے جس نے اپنی (RHETORICE) میں پہلی بار خطابت کی حد بندی کی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اصول و ضوابط بھی مدون کئے۔ خطابت کے فن کا لازمہ اس نے (PERSUATION) کو قرار دیا ہے انگریزی کا یہ لفظ WR. ROBERS کا ترجمہ ہے

PERSUATION کا مطلب ہے ہم خیال بنانا، راضی کرنا، ہموار کرنا، ہم آہنگ کرنا۔
ارسطو نے خطابت کے تین پہلو قرار دیئے ہیں۔

۱۔ وہ صلاحیت جو اپنی شخصیت کو مستند بنا کر اپنی بات کو مستحکم کرتا ہے۔

۲۔ وہ صلاحیت جو سامعین کے جذبات کو ابھارتی ہے اور وہ صلاحیت جو مدعا کو ثابت کرتی ہے۔

خطیب اپنے اپنے کردار و شخصیت یا اپنی انکشاف ذات سے اپنے اپنے سامعین کو ایک خاص طرح کے ذہن کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔ وہ متضاد جذبات کو متوازی خطوط پہ لے چلتا ہے۔ مثلاً سامعین سے دوستی کر کے اپنے مخالفین کے لئے غصّہ اور دشمنی کے جذبات کو بیدار کرتا ہے۔

ارسطو کی نظر میں خطابت منطق سے کہیں زیادہ مشقت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی نظر میں لوگوں کو ہم خیال بنانے سے کہیں زیادہ مشقت کا مطالبہ کرتی ہے اس کی نظر میں لوگوں کو ہم خیال بنانے سے کہیں زیادہ خطابت کی غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہم خیال بنانے کے ذرائع اختیار کرے۔ خطیب کا کام جذبات کو بیدار کرنا ہے۔ اس نے خطابت کے تین اسلوب قرار دیئے ہیں۔ الفاظ سے تزئین اور با وقار اسلوب۔ (۲) معتدل اسلوب، جسے خوشگوار بھی ہونا چاہیئے۔ (۳) سادہ اسلوب، جس میں گفتگو کا انداز ہوتا ہے۔ خطابت نثر اور نظم دونوں کو اپنا وسیلہ بناتی ہے اور اس طرح یہ اسلوب بھی ہے اور تکنیک بھی۔ ارسطو کی اس نشاندہی کے ساتھ خطابت کے کچھ اور پہلو اور رُخ سامنے آتے ہیں۔ مثلاً ایک خطیب وہ ہے جو جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے اور کچھ نعروں کا سہارا لیتا ہے۔ جذباتی اُبال اور وقتی و ہنگامی اقدار کے سہارے ان لوگوں کو ہمنوا بنانا اس کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ جنھیں وہ خطاب کر رہا ہے۔
خطابت کا ایک رُخ وہ بھی ہوتا ہے جسے منفی خطابت کہہ سکتے ہیں جس کے لئے انگریزی میں (PURSUATION THOUGHT NEGATIVE) کہا گیا ہے، یہ وہ منطقہ ہے جہاں جذبۂ تنفر کو بیدار کیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال میر انیس کے مراثی میں پہلوان شام کے رجز ہیں اور اس کی بھونڈی شکل جوش کی نظموں کے وہ حصے ہیں، جہاں وہ ذلیل غلامان رو سیاہ نامرد قوم، پٹاری کے سڑے انگور اور سرطان کے پھوڑے جیسی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔

خطابت کا اعلیٰ ترین رُخ وہ ہے جو علویت اور ترفع پیدا کرتا ہے۔ لاینجائنس جیسے

SULETION کہتا ہے۔ جو حیثیت خطابت کا وہ رُخ ہے جس کی سب سے اچھی مثال اقبال کی شاعری ہے اور خصوصیت سے مسجد قرطبہ کا آخری بند ــــ

عرصہ دراز تک خطابت اور شعر پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ شعر و شاعری اور خطابت میں واضح فرق محسوس کیا مگر اسے اس کا اعتراف تھا کہ شاعر خطیب کا سب سے نزدیکی رشتہ دار ہوتا ہے۔ آہنگ کو چھوڑ دیجئے تو شاعر اور خطیب ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ الفاظ کی ترتیب، ان کی تزئین، ذہنوں کو متحرک کرنا، یہ قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عربی میں علامہ جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں خطابت کو شاعری کا اسلوب قرار دیا ہے۔ عربی میں قصائد اور رجز اور بازار عکاظ کے میلوں میں شعرا کا قصیدہ پڑھنا خطابت کے اہم پہلو رکھتا تھا۔ مغرب میں سترھویں صدی تک خطابت کو اہمیت حاصل رہی لیکن اسی دور سے ٹامس فلر نے خطابت کو "ام الکذب" کہنا شروع کیا۔ یہ صدا سقراط کی صدائے بازگشت تھی۔ جس نے کہا تھا کہ خطابت حقیقت کو مسخ کرتی ہے اور اس طرح خطابت کو شیطان کا مددگار قرار دیا گیا۔ شاید یہی سبب ہے کہ ملٹن کا ابلیس بڑی اچھی تقریریں کرنے والا ہے۔ جے ایس مل نے اپنے مضمون WHAT IS POETRY میں خطابت کو وقار بخشنے کی کوشش کی۔ اس نے لکھا "شاعری اور خطابت محسوسات کے اظہار کے سانچے میں خطابت سُنی جا سکتی ہے۔ یعنی ہم اسے (HEAR) کرتے ہیں۔ شاعری میں سننے والے کی براہ راست وابستگی ضروری نہیں۔ خطابت راست تخاطب کا نام ہے، خطیب مجمع کا تصور کرتا ہے، اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس دور میں سانس لے رہا ہے اور کن لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے لیکن شاعر ان قیود سے بے نیاز ہوتا ہے۔ شاعری تنہائی کے لمحات میں ایک طرح کی خود کلامی ہے۔ پہلے ہم خود سے کچھ کہتے ہیں اور پھر بعد میں دوسروں سے کہتے ہیں لیکن خطیب پہلے دوسروں سے کچھ کہتا ہے اور بعد میں لوگ اسے دوہراتے ہیں۔

کروچے جو ہر جگہ وحدت کا قائل ہے۔ وہ خطابت کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کی نظر میں اجتماع کے وجود کو فرض کرنا اور وحدت کو مجروح کرنا ہے۔ ایک سچے فن کار کا اجتماع سے کیا تعلق۔ رچرڈز نے جہاں کروچے کی تائید کی ہے وہاں اس نے خطابت کی بازیافت بھی کی اور یہ کہا کہ خطابت کے پرانے قوانین جنگ جویانہ ہیں۔ قائل کرنے اور جیتنے کے لئے بلکہ جدید خطابت غلط فہمیوں کو دور کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے پاس کوئی دعا دار

جاتا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے صحیح تناظر میں ان کے معنیٰ اور ان مطالب و مفاہیم کا تعین کرے۔ رچرڈز اور بوتھ، شاعری اور ناول کے تناظر میں تخلیق کا فرض یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے قاری کو کنٹرول کرے۔ خطابت کے بارے میں یہ تصوّرات بہت سارے گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ خطابت اور تقریر میں واضح فرق یہ ہے کہ تقریر صدا اور صوت کی محتاج ہوتی ہے۔ خطابت میں زبان، خیالات کا لباس ہوتی ہے۔ اسے تحریر میں بھی اسی طرح پڑھا جا سکتا ہے جس طرح تقریر میں سنا جا سکتا ہے۔ تقریر صرف نثر سے تعلق رکھتی ہے۔ خطابت نثر اور نظم دونوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ (فلسفے کی اصطلاح میں خطابت جوہر ہے جو نظم و نثر کی جملہ اصناف میں پائی جاتی ہے۔ جب کہ شاعری عرض ہے۔ یعنی قائم بالذات) خطابت اور شعر کے سلسلے میں یہ سرسری جائزہ اس لئے پیش کیا گیا کہ دونوں کے ربط کی وضاحت اور دونوں کا فرق بھی نمایاں ہو سکے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہو سکے کہ خطابت کے عروج و زوال کی داستان بہت سارے سماجی عوامل کی رہین منت ہے۔ اس سے پہلے کہ اردو شاعری کے تناظر میں خطابت کے بارے کچھ عرض کیا جائے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خطابت کے جو اجزاء ہیں ان کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔ خطابت میں توضیحی انداز، وقار، الفاظ کی تزئین، مترادفات کا استعمال اور تکرار ضروری سمجھی جاتی ہے۔ خطابت کا کام عام طور سے جذبات کو برانگیختہ کرنا یا جوش کرنا سمجھا گیا ہے لیکن یہیں پر یہ عرض کرنا ہے کہ اگر خطابت کے معنی PERSUADE، اور ہم خیال اور ہمنوا بنانے کے ہیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ جذبات کو برانگیخت کیا جائے۔ جذبات کی تہذیب و تربیت اور سامعین یا قارئین کی ذہنی تشکیل ہمنوا و ہم خیال کے لئے ضروری ہے۔ یہیں سے ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ خطابت کا مقصد ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔

اردو شاعری میں خطابت کا ایک پہلو وہ بھی رہا ہے جہاں قصائد میں شاعرانہ تعلّی نظر آتی ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا گیا یعنی اپنی شخصیت اپنے کردار کو ابھارنا۔ سوداؔ کے اس طرح کے شعر ـــ

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے

خطابت کا ہی پہلو رکھتے ہیں۔ میرؔ صاحب نے جب یہ کہا تھا کہ شعر میرے

خواص پسند ہے پر یہ گفتگو عوام سے ہے، تو انھوں نے بھی خطابت کے اس پہلو کو مدنظر رکھا تھا جو ارسطو کے ہاں خطیبی اسلوب کہلاتا ہے اور جس میں زبان کی تزئین نہیں ہوتی بلکہ گفتگو کرنے والا انداز ہوتا ہے۔ لہجے کی وہ تیزی جو طنز و استہزا کا رخ اختیار کرتی ہے وہ کہیں کہیں آتش کی غزلوں میں بھی نظر آجاتی ہے، خاص طور سے اس غزل میں ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

یہاں وہی انداز ہے۔ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرلی اور مخالف کے لئے نفرت کے جذبات بیدار کرنا۔ میر انیس جنھوں نے شعوری طور پر عربی کی خطیبانہ شاعری کے مزاج سے اردو کو ہم آہنگ کیا۔ ان کے مرثیوں کے رجز خطابت کا شاہکار ہیں۔ جب وہ فوج حسینی کا ایک بہادر پوری فوج شام کو مخاطب کرتا ہے۔ انیس نے خطیبانہ شاعری میں جہاں مترادفات کے استعمال کے نشستوں اور الفاظ کی تزئین سے کام لیا وہاں انھوں نے اساطیری پہلو پر بھی خاصہ زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی اور اجتماعی شعور کی تشکیل پر بھی توجہ کی۔

؎ گیتی کے چار دانگ میں برپا ہے میرا شور

لیکن خطابت کو سماجی اور سیاسی تناظر میں اردو شاعری سے روشناس کرانے کا سہرا حالی اور محمد حسین آزاد کے سر بندھتا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ محمد حسین آزاد جس اجتماع کو حب وطن کے موضوع پر خطاب کر رہے تھے وہ اجتماع بہت بڑا ہوتے ہوئے بھی بہت چھوٹا تھا اور ان کی خطابت بھی تیسرے درجے والی خطابت تھی جہاں تمثیلی انداز میں اپنی بات منوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالی نے وہ معتدل اسلوب اختیار کیا تھا جہاں منطقی استدلال ثبوت ماضی پر نظر، مستقبل کی طرف اشارے اور جذبات کو برانگیختہ کرنے یا ان کی تہذیب و تربیت کے بجائے جذبات کو متحرک کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

حالی کا نقطۂ نظر بھی یہ تھا کہ شاعری کا مقصد جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مقدمہ میں اشتعال کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر مسدس میں اور اپنی نظموں میں وہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کے بجائے معتدل اصول اختیار کرتے ہیں۔ ان کا یہ اسلوب خطابت کا وہ رخ رکھتا ہے جہاں ناصحانہ انداز حاوی اور غالب نظر آتا ہے۔

یہاں اس پہلو کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ حالی کے دور میں ایک طرف غدر کے بعد ملک کی سیاست کی بساط الٹی ہوئی پس منظر میں قتل و غارت گری، جبر و استبداد اور جذبات کے اظہار

بھی زبان اور ذہنی سطح کی پسماندگی اسی کے متقاضی تھی کہ لہجہ نرم اور معتدل رہے۔ دوسری طرف حالی کا سیاسی شعور ہمنوا بنانے کے لئے زمانے کے رُخ کے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔

بیسویں صدی کا آغاز، ہندوستان کو اس دور میں لے آیا جہاں فریاد کا آہنگ احتجاج میں بدلا اور ہمنوا بنانے کے بجائے اُبھارنا، اکسانا، جذبات کو برانگیختہ کرنا مقصد قرار پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ادبی تخلیق اپنے دور سے بے نیاز نہیں ہوتی جس دور سے ملک گذر رہا تھا اس کا فطری تقاضہ یہ تھا کہ خطابت کو وسیلہ بنایا جائے، چنانچہ مہاراج بہادر برق، برج نارائن چکبست، درگا سہائے سرور کی شاعری خطابت کے وہ تمام اجزا رکھتی ہے جو حالی کے معتدل اسلوب سے آگے کی چیز ہے۔ الفاظ کی تدوین پر زیادہ زور ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اب خطابت کا وہ پہلو نظر آنے لگتا ہے جو ارسطو کے خیال میں اسلوب کی پہلی شکل ہے۔ جہاں احتجاج، نفرت اور محبت متوازی خطوط نظر آتے ہیں۔ اور پھر اسی دور میں اقبال کا بلند آہنگ سنائی دیتا ہے۔ اقبال خطابت کے اس رنگ و آہنگ کے امین ہیں جس کی طرف نہ صرف ارسطو بلکہ تمام مغربی و مشرقی فلسفیوں نے اشارہ کیا ہے۔ ان کے یہاں جذبات کو ابھار کر اس کے تزکیہ و تطہیر کا عمل نظر آتا ہے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی شاعر کے یہاں خطیبانہ رنگ کا وجود یا عدم اُن کے شعری رویئے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اقبال کی نظر میں شاعر رنگین نوا، دیدہ بینائے قوم ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

تو اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ شاعر اور سماج کے درمیان ربط اور ابلاغ کے قائل ہیں اور شاعری کو مقصدیت سے ہم آہنگ رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنی نوائے پریشان کو شاعری نہیں سمجھتے بلکہ خود کو محرم راز قرار دیتے ہیں۔

شاعری اُن کے لئے اُن انکشافات کا ذریعہ ہے اور یہ انکشافات ذات سے کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ خطابت کے لئے یہ لازمی ہے کہ:

۱۔ یہ معلوم ہو کہ کیسے مخاطب کیا جارہا ہے، اس کے معتقدات کیا ہیں۔ اس کی اساطیر روایات کیا ہیں اور جنھیں خطاب کیا جارہا ہے ان کی ذہنی سطح کیا ہے؟

اقبال بھی اس سے باخبر ہیں اور اسی لئے ان کے خطیبانہ آہنگ میں زیادہ اہمیت تطہیر جذبات علویت کی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں مترادفات کا استعمال، تکرار، قافیہ اور تمثیلی خطابت

نظر آتی ہے جس کی بنیاد کبھی مجرد تصورات پر بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی سیاسی و سماجی تناظر میں واقعات پر ہوتی ہے ان کے یہاں ایسی خطابت کا اعجاز ہے کہ لمحے صدیوں میں احاطہ کر لیتے ہیں اور قطرۂ خون جگر سے پل میں دل کی دھڑکن آجاتی ہے۔ جوشؔ نے اپنے خطیبانہ آہنگ کو اقبال سے الگ رکھا ہے۔ صرف ان کی خطابت صرف اشتعالی خطابت ہے۔ وہ جذبات کو ابھارنا اور بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی بعد کی منزل کا کوئی تصور ان کے یہاں نہیں ملتا۔ انھوں نے خطابت کے وہ سارے حربے استعمال کئے ہیں جن کا تذکرہ سسرو، ڈیما ستھالینز نے کیا ہے۔ گالیاں سننے ہمنوا بنانے کے بجائے ڈانٹ ڈپٹ، پھٹکار، للکار سے کام لینا ان کی خطابت سے کام لینے کے اصول ہیں۔ مترادفات کو تشبیہ کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرنا یہ بھی ان کا مخصوص وصف ہے۔ نازک ساعتوں کا ساتھ سے خطاب' ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب' پنجاہ سالہ جوبلی' یا پھر حسین اور انقلاب' آواز حق نوائے آزادی' ان سب میں یہی انداز ملتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے' جہاں شاعری اور خطابت ایک دوسرے سے واضح طور پر الگ بھی نظر آتے ہیں اور بذات خود خطابت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

خطابت وسیلہ ہے حصول مقصد کا اور جو دور اقبال اور جوشؔ کو ملا تھا اس کی مناسبت سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد تھا جس کیلئے انھوں نے خطابت کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ حالیؔ سے لے کر جوشؔ تک اور جوشؔ کے بعد ترقی پسند مصنفین کے شعراء تک خطابت کی روایات کا ایک تسلسل نظر آتا ہے اور اس تسلسل میں اہم نام ابھرتے ہیں۔ یہاں یہ بے اختیار عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہی شاعری استداد زمانہ کے باوجود عظیم ہوتی ہے اور زندہ رہ جاتی ہے جس کے پاس اپنی تاریخی وراثت ہوتی ہے' تجدد کی کوششیں محمود ہیں' لیکن ان کا انجام عظمت اللہ خاں اور ن م راشد کی شاعری کا ہو جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ تاریخی تسلسل' تہذیبی روایات سے مربوط ہوتا ہے اور تجدد کی ان کوششوں میں اگر تہذیبی روایات سے وابستگی نہیں ہوتی تو پھر یہ تجدد ایجاد بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ میر انیسؔ کو اگر سودا اور ضمیرؔ کا ورثہ نہ ملا ہوتا اور اقبالؔ اور جوشؔ کے پس منظر میں اگر انیسؔ اور حالیؔ' چکبستؔ اور سرورؔ نہ ہوتے۔ سردارؔ' کیفیؔ' مجازؔ اور مجروحؔ کو اگر اقبالؔ اور جوشؔ کی وراثت نہ حاصل ہوتی تو یہ نام آج ادب کا جز نہ بنتا۔

مالک رام نے خطابت کو دنیا کا سب سے قدیم ذریعہ ابلاغ قرار دیا ہے۔ ابلاغ کے

مطلب ہے دوسروں سے رابطہ قائم کرنا۔ رچرڈسن کہتا ہے کہ زندگی کا تمام تر تصفیہ ہمارے تکلم اور اس طرح ہماری زبان سے واسطہ ہوتا ہے۔ زبان کے ذریعہ ہم ایک دوسرے سے ترسیل کا ذریعہ قائم کرتے ہیں اور زندگی اس کے علاوہ ہے کیا کہ ہمارے دوسرے کے ساتھ روابط قائم نہ کیا۔

یہہ نقطۂ نظر اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ شاعری ہو یا ناول یا ادب کی کوئی بھی صنف، اس کے لئے ابلاغ اور ترسیل اور روابط ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے کہ کیا شاعری کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ لوگوں کو ہمنوا بنایا جائے۔ تاثر کی کوئی بھی کیفیت ہو اگر (PERSNALIA) نہیں ہے۔ اگر ہمنوا بنانے کا تصور نہیں ہے تو اس میں تاثیر نہیں ہوگی اور اگر تاثیر نہیں ہوگی تو پھر وہ کوئی اور شئے ہو سکتی ہے، ادب یا شعر نہیں ہو سکتا۔ سوال یہہ ہے کہ تاریخی تسلسل، تہذیبی روایات اور ابلاغ و ترسیل کے تقاضے کیا دورِ حاضر میں ختم ہو گئے؟ جس روایت کا آغاز حالی سے ہوا تھا وہ کون سے اسباب و علل ہیں جنھوں نے دورِ حاضر میں خطابت کو نظر انداز کر کے خود اپنی ذات کے خول میں سما جانے کو شاعری کی معراج سمجھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی دنیا دورِ انتشار سے گذر رہی ہے۔ لیکن کوئی بھی تاریخ کا کوئی ایسا دور بتا سکتا ہے، جب انتشار، بے اطمینانی، بحرانی کیفیت نہ رہی ہو۔ صرف اس فرق کے ساتھ کے ہر دور میں ان کیفیات کا شکار ہونے والے طبقات مختلف رہے ہیں۔ ورنہ ازل سے تا ایں روز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی ستیزہ کار رہا ہے۔ آگ بھی رہی ہے اور اولاد ابراہیم بھی رہی ہے اور نمرود بھی رہے ہیں۔ نیل کا پانی بھی رہا ہے اور موسیٰ و فرعون بھی رہے ہیں تو پھر آج کے دور کی یہ تخصیص جو انسان کو ٹوٹا پھوٹا، ادھورا، آڑا، ترچھا، بانکا آدمی دکھا رہی ہے کیوں؟

یہہ صدیہ کیوں لگتا فرد اس سانحہ کا شکار ہو جائے کہ اپنے سایہ سے بھی ڈر جائے اور اگر واقعی ایسا دور آیا ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ پریم چند کے الفاظ میں "ہماری کسوٹی پر ہر وہ ادب کھرا اترے گا جو جگائے سُلائے نہیں۔ اس لئے کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔ آج کا دور بھی شاعروں کو آواز دے رہا ہے کہ رمز و ایما اور ابہام کی سرحدوں سے نکل کر واضح براہِ راست اور دو ٹوک لہجہ میں اس کا اعلان کریں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ شاعری صبح کے دھندلکے سے نکل کر دن کا اجالا چاہتی ہے۔ کچھ ایسا محسوس

ہوتا ہے جیسے کچھ دنوں پہلے شاید اس کی اتنی شدید ضرورت نہ محسوس کی گئی ہو کہ شاعری کو خطابت سے ہم آہنگ کر دیا جائے اور شاید فیض کو وہ علامتی پرسکون "ڈرائنگ روم والا" خطابت والا انداز کسی حد تک گوارا بھی رہا ہو لیکن آج ۱۳ر اکتوبر کو جب عالمی تاریخ کا دامن بیروت کے قتل عام سے داغ دار ہو چکا اور تہذیبی اقدار میں آگ لگائی جا چکی ہے "انسانیت دوزخ کی بھٹی کے دروازے تک دھکیلی جا چکی ہے کیا اس کی ضرورت نہیں ہے کہ خطابت جیسے ذریعہ ابلاغ کو پھر شاعر کام میں لا کر رابطہ کی طرف قدم بڑھائے۔ شاید آج کی تاریخ یہہ مطالبہ کر رہی ہے کہ ہمارے شعرا کو یہہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ [illegible] زندگی کے اس نازک مرحلہ پر بیروت کے کس طرف ہیں اُس طرف جدھر حالی اور اقبال با جوش کھڑے ہوئے ہیں یا اس طرف جدھر بموں کے دھماکوں سے اٹھے ہوئے دھوئیں کی گنجلک فضاء میں کچھ نہ دکھائی دینے والی کیفیت اور جلتے ہوئے خون و گوشت کی بو ہے۔ اس کا فیصلہ نقاد نہیں کر سکتا۔ اس کا فیصلہ یا تاریخ کرے گی یا پھر اس کا فیصلہ شعرا کو کرنا ہوگا۔ مجھے تو صرف میر صاحب کا ایک شعر دُہرانا ہے ؎

افسردگی سوختہ ساماں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ بجھی ہے دلوں کی آگ

(ایس وی یونیورسٹی (تروپتی) کانفرنس میں پڑھا گیا)

اُردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اُردو

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے اردو امتحانات مسلمہ عثمانیہ یونیورسٹی اردو فاضل اور اردو عالم میں شرکت کر کے اعلیٰ تعلیمی مدارج حاصل کیجئے۔ انگلش میڈیم کے بچوں اور طالبات کے لئے اردو دانی اور اردو زباندانی کے امتحانات اردو نوشت و خواند کے سلسلے میں اہم کڑی ہیں۔ یہ امتحانات سارے آندھرا پردیش، مہاراشٹرا، کرناٹک اور دہلی کے مراکز پر ہر سال مئی / ڈسمبر میں منعقد ہوتے ہیں۔ نصاب کامل (قواعد و ضوابط) کے لئے ایک روپیہ پچاس پیسے بصورت منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ بھیج کر تفصیلات حاصل کیجئے۔

ناظم شعبہ امتحانات ادارہ، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ 500004

جمیلہ نشاط

تین نظمیں

(جمیلہ نشاط، حیدرآباد کے ممتاز مصوّر سید بن محمد نقش مرحوم کی صاحب زادی اور ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں۔ ۱۵ار ۱۹۵۵ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ بی ایس سی، بی ایڈ کرنے کے بعد انگریزی ادب سے ایم اے کر رہی ہیں۔ زندگی کے محسوس اور پیچیدہ تجربوں کو وہ احساس کی آگ میں تپا کر نظم کا روپ دیتی ہیں۔ ان کی شاعری امکانات سے معمور ہے۔ ادارہ)

(۱)

میرا بچپن کھڑا ہے
سہیلی کے ساتھ
ٹپک رہے ہیں تارے
ان دیواروں پر
آسمان ڈوبنے لگا مرے آگے
کیوپڈ کا تیر چل گیا
مرے بدن پہ
کسی نے ہارن بجا دیا
جَل تھل کرنے لگی تری یاد
مری پلکوں پہ
سوہنا جیون
لوٹ لیا میرا من
لیکن دور

اس قبرستان میں
کھڑی ہے میری آتما
اور
سفید چہرے
سر اٹھائے تک رہے ہیں
ناک سے مرے
ٹپک رہا ہے
لال رنگ
رقصاں ہیں تمام چہرے
اور سواگت کر رہے ہیں
اک سکھیہ منتری کا
مرے پاؤں گھر میں دھنسے ہیں
اور پھر
اس قبرستان میں
موت اور زندگی
گلے مل رہے ہیں

(۲)

مد منتظر ریت
ری زندگی
ٹرے ٹکڑے
یالات کا شیش محل
ری آواز
لی رات کی رقاصہ
ب تنکا ہوں میں
بہ جی چاہتا ہے
مندر چیر دوں
سمانوں کو کچل ڈالوں
راپنے گلوب کی وسعتوں کو
بے کراں کائنات میں ڈبو دوں

(۲)

معصوم چہرے
زندگی کی کڑی دھوپ میں
مرجھاتے چلے
اور
سوکھی پتیاں
اپنے کل کو
کچلتا ہوا
دیکھتی رہیں
وقت کے لمبے قدم
ان چہروں کو
دھندلا کر گئے
پتہ نہیں
یہ چہرے، وقت
اور زندگی کا
سمبندھ کیسا ہے

داؤد اشرف

مخطوطات اور اُردو ادب

مخطوطات صرف علم وادب کے بیش بہا خزانے ہی نہیں ہوتے بلکہ ساری انسانی تہذیب اور اس کے ارتقا سے ان کا انتہائی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب اور سائنس کے ارتقا کی ساری تاریخ اس کی گواہ ہے۔ جہاں جہاں بھی انسانی معاشروں اور حکمرانوں نے مخطوطات کی قدر کی اور انھیں سینہ سے لگائے رکھا علوم و فنون کی ترقی نے صدہا سال کا سفر برسوں میں طے کیا اور جہاں جہاں ہوس، ملک گیری اور توسیع پسندی اور اوہام اور عصبیت مخطوطات پر ناگہانی آفت بن کر ٹوٹ پڑے، انسانی تہذیب کا ارتقا سیکڑوں سال پیچھے رہ گیا۔ ویونانی علمی خزانوں کے ساتھ رومیوں نے جو جابرانہ برتاؤ کیا اور پھر عربوں اور عجمی مسلمانوں کے عظیم علمی و تہذیبی کارناموں کو جس طرح خونخوار تاتاری لشکروں نے روند ڈالا، ان سب کی داستانوں سے ہماری تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے ان سے صدہا سالوں تک استفادہ نہ کیا جا سکا۔ جس کی وجہ سے مختلف علوم کے ارتقا اور سائنس دانوں کے کارناموں کو منظر عام پر آنے میں صدہا برس کی تاخیر ہوئی۔

مخطوطات کسی ... کے تحقیقی ادب کا بنیادی مواد بھی ہوتے ہیں۔ مخطوطات ... دور کے ادب کا بہت قیمتی اثاثہ ہوا کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ... اس کے ادب کے آغاز و ارتقا ... دور کی تاریخ کی بازیافت کے لئے ... ادب سے متعلق مخطوطات کو جو نمایاں اہمیت حاصل ہے، اس سے ...

ہر طالب علم خوب واقف ہے۔

قدیم اردو مخطوطات کی بنیاد پر اردو ادب میں جو تحقیقی کارنامے انجام پائے ہیں اس کی وجہ سے اردو ادب کا دامن نہ صرف کلاسیکی اور قدیم ادب کے سرمایہ سے مالا مال ہوا بلکہ اردو ادب ماضی میں نئی وسعتوں سے ہمکنار بھی ہوا۔ اردو کے قدیم مخطوطات ہی کی بدولت اردو دنیا ابتدائی مربوط نثری کارناموں اور قدیم دکنی شعراء مثلاً محمد قلی، وجہی، ابن نشاطی، غواصی، نصرتی وغیرہ کے کلام سے روشناس ہوئی ہے۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کتب خانوں میں بیشمار اردو مخطوطات دستیاب ہیں ایک ہی مخطوطے کے کئی کئی نسخے مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ صحیح نسخے کی ترتیب اور طباعت کے لئے مختلف نسخوں کی کاپیوں کا عکس منگواکر ان نسخوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مقابلہ اور تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ کون سے نسخے ناقص ہیں اور کون سا مکمل۔ مخطوطات کی تصحیح کے لئے ایک مخطوطے کے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے۔ اردو کے قدیم، نادر اور کمیاب مخطوطات کی ترتیب بہت دقت طلب کام ہے۔ اگر کسی مخطوطے سے اس کے بارے میں بنیادی اور ضروری مواد دستیاب نہ ہوتا ہو اور اگر اس مخطوطے کی ترتیب کے لئے دوسرے نسخے دستیاب نہ ہوں تو ایسی صورت میں اندرونی شہادتوں اور دوسرے ماخذوں کی چھان بین کے لئے سخت محنت اور عرق ریزی درکار ہے۔

قدیم اردو ادب کا سراغ لگانے اور لسانی معاملات پر تحقیق کی غرض سے جن مخطوطات کو مرتب کیا جاتا ہے ان کا نہ صرف تعارف کروانا پڑتا ہے بلکہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ان مخطوطات کا اس انداز سے جائزہ لینا پڑتا ہے کہ مخطوطات کے مصنفین، ان کے حالات، شخصیت، ماحول اور ان کے ادبی مرتبہ کے تمام قدوخال واضح ہو جائیں۔ ان مخطوطات کو مرتب کر کے شائع کرنے سے نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مصنف کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اس دور اور ماحول کی اہم خصوصیات بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تصانیف کا ادبی درجہ اور مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک محقق کسی مخطوطے کو ترتیب دینے کے بعد اس کے سامنے جو مواد اور شہادتیں موجود ہوتی ہیں ان کی بنیاد پر چند نئی باتوں کا انکشاف اور دعوؤں کا اعلان کرتا ہے لیکن کوئی بھی علمی اور تحقیقی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا، مستقبل میں تحقیقی کام

سے آگے بڑھنے اور اسی موضوع پر مزید مواد فراہم ہونے پر اس کے دعوے غلط ثابت ہونے کے امکانات موجود ہیں۔

مولوی عبدالحق نے "معراج العاشقین" کے دستیاب دو قلمی نسخوں سے ایک صحیح نسخہ مرتب کرکے شائع کیا تھا اور اس رسالہ کو حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیل نے اس رسالہ کے متن، زبان و بیان، صوتی خصوصیات اور اسی نام کے دوسرے نسخوں کے تقابلی مطالعہ اور تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ یہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ گیارھویں کے آخر یا بارھویں صدی کے آغاز کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔

وجہی کی "سب رس" کو ترتیب دے کر شائع کرنے کے بعد اردو میں ادبی نثر کا سب سے پہلا نمونہ سامنے آیا۔ سب رس اور قطب مشتری کے منظر عام پر آنے اور وجہی پر تحقیقی کام ہونے کے باوجود اس کی زندگی کے حالات کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی میسر نہیں تھیں لیکن چند سال قبل ایک مخطوطہ دستیاب ہوا جو وجہی کا فارسی دیوان ہے اس فارسی دیوان کے ہاتھ لگنے سے وجہی کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس مخطوطے میں ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں جن سے اس کے اصلی نام وطن اور قطب شاہی سلاطین سے اس کے تعلقات کا ایک خاکہ بھی سامنے آتا ہے۔

دکنی ادب پر تحقیق کے آغاز سے پہلے ولی کو اردو کا پہلا شاعر مانا جاتا تھا لیکن بعد کو قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے شعرا پر تحقیقی کارنامے منظر عام پر آنے کے بعد نہ صرف اردو کے پہلے شاعر کے بارے میں تصور بدلا بلکہ اردو شاعری کو ماضی میں نئی وسعتیں بھی حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر زور نے سخت محنت کے بعد محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم دیوان کو مرتب کرکے شائع کیا۔ اس تحقیقی کارنامہ سے نہ صرف یہ ثابت ہوا کہ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے بلکہ قدیم اردو شاعری کی صحت مند اور قابل قدر روایات بھی سامنے آئیں۔ قدیم یا کلاسیکی اردو ادب کا بیشتر سرمایہ جو آج اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم اور ضروری جزو ہے مخطوطات کی شکل میں محفوظ تھا۔ ان مخطوطات کو مرتب کرکے شائع کرنے کا باعث کئی قدیم نثر نگار اور شاعر اردو دنیا سے روشناس ہوئے جن کے تحقیقی کارناموں نے اردو ادب کو عظمت اور ہمہ گیری بخشی۔

ہندوستان اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں اُردو مخطوطات کے قیمتی اور اہم ذخیرے موجود ہیں۔ خود شہر حیدرآباد میں ادارہ ادبیات اردو، سالار جنگ لائبریری اور اورنٹیل مینوسکرپٹ لائبریری اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اُردو مخطوطات کی قابلِ لحاظ تعداد دستیاب ہے۔ جن اداروں اور کتب خانوں میں اُردو مخطوطات کافی تعداد میں ہیں، اُن مخطوطات کی توضیحی فہرست (CATALOGUE) تیار کی جانی چاہیئے اور ہر ادارہ یا لائبریری میں دوسرے اہم اداروں اور لائبریریوں کے (CATALOGUES) موجود ہونے چاہئیں تاکہ ایک ہی مقام پر تحقیقی کام کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ مخطوطات کے بارے میں معلومات فراہم ہو سکیں۔

مخطوطات کی بنیاد پر اُردو ادب میں کافی تحقیقی کام ہو چکا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کام باقی ہے۔ مستقبل کے کام کے لئے مخطوطات کی بہتر نگہداشت اور سائنٹفک طریقوں پر تحفظ ضروری ہے اس کے علاوہ اُردو کے قدیم اور اہم مخطوطات کے تحفظ کی جانب توجہ دینا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اکثر مقامات پر ان مخطوطات کا بہتر اور اطمینان بخش طریقہ پر تحفظ نہیں کیا جا رہا ہے۔ مخطوطات کی بہتر نگہداشت کے لئے حسبِ ذیل امور پر توجہ دینا ضروری ہے۔

قدیم مخطوطات کو روشنی، گرمی، نمی، دیمک، کیڑوں، جھینگروں اور چوہوں سے بچانا۔
مخطوطات کو کیڑوں سے پاک و صاف کرنے کے لئے جراثیم کش دوا کا استعمال۔
مخطوطات رکھنے کے لئے لکڑی کی الماریوں کی بجائے دھاتی الماریوں کا استعمال۔
مخطوطات کی جلد خراب ہونے یا اندرونی صفحات پھٹ جانے کی صورت میں ان کی درستگی تاکہ ان کی عمر میں کافی اضافہ ہو، درستگی کے لئے جو نشاستہ اور دوسری اشیاء استعمال کی جائیں وہ سب کاغذ اور روشنائی کے لئے نقصان دہ نہ ہوں اور ان سے کیڑوں، جھینگروں اور چوہوں کو اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے مخطوطات کے قریب آنے کی ترغیب نہ ہو۔
ایسے کتب خانوں میں جہاں اُردو مخطوطات کی قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے وہاں (REPROGRAPHY) کی سہولت کا ہونا ضروری ہے تاکہ طلب کرنے کی صورت میں ریسرچ اسکالروں کو ان کی ضرورت کے مطابق مخطوطات کی مائکرو فلم یا زیراکس کاپیاں فراہم کی جا سکیں۔ اس کے علاوہ نادر اور قدیم مخطوطات کی بار بار ورق گردانی سے ان کے خراب یا

(بقیہ صفحہ پر ملاحظہ)

وقار خلیل

اُردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم جون : اُردو گھر (مغلپورہ) میں تعلیم بالغان اسکیم کے تحت فارغ التحصیل ۶۰ طلباء کو اسناد تقسیم کیے گئے۔ جناب عابد علی خاں ٹرسٹی اردو گھر و ایڈیٹر سیاست نے اس جلسہ کی صدارت کی اور کہا کہ اُردو گھر کی تعمیر سے پرانے شہر میں ہمہ وقتی تعلیمی اور تہذیبی کی نشاط ثانیہ ہورہی ہے۔ مینجنگ ٹرسٹی جناب منوہر راج سکسینہ، مہتم اردو گھر جناب علی احمد جلیلی، استاد اُردو گھر جناب الہام واحدی اور جناب رضی الرحمٰن (ڈالن اسکول) نے بھی مخاطب کیا۔

● پاکستان سے موصولہ اطلاع کے مطابق دکن کے صاحب طرز انشاء پرداز، مصنف اور اردو کالج کے سابق پرنسپل، پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کا ۲۲ مئی کو کراچی میں انتقال ہوگیا۔ ریاستی اُردو اکیڈیمی نے چند سال قبل پروفیسر ابوظفر کی اہم عروضی تصنیف "آہنگ شعر" شائع کی تھی۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں ظفر مرحوم کی رحلت پر اظہار رنج والم کیا گیا۔ ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے بانی ڈاکٹر زور سے مرحوم کے روابط استوار تھے۔ خدا بخشے وہ بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔

۲ جون : ممتاز صحافی اور شاعر جناب علاء الدین حبیب سابق سب ایڈیٹر روزنامہ ملاپ کا اچانک بعارضہ قلب انتقال ہوگیا۔ صحافتی اور علمی حلقوں میں حبیب مرحوم کی وفات کو شدید طور پر عرصہ تک محسوس کیا جائے گا۔

۳ جون : صدرنشین ریاستی سرکاری زبان کمیشن ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی تلگو غزلوں کے کیسٹ کی رسم اجراء تلگو فلم اسٹار مسٹر ناگیشور راؤ نے انجام دی اور ڈاکٹر ریڈی کی تلگو، اُردو ادبیات سے یکساں ربط پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تلگو اردو غزلوں سے ہندو مسلم اتحاد کو نئی راہ دکھائی ہے۔ مسٹر راموجی راؤ چیف ایڈیٹر تلگو روزنامہ "اینادو" نے کہا کہ ڈاکٹر ریڈی تلگو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو غزل کے عروضی فارم میں تلگو غزل کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔

۴ جون : جسٹس ایم آر اے انصاری کی صدارت میں ریاستی اقلیتی کمیشن کا اجلاس منعقد ہوا، اُردو سے متعلق حکومتی اقدامات پر اس اجلاس میں جائزہ لیا گیا اور ان کی یکسوئی کے لئے حکومت سے نمائندگی کا فیصلہ کیا گیا۔

۶ جون : نامور نقاد اور سخنور پروفیسر مغنی تبسم صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، لندن اور امریکہ میں ۳ ماہ کے قیام کے بعد حیدرآباد

بل ہوئے۔ موصوف نے اس
وران مختلف سیمیناروں، مشاعروں
ں شرکت کی اور ادب و ثقافت
ہ موضوعات پر لکچر بھی دیئے۔

● بزم شعر و ادب کا مشاعرہ
ناب محمد شفیع التلی سکریٹری مدینہ
کیشنل سوسائٹی محبوب نگر کی
صدارت میں منعقد ہوا جناب امیر
احمد خسرو مہمان خصوصی تھے۔ ابتدا میں
ے صدر جناب رشس اختر اور شبیر
ناب صلاح الدین نیر نے مخاطب
یا۔ پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد اور
ناب علاء الدین حبیب کی وفیات
قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔
خل شعر میں خسرو، خیرات ندیم،
یر، محمد منظور احمد، صادق نقوی،
نیر الزماں نیر اور یونس اختر میاں
نے کلام سنایا۔

رجون: ریاستی ہندی اکیڈمی
ایک مشاورتی اجلاس صدر اکیڈمی
ترسا بندلا دیوی دھن راج گیر کی
صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں
ریاست کے اردو شاعروں کے
منتخب کلام کے ہندی رسم خط میں
ینا انتخاب کی اشاعت کا فیصلہ کیا

گیا۔ اکیڈمی نے اس سلسلے میں پروفیسر مغنی
تبسم، جناب کنول پرشاد کنول اور وقار خلیل
پر مبنی سہ رکنی ایڈیٹوریل بورڈ کی منظوری
دی۔

۱۲ رجون: مجلس شہر ادب کا ماہانہ
مشاعرہ حضرت سید شہیدی کی صدارت
میں ہوا۔ خواجہ شوق، یوسف ناظر،
خواجہ ذاکر گوہر شاہی، فرید متین،
سید فیضانی اور جری القادری نے
کلام سنایا۔

۲۴ رجون: مخدوم سوسائٹی کے
زیر اہتمام رویندرا بھارتی میں اردو ڈرامہ
"غالب کی پرچھائیاں" اسٹیج کیا گیا۔ مسٹر
شرادن کار چیف سکریٹری مہمان خصوصی
تھے۔ غالب پر اسٹیج کئے گئے ڈرامے کو
ادبی اور تہذیبی حلقوں میں بیحد پسند کیا گیا۔

جولائی ۱۹۸۴ء

۳ر جولائی: ابوالکلام آزاد اورینٹل
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام
منعقدہ علمی اجلاس کو اقبال شناس
...... ادیب سردار سربجیت سنگھ
لانبا (دہلی) نے علامہ اقبال کے فلسفہ
خودی پر مخاطب کیا۔ جناب میر اکبر
علی خان صدر انسٹی ٹیوٹ نے صدارت کی

۴ر جولائی: مسٹر سربجیت سنگھ
لانبا نے اقبال اکیڈمی کا معائنہ کیا اور
ذخیرہ اقبالیات پر خوشنودی کا اظہار
کیا۔ جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر
اکیڈمی اور جناب مصلح الدین سعدی
ایڈیٹر "اقبال ریویو" نے اکیڈمی کی
سرگرمیوں سے واقف کرایا۔

۵ر جولائی: حلقۂ ارباب ذوق
(نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری)
کے علمی اجلاس کو مسٹر سربجیت سنگھ
لانبا نے "اقبال اور انسان" کے زیر عنوان
مخاطب کیا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین
فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی
نے صدارت کی۔ جناب محمد منظور احمد
معتمد اعزازی حلقۂ ارباب ذوق نے
مہمان مقرر کا تعارف کرایا اور نظامت
کے فرائض انجام دیئے۔

۸ر جولائی: ترقی اردو بیورو
(وزارت تعلیم حکومت ہند) کے
زیر اہتمام چلائے جانے والے مراکز
خوشنویسی کے عہدیداروں کی کل ہند
کانفرنس، حیدرآباد میں کل ہند اردو
تعلیمی کمیٹی کی طرف سے اس کے
صدر جناب خلیل پاشاہ کی صدارت
میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر کتابت

اور [illegible] کے علاوہ اردو کے
تعلیمی و تدریسی مسائل پر تبادلۂ خیال
ہوا۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف
اور پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبہ
اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے بہ حیثیت
مہمانان خصوصی شرکت کی۔ مندوبین
میں پروفیسر نظام الدین ایس
گوریکر (بمبئی)، ڈاکٹر عثمانی (وانمباڑی)
ڈاکٹر انصاری (مالیگاؤں) اور جناب
میر سراج الدین علی خاں وداد رعادیا
اور دوسروں نے شرکت کی۔

● ایلیڈرس کونسل آف انڈیا
کے زیر اہتمام محفل [illegible] کے
موقع پر جناب پروفیسر مغنی تبسم اور
ڈاکٹر [illegible] نے سفر یورپ،
امریکہ کے حالیہ دورہ پر اپنے
خوشگوار اور معلومات آفریں
تاثرات پیش کئے۔ بلا دی مشاعرہ
کے تحت تقریباً دو درجن معززین
نے اپنے پسند کے اشعار سنائے۔ محفل
مشاعرہ میں مسز ڈاکٹر مغنی تبسم،
بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر نکہم، وقار خلیل
محمد منظور احمد، صلاح الدین نیر،
رشن اختر، فیض الحسن خیال، رکن الدین
احمد وفا اور شیخ سعد حسن سعدی نے
کلام سنایا۔ جناب جیلانی پیرک نے
نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۴ر جولائی: محفل خواتین کے علمی و
شعری اجلاس کی محترمہ سلمیٰ کمال الدین
نے صدارت کی۔ محترمہ نجمہ نکہت نے
کہانی اور محترمہ ڈاکٹر فرحت لطیف
نے خواتین کے موضوع پر مضمون
سنایا۔ خواتین شعراء نے اس موقع
پر اپنے کلام سے نوازا۔ مظفر النساء ناز
نے نظامت کی۔

● پرنس نواب مکرم جاہ بہادر نے
اردو گھر میں صاحبزادہ اختر واجد
کے مجموعۂ غزل "آواز کی خوشبو"
رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان
[illegible] انجمن ترقی اردو نے
اس خوشگوار تقریب کی صدارت
کاظم نواز جنگ (علی پاشاہ) اور
انصاری صاحبان مہمانان خصوصی
ڈاکٹر حسن الدین احمد، جناب منو
راج سکسینہ، جناب محمد منظور احمد
جناب نذیر علی عدیل اور محترمہ
جمیلہ رضوی سحر نے اختر واجدی
شاعری پر اظہار خیال کیا۔ جناب
عابد صدیقی نے نظامت کے فرائض
انجام دیئے۔

۱۵ر جولائی: بزم طنز و مزاح کے
زیر اہتمام اردو گھر میں بصدارت
محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف
لطیفہ گوئی کی محفل آراستہ ہوئی۔

(باقی آئندہ)

مخطوطات اور اردو ادب ● ص ۳۷ سے آگے

تلف ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس لئے ذخیرہ کے تحفظ کے لئے ایسے مخطوطات کی میکرو فلم کاپیاں تیار کی جانی چاہیئے۔ اس طرح اصل مخطوطہ بہ شکل عکس محفوظ ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ ریسرچ اسکالر بیشتر صورتوں میں اصل مخطوطہ کی بجائے اس کی عکسی تصویر سے کام چلا سکتے ہیں۔ ▲▼

GUST 1984

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 482,

سب رس



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جلد ۴۴ شمارہ ۹ سن اجراء ۱۹۳۹ء

فون: ۳۸۴۶۹

ستمبر ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرسالانہ: ۳۰ روپے کتب خانوں سے ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے بیرونی ملکوں سے

بحری ڈاک سے	ہوائی ڈاک سے
۶ ڈالر	مشرق وسطیٰ ۱۵ ڈالر
۷ ڈالر	امریکہ ۲۰ ڈالر
۴ ڈالر	[illegible] ۱۰ ڈالر
۲½ پونڈ	انگلستان ۸ پونڈ

رحمٰن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس چادر گھاٹ سے چھپوا کر حیدرآباد ۔ ۴ سے شائع کیا

کتابت: رضی الدین اقبال

خط و کتابت کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲

سرورق: سلطان ابوالحسن قطب شاہ

ترتیب:

خادم رزمی

سلام

چھلے پیچ کو مشکیزے میں پانی بھرنا
پھر چھوٹے لشکر کے بیچوں بیچ گزرنا
رات تلاطم خیز فضا اور ایک صدا کا
دور دجلے جس کو موت کے گھاٹ اترنا
اک جانب سایہ سبزہ ہے دوزخ جس کا
دوجی سمت سلگتی ریت پہ کوثر جھرنا
سورج اس دھرتی پر دھوپ بچھائے شاید
جس پر ایک گلاب بدن کو ابھی بکھرنا

کیسی نوری سوچوں، سچے لہجوں والے
سچائی کے ساتھ ہی جن کا جینا، مرنا

سلیمان اطہر جاوید

قلم کی کاشت

ایک مطالعہ

محمد عثمان عارف نقشبندی، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ایڈووکیٹ، سیاستداں، وزیر با تدبیر، صوفی منش اور شاعر ———— اہم بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی یہ جہات ایک دوسرے کو متاثر کئے بغیر مختلف سمتوں میں رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ان کے ایڈووکیٹ، سیاستداں، صوفی اور وزیر کے موقف نے ان کی شاعرانہ مرتبت میں اضافہ شاید ہی کیا ہو، ہاں ان کی شاعری نے ان کی ان حیثیتوں کو اور جلا بخشی ہے کچھ اور دلآویز اور محترم بنا دیا ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات اور معاملات سے وابستگی کے باوصف عثمان عارف اپنی شاعری پر اتنی ہی توجہ دیتے ہیں جیسے نہ ان کی اور کوئی مصروفیت ہے اور نہ وہ کسی اور معاملہ سے وابستہ ہیں پھر ایسی عجب غیر بات بھی نہیں۔ بیشتر زبانوں میں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خود برصغیر میں ایسے متعدد نام ہیں اہمیت رکھتا ہے تو دور عصر حاضر میں حسرت موہانی، فیض، مخدوم، وجاہت قاضی علیم کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

عثمان عارف نے اپنی شاعری پر توجہ دینے کے باوجود، [illegible] سبب خصوصاً اپنے کلام کی اشاعت پر ایسی اور اتنی زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس لئے بحیثیت شاعر کے انہیں وہ مقام نہیں مل سکا جس کی ان کی شاعری استحقاق رکھتی ہے تاہم ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "نغمہ طور" (۱۹۸۷) "[illegible]" (۱۹۸۸) "[illegible]"

کاشت" اور "نور زندگی" (۱۹۸۲ء) —————— یہ ایک قابلِ لحاظ سرمایہ ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے تنقید نے ان کے بارے میں توجہ نہیں دی —————— "قلم کی کاشت" عثمان عارف کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں اُردو غزل کے سارے روپ جلوہ گر ہیں۔!

عثمان عارف کی شاعری کی عمر اور ان کی دیگر مصروفیات خواہ کچھ ہوں لیکن ان کو ابتدا سے شاعرانہ ماحول ملا۔ عثمان عارف نے شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ ان کے والد الحاج مولانا محمد عبداللہ بیدل بیکانیری، ایک نامور شاعر تھے۔ جن کا شمار حضرت بیخود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا۔ عثمان عارف کا رشتہ شوق قدوائی سے بھی ملتا ہے کہ کالج میں عثمان عارف کے استاد حکیم بادشاہ حسین رعنا لکھنوی تھے جو نبیرۂ شوق ہوتے ہیں۔ یوں عثمان عارف کا تعلق دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے ہو جاتا ہے اور ان دونوں دبستانوں کے بیشتر اوصافِ حمیدہ سے ان کی شاعری مزیّن ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ عثمان عارف کی غزل میں اُردو غزل کے سارے روپ جلوہ گر ہیں۔ میرے نزدیک یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ عثمان عارف نے جہاں غزل اور غزل کی روایات کا گہرا مطالعہ کیا اور ان سے اخذ و اکتساب کیا ہے، عصری زندگی اور اس کے مسائل اور تقاضوں پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ زندگی کو انھوں نے ہر زاویئے اور ہر جہت سے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، برتا ہے اور یہ ساری جھلکیاں ان کی غزل میں مل جاتی ہیں۔ "قلم کی کاشت" میں عثمان عارف کی صرف غزلیں شامل ہیں اور اس کاشت کی آبیاری، کوئی شبہ نہیں "انہوں نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ میں یہاں سب سے پہلے "قلم کی کاشت" سے چند ایسے اشعار پیش کروں گا جو غزل کے ایسے روایتی رنگ کے حامل ہیں جس سے غزل، کچھ ایسی نیک نام نہیں۔ عثمان عارف نے یہ اور بات ہے اس رنگ میں اپنے آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ یہ شعر ؎

کہاں غموں کی کڑی دھوپ میں قیام کریں — تمہاری زلفوں کا سایہ ملے تو شام کریں

بپھر اٹھتا ہے جو دیکھا ہے اس طرح یارِ شباب — جس طرح مئے سے لبالب جام چھلکا جائے ہے

پھولوں سے بھی نازک ہے وہ شبنم سے خنک تر — جو شعلہ بدن و شعلہ رخ و شعلہ جبیں ہے

گرانا بجلیاں پردۂ اغیار — کرم یہ بھی ستم سے کم نہیں ہے

چمن میں لالہ و گل سے جو ہمکلام ہوا — تو یاد آ گئی تیری ادا ادا مجھ کو

پیار خود آتا ہے آئینہ میں اپنے حسن پر — اب تو وہ اپنی ادا پر خود ہی شرما جاتے ہے

ان اشعار کے موضوعات روایتی ہیں اور اسلوب بھی۔ عثمان عارف نے یوں روایتی غزل کے رنگ و آہنگ دونوں کے جمال کو بہ تمام و کمال برقرار رکھا ہے لیکن ان ہی حسن و عشق کے موضوعات پر ان کے اشعار غیر معمولی طرحداری کے حامل ہیں۔ خارجیت سے دور، روایتی انداز سے ہٹ کر، بڑے ہی نکھرے ستھرے، چہکتے مہکاتے، دلوں کو چھوتے سے۔

یہ ہے خلوص ترکِ تعلق کے باوجود — آنسو نکل پڑے جو کبھی سامنا ہوا
محبت خود بخود ہے ایک عالم — شریک اس میں کوئی عالم نہیں ہے
اک ہوس سی دل میں ہے تو آنکھوں میں ہیں آنسو — اس محفلِ شب ویراں سے وہ گذرا سا لگے ہے
نرم خو، شیریں سخن، نازک بدن، رنگیں لباس — اب کوئی ایسا نظر آیا تو کتنا ڈر لگے

تصوف، اردو غزل اور خاص طور پر روایتی غزل سے ملزوم نہ سہی تاہم ان دونوں کا باہمی رشتہ گہرا اور مضبوط ہے۔ آج عوام کا مزاج اور ماحول بھی تصوف کا کہاں؟ بنیادی وجہ یہ بھی ہے عثمان عارف نسبتِ طریقت، نقشبندی رکھتے ہیں اور بقول خود صوفی بھی ہیں۔ اس طرح ان کی غزلوں میں تصوف کی کار فرمائی تعجب کی بات نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کا رنگ گہرا سہی، گیرائی کا حامل نہیں ہے۔ ان کے ہاں تصوف کے موضوعات اور مسائل کے حامل اشعار کچھ ایسی زیادہ تعداد میں نہیں ملتے۔ کم از کم زیرِ نظر شعری مجموعہ "قلم کی کاشت" میں اس نوع کے اشعار کی تعداد کم ہے۔ میں چند اشعار درج کرتا ہوں۔

کوئی رہبر نہیں دیکھا نہ کوئی ہمسفر جانا
وہ جس نے شمعِ دل کو ہی چراغِ رہگذر جانا

نور ہی نور ہے نقشہ کہاں، تحریر کہاں
آئینہ خانہ میں دیکھیں تری تصویر کہاں

کس کی عظمت کا ہے مظہر یہ جہانِ رنگ و بو
دیکھنا عارف، نگاہِ معتبر سے دیکھنا

البتہ نقشبندی گھرانے سے وابستگی اور صوفیانہ رجحانات سے عثمان عارف نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اپنے ایک اور مجموعۂ کلام "نغمۂ زندگی" میں "حالاتِ مصنف" کے تحت انہوں نے لکھا ہے: "صلح کل میرا مشرب، خدمتِ خلق نصب العین، زندگی اور انسانیت میرا دین و ایمان ہے، یہی بہت بڑی چیز ہے، بہت بڑی دولت ہے۔ اسی وسیع النظری اور وسیع القلبی

سے آئینہ دکھانے کے ہر شعبہ میں سر فہرست رہے۔ مسلمانوں ... کو اور علم اخلاق کے انحطاط ... جذبات کو کس قدر مجروح اور منتشر کر دیا ہے اور یہیں ان کو احساس کی دولت بیدار ... یہ ہے جو بہت کم کے حصے میں آتا ہے۔ شاعر کے جذبات کس قدر نازک ہیں وہ غیر معمولی حد تک کس قدر حساس ہے اس کا اظہار تو غزلوں کے بے شمار اشعار سے ہوتا ہے۔ یہاں صرف نمونے کے دو، تین شعر پیش ہیں ــ

یہ کیا دستور ہے حضرت، یہ کیا آئین دنیا کا
تہی دامن کوئی رہنا کوئی پھولوں سے بھر جانا

موت پر آہیں بھریں، ماتم کریں، آنسو بہیں
زندگی وہ سانحہ جس کا کہیں رونا نہیں

وہ جسم ہوں جو چوٹ سے شیشے کی نہ ٹوٹے
جو پھول کے لگنے سے ہو زخمی وہ بدن ہوں

ایسا بدن جو پھول کے لگنے سے زخمی ہو وہ کہاں تک سلامت رہ سکتا ہے۔ ٹوٹ ٹوٹ جائے، ریزہ ریزہ بھی ہو جائے تو کم ہے۔ یہ انتشار و افتراق، یہ اخلاقی قدروں کا فقدان، تہذیب کا ماتم، علیحدہ روایات کا مرثیہ یہ ایک کب تک دیکھتا اور پڑھتا رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات، یہ بہیمیت، انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل، یہ شب و روز کی کب تک برداشت کرے۔ ایسے تک خون کے آنسو روتا رہے [illegible] مبادا کہ غمگین عارف نہ صرف برسر اقتدار جماعت کانگریس کے ایک اہم رکن ہیں بلکہ ایک اہم وزیر بھی۔ بعض [illegible] حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری حکومت ہمیشہ جذبۂ اختلاف کے سر تھوپتی ہے، یہ درست نہیں، حکومت کو بھی اپنی ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے۔ غمگین عارف نے حکومت سے اپنی وفادارانہ وابستگی کے باوجود، فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں بڑا غیر ذمہ دارانہ اور دو ٹوک موقف اختیار کیا ہے۔ یہ جرأت مندی کا ثبوت ہے۔ وہ یہاں کچھ نہیں رہ جاتے نہ سیاست داں نہ وزیر، نہ کچھ اور بلکہ صرف اور صرف ایک انسان! واقعہ یہ ہے کہ غمگین عارف سیاست پر اخلاقی قدروں کی بالادستی کے قائل ہیں۔ اپنے سیاسی موقف کو انہوں نے کھلے طور پر واضح کیا ہے، اپنے شعری مجموعہ "نیرنگ" میں انہوں نے اس سیاست کی تائید کی ہے" جس کا نام حکمت ہے جو انسانیت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے خلاف نہ ہو۔ اب یہ اشعار پڑھیئے جو صرف ایک انسان کے جذبات و احساسات کا اظہار ہیں ــ

کسے معلوم تھا جب جائے گا سب شہر بنا مقتل
ہر سو ہیں شعلے بار کوچۂ قاتل سے نکلے ہیں

کیا دیوانے کو سمجھانے چلے فرزانے
شہر کی سڑکوں پہ یہ خون اچھالا کیوں ہے

انسان ہیں کہ شہروں میں خونخوار درندے
معلوم نہیں ہوتا جنگل ہے کہ بستی ہے

اک خون کا سیلاب ہے اک آگ کا دریا
جو امن کی دھرتی تھی وہ مقتل کی زمیں ہے

غنچہ و گل کیا کہیں گے وہ تو شعلے بن گئے
سوالیہ نظر لیے جلتے گھر سے دیکھتا

پریشاں، سہمے سہمے، دم بخود ہو کے چھپ
پاس کے جلتے مکاں سے شعلے لپک کر لگا

صرف فرقہ وارانہ فسادات ہی کیا؟ زندگی اور زمانے کے دیگر واقعات، پیچ و خم، نشیب و فراز اور سیاہ و سپید کا بھی عثمان عارف نے بنظرِ غائر جائزہ لیا ہے۔ عصرِ حاضر کے اخلاقی زوال، مفاداتِ حاصلہ کی کشمکش، مادہ پرستی، کساد بازاری، دولت کی نامنصفانہ تقسیم، مجرمانہ ذہنیت، ماحول کی تہی مائیگی کھوکھلے پن، معاشرتی اختلال، سیاسی انتشار، غرض یہ اور ایسی کئی چیزوں کا وہ گہرا احساس رکھتے ہیں ان کا نقطۂ نظر انسانیت دوست اور زندگی بخش ہے۔ اپنی صوفی منشی اور جرات و بیباکی کے باعث وہ اظہار میں کسی رو رعایت کے بغیر کرتے ہیں جو خارج میں وہ دیکھتے ہیں اس لئے بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ غرض اس طرح حیثیت سے ان کے کلام میں ایک اپنائیت اور بے ساختگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے انہوں نے اپنے اطراف و ماحول اور "آج" سے پیار کرنا سیکھا ہے وہ فرسودہ روایات اور ساکت و جامد رسم و رواج سے دامن بچا کر ایک نئی صبح کے منتظر ہیں ـــ جلنے دو خوشبو صبح کی ہوا آئی ہے

زندگی ایک نئی صبح سے شرمایا جائے
کیسے پیچیدہ معاملات کو سلجھایا جائے
کس سے گرتی ہوئی دیوار سنبھالا جائے

یہ اور ایسے کئی اشعار شاعر کی عصری حسیت کی دستاویز ہیں، جیسے اشعار نہیں مرقعے ہیں عصری زندگی کے مختلف گوشوں کے، مختلف پہلوؤں کے ـــ

لو عرفان ہراس ہے، پتھرائے ہیں لوگ
پوچھیں جو حالِ ظلم کسی سے کہا نہ جائے

تنہا کشو حیات کے ساماں کے باوجود
کاندھوں پہ زندگی کا جنازہ دکھائی دے

کیسی وفا، کہاں کی محبت، خلوص کیا !
چھوڑو گذر گیا وہ زمانہ گذر گیا

ساحل کہاں ہے امن کا طوفانِ زندگی
انسان آج قلزمِ خوں میں اتر گیا

بہت اداس، بہت مضمحل، بہت غمگیں !
یہ زندگی ہے اسے نذر کس کے نام کریں

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جدا ہے
بازار میں دنیا کے ہر اک شخص بکا ہے

سونا حرام، شام و سحر جاگتے رہو
انسانیت کا غم ہے اگر جاگتے رہو

اور پھر اس غزل کے بیشتر اشعار کئی مسائلِ حاضرہ کو اپنے میں سمیٹے۔ شاعر کی عصری حسیت کی جامع اور وقیع تصویریں ہیں۔ میں چند شعر درج کرتا ہوں ـــ

مجھے تم اپنی بابت جو بھی کہدو مان لیتا ہوں،
یہ دنیا تو تمہاری داستاں کچھ اور کہتی ہے

تمہیں دھوکے میں رکھتا ہے تبسم لالہ و گل کا
مجھے حالات، برقِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

بہت ممکن امیرِ کارواں کی کوئی منزل ہو
مگر رفتارِ اہلِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

بہاروں کی تعریفوں کے کل جو گیت گاتی تھی

وہ آواز حال گلستاں کچھ اور کہتی ہے
اجازت دی ہمیں تحریر کی تقریر کی تم نے
مگر آوازِ ساز ترجماں کچھ اور کہتی ہے

خصوصاً آخری تین اشعار میں جو طنز اور امر واقع کا اظہار ہے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت مشکل سے یقین آتا ہے (بلکہ نہیں) کہ یہ اشعار برسرِ اقتدار جماعت کے ایک ذمہ دار رکن کے ہیں (عموماً ایسے اشعار تو ہمارے ہاں بائیں بازو کے رجحانات کے حامل شاعروں کے ہوتے ہیں) عثمان عارف نے گویا یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانیت اور انسان دوستی اور اخلاقی قدروں کا احترام سیاسی اور نظریاتی وابستگی سے بالاتر ہے۔ اگر انسان کے دل میں خلوص اور دردمندی ہے اور وہ انسان کو انسان سمجھتا ہے تو سب سے پہلے وہ انسان کے دکھ پر روئے گا، اس کی خوشی پر مسکرائے گا، خواہ وہ انسان اپنا ہو یا پرایا ——————

یہی انسان دوستی، دردمندی، اخلاص، پیار اور اپنائیت کے جذبات عثمان عارف کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ ان سے ان کے کلام میں ایک ایسی دلنوازی اور دلکشی پائی جاتی ہے کہ غزل اور نکھر جاتی ہے۔ یہ اشعار آسانی سے نہیں بھلائے جا سکتے ــــ

اخلاص و محبت کے حسیں پھول کھلے ہیں
ہم جس سے ملے، جی سے ملے، دل سے ملے ہیں

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارف، خدا بہت ملے، انسان کم ملے

ہونے کو تو اس دور میں کیا چیز نہیں ہے
انسان کو ڈھونڈو یہاں، انساں ہی نہیں ہے

سپردِ مرگ کیا، کیسی بے وفا نکلی!
تمام زندگی جس زندگی کے ساتھ چلے

تغزل، غزل کا وصفِ خاص ہے۔ یہ کہنا لایعنی ہے کہ تغزل الفاظ کی رنگینی، مرصع کاری اور تشبیہات و استعارات کی دلآویزی سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن تغزل کے لئے دراصل خیال کی رنگینی اور دلآویزی اولین شرط ہے۔ مشاہدہ کی گہرائی، احساس کی شدت، اظہار کی بے ساختگی اور خیال و اظہار میں ہم آہنگی بھی ———— بطور مثال ایسے بہت سے اشعا

پیش کئے جا سکتے ہیں کہ سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ کے باوجود فکر و خیال کی چاشنی اور وقار سے وہ جدیدِ ادبی سرمایے کا گراں بہا حصہ بن گئے ہیں۔ تغزل کے لئے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں۔ یہاں مختلف موضوعات کے حامل ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں الفاظ کی رنگینی اور چکا چوند کی کیفیت ہو یا نہ ہو، تغزل کے اچھے نمونے ہیں ؎

وقت ہی کیا مصروف ہے تقاضوں کے ساتھ
کتنی تصویریں بناتا ہے بگاڑ دیتا ہے

نقاب چہرے سے کس نے اٹھائی پچھلی رات
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں چاند مدھم ہے

اخلاص و محبت کے حسیں پھول کھلے ہیں
ہم جس سے ملے جی سے ملے دل سے ملے ہیں

جنونِ عشق میں منزل کو جا لیا ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

اب یہاں ایسے بھی اشعار پیش کروں گا جن سے ظاہر ہوگا کہ کوئی فنکار اپنے زمانے کی اقدار اور رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ اقدار و رجحانات اچھے ہوں کہ برے، خوب ہوں کہ خراب، شستہ ہوں کہ شکستہ، بہر کیف اپنی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے جدید شاعری کے معائب اور محاسن کے بارے میں کچھ عرض کرنا نہیں ہے اس لئے کہ ہر دور کی شاعری معائب کی بھی حامل ہوتی ہے اور محاسن کی بھی۔ کم یا زیادہ، یہ اور بات ہے۔ عثمان عارف اپنے مزاج کے اعتبار سے اگرچہ اُردو شاعری کی کلاسیکل روایات سے قریب ہیں لیکن غزل کے جدید رجحانات کی کارفرمائی بھی ان کے ہاں ملتی ہے اور وہ اشعار جن سے جدید شاعری کی طرحداری اور بانکپن کا اظہار ہوتا ہے ؎

کیسے بوسیدہ روایات کو قائم رکھیں
کس سے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

وہ خوف و ہراس کا ہے پتھر بنے ہیں لوگ
پوچھیں جو حالِ ظلم، کسی سے کہا نہ جائے

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جدا ہے
بازار میں دنیا کے ہر ایک شخص بکا ہے

زخم [illegible] مرقعے کے ہیں کتنے انگشت
شہر کی سڑکوں پہ پڑے دیکھا ہے

اپنے اپنے چہروں سے ڈرتے — وقت کے ہاتھوں میں آئینہ بھی ہے

لیکن اس کے ساتھ ایسے اشعار بھی ہیں جو مجموعی طور پر عثمان عارف کے مزاج سے ہم آہنگ تو نہیں، بس لگتا ہے جدید شاعری کی رو نے انھیں متاثر کردیا اور یہ اشعار آپ ہی آپ ہوگئے۔ ان اشعار کی تعداد "قلم کی کاشت" میں زیادہ نہیں، تاہم چند ایک ضرور ملتے ہیں۔ یہ دو ایک ــ

بھونکا ہوتا ہے آگ بھیڑیے کے پیٹ میں — پانی کے حلق میں ہے جو کانٹا لگا ہوا

"ابلاغ" میں جو ساتھ حسینہ تھی کل ترے — ہنستی تھی آج "تاج" میں اک نوجوان سے

گاؤں کی گوری کہاں، گھونگھٹ کہاں — سامنے نہریں بھی ہیں دریا بھی ہے

مجموعی طور پر "قلم کی کاشت" اردو شاعری میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ عثمان عارف نے زندگی کا گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیا ہے۔ احساس کی ندرت، جذبات کی شدت، مشاہدے کی گہرائی، اظہار کی شگفتگی کے باعث ان کے کلام میں خاصی دیدہ زیبی اور لالہ کاری ہے۔ انھوں نے بلاشبہ ماحول کی تیرہ ناکی، اخلاقی بحران اور معاشرتی قدروں پر آنسو بہائے ہیں لیکن وہ انسان اور انسانیت سے مایوس نہیں۔ یہی رجائیت شاعر کا بہت بڑا ہتھیار ہے۔ رجائیت کے جلو میں کئی اشعار ان کے مزاج کے اس رُخ کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اسی رجائیت کے باعث کہا جا سکتا ہے کہ عثمان عارف کی شاعری آج کی نہیں، کل کی شاعری ہے۔ زندگی کی اخلاقی قدروں، اعتماد اور اعتبار کی شاعری ——— اور آخر میں بس ایسے چند اشعار جو

ڈوبنے والے سے طوفاں کی حقیقت مت پوچھ
ڈوبنے والا ہی ساحل کا پتہ دیتا ہے

اک صبح نو کی شوخ کرن کی امید میں!
رکھتا ہوں ذہن و دل کا دریچہ کھلا ہوا

مجبوریوں کو ان کی ہمیشہ رکھو خیال میں
آئیں گے وہ ضرور، مگر جاگتے رہو

جنون عشق میں منزل کو جا لیا ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

منزل ہمارے اپنے ارادوں کے ساتھ ہے
رہبر طلب نہ اب کوئی نقشِ قدم بنے

رفعت النساء بیگم

کرشن چندر کی افسانہ نگاری

کرشن چندر عصر حاضر میں اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ شگفتہ، پرکیف اور بے ساختہ اسلوب، ہلکی ہلکی غنائیت، طنز و مزاح کی پرلطف چاشنی اور فطرت کے حسن کو لے کر کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے تانے بانے بُنے ہیں۔ ان کے موضوعات عام طور پر رومانی ہوتے ہیں لیکن ان رومانی موضوعات کو انہوں نے کچھ ایسے رنگ و آہنگ سے پیش کیا ہے کہ زندگی کی بڑی بڑی حقیقتیں ان کے دائرے میں سمٹ آتی ہیں۔ یوں تو ہر فنکار جذباتی اور حساس ہوتا ہے لیکن کرشن چندر میں یہ کیفیات کچھ اور زیادہ تھیں اور پھر زبان و بیان پر انھیں کچھ ایسی قدرت حاصل تھی کہ انھوں نے مبہم جذبات اور انجانے احساسات کو لفظوں کا پیکر دے کر ان کی تقدیر ہی بدل دی۔ اگرچہ کرشن چندر کی ہر کہانی پر رومانیت کی چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے لیکن خاص طور پر ان کے ابتدائی دور کی کہانیاں پورے طور پر رومانی ہیں۔ کشمیر کی حسین اور دلکش سرزمین، گلپوش اور گلنار پہاڑیاں، جھل جھل کرتی شوخ اور چنچل ندیاں، چاندنی لٹاتے آبشار، برفانی کہسار اور دھڑکتے ہوئے دل اور ان دھڑکتے ہوئے دلوں کی محبتیں ———— اس ماحول سے اپنے افسانوں کا مواد لے کر کرشن چندر نے کیا کچھ قیامتیں نہیں ڈھائی ہیں، کچھ نہ پوچھئے ————

یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ کرشن چندر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گزارا۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے حسن کے دل کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کشمیر کی زندگی کا دوسرا پہلو اس کی بدصورتی ان کے افسانوں میں معنی خیزی کے ساتھ ابھر آتی ہے۔ مہیب بدصورتی جاگیردارانہ ماحول اور اس کی مظلومیتوں، سفاکیوں، ظالمانہ اذیت کوشیوں اور کشمیری عوام کی غربت اور زندگی کے لئے صبر آزما

پہلو وجہ سے متعلق ہے۔ یوں تو حسن اور بدصورتی دونوں پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کرشن چندر نے کشمیر کی زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ متضاد ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے ایک رخ کو پیش کرتی ہے۔ حسن اور بدصورتی کا یہی متوازن امتزاج تاثر کی شدت کو تیز کر دیتا ہے اور یہی چیز ان کی ہمہ گیر اور وسیع مقبولیت کا باعث بھی ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'طلسم خیال' ہے۔ اس مجموعے کے افسانے اس وقت لکھے گئے جب کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب پر چھائی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ 'طلسم خیال' کے افسانوں پر رومانیت کی چھاپ گہری ہے پر رومانیت محض لفاظی، زندگی سے فرار اور تخیل پرستی ہی سے عبارت نہیں بلکہ کرشن چندر نے طرحداری سے کام لیتے ہوئے اس میں علم و ادراک اور آگہی اور تجربات اور زندگی کی سنگین حقیقتوں سے ٹکرانے کے عزم کی آمیزش بھی کر دی ہے۔ ان کی رومانیت محض لذت پرستی نہیں، ریاکاری سے نفرت، بناوٹ سے بیزاری کا احساس دلاتی اور صاف ستھرے معاشرے کی تشکیل پر آمادہ کرتی اور معصومیت اور مظلومیت سے پیار کے آداب بھی سکھاتی ہے۔ 'طلسم خیال' کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت ان کی منظر نگاری ہے۔ قاری کشمیر نہ بھی گیا ہو، کرشن چندر کے افسانے پڑھتے ہوئے کشمیر کی سیر کر لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کشمیر کے ایک ایک منظر، ایک ایک باغ، ایک ایک روش، ایک ایک پھول، ایک ایک پھل، وادیوں کے حسن، کہساروں کے نکھار اور جھیلوں کی شادابیوں کو وہ اپنے افسانوں میں متحرک اور چلتے پھرتے پیش کر دیتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کے مجموعے "نظارے" کا رنگ ڈھنگ بدلا جاتا ہے۔ یہاں رومانیت کی لے مدھم اور حقیقت یعنی اور سماجی شعور سے ہم آہنگ ہوتی ہے گویا رومانیت اور حقیقت ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں۔ فنکار اب صرف رنگین وادیوں کی سیر نہیں کرتا بلکہ تلخ حقائق کو بھی دیکھتا اور اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے۔ 'نظارے' کے افسانوں میں وادیاں اور آبشار بھی ہیں مگر ان پر پولیس کا پہرہ بھی، مدہوش کن حسن رکھنے والی کشمیری لڑکیاں بھی ہیں، لیکن یہ لڑکیاں جاگیرداروں کے شراب کے برتن بھی صاف کر رہی ہیں اس طرح وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو، متضاد پہلوؤں کو اپنے افسانوں کے کینوس میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا معرکہ آرا افسانہ 'دو فرلانگ لمبی سڑک' ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی سڑک کی کہانی ہے جس میں نہ کوئی مشاہدہ ہے نہ پیچ و خم، سیدھی سادی چلی گئی ہے جس میں زندگی کے بھیانک گوشے منظر عام

کیے گئے ہیں یہ شاہکار افسانے واقعات پر مشتمل نہیں افسانہ مجموعی طور پر لکھا جاتا تھا اور اسی طرح کرشن چندر کا فن رومانیت اور حقیقت پسندی کا ایسا خوبصورت امتزاج ہے جس پر غلبہ رومانیت کو حاصل ہے۔ کرشن چندر صف اول کے ترقی پسند ادیب تھے لیکن بعض نقادوں نے ترقی پسند کہنا چاہیے ترقی پسند نقادوں میں سجاد ظہیر اور سردار جعفری نے نظریے کو زیادہ اہمیت دی اور کرشن چندر، عالی، اختر علی سردار جعفری اور کرشن چندر ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے نظریے کے ساتھ ساتھ زندگی اور ادب کے دیگر تقاضات کو بھی برتا۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کرشن چندر نے ترقی پسندی کا نام لے کر رومانیت کی اشاعت کی ہے۔ اصل میں یہ ہر عظیم ادیب کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے نہ رومان کی لذتوں سے منہ موڑ سکتا ہے۔ کرشن چندر کی دنیا بھی ان دونوں کے درمیان آباد اور شاد ہے۔

کرشن چندر نے افسانہ کی فنی حیثیت پر کم ہی زور دیا ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری اور منظر نگاری جیسی چیزیں ان کے ہاں ایسی اہمیت نہیں رکھتیں، انھوں نے ان عناصر پر بہت کم زور دیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

” افسانے میں چاہے کچھ بھی تجربات کیے جائیں لیکن کہانی پن ضرور ہو تو زندگی ہے بلکہ یہ کہانی پن ہی ہے جو واقعات کو ایک نوع کی فنی تنظیم کی شکل دیتا اور افسانہ کو آگے بڑھاتا اور افسانے کو پلاٹ کی چار دیواری سے باہر نکلنے نہیں دیتا ہے یہاں کہانی کا مرکزی خیال بکھرنے نہیں پاتا۔ کرشن چندر نے پلاٹ کے بارے میں عجیب عجیب تجربے کیے ہیں بقول ایک نقاد کرشن چندر پلاٹ کے معاملے میں بہت زیادہ ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ”زندگی کے موڑ پر“ جیسے پیچیدہ پلاٹ کے حامل افسانے بھی لکھے اور ”دو فرلانگ لمبی سڑک“ جیسا افسانے بھی، جن کا کوئی پلاٹ ہی نہیں اور انہوں نے معکوس پلاٹ سے بھی کام لیا یعنی ان کے بعض افسانوں کا پلاٹ وہاں سے آغاز ہوتا ہے جہاں اس کو ختم ہونا ہوتا ہے۔ ”موہنجداڑو کا خزانہ“ اور ”تیڑھی میڑھی ریل“ ایسے ہی افسانے ہیں لیکن کرشن چندر نے پلاٹ کے اعتبار سے اردو ادب کو بعض از حد خوبصورت اور دلکش افسانے بھی دیئے ہیں۔ جیسے ”بھلا“ — ایک کسان کا اپنی زمین کے لئے پٹواری سے لے کر آسمان پر خداؤں تک پہنچنا اور واپس اپنی زمین پر پہنچ دیا جانا اور اس طرح اس کی خودی کا بیدار ہونا نہایت خوبی سے اس افسانے کے کینوس پر پھیلا دیا گیا ہے۔ و نیز ان کے کامیاب پلاٹ کے حامل افسانوں میں ”پالنا“، ”چھوٹے پیٹ کا کنواں“، ”بھگوان کی آمد“، ”بھیڑیوں کا منصف لیڈ“

لائقِ ذکر ہیں ——— اور یہی حال کردار نگاری کا ہے اگرچہ افسانہ میں کردار نگاری کو اور عناصر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن کرشن چندر کا رویہ اس تعلق سے بھی بے نیازانہ اور رومانی ہے۔ وہ اپنے کرداروں پر بہت کم زور دیتے اور عموماً ان کو بیانیہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور کرداروں کو افسانہ کے پلاٹ پر قربان کر دیتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو کرشن چندر کی رومانیت ان کے کرداروں کے تعلق سے بھی لائقِ دید ہے۔ ان کے افسانوں کی ہیروئنیں، ہیروؤں سے زیادہ لائقِ توجہ ہوتی ہیں اور یہ ان کی رومانیت ہی ہے کہ ان کے کرداروں پر نہ مفلوک الحالی کا اثر پڑتا ہے اور نہ ظلم و ستم اور محنت و مشقت کا ——— وہ لاکھ مفلس ہوں، جور و استبداد کا شکار ہوں، تعجب کی بات ہے اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے کئی نسوانی کردار اس سلسلے میں بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ نسوانی کردار بے حد غریب اور فاقہ زدہ ہیں لیکن غیر معمولی حسین ہیں۔ کرشن چندر ان کے حسن کی تمام جزئیات کو ان کے ناک نقشے اور خد و خال کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ہونٹوں کی یاقوتی سے لے کر غلافی پپوٹوں والی آنکھوں کی پلکیں تک گن ڈالتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ مسلسل فاقوں محرومیوں اور صعوبتوں کے باوجود یہ حسن برقرار کس طرح رہ گیا ——— ان کے افسانے 'پولکیش کی ڈالی' کی ہیروئن فاقہ زدہ علاقے میں رہتی ہے لیکن ان کے حسن کی بے مثالی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چہرہ پہ پژمردگی کا نام و نشان نہیں، ہونٹ سرخ اور رخسار سرخ و سپید! افسانے 'ایک خوشبو اڑی اڑی سی' کی ہیروئن کا بھی یہی حال ہے جتنی خوبصورت ہے اتنی غریب بھی! ——— کرشن چندر کا ایک بے حد معروف افسانہ ہے 'پورے چاند کی رات' ——— کردار نگاری کے زاویئے سے یہ بھی کامیاب نہیں۔ یہاں اسلوب اور اپنی جذباتیت پر کرشن چندر نے کرداروں کو قربان کر دیا ہے۔ ایسے اور کئی افسانے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کرشن چندر کی کردار نگاری کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے کرداروں کی جگہ لیتے ہیں۔ اس خصوصیت میں میں ان کے افسانہ 'ٹیکسی ڈرائیور' کا ذکر کروں گی۔ اس افسانے کا مرکزی کردار وکرم ٹیکسی ڈرائیور ہے جو عدالت میں جج کی کرسی پر بیٹھ کر فیصلے کرنے لگتا ہے تو وکرم ٹیکسی ڈرائیور نہیں بلکہ کرشن چندر دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے 'دانی' کا کردار ——— دانی جو شاعر ہے [illegible] کے بعد ہسپتال میں شریک ہوتا ہے لیکن اپنا دماغی توازن کھو دیتا ہے اور پاگل ہو جاتا ہے۔ ہسپتال سے باہر آنے کے بعد،

فٹ پاتھ کے کنارے، سڑک پر تین اینٹوں کی مدد سے بہت بڑی عمارت بنانے کی سوچتا
جس میں رہنے کے لئے ان سب کو جگہ مل جائے گی جو فٹ پاتھ پر زندگی گزار رہے ہیں۔
اپنی طرح کی عجیب رومانیت ہے اور پھر "قیدی" کا گجیندر سنگھ بھی ایک کمزور کردار۔
سچ تو یہ ہے کہ کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا میں رومانی نقطۂ نظر سے انداز
جائزہ لیا اور بعد میں اشتراکی زاویئے کو اپنایا یہی وجہ ان کے کرداروں میں عام طور
نکھار اور بانکپن نہیں جو اس کو کسی بھی زاویے سے ہٹ کر صرف اس کردار کے روپ
دیکھے۔ قطع نظر اس کے جہاں کرشن چندر کی رومانیت کی لے قدرے مدھم پڑ جاتی ہے ان کی کردار نگا
جوہر کھلنے لگتے ہیں۔ "چندروکی دنیا" ان کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں طرح طرح کے کردار مل جاتے ہیں۔ انہوں نے مختلف مزاج، رنگ
پیشے، عمر اور ذات کے افراد پر قلم اٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے انہوں نے زندگی اور زمانے کا بے حد گہ
کیا ہے اور اپنے کرداروں کے دروں ان کے بیچ میں جھانک کر دیکھا ہے۔ بیشتر کردار ان کے افسانوں
پھرتے، جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ "مہالکشمی کا پل" ان کا اس خصوص میں ایک قابل ذکر ا
جس کے کئی کردار افسانہ نگار کی ہنرمندی اور اس کے قلم کی تاثیر کا مظہر بن جاتے ہیں مگر دلو نگا
سلسلے میں ان کے اور چند افسانوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گی۔ افسانہ "بھگت رام" کا بھگت ر
ار نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ بھگت رام کے کردار میں کرشن چندر نے احتجاج کی آواز کو سمو دیا۔
بھگت رام کی بغاوت ایک معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ ایک ایسے معاشرے کو جو
عیار اور مکار افراد کی گرفت ہے۔ بھگت رام جیسا انسان ہی لرزہ براندام کر سکتا ہے۔ "کالا
کا ہیرو، کالو بھنگی، بھگت رام کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹا کردار ہے۔ اگرچہ اس افسانے میں کرشن
کا اسلوب مسحور کن ہے لیکن جذباتیت اور خطابت کے باوجود یہ کردار کچھ ایسا توانا نہیں۔
"یوبی" کا کردار موبی عظیم نہ سہی خوبصورت ضرور ہے۔ یہ چند ایک کرشن چندر کے یاد ر
جانے والے کردار ہیں "بے مثال اور لاجواب! چنانچہ ان کی کردار نگاری کی چند ایک خامیوں
باوجود اپنے ایسے ناقابلِ فراموش دلوں کو چھو لینے والے کرداروں کے باعث زندہ رہیں

کرشن چندر کی حقیقت نگاری اس وقت نکھرتی ہے جب وہ طنزیہ انداز اختیار
ہیں اور ان کے افسانوں کا جذباتی اور رومانی انداز قدرے مدھم ہو جاتا ہے۔ طنز، کرشن
کے افسانوں کا ایک اہم عنصر ہے اور اس کا ذائقہ ان کے ہاں ہے بھی خاصا دیکھ! ان کے ہا

انفرادی حیثیت بھی ہے اور اجتماعی حیثیت بھی! وہ افراد کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور اداروں اور مملکت کو بھی! ان کا طنز بڑا بھاری اور کاری ہوتا ہے اور محض طنز برائے طنز نہیں بلکہ مقصدی اور اصلاحی! ایسے افسانوں کا مطالعہ کیجئے اندازہ ہوگا کہ کرشن چندر کی نظر اپنے معاشرے پر کیسی گہری ہے۔ وہ زندگی کے منفی پہلوؤں، گندگی، غلاظت اور انسانی فطرت کی خباثتوں کو کتنے تیکھے اور زہرناکی لئے ہوئے طنزیہ اسلوب میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ کرشن چندر کی حقیقت پسندی ان کی جذباتیت پر غالب آچکی ہے۔ یہ طنزیہ حقیقت نگاری خاص طور پر کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں زیادہ تر ملتی ہے۔ "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "زندگی کے موڑ پر"، "بالکونی" اور تقسیم ہند اور فسادات کے موضوعات پر تحریر شدہ ان کے افسانے طنز کے لاجواب شاہکار ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "ہم وحشی ہیں" میں تو طنز اور طنز کے سوا ہے ہی کیا۔ ؟ بقول کرشن چندر انہوں نے یہ افسانے انتہائی غم و غصے کے عالم میں لکھے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اس طرح کی جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں "بھوت"، "کالو بھنگی"، "مہالکشمی کا پل"، "تکوان کی" مطالعہ کے قابل ہیں۔ میں یہاں ان کے افسانوں سے طنزیہ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں اندازہ ہوگا :

"یہاں امریکی بلیڈ، جاپانی کلپ، انگریزی صابن، فرانسیسی تیل
اور ہندوستانی غریبی بکتی ہے۔"

"پاربتی ہر روز صبح اٹھتے ہی اس تصویر کے درشن کرتی ہے کیونکہ
جن لوگوں کو لکشمی پرچے نہیں ملتی وہ اس کی تصویر ہی دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔"

"انسان کیسی کیسی حالتوں میں مرتا ہے اس کی اتنی حیرت نہیں، حیرت
اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ کیسی کیسی حالتوں میں زندہ رہ جاتا ہے اور
موت کا مقابلہ کرتا ہے۔" (محراب)

طنز و مزاح کا اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے لیکن کرشن چندر کے ہاں مزاح کا عنصر بہت کم ہے۔ جہاں بھی انہوں نے مزاح نگاری خالص مزاح نگاری کی کوشش کی ہے انھوں نے معیار کو برقرار نہیں رکھا ہے۔ ان کے افسانے "کتا پالنا [illegible]"، "نظر کی آمد"، "گیدڑ دان"، "پرانا قرضہ"

پڑھے ہوں گے۔ ان افسانوں میں فنکارانہ دروبست کی کمی کا اظہار ہوتا ہے اور مزاح آرٹ کی شـ
اختیار نہیں کر پاتا۔ 'کتّا پلاننگ' کا موضوع ہی عامیانہ ہے۔ کتے، بلیوں اور چوہوں کی پلاننگ
سے بات شروع ہوتی ہے اور انجام کار کیڑوں مکوڑوں تک جا پہنچتی ہے کہ اگر کتے نہ ہوں تو
بڑھ جائیں گی۔ بلیاں نہ ہوں تو چوہوں کی بھرمار ہو جائے گی اور اس طرح کیڑوں تک کی بارـ
ہے۔ کرشن چندر کے صرف پُر لطف اور رسیلے انداز بیان کے باعث قاری ان کے ایسے افـ
پڑھ جاتا ہے۔ مزاح یا تو مواد سے پیدا ہونا چاہیے یا اسلوب سے، جو مزاح اسلوب کا مرہو
منت ہوتا ہے وہ اعلیٰ اور معیاری کہلاتا ہے لیکن جب عمداً مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جا
یا سطحی واقعات بیان کرنے کی کوشش کی جاتی اور قارئین سے گویا کہا جائے کہ 'بھئی آ
ہنسیے' تو ایسی صورت میں افسانہ کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور صرف افسانہ نگار پر ہنسی آتی۔
افسانوی مجموعوں 'مزاحیہ افسانے' یا 'ہوائی قلعے' میں ایسے کئی افسانے مل جاتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو جو چیزیں کرشن چندر کو اردو فکشن کا ممتاز اور منفرد فنکار بنا پائی ہیں
ان کی منظر نگاری اور اسلوب ہے۔ منظر نگاری افسانے میں نہ صرف رنگ بھرنے کا کام
ہے بلکہ اس کا افسانے کے زماں و مکاں سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ منظر نگاری یوں تو ہر
اور افسانہ نویس نے کی ہے۔ خاص طور پر پریم چند اور ان کے ہم عصروں میں منٹو، بیدی، ند
قاسمی، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری نے منظر نگاری کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں لیکن
کے ہاں منظر نگاری کُل کے ایک جز کی حیثیت رکھتی ہے الگ سے شاعری اور غنائیت کا
نہیں جب کہ کرشن چندر کے ہاں منظر نگاری جزو کے بجائے کُل ہے۔ سارے افسانے پر
ہوئی روح کی طرح افسانے کے رگ و ریشہ میں دوڑتی ——— منظر نگاری کے لـ
کرشن چندر کو بلاشبہ ورڈز ورتھ اور میر انیس کے ساتھ جگہ دی جا سکتی ہے۔ انھیں منظر نـ
میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ مختلف مواقع اور مناظر خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔
سلسلے میں ان کا حافظہ بڑا غضب کا ہے۔ انھیں ہر درخت، ہر پھل اور ہر پھول کا نام یاد۔
خوبصورت آسمان، پرندے، شفق، چاندنی، ستارے، پھول، سیب، ناشپاتی اور
کے درخت، دریا، کلکلاتا، بہتے میٹھے جھرنوں کی لطافت، اُن کے دامن میں آبشاروں کا حسن
وادیاں، جھیل ——— اور ان کے علاوہ ویران اور سنسان جگہیں، جیسے بھاڑ
اور شہر، فٹ پاتھ، دیہات اور کارخانے سب کچھ، سب کچھ کرشن چندر کے ہاں بہت

آتے ہیں۔ "پرانے خدا" میں "پندراون" مندر اور "سب سے بڑا گناہ" میں "چوپاٹی" کے مناظر آپ نے ان جگہوں کا نظارہ نہ کیا ہو تو کرشن چندر کے یہ افسانے پڑھ لیجئے۔ میں یہاں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں، قدرے طویل ہے لیکن سورج نکلنے اور صبح ہونے کا یہ سماں کوئی اندھا بھی سن لے تو محسوس کرے کہ اس نے یہ منظر دیکھ لیا ہے۔ کتنا دلنواز اسلوب ہے:

"دن بڑا ہی خوبصورت تھا۔ ابھی پو نہ پھٹی تھی اور آسمان پر افق کے
چاروں طرف کنارے کنارے پہاڑوں کی سیاہ نوکیلی چوٹیوں کے اوپر
بدلیوں کے لچھے الجھے ہوئے تھے۔ مغرب میں بدلیوں کی روئیں گہری
ہوتی ایک جامد غبار بن گئی تھیں اور مغرب میں پہاڑیوں کی کنواری چوٹیاں
اس سیاہ غبار میں یوں ابھری ہوئی تھیں جیسے سیاہ انگیا میں
جوانی کے کنول اور پھر بادلوں کے بسیار لچھے اس غبار کے شمال مشرقی
کونے سے اٹھتے ہوئے اور پورب تک پھیلتے گئے تھے۔ پھیلتے گئے اور
پھیلے اور چمکدار ہوتے گئے اور سورج کے منبع کے پاس جا کے بالکل
غائب ہو گئے۔ اس منبع کے پاس مطلع اتنا صاف تھا کہ شمع کی لو
کا دھوکا ہوتا تھا۔ شمع بستر کے کنارے جل رہی تھی اور رات اپنی زلفیں
پھیلائے ابھی تک سو رہی تھی اور شمع کا اجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے تو
چوٹیوں کے شبنمی ہونٹ بادلوں سے الگ ہوئے۔ کیسی مجبوری تھی
ان میں، جیسے وہ اس طویل بوسے سے الگ نہ ہونا چاہتے
ہوں۔ پھر ایک سپید، سنہری ضیاء منبع سے ابل کر آسمان کے چہرے پر
دوڑ گئی، جیسے رات سوتے میں مسکرا اٹھے ــــــــــ
اور رات کی زلفوں کو شمع کی لو نے چھو لیا اور زلفیں پھیلتے پھیلتے بالکل
مغرب میں چلی گئیں اور پھر ایک دم اجالا ہو گیا ــــــــــ" (افسانہ "ایک دن")

اتنے طویل اقتباس کے بغیر منظر نگاری میں کرشن چندر کی لطیف تشبیہات کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ چوٹیوں کے شبنمی ہونٹ۔ بادلوں کا طویل بوسہ اور جیسے رات سوتے میں مسکرا اٹھے۔ اس قسم کی تشبیہات کرشن چندر سے قبل شاید ہی کسی نے استعمال کئے ہوں۔ در اصل یہ افسانہ "ایک دن" کرشن چندر کے ان افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے جن میں منظر نگاری اور [illegible] ایک ہی

تصویر کے دو رخ بلکہ ایک ہی منظر کے دو حصے بن جاتے ہیں۔ کرشن چندر کا اسلوب اور منظر ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کرشن چندر کی منظر نگاری کشمیر، وہاں کی پہاڑیوں، وادیوں، چشموں، ندیوں، جھیلوں، مرغزاروں، چرند، پرند، پھلوں، پھولوں اور انسانی حسن کی مرہونِ منت ہے۔ کشمیر کی منظر نگاری کرشن چندر کے وجدان میں کچھ یوں جذب ہو چکی ہے کہ اس کے بغیر ان کی کہانیوں میں رنگ و بو، چمک دمک ممکن ہی نہیں۔ کرشن چندر سے زیادہ ہمارے کسی اور افسانہ نگار نے کشمیر کے مناظر سے اتنا رس نہیں نچوڑا۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیر کے بارے میں منظر نگاری کی اس تکرار کے باعث کبھی کبھی ان کے ہاں یکسانیت اور یک رنگی پیدا ہو چکی ہے لیکن بہرکیف ایسا کم ہے و نیز ہر بار ایک نئے، دلکش اور جاذبِ نظر اسلوب نے اس منظر نگاری کی لاج رکھ لی۔ حد تو یہ ہے کہ کشمیر، جہلم، گلمرگ، بالکونی، تکڑ، سڑک اور وادی وغیرہ شدتِ تاثر کی وجہ سے کرشن چندر کے افسانوں میں زندہ کرداروں کی طرح متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ یہ کسی بھی فنکار کا بہت بڑا کمال ہے اور یہ دو اقتباسات ان کے ایک افسانہ "کالا سورج" سے لئے گئے ہیں۔ ایک وادی ———— ظاہر ہے یہ کشمیر ہی کی وادی ہے، کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

> "میدانوں سے پرے، بہت دور اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی تھی۔ اس وادی کے بیچ میں ایک چھوٹی سی خوشنما جھیل تھی جس میں ایک پتلی سی آہستہ خرام ندی مشرقی پہاڑیوں سے نکل کر آملتی تھی اور جھیل کے دوسرے کنارے سے پھوٹ کر مغربی سلسلہ ہائے کوہ کی طرف چلی جاتی تھی۔"

اور پھر اسی ندی کے کنارے کا منظر:

> "نیچے وادی میں ندی کے کنارے پھل دار درختوں کے مرغزار تھے اور بید مجنوں کے گھنیرے کنج تھے جن کی لانبی مخروطی ڈالیاں دور تک پانی میں جھکی ہوئی چلی گئی تھیں اور دور تک دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ندی کے کنارے کنارے الھڑ دیہاتی دوشیزائیں سر جھکائے، زلفیں بکھرائے، اپنی پتلی انگلیوں کی حنائی پوروں سے پانی میں کھیل رہی ہیں۔"

یوں منظر نگاری اور اپنے اسلوب سے کرشن چندر جادو جگا جاتے ہیں۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا طرۂ امتیاز ان کے اسلوب کا یہی بانکپن ہے۔ اسی سے ان کے فن کو بقائے دوام حاصل ہے۔ ان کی نثر میں وہ دل آویزی ہے کہ شاعری اور تغزل ہزار جان سے اس پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھیئے۔ بعض مواقع پر ایسا لگتا ہے کہ ہم خوابوں کی فضا میں کھوئے سے جا رہے ہیں، جیسے کانوں میں کوئی شہد ٹپکا رہا ہے۔ پھول کھل رہے ہیں، چشمے ابل رہے ہیں، موتی جگمگا رہے ہیں۔ کتنی غضب کی صناعی ہے:

> "مرنالنی کی آنکھیں بڑی اداس تھیں اور ہونٹ بڑے خوبصورت تھے۔ ان نگاہوں کی اداسی ایک مدھم رنگوں والے غالیچے کی طرح ملائم، مدھم اور خنک آمیز تھی۔ انھیں دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ زندگی کی پُرپیچ اور خار دار راہوں پر سے گذرتے ہوئے ان سایہ دار پلکوں کے نیچے چند لمحے آرام اور سکون کے بتا دیئے جائیں۔" (مینا بازار)

حسین اور دلآویز الفاظ کا استعمال کرشن چندر نے جس قدر زیادہ کیا ہے اردو کے اور کسی ادیب نے شاید ہی کیا ہو۔ الفاظ کی تراش خراش اور ان سے جمالیاتی تاثر پیدا کرنے میں ان کو بڑا ملکہ تھا اور پھر ان کے اسلوب کی روانی اور چکا چوند کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ " خوبصورت الفاظ گویا کرشن چندر کی میراث ہیں"۔

نادر، اچھوتی اور لالہ کار تشبیہات نے کرشن چندر کے اسلوب کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ ان کا تخیل کتنا وسیع، کتنا گہرا ہے کہ وہ جیسے نامعلوم جزیروں سے ان تشبیہوں کو ڈھونڈ لاتے ہوں۔ کتنی نازک، کیسی کومل ہیں یہ تشبیہات:

> "پتوں اور ڈانڈوں کے اتصال پر مکئی کے بھٹے سنہری فرغل پہنے اپنے سر پر کالے بالوں کی چوٹیاں لہرائے ان دوشیزاؤں کی طرح بے قرار نظر آتے ہیں جو میلے میں جانے کے لئے بے تاب ہوں۔" (کالک ٹیل)

اور اب ان کا افسانہ "مکئی کے دانے" جہاں انہوں نے تشبیہات کے پھول ہی پھول کھلا دیئے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

> "ایک لمحے کے لئے ٹھاکراتی کی ہتھیلی سے مس ہوئی اور ٹھاکر سنگھ کو ایسا لگا کہ جیسے دور دور تک شامیں پتوں سے بھر گئیں۔"

دوسرا جملہ:

"ٹھاکرانی نے ہتھیلی پر اپنی خوبصورت انگلی رکھ دی اور ٹھاکر سنگھ کو
ایسا لگا جیسے کبوتری شاخ پر بیٹھ گئی۔"

فطرت کی طرح کرشن چندر حسن نسواں کے بھی پرستار ہیں۔ حسن نسواں ان کے افسانوں میں اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور تابناکیوں کے ساتھ موجود ہے انھوں نے حسنِ نسواں کو جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے رنگین، حسین اور دلکش الفاظ میں اور مزے لے لے کر بیان کیا ہے کہ خود الفاظ سے جوانی جھلک پڑتی ہے 'دیکھئے یہ تحریر نہیں کرشن چندر نے حسن کو پیرہن دے دیا ہے:

"آنکھوں میں جوانی ناچ رہی ہے۔ تبسم زیرِ لب کانپ کانپ جاتے ہیں۔ رخساروں کے سیب چمک رہے ہیں جیسے شفق کی ڈالیاں جھک گئی ہیں اور غربی آسمان کے باغ کی رعنائی ان جسموں میں اُتر آئی ہے۔"

کرشن چندر کو اپنے اسلوب کی اس رنگینی اور طرحداری کا پورا پورا احساس ہے کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اسلوب میں نئے نئے تجربے کئے۔ اسلوب کو متحرک اور رواں دواں رکھا۔ ظ۔ انصاری سے اپنی ایک گفتگو میں انہوں نے کہا تھا:

"میں اسٹائیل کو جامد نہیں بلکہ متحرک اور مقناطیسی طاقت سمجھتا ہوں جو
بدلتا رہتا ہے میں نے اسٹائیل میں اتنے تجربے کئے ہیں جو
اردو میں کسی نے نہیں کئے۔"

کرشن چندر۔۔۔ یہ درست ہے ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن رہے لیکن ان کے دل میں رومانیت کی شمع بھی جلتی رہی۔ انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا لیکن جمالیاتی اقدار سے بھی ان کا رشتہ محکم رہا۔

ادب برائے زندگی ان کی زندگی کا مطمحِ نظر رہا لیکن ان کے پاس کئی افسانے ایسے بھی ہیں جو "برائے زندگی نہیں، صرف برائے ادب ہیں۔ 'کچرا بابا' اور 'پہلا دن' وغیرہ ان کے ایسے ہی افسانے ہیں جو کرشن چندر کے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کے پاس ایسے افسانوں کی تو بہتات ہے جن میں پلاٹ اور موضوع شاید ہی ہو۔ صرف منظر نگاری اور اسلوب کی چمک دمک ہے۔ جذباتی انداز بیان ہے اور رومانی طرز تحریر ہے۔ انھوں نے مجموعی طور پر اردو افسانے کو اپنے طور پر ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ معاشرے کی فرسودگی،

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

غزلیں

رفعت سروش

جو برہم ہے نگاہِ ناز ہر شے فتنہ ساماں ہے
گلستاں شعلہ پیکر ہے، ہوائے گل پریشاں ہے

زمیں کے قلبِ سوزاں میں جہنم ہی جہنم ہیں
فسادِ عقلِ انسانی سے خود یزداں بھی لرزاں ہے

یہ کیسی پیاس ہے صدیوں سے جو بجھنے نہیں پاتی
یہ کیسی کربلا ہے جو بیاباں در بیاباں ہے

لکھا دستِ ازل نے حرفِ دانش میرے سینے پر
یہی توریت ہے، انجیل ہے، گیتا ہے قرآں ہے

سفینہ آ لگا عمرِ رواں کا جب کنارے پر
تو کیا موجِ بلا کیسی ہوا، کیا جوشِ طوفاں ہے

خیرات ندیم

فضیلتِ علم کی جھوٹی انا کے لہجے میں
کہیں غرورِ عبادت دعا کے لہجے میں
پکارتا ہے زمانہ بہ شانِ جمہوری
ارادتاً ستمِ ناروا کے لہجے میں
بدل چکا ہے بہت شہرِ دلبراں کا مزاج
عجیب زہر ہے آب و ہوا کے لہجے میں
کہیں کہیں ابھی قدرِ حیات زندہ ہے
خلوص مجھ کو ملا ہے وفا کے لہجے میں
سخنوری کا بھی انداز والہانہ ہے
نشہ ٹپکتا ہے طرزِ ادا کے لہجے میں
خطوطِ جسم سے آگے بھی سوچنا ہے کچھ اور
ہے بانکپن تو بہت ارتقا کے لہجے میں

ندیم اہلِ وفا کو سنائی دیتی ہے
صدائے تشنہ لباں نینوا کے لہجے میں

صفیہ اریب

چار نظمیں

چار نظمیں

(۱)

سبھی اقدار کی
کرچوں کا
بے پایاں خزانہ
دفن ہے سینے میں —!
اور
اک ناگ —
پھن پھیلائے —
پہرہ دے رہا ہے —
اس خزانہ پر —!

(۲)

زندگی —
غبار میں لپٹی ہوئی ہے —!
گرد —
سانسوں کی غذا ہے —!
رگوں میں
دوڑتی ہے خون بن کر —!
ہر شے دبی پڑی ہے!
ماضی —
بسر ہو چکا ہے —!
یہ لمحہ —
جیسے میں جی رہی ہوں
گرد ہی کی
اک لہر ہے سا

(۳)

ہر غم سے
کچھ اپنا سلسلہ
محسوس ہوتا ہے —!
تسلی میں کسی کو
دے نہیں سکتی!
سمندر کی کوئی
سرحد نہیں ہوتی —!
فصیلیں — ذات کی
غم کا احاطہ
کر نہیں سکتیں —!
کہ —
یہ الفاظ کا صحرا
تہی دامن ہے خود ہی —

(۴)

ویرانے کو
سجا رہی ہوں
دوہری زندگی کے لیے —!
ویرانی تو
ہر جگہ ہے!
چاہتی ہوں
ویرانہ — کم سے کم باہر سے
آباد لگے —!

قطب سرشار

دو غزلیں

مروتیں بھی غلط ہیں ترا حسد بھی غلط
قبول بھی ترا جھوٹا ہے اور رد بھی غلط

نفی کے رمز میں اثبات بھی ہے پوشیدہ
سفر شناس نہیں ہو تو پھر عدد بھی غلط

اگر تو چاند نہیں میں بھی کوئی بحر نہیں
تری کشش بھی غلط میرا جذر و مد بھی غلط

فضول کون یہاں کس کا بوجھ اٹھاتا ہے
مرا سپاس بھی باطل تری مدد بھی غلط

وفا کی حد میں سبھی ترک و اختیار بجا !
ضمیر زندہ نہ ہو تو ہر ایک حد بھی غلط

نظر تو وہ ہے جو منظر کے رمز پڑھتی ہے
رہو گو تماشا نگاہِ رصد بھی غلط

دلوں کا درد سمجھنا خرد کے بس میں کہاں
ہمالیہ کی سی فہم دراز قد بھی غلط

تم کو یہ شکایت ہے ترسیل نہیں ہوتی
فطرت کے اشاروں میں تفصیل نہیں ہوتی

بے شکل و شباہت کی تشبیہہ بھلا کیا دوں
احساس ہی ہوتا ہے تمثیل نہیں ہوتی

مفہوم نہ ہو جب تک الفاظ کے سینے میں
احکام ہی ہوتے ہیں تعمیل نہیں ہوتی

صد بحرِ حوادث سے مٹتی نہیں سرمستی
یہ ریت ہے پانی میں تحلیل نہیں ہوتی

دنیا کی کہانی ہے اک سلسلہ جنبانی !
افراد بدلتے ہیں تکمیل نہیں ہوتی !

سرشار نہیں آساں یوں دل میں اُتر جانا
احساس کی گہرائی کچھ جھیل نہیں ہوتی

سید عبدالستار

دکنی شاعری اور ہندوستانیت

ہندوستانیت" ایک فلسفیانہ اور ادبی تصور ہے جو اس برِ صغیر کی نت نئی تہذیب کے میل ملاپ، معاشرتی بندھنوں اور معاشی رابطوں سے جنم لیتا ہے اس موضوع کا تعلق دکنی شـ سے ہونے کے سبب اب ہم دکنی شاعری کی طرف رجوع کریں گے کہ دکنی شاعری میں ہندو کی کیا اہمیت ہے۔

دکن جب اردو شاعری کا مرکز قرار پایا تو مقامی اثرات کو قبول کرنے کے باعث اور شما دوری کی وجہ سے یہاں کی شاعری دکنی کہلائی۔ دکنی شاعری میں ہندوستان کی اہمیت اور اہ اور ہندوستانی عناصر کی اکثریت کی ایک خاص وجہ سلطنتِ دکن کا بہمنیہ سلطنت کے ان لوگوں کے ہاتھوں میں آنا ہے جو اپنے آپ کو شمالی ترک ہونے کے باوجود دکنی کہنے پر فخ محسوس کرتے تھے۔ خصوصاً سرزمینِ دکن سے ان کے جذباتی لگاؤ نے دل کھول کر مقامی کی ہمت افزائی کی اور دیسی رسم و رواج، میلوں، ٹھیلوں اور تہواروں کو ترقی دی۔ یہاں شعرا نے ہندوستانیت کو دکن تک محدود کر کے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دکنی شـ کو ہندوستانیت کی مکمل اور مفید ترجمانی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ دکنی شاعری پر شروع ہی ہندوی اثرات غالب رہے ہیں۔ بہمنی دور میں نظامی سے لے کر میراں جی تک اور عادل شا قطب شاہی دور کے ابتدائی شعرا کے ہاں ہندوی اثرات اپنے گہرے آب و رنگ کے ساتھ نما دکن میں نظم پہلے وجود میں آئی جس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا دکن میں شاعری کو مذہبی تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جس کے لیے بجائے دوسری اصناف کے نظم بہت

کارآمد صنف سمجھی جاتی تھی۔ اپنے قریب کی اشیاء اور ماحول کی عکاسی کا رجحان ابھرا تو شعرا یہاں کے رسوم، تہواروں، تقریبوں اور دوسرے مظاہر کے بیان میں اپنے زمانے کی معاشرت اور تہذیب کے جواہرات کو محفوظ کرنے میں کامیاب رہے۔ دکنی نظم نمونا قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے روپ میں ابھری۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے یہ تمام اصناف ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں مگر ان کا خارجی اشیاء اور واقعات کو مس کرنا، انھیں نظم کے دائرے میں لے آتا ہے۔ نظموں میں نہ صرف ہندی الفاظ بہت زیادہ ہیں بلکہ ان میں سے اکثر خالص ہندوستانی مزاج کے متحمل نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ عشقیہ نظموں میں بھی جہاں بجائے مرد کے عورت کو مخاطب کیا گیا ہے نسوانی لہجے سامنے آتے ہیں۔ نظم سے ہٹ کر جہاں غزل کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا ہے وہاں بھی لہجے کے اعتبار سے دیسی اثرات ہی کا تسلط قائم ہے۔

دکنی دور میں شعرا نے غزل میں بھی بہت کچھ کہا تاہم اس کو نظم ہی کا دور کہہ سکتے ہیں دکنی شاعری میں مظاہر وطن کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جس کے نتیجہ میں یہاں کے پھل، پھول، بادل و برکھا اور پرندوں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شاعری کی تقلید میں دکنی شاعری میں بھی عورت کی طرف سے عشق کا اظہار ہوا ہے دوسرے شام اور منتر ٹونا وغیرہ الفاظ ہندو اساطیر کو سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً

اب چھوڑ میں مت جاوے رے
تج برہ جلی کوں مت جاوے رے
یو جانے تو ہری من بھاوے رے

یو تھور شام سلونا توں میرا ہے
نہ چلے تج اُپر منتر ٹونا ٹمنے
جو کوئی چاہے سو فانی بہنا دے

(برہان الدین جانم، سولھویں صدی عیسوی)

وزیر آغا لکھتا ہے:

"دکن حملہ آوروں کی مسلسل یلغار سے نسبتاً محفوظ رہنے کے باعث ہندوستان کی قدیم فضا اور اس کے نتیجے میں بھاشا کی شاعری سے زیادہ قریب تھا" [1]

---

[1] اردو شاعری کا مزاج۔ وزیر آغا صـ ۲۴۸

دکنی قصیدوں میں ہندوستانیت نے محل و باغ کی تعریف و توصیف، رہن سہن کے آداب، لباس، چال ڈھال اور دیگر طریقہ ہائے زندگی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ مرثیوں کا ہیئت اور مزاج کے نقطۂ نظر سے گیت کے ذیل میں آنا بھی ہندوستانیت کی دلیل ہے وہ مرثیے جو راگ راگنیوں کے مطابق تحریر کیے گئے ہیں ان میں راگ راگنیوں کے نام تک ملتے ہیں۔ دکنی کی مثنویوں میں ہندوستانی قصوں ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عاجز کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" نام کی حد تک بیرون ہند موضوع کی حامل معلوم ہوتی ہے مگر اس کی تہذیبی فضا خالص ہندوستانی ہے جو اس برصغیر کی ایک عورت ہے اور اس کے جذبات و احساسات اس برصغیر ہی کی روایت کے لئے وابستہ ہیں۔

دکنی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہندوستانیت اپنے آپ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دکنی شاعروں نے ہندوستانی تہذیب یا ہندو دیو مالائی عناصر کو اپنی شاعری میں جگہ دینا شاید لازمی قرار دے دیا تھا۔ اس سلسلے میں دکنی شاعروں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جن میں نہ صرف پیشہ ور شاعر بلکہ بادشاہ شاعر بھی پیش پیش رہے ہیں جنھوں نے ہندوستان سے متعلق کئی پہلوؤں پر مضامین باندھے ہیں۔ اب ہم دکنی شعراء کے کلام کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ جن کی شاعری میں ہندوستانی عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔

عادل شاہی دور میں جو نامور دکنی شعراء گزرے ہیں ان میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (جگت گرو) ایک اہم بادشاہ شاعر ہے۔ جو اپنے ہم عصروں اکبر اعظم اور محمد قلی کی طرح ہندوستانیت کا حد درجہ دلدادہ تھا۔ ہندی لباس، زبان اور طرز معاشرت سے اس کو بڑی دلچسپی رہی ہے اور ہندی موسیقی کا تو وہ خود ماہر تھا۔ اس کی مشہور شعری تصنیف "نورس" کو زیر بحث لائیں جو اگرچہ پوری دکنی میں نہیں لیکن ان میں بعض راگ راگنیوں کو بلا جھجک دکنی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو اس کے کلام کی ہندوستانیت ایک حد تک نمایاں ہو جائے گی۔ ابوالفیض سحر اس مشہور و معروف تصنیف کے تعلق سے یوں لکھتے ہیں۔

"ہندو دیومالائی عناصر کے تعلق سے اسے اردو کے دکنی عہد کی نمائندہ شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بیشتر گیت ہندو دیو مالا سے بھرے ہیں، شیو، پاروتی، سرسوتی، گنیش، اور اندر جیسے

دیوی دیوتاؤں کا ذکر اس میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ
بار بار آتا ہے۔" [1]

مثال کے طور پر :-

نورس سور جگ جوتی آلز سور گنی پوست سرستی' ماتا ابراہیم پرساد جنی دونی

شیو جی کا سرا پا ہے :-

بھیرو کرپور گورا بھال تلک چندرا تیری منترا جٹا مکٹ گنگا دھرا

علی عادل شاہ ثانی ' متخلص بہ شاہی بنیادی طور پر دکنی کی طرف مائل رہا۔ جس کی وجہ سے اس کی مادری زبان کا دکنی ہونا اور اس کی طبیعت کا اُسی زبان میں شاعری کی طرف مائل ہونا ہے۔ شاہی نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اس کے دیوان میں نظموں کے مقابلے میں قصیدوں کی تعداد بہت ہے۔ جن میں قصیدہ ' علی دادِ محل' بہت اہم ہے۔ محل پر تبصرہ ہندوستانی طرز تعمیر تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ قسم قسم کے پھولوں میں چنبیلی' جوہی اور گلاب کے نام ہندوستانی پھولوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ شعر ہے :-

چنبیلی جو چھبیلی ہے ' نئی نازک نویلی ہے گلاں کے مست سہیلی کر کھلا مجلس میں لے آیا ہے

اسی دور میں ملا نصرتی دکنی شاعری کا مسلم الثبوت استاد مانا جاتا ہے۔ یہ قدیم اردو کے شعرائے عظیم میں سے ایک ہے جس نے بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی مثنویوں سے اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا ہے اس کی پہلی تصنیف مثنوی ' گلشن عشق' ہے جس میں ایک مشہور دکنی عشقیہ داستان " منوہر و مدمالتی" کو بیان کیا گیا ہے اور مثنوی " علی نامہ" رزمیہ ہے ' جس میں اس دور کی تہذیب ' معاشرت اور کلچر کو واقعات کا حصہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ نصرتی کی غزل کا موضوع بھی عورت ہے۔ چند غزلیں ہندوی شاعری کی روایت میں ایسی بھی ہیں جن میں عورت اپنے کی کیفیات کا اظہار کرتی ہے۔ مثلاً :-

میں مست ہو کر تج میں بیتاب ہو رہی تھی پیش باتاں پر مری کاڑ کو تج کیوں جگاتا ساد سے
کشتی مری اُمید کی تھی ' برہ کے طوفان میں تیں پس ملن گرداب ہو' پھر ڈباتا ساد سے

قطب شاہی سلطنت کے عہد میں محمد قلی قطب شاہ' عبداللہ قطب شاہ' غواصی اور

---

[1] تیشۂ نظر ' ص ص ۱۸ تا ۱۹

وجہی کے کلام کی بہت قدر ہوئی۔ محمد قلی کا ضخیم کلیات، دکنی شاعری اور ہندوستانی عناصر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اپنی عربی سے واقفیت، فارسی دانی، علوم اسلامی سے آگاہی اور ایرانی تہذیبی قدروں کی حامل ہونے کے باوصف محمد قلی وہ شاعر ہے جس نے ہندوستانی تہذیب کی روح کو نہ صرف سمجھا بلکہ لباس اور رسم و رواج کی حد تک ان کو اختیار کیا اور شعر و ادب میں ان کو یوں سمو گیا کہ آج تک بھی اپنے شعر و ادب میں ہندوستانی تہذیبی عناصر کی عکاسی اور ترجمانی میں کوئی بھی شاعر محمد قلی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ محمد قلی نے نہ صرف یہ کہ ایک فرمانروا کی حیثیت سے ہندوستان اور ہندوستانیت سے محبت کی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک شاعر کی حیثیت سے ہندوستانی تہذیب، رہن سہن، رسوم و آداب اور یہاں کے رنگ ڈھنگ کو اپنے کلام کا موضوع بنایا اور کئی طرح ان موضوعات پر طبع آزمائی کی اور ان کو نوع بہ نوع انداز سے صفحۂ قرطاس پر پیش کیا کہ ہندوستانی تہذیب غیر معمولی دلکش انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے اس کی نظموں کا ہر لفظ ملک کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس میں یہاں کی زمین، جھومتی، فضائیں گنگناتیں اور ذرہ ذرہ ناچتا نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری کی فضا سر تا سر ہندوستانی ہے۔ محمد قلی کی شاعری پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ کو دیکھ کر ڈاکٹر زور نے کہا ہے کہ "وہ ہندوستان کا پہلا شاعر ہے۔ جس کی اردو شاعری کے تانے بانے جدید شاعری سے ملتے ہیں اور ڈاکٹر حکم چند نیر نے کہا ہے:

> "اردو شاعری میں وطن کا ذکر سب سے پہلے محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں ہندوستان کے پھلوں، پھولوں، موسموں، تیوہاروں، عمارتوں اور پرندوں کا ذکر ملتا ہے۔" ۱

نمونہ کلام:

اناراں میں تجے دانے سو جیوں یاقوت پتلیاں میں
ہر اک پھل اُس اناراں پر تجے سکے نمن سا دا
ہوا آئی ہے لے کے بھی ٹھنڈ کا لا
پیا بن سنا نا مدن بانے بالا
پیارے بسنت کا ہوا آئیا
سکیاں تن مشک و زعفران لایا

۱۔ [illegible] ص ۱۸۹

عبداللہ قطب شاہ کے کلام کو دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی محمد قلی کے نقش قدم پر چل کر منقبت، برسات، مولود اور دوسری ہندوستانی تقریبوں پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ شاعری اور موسیقی کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے "جگت گرو" کی شعری تصنیف "نورس" کے جواب میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ موسیقی سے شاعری کو ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:-

چندر کلا تیرا کلا ہے نرملا اُچلا
تو منج بھلا کے مبتلا کیا کلا و ترملا

نینی میں ملا توں کا جلا تیا بلا نکہہ کھلا!
کنت اُچیلا ہلوں ہلا کے چُلبُلا ہے وہ بلا

عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں جس شاعر کو ملک الشعراء کی حیثیت حاصل تھی وہ غواصی ہے جس کی تین مثنویاں، مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ مینا ستونتی کا قصہ اصلاً ہندوستانی ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں ایک عوامی کہانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ غواصی نے اس کہانی کو دکنی مزاج اور رنگ روپ میں ڈھالا ہے۔ اس کے تمام کردار ہندو ہیں۔ دوسری مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' میں راکششی اور دیو بھوت کا ذکر ہندو اساطیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ زگن ڈائن اور بڑا بھوت کی قلمی تصویریں دیکھ کر پڑھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے زندہ ڈائن اور بھوت کھڑے ہیں۔ مثلاً:

تیا کچھ بدشکل چہرہ اتھا! جو دیکھیں سے اسکوں زہرہ نہ تھا
فرشتے بھی ڈرتے رہتے عرش پر اتر آؤ نکے اس زمیں فرش پر
بڑا بھوت کہتے سو تھا آپ وو کہ تھا سارے بھوتاں کیرا باپ وو

دکنی شاعری میں 'قطب مشتری' اور 'سب رس' جیسے نثری و شعری شاہکار کے خالق ملا وجہی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ مثنوی 'قطب مشتری' میں محمد قلی اور بھاگ متی کے عشق کی داستان منظوم کی گئی ہے۔ 'قطب مشتری' میں جنوں، پریوں، بھوتوں اور راکششوں کے لڑنے جھگڑنے کے ذکر سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے جو کہ اس وقت کی داستانوں کے عین مطابق ہے راکشش پہ بادشاہ کے تیر چلانے اور اس کے زمین پر گر پڑنے کا منظر ملاحظہ ہو:-

کشش کر جو شہ تیر مارے سو وو پڑیا جیوں پہ تل سیرا پہاڑوں ہو

الٹ یوں دستے زخم سینے میں کہ جیوں عکس اپنے جھاڑ کا نیر میں

دکنی شاعری کا سربرآوردہ شاعر جو ایک عہد کا خاتم اور دوسرے عہد کا بانی ہے ولیؔ دکنی عہد
اس کے کلام میں ہندوستانیت کے عناصر پورے آب و تاب کے ساتھ ابھرتے دکھائی دیتے ہیں
ولیؔ نے اپنی غزلوں میں معشوق کا جو رنگ بھرا ہے وہ صرف ہندوستانی
ہو سکتا ہے اس کے کلام میں جو ہندوستانی عناصر نظر آتے ہیں وہ محض ایک اتفاق نہیں بلکہ
عملاً انھیں منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ ولیؔ نے اپنی شاعری میں ارجن، کشن، گوپیوں، دیوالی، بانسری
اور گنگ و جمن کے علاوہ ہندی لفظوں کو بھی جگہ دی ہے۔ دو شعر ہیں :-

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

زلف تیری ہے موج جمنا کی پاس تِل اس کے جیوں سناسی ہے

نظام شاہی سلطنت بھی شعر و شاعری کی خوشگوار فضا سے معمور تھی۔ یہاں کے شعرا
میں حسن شوقی کی دو مثنویاں "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ" خاص طور پر مذکور ہیں۔ صرف
مثنویوں اور غزلوں میں درج اشعار ہی سے ہندوستانیت کی بو آتی ہے۔ مثال کے طور
"فتح نامۂ نظام شاہ" کے یہ شعر سنیئے :-

نہ آب بھنور تالاب نہ بیدا !
نہ چھوڑوں تو نگر نہ چھوڑوں گدا

کروں دُور بنیاد اسلام کی
جو مانے ڈرا ہے جگت رام کی

شاہ امین الدین اعلیٰ کا شمار دکن کی برگزیدہ ہستیوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف "کلام ا
وجودیہ" اور "محب نامہ" نظم میں ہیں۔ ریختہ اور غزلوں کے علاوہ مخصوص راگ راگنیوں کے مطا
گیت اور دوہرے بھی ترتیب دیئے گئے ہیں۔ نظامیؔ بیدری کی مثنوی "کدم راؤ اور پدم راؤ"
بھی قصے اور نام کے اعتبار سے ہندوستانیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے آنے میں مدد دیتی
غرض ایسی بے شمار شخصیتیں دکنی شاعری میں ملتی ہیں جن کی ادبی و فنی کوششوں سے
ہندوستانیت کا خاصا پہلو ابھر کر اور ہونے لگتا ہے۔

۱

نقد و نظر

- تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔
- تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں اُردو شعر و ادب کی ترقیات سے بحث کرتے ہوئے عموماً حیدرآباد کی طرف کما حقہ، توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں حیدرآباد کی شعری اور ادبی محفلوں پر دہلی ہی کے بعض باکمال چھائے ہوئے تھے۔ ان میں مرزا علی لطف، شیخ حفیظ دہلوی اور آخر میں شاہ نصیر دہلوی کو خصوصیت حاصل رہی ہے۔ ان سب کمالات کو محض اس بنا پر نظر انداز کرکے کہ وہ دہلی سے کہیں اور چلے گئے تھے خود اہلِ دہلی کی خدمات کا جو بھی جائزہ پیش کیا جائے گا ناقص ہوگا۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دہلی کے ان با استعداد استادوں نے حیدرآباد کی علمی اور ادبی فضا پر جو اثرات مرتب کیے تھے اُردو ادب کی تاریخ میں ان کی بھی اہمیت ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ کام خاص اہلِ حیدرآباد ہی کے کرنے کا ہے۔

آج کل یونیورسٹیوں میں ' ادوار ' سے متعلق تحقیقی کام کرنے کا چلن زیادہ ہو گیا ہے لیکن غالباً زیادہ مناسب بات یہ ہوگی کہ اگر مواد دستیاب ہو اور گنجائش نظر آئے تو افراد کو موضوع بنایا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بنیادی حقائق زیادہ صحت اور قطعیت کے ساتھ متعین طور پر سامنے آجائیں گے۔ ان متعین حقائق کی روشنی میں پورے دور کے بارے میں زیادہ بہتر رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد کے بعض با صلاحیت نوجوانوں کو اس پہلو کی طرف توجہ ہوئی ہے اور مذکورہ دور کے اہم تر شعرا سے متعلق کئی نہایت قابلِ قدر کام

سامنے آچکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'دیوانِ لطف' بھی انھیں میں سے ایک ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔ وہ حیدرآباد کے رہنے والے نوجوان، باہمت، با استعداد اور مخلص شخص ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعلا سند کے لیے انھوں نے مرزا علی لطف کی حیات اور خدمات کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر رفیعہ سلطانہ اور پروفیسر غلام عمر خان جیسے تجربہ کار اور جہاں دیدہ اساتذہ بھی اس مقالے کے مداح ہیں۔ ہمارے نزدیک زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹریٹ کی سند مل جانے کے بعد بھی روشِ عام کے برخلاف ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے موضوع سے دلچسپی کو برقرار رکھا ہے اور تلاش و جستجو کے کام میں لگے رہے ہیں۔ ان کی یہ لگن لائقِ ستایش ہے کیونکہ اس کے بغیر حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گذشتہ سال انھوں نے 'دیوانِ لطف' شائع کر کے اپنے شوق کے زندہ ہونے کا ایک زندہ ثبوت پیش کیا ہے۔

پروفیسر غلام عمر خان صاحب نے جو بذاتِ خود بھی حسنِ خلق اور خلوص محبت کا پیکر ہیں مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ذاتی تجربے اور علم کی بنیاد پر لکھا ہے کہ "ڈاکٹر اکبر علی بیگ صاحب کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو اسے انہماک، جاں فشانی اور سلیقے کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیشِ نظر تحقیقی کاوش بھی متذکرہ خصوصیات کی آئینہ دار ہے ..... کلامِ لطف کی پیشِ نظر ترتیب و تدوین متنی تحقیق و تنقید کا کامیاب نمونہ ہے۔"

(ص ص ۸، ۱۰)

راقم کا تجربہ یہ ہے کہ اِدھر جو کتابیں مدوّن ہو کر شائع ہو رہی ہیں بیشتر کو دیکھتے ہی زبان پر یہ مصرع آجاتا ہے کہ ع اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لیکن زیرِ تبصرہ دیوانِ لطف کو پڑھنے کے بعد سب سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی کہ اکبر علی بیگ صاحب تدوین کے جدید اصولوں سے باخبر ہیں۔ اپنے کام کے بارے میں انھوں نے خود کہا ہے کہ:

" اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی ایک مخطوطے کی غیر ضروری تقلید نہ کی جائے بلکہ مصنف کے ساتھ انصاف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں وہی متن قبول کیا گیا ہے جو زبان اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے مصنف کی زبان اور اسلوبِ بیان سے زیادہ قریب معلوم ہو۔"

اس بارے میں شبہ کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ علی لطف سے متعلق ایک مبسوط مقالہ کی تکمیل کے بعد مرزا اکبر علی بیگ نے ان کی علمی حیثیت بلکہ استعداد اور ان کی زبان اور بیان کے معیار اور مزاج کے بارے میں فی الجملہ ایک رائے ضرور قائم کرلی ہوگی۔ علی لطف کی لفظیات کا بھی انھیں اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا اس کے املا اور تلفظ وغیرہ کے امتیازات بھی ڈاکٹر اکبر علی بیگ کے پیش نظر ہوں گے۔ وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سلسلے کی کچھ بحثیں انھوں نے اپنے مبسوط مقالے میں کی ہوں گی لیکن اب جب کہ وہ دیوانِ لطف شائع کر رہے تھے مناسب یہ تھا کہ اس کے مقدمے میں بھی مختصراً ہی سہی لیکن ان امور سے متعلق معلومات ضرور فراہم کرتے تاکہ اس شخص کے لیے جس نے ان کا مقالہ نہیں دیکھا ہے ان کے اس دعوے کی صحت کا اندازہ کرلینا بھی ممکن ہو جاتا کہ انھوں نے متن کی تیاری میں علی لطف کے ساتھ واقعی انصاف کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے ماخذ کا جس طور پر تعارف کرایا ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ اس تعارف کے بعد یہ یقین کرلینے کی کوئی وجہ نہیں کہ انھوں نے تمام ماخذ سے کا حقہٗ استفادہ کیا ہے البتہ اس بات پر ضرور تعجب ہوتا ہے کہ اختلافاتِ نسخ زیادہ نہیں ہیں۔ شاید صرف اہم تر اختلافوں کی نشاندہی کو کافی سمجھا گیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ تدوین کے لیے تمام اختلافوں کی نشاندہی مناسب ہے۔ بعض وقت بہت معمولی اختلافات بھی اہم نتایج تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

دیوانِ لطف کے مقدمے میں ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے سوانح اور ان کی شاعری وغیرہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی پیش کیا ہے یہ گمان غالب یہ سب مباحث انھوں نے اپنے مبسوط مقالے سے اخذ کیے ہیں۔ پھر بھی یہ مباحث مفید ہیں اور ان سے علی لطف کا تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے دیوانِ لطف کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش میں اس کے آخر میں لطف کی لفظیات کی ایک فرہنگ بھی شامل کردی ہے۔ اس کے نفع بخش ہونے میں شبہ نہیں۔ دیوانِ لطف کی ترتیب کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ توقع کی جانی چاہیے کہ علمی حلقوں میں اس مفید کام کی کما حقہٗ پذیرائی ہوگی اور اپنی متنوع صلاحیتوں سے کام لے کر ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ آیندہ اور بھی قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیں گے۔

وقار خلیل

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۶ر جولائی : بندگ اور قادرالکلام شاعر حضرت عبدالقادر خان خسرو مرحوم کے مجموعۂ کلام "شب گردی خسرو" کی رسم اجراء ڈاکٹر ایم چنا ریڈی سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش نے انجام دی۔ مسز رودا مستری ایم پی نے صدارت کی۔ جناب محمود انصاری نے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب کیا۔ محفل شعر میں کنول پرشاد کنول، پروفیسر مغنی تبسم، سعید شہیدی، صلاح الدین نیر، اطہر الامان ارشد، رئیس اختر، علی احمد جلیلی، رحمٰن جامی، فیض الحسن خیال، جوہر ہاشمی، مظفر الحنا ناز، عزیز النساء صبا، ضمیر الزماں ضمیر اور کشن پیاکرن نے کلام سنایا۔ ممتاز مورخ و شمس زاہد نے دیر تک غزلیات خسرو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرکے محفل کا خوشگوار اختتام کیا۔

● سالار جنگ میوزیم کی طرف سے اس کے بانی نواب سالار جنگ کی یاد میں "..." کے زیر عنوان مذاکرہ منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ، جناب میر معظم حسین (سابق مشیر نظم) نے سالار جنگ اور میوزیم کے لاثانی ذخیرۂ نوادر پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ ڈائرکٹر میوزیم ڈاکٹر ایم ایل نگم نے منظوم خراج ادا کیا اور بتایا کہ نواب صاحب کی مبسوط سوانح میوزیم کی طرف سے مختلف زبانوں میں شائع کی جائے گی۔ اس موقع پر جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کو صحافت کا "غالب ایوارڈ" ملنے کی مسرت میں میوزیم کی طرف سے ڈاکٹر نگم نے گلپوشی کی۔

۱۸ر جولائی : سالار جنگ میوزیم کی طرف سے سہ لسانی مشاعرہ جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں ہوا۔ سعید شہیدی، ولی قادری، صلاح الدین نیر، اوم پرکاش زخمی، ڈاکٹر موہن لال نگم، نہپال سنگھ ورما، رئیس اختر، عزیز النساء صبا، کیشو چند عالم، ابوالقاسم قاسم، وقار صدیقی دہلوی، دول چند ششی، انور ہاشمی اور وینو گوپال شبنم نے کلام سنایا۔

۲۱ر جولائی : مسز آدرش مصرا، انچارج ترقی اُردو بیورو حکومت ہند نے اندرا پریہ درشنی ڈگری کالج کی طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ بیورو کا دفتر برائے جنوبی ہند حیدرآباد میں عن قریب اپنا کام شروع کرے گا۔ مسز مصرا نے کل ہند اُردو تعلیمی کانفرنس کے زیر نگرانی مرکز خوشنویسی برائے طالبات کا کانفرنس کے صدر جناب جلیل پاشاہ کے ہمراہ معائنہ کیا۔

● ادارۂ فکر و نظر کا ادبی و شعری اجلاس نواب میر احمد علی خاں سابق

وزیر داخلہ کی صدارت میں ہوا۔ موصوف نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت اردو کو فروغ دینے کی پالیسی پر کاربند ہے، ایسے حالات میں اردو والوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی صفوں کو متحد کرلیں۔ مشاعرہ میں لعل ارشد، جاندار افسر، نذیر علی عدیل، قادر نعیم، زور آغائی، راجہ لال راجہ، سعید فیضانی، اختر واحدی، چاند ہاشمی راہی، ضیا ساحری، خالد کشیری، رؤف رحیم اور رشاد عدیلی نے حصّہ لیا۔

۲۲ جولائی: کارکنان روزنامہ سیاست نے جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست کو صحافت کا غالب ایوارڈ ملنے کی مسرت میں جلسۂ تہنیت منعقد کیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ آپ نے جناب عابد اور روزنامہ سیاست کی صحافتی اور حیدرآبادی روایات کی نمائندہ پاسداری اور بے لوث اردو دوستی کو خراج تحسین ادا کیا۔ ابتداً جناب ہاشم سعید جنرل سب ایڈیٹر سیاست نے خیرمقدمی تقریر کرتے ہوئے سیاست کے ۳۵ سالہ صحافتی کردار کو اردو صحافت کا روشن دور قرار دیا۔ مہمانانِ خصوصی مسٹر ٹی انجیا، سابق چیف منسٹر، جناب سید مظفر شاہ صدر ریاستی قانون ساز کونسل کے علاوہ مسٹر جی وینکٹ سوامی سابق وزیر نے بھی جناب عابد علی خان اور روزنامہ سیاست کی خدمات کو سراہا۔ جناب صلاح الدین نیر نے تہنیتی نظم سنائی۔ مشہور خوشنویس غوث محمد خان نے خطاطی کا شاہکار نذر کیا۔

۲۶ جولائی: مجلس شہر ادب کا ماہانہ مشاعرہ جناب سعید شہیدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یوسف نظر نے نظامت کی۔ سعید نظر، فرید متین، خواجہ ذاکر، گوڈ رشاہی، کاظم عابدی، انور سلیم، سعید فیضانی، پرویز عابدی، جیلانی بیگ، صادق، رشید شہیدی، سلطان کاظمی، اسمٰعیل ظریف اور ابراہیم خلیل نے کلام سنایا۔

اگست ۱۹۸۴ء

۸ اگست: ساہتیہ اکیڈیمی دہلی کے زیر اہتمام "ہندوستانی ادب کے معمار" سلسلے کے تحت دبستان دکن کے آخری معلم، محقق اور دانشور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانیٔ ادارۂ ادبیات اردو کی حیات اور علمی و ادبی کارناموں پر پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی کتاب "ڈاکٹر زور" کے نام سے شائع ہوئی۔

۹ اگست: عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن، نمائش سوسائٹی اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کی طرف سے جناب پدم شری عابد علی خان، ایڈیٹر روزنامہ سیاست کو غالب صحافتی ایوارڈ عطا ہونے کی مسرت میں جلسۂ تہنیت کا انعقاد عمل میں آیا۔ ریاستی وزیر فینانس مسٹر پی بھاسکر راؤ نے جناب عابد علی خان کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا۔ جناب میر اکبر علی خان سابق گورنر اڑیسہ، جناب سید مظفر شاہ، صدر ریاستی قانون ساز کونسل، مسٹر پی نرسا ریڈی سابق وزیر نے سیاست اور جناب عابد علی خان کی خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے خراج تحسین

... کیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

۲۵ر اگست : ہندی اور اردو کے ممتاز ادیب اور محقق پروفیسر سری رام شرما سابق صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی کا انتقال ہوگیا۔ پروفیسر شرما ۱۶ر اگست کو اسکوٹر کے حادثہ میں بے ہوش ہوگئے تھے۔ آنجہانی شرماجی کا اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں ان کی المناک وفات پر اظہارِ رنج و ملال کیا گیا۔ مجلسِ ادبیات اردو کی محفلوں میں وہ بہ پابندی شرکت کیا کرتے تھے۔

۲۷ر اگست : ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے پروفیسر سری رام شرما کی وفات پر تعزیتی بیان میں گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے اردو اور ہندی والوں کے لئے ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی المیہ قرار دیا۔

۳۱ر اگست : ہندی، تلگو، اردو اور مرہٹی کی علمی و ادبی ایک سو انجمنوں کی طرف سے پروفیسر شرما کو ایک نمائندہ جلسۂ تعزیت میں زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر سی نارائن ریڈی صدر نشین سرکاری زبان کمیشن، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے، مسٹر ڈی راما نجم راؤ، پروفیسر مغنی تبسم، مسٹر اوم پرکاش نرمل، جناب مجید اللہ، مسٹر سری نواس لاہوٹی اور دیگر مختلف کرم فرماؤں نے مخاطب کیا۔ آخر میں ایک قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

صد ۲۳ کا سلسلہ ملاحظہ فرمائیے :

کرشن چندر کی افسانہ نگاری

استحصال اور فرد اور بے بسی اور مظلومیت کو ایک نئے زاویئے سے اجاگر کیا۔ ان کے یہاں نعرہ بازی نہیں، ایک دھیما اور دل میں اتر جانے والا انداز ہے۔ ان کے افسانے قاری پر بوجھ نہیں بنتے لیکن سنجیدگی کے ساتھ اس کو سوچنے اور فکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خامیوں سے انکار نہیں لیکن ان کے فن میں رفعتیں بھی بے پناہ ہیں اور کون ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ اردو افسانے کا ایک مینارۂ نور ہیں۔

نتائج اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو

منعقدہ مئی ۱۹۸۴ء

ردو دانی : مرکز بھونگیر، کامیاب رول نمبر ۱، ۲ مرکز
بنا سرپور کامیاب رول نمبر ۳ تا ۷، ۹ تا ۱۱، ۱۳ تا ۱۴ مرکز
رپور : کامیاب ۱۵ تا ۱۷، ۲۰ تا ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۳۰
رکز کریم نگر کامیاب ۳۱ تا ۳۹ مرکز گوشہ گیر ادھوس
۴ تا ۴۳ مرکز کھمم ۴۴ ، مرکز سدن پلی ۴۵ تا ۴۹۔
ظام آباد: ۵۰ ، نیلور ۵۳ تا ۵۵ حیدرآباد: ۵۶
۵۷، ۶۱، ۶۸ تا ۷۰، ۷۵، ۷۷ مرکز ادھونی ۷۸ تا
۸۰، ۸۵ تا ۹۵

ردو زبان دانی : بھونگیر ۲، ۳، ۶، ۸، ۹، ۱۰
رکز دبنار سرپور اول: ۱۱، ۱۷، ۴۱ تا ۴۳، ۴۵، ۴۸
۴۹، کامیاب : ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۸، ۲۰ تا ۲۴، ۳۰ تا
۳۳، ۳۴، ۳۶، ۳۸ تا ۴۴، ۴۸، مرکز سرپور، اول
۵۴ کامیاب: ۵۵ مرکز کریم نگر اول: ۵۷ کامیاب
۵۸ کھمم، اول: ۶۴، ۶۵، ۶۸، ۷۱ کامیاب: ۶۶
۶۷، ۶۹، ۷۰ مرکز سدن پلی کامیاب: ۷۵ مرکز
نظام آباد اول ۷۹، ۸۰، ۸۱ کامیاب: ۷۸ مرکز نیلور:
ول، ۸۵، ۸۸، کامیاب ۸۲، ۸۴، ۸۶، ۸۷ مرکز گوشہ

کامیاب ۹۱، ۹۲ مرکز حیدرآباد اول: ۹۳، ۹۸، ۱۰۲،
۱۰۴، ۱۱۰، ۱۲۱ تا ۱۲۳ کامیاب ۹۴، ۹۵، ۱۰۰، ۱۰۶ تا
۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۹ مرکز ادھونی اول ۱۲۵،
کامیاب ۱۲۴

اردو عالم : مرکز آرمور ۱ تا ۸ درجہ دوم مرکز بھونگیر دوم ۹
۱۱، ۱۲، ۱۴ تا ۱۷، سوم ۱۰۔ مرکز ملی اول: ۱۹، ۲۲
۲۹، ۳۱، ۳۶، ۴۸، ۴۹، ۵۵ دوم ۲۵، ۲۷، ۲۸
۳۳، ۳۴، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۵، ۴۷، ۵۰ تا ۵۲
۲۲، ۲۳، سوم ۲۳، ۲۴، ۲۶، ۴۱، ۴۳، ۴۴
۷۱۔ مرکز دبنار سرپور(ن) دوم ۵۶، ۶۳، ۶۷، ۶۸
۷۰، ۷۱، ۷۷ سوم ۵۸، ۶۱، ۶۴ تا ۶۶، ۶۹، ۷۲ تا ۷۶
۷۸ مرکز سرپور، دوم: ۸۱، ۸۴، ۸۶ تا ۸۹، ۹۱ سوم
۸۳، ۸۵، ۹۰، ۹۲، ۹۳۔ مرکز کریم نگر اول: ۹۴، دوم
۹۶ ۔ مرکز گوشہ گیر (ادھوس) اول: ۱۰۳ دوم ۹۷ تا
۱۰۲، ۱۰۵ تا ۱۰۷ سوم ۱۰۴ مرکز کھمم: دوم ۱۱۰، ۱۱۲،
سوم ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹ مرکز محبوب نگر:
دوم ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۳۹، سوم ۱۲۰، ۱۲۳ تا ۱۲۸،

مرکز [illegible] سوم: ۱۲۹، مرکز نظامیہ گیر، اول ۱۳۳، دوم
۱۳۱ [illegible] تا ۱۲۵، ۱۲۷ تا ۱۳۱، ۱۳۳ تا ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۴۰
۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳ تا ۱۶۴، ۱۶۶ تا ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۷۲ تا
۱۸۴، ۱۸۸ تا ۱۹۰، ۱۸۳ تا ۱۹۵، ۱۹۷۔ سوم: ۱۲۶،
۱۴۰، ۱۴۸ تا ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵، [illegible]، ۱۷۷
۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۹، مرکز نظام آباد
اول: ۳۸ دوم ۱۹۹ تا ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۷۴ تا ۲۷۹،
۲۸۱ تا ۲۸۳ سوم ۱۹۸، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰۔ مرکز
نلگنڈہ، دوم: ۲۱۰، ۲۲۱، ۲۲۳، سوم ۲۱۱، ۲۱۴ تا
۲۱۶، ۲۲۳، ۲۲۴ تا ۲۳۲۔ مرکز نندیال، دوم ۲۳۳ تا
۲۳۵، ۲۴۱، ۲۴۳ سوم ۲۳۶ تا ۲۴۰۔ مرکز نیلور،
دوم: ۲۴۴، ۲۴۸۔ مرکز حیدرآباد: اول ۲۹۶،
۳۰۵، دوم ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۰۲، ۳۲۴،
۳۲۴، ۳۲۹، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۴۳، ۳۴۵،
۳۴۷، ۳۴۸، ۲۵۴، ۳۶۴ تا ۳۶۵ سوم ۲۷۵
تا ۲۷۷، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۹۱، ۲۹۲، ۳۰۰، ۳۱۸،
۳۲۵، ۳۳۰، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۶۶ تا ۳۶۸
اُردو فاضل: مرکز [illegible] درجہ دوم ۴، ۹، ۱۰
درجہ سوم ۱ تا ۳، ۵ تا ۸، ۱۱، ۱۲ مرکز بھونگیر، دوم:
۱۹، ۲۱، ۲۳ تا ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۲، سوم ۱۲ تا ۱۸
۲۰، ۲۸، ۳۱ مرکز [illegible] دوم: ۳۳ تا ۳۶، ۴۰، ۴۲
۴۴، ۵۱، ۴۱ سوم ۳۷، ۳۸، ۴۳، ۴۴ تا ۴۹،
۵۲ تا ۵۶، ۵۸ تا ۶۰، ۶۳۔ مرکز [illegible]:
دوم ۷۰، ۷۲، ۷۳ سوم ۶۸، ۶۹، ۷۱، ۷۴ تا ۷۶
مرکز [illegible] دوم ۸۰، ۸۱، سوم ۷۸، ۷۹، ۸۲، ۸۳،

مرکز کریم نگر، دوم: ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۲ سوم ۸۵، ۸۶
۹۰، ۹۳ مرکز [illegible] دوم ۹۵، ۹۷، ۹۸
سوم ۹۲، ۹۴، ۹۹۔ مرکز کھمم: سوم ۱۰۱ تا ۱۰۹، ۱
تا ۱۲۲، مرکز محبوب نگر دوم ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۴
۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۰، سو
۱۲۵ تا ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۰
۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵ تا ۱۴۸ تکمیل گروپ II ۱۳۱، تکمیل
گروپ II، III ۱۵۱۔ مرکز مدن پلی سوم ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵
۱۵۷ تکمیل III ۱۵۸ مرکز نظام آباد، اول ۱۵۹،
۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۶ تا ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۶۳، سو
۱۶۲ تا ۱۶۴، ۲۶۱، ۲۶۴، ۲۶۵ مرکز نلگنڈہ، د
۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۱ تا ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۴
سوم: ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۵ تا ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۹
تکمیل گروپ: II، III ۱۷۴، ۱۸۵۔ مرکز نندیال،
۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، سوم ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۳
۱۹۵ تکمیل گروپ I، II ۲۵۶ تا ۲۵۸۔ مرکز نیلور
درجہ سوم ۱۹۶ تا ۱۹۸ مرکز حیدرآباد سٹی کالج، دا
۲۱۰، ۲۲۷ تا ۲۳۰، ۲۴۱، ۲۵۴ سوم ۸۲
۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۸ تا ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۰
۲۴۳ تا ۲۴۴، ۲۴۹، ۱۵۱، ۱۵۲، [illegible]
I، II ۲۲۸ گروپ II، III ۲۳۴، ۲۴۷
۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۳، تکمیل گروپ II ۲۷۹۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ
([illegible] معتمد اعزازی شعبۂ امتحانات)

SEPTEMBER 1984 R. N. I
Regd. H/H

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 482, (A. P

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جلد ۴۴، شمارہ ۱۰، سن اجرا ۱۹۳۸ء

فون: ۳۸۸۴۹

اکتوبر ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مدیر اعزازی: پروفیسر مغنی تبسم
شریک مدیر: محمد منظور احمد
معاون مدیر: وقار خلیل

مجلس مشاورت:
صدر: حامد علی عباسی
نائب صدر: ہاشم علی اختر
معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

ارکان:
عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ
محمد اکبر الدین صدیقی، رحمٰن راج سکینہ
پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ: ۲۰ روپے، کتب خانوں سے: ۲۵ روپے

بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے:

بحری ڈاک	ہوائی ڈاک سے:	
۶ ڈالر	۱۵ ڈالر	مشرق وسطیٰ
۸ ڈالر	۲۰ ڈالر	امریکہ
۶ ڈالر	۱۰ ڈالر	پاکستان، برما، سیلون
۳ پونڈ	۸ پونڈ	انگلستان

رحمٰن راج سکینہ، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان میں چھپوا کر، حیدرآباد ۲ /۸۲ م سے شائع کیا — کتابت: رضی الدین اقبال

ادارہ ادبیات اردو، ایوان اردو پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ 500482.

سرورق: ملا باسٹی بیجاپوری

ترتیب

اپنی بات

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہماری قوم کو "آرام حرام ہے" کا نعرہ دیا تھا۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ ہندوستان کی بقا، ترقی اور اقوامِ عالم میں باعزت اور باوقار مقام و مرتبہ کے حصول کے لیے سخت محنت اور مسلسل جد و جہد کی شدید ضرورت ہے۔

آج اردو والے اپنی زندگی کے ایک اہم اور اعلیٰ مقصد کو پانے کے لیے اسی نعرہ کو پیشِ نظر رکھیں اور صبر و سکون اور پُرخلوص جذبہ کے ساتھ ہندوستان میں اردو کی بقا و ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جائیں تو ہماری زندگی کے اس آزمائشی دور میں بھی ہم بلاشبہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔

اردو میں ہندوستانی تہذیب کی روح ہے، اس کے درخشاں و تابناک مرقعے ہیں۔ ہمارے ادب میں ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں محفوظ ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک آزادی کی مسلسل جد و جہد میں بھی اردو کا شاندار حصہ رہا ہے۔ اس وقت، ہماری زبان کو پُرخلوص خدمت کا جذبہ رکھنے والے، خاموش، مستقل مزاج، سنجیدہ لیکن سرگرم خدمت گزاروں کی ضرورت ہے۔ اگر فعال افراد، انجمنیں اور ادارے، "اردو کی لازمی تعلیم"، بنیادی اردو تعلیم اور بالغوں کے لیے بلا فیس یعنی مفت اردو کی تعلیم کے [illegible]

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر دیکھیے)

سلیمان اطہر جاوید

قومی یکجہتی کے فروغ میں

شعرائے جامعہ عثمانیہ کا حصہ

اُردو قومی یکجہتی کا خواب بھی ہے اور خواب کی تعبیر بھی! اگر ہمارے ملک کے ارباب اقتدار اس ملک میں جمہوریت کو واقعی کامیابی سے ہمکنار کرنا اور سدا ترقی کی شاہراہ پر گامزن رکھنا چاہتے ہیں تو اُردو کو اس کا حق دینا ہوگا۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور پھر اُردو کو علمی و ادبی اور سنجیدہ و شائستہ سطح سے ہم آہنگ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے، کون ہے جو جامعہ عثمانیہ کے کردار سے انحراف کر سکتا یوں اُردو اور جامعہ عثمانیہ کا قومی یکجہتی سے رشتہ مضبوط اور محکم ہو جاتا ہے ——
کہا جا سکتا ہے کہ قومی یکجہتی کے فروغ میں اُردو شاعروں کے کردار کا جائزہ لینے کی بجائے اس موضوع کو صرف جامعہ عثمانیہ کے شاعروں تک کیوں محدود کیا جائے؟ یہ بات بلاشبہ عثمانیہ یونیورسٹی کے آج کے موقف کے بارے میں درست ہے کہ آج عثمانیہ یونیورسٹی کی حیثیت ملک کی بیشتر جامعات کی طرح ہے لیکن جامعہ عثمانیہ کہتے ہوئے ہم ایک عظیم تعلیمی ادارے کے ایک مخصوص دور اور ایک مخصوص کردار سے مراد لیتے ہیں۔ وہ دور اور وہ کردار جو اُردو کے حق میں آج بھی باعث سربلندی و وجہ افتخار ہے۔

آج ہم قومی یکجہتی کی باتیں جس پس منظر میں، جس حکمت عملی کے تحت اور جس [illegible] رکھتے ہوئے کرتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اس کی اولین مثال سلطنت آصفیہ اور جامعہ عثمانیہ نے عرصہ قبل پیش کر دی تھی۔ سلطنت آصفیہ [illegible] علاقوں، زبانوں کے [illegible]

پر مشتمل تھی۔ ملک کی لسانی بنیادوں پر تنظیم جدید کے نتیجے میں یہ علاقے اپنی اپنی زبان کی ریاستوں میں
شامل کر دیئے گئے ہوں لیکن سابق ریاست حیدرآباد میں یہ سب مل کر ایک لسانی اکائی کی حیثیت
رکھتے تھے۔ اردو ان علاقوں میں مشترکہ زبان ہی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ان میں قومی یکجہتی
کی ایک علامت بھی تھی۔ سیاسی حالات نے آگے چل کر جو بھی کروٹ لی ہو، تاریخ شاہد ہے کہ
ریاست حیدرآباد اپنی اس علاقائی لسانی رنگارنگی کے باوجود قومی یکجہتی کا روشن باب رہی۔

ان پیچ و خم میں قومی یکجہتی کے فروغ میں جامعہ عثمانیہ کے شاعروں کا کردار ایک مینارۂ نور
بن جاتا ہے اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ سقوطِ سلطنتِ آصفیہ سے قبل حیدرآباد، بقول فانی '
ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندوستان سے دور تھا۔ ریاست حیدرآباد کی اپنی اس جداگانہ امتیازی
اور انفرادی وحدت اور اپنی اس شناخت کی برقراری کے سبب بھی جامعہ عثمانیہ کا کردار، عثمانیہ
یونیورسٹی سے بآسانی ممیز کیا جا سکتا ہے۔

بحیثیت ریاست کے اپنے جداگانہ موقف اور سیاسی اکائی کے بطور اپنے انفرادی
مقام کے پس منظر میں یہاں کے سیاسی اور مذہبی قایدین اور اربابِ اقتدار کے جو بھی جذبات و
محسوسات ہوں، ادیبوں اور شاعروں نے اس ڈھانچے میں رہنے کے باوجود اپنی دنیا آپ بسائی
انہوں نے اردو سے اپنی جذباتی وابستگی کو ہر قیمت پر برقرار رکھا لیکن دیگر زبانوں سے بے تعلقی
بھی نہیں برتی۔ ان زبانوں کے الفاظ، محاورات اور تلمیحات وغیرہ کو اپنے کلام میں استعمال کیا، اور
اسی کے ساتھ حیدرآباد میں رہتے ہوئے حیدرآباد سے دور نہیں رہے ——— برطانوی سامراج
کے خلاف قومی تحریکات کا ساتھ دیا، قومی ورثے کی پاسداری کی، عوامی جذبات و احساسات کی
ترجمانی کی۔ ان کے حوصلوں اور امنگوں کو نیا موڑ دیا، خواہ وہ ہندو ہوں کہ مسلمان، ان شاعروں نے
دوسرے مذاہب اور معتقدات کا احترام کیا۔ احترام ہی نہیں، دیگر مذاہب کے پیشواؤں کے
کردار اور ان کی خدمات کو سراہا اور ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے ان کی تعلیمات کی ترویج
و اشاعت میں حصہ لیا۔ قومی یکجہتی کے فروغ میں شعرائے جامعہ عثمانیہ کا یہ کردار بھی لائقِ ستائش
ہے کہ انہوں نے کسی ایک علاقے، وہاں کے موسموں، دریاؤں، پہاڑوں، مقامات، پھلوں اور
پھولوں وغیرہ ہی کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا اور اپنے اشعار میں صرف انہی کے حوالے
نہیں دیئے بلکہ ہندوستان کے اس وسیع و عریض علاقے، یہاں کی پہنائیوں، مہکتی فضاؤں، جھکتے
موسموں اور جھومتی بدلیوں اور یہاں کے سادھوؤں اور ویدوں سے بھی ویسی ہی چاہت اور

جذباتی تعلق کا اظہار کیا۔ انہوں نے کسی بھی تفریق اور تعلق کو ہوا نہیں دی اور جیسا کہ سچے ہندوستانی شاعروں اور فنکاروں کا خاصہ رہا ہے، نسل، مذہب، علاقائی اور ذات پات کے تمام رجحانات سے ماورا ہو کر جامعہ عثمانیہ کے شاعروں نے قومی جذبات کے فروغ، انسان دوستی اور انسانیت پرستی کو اپنا شعار بنایا۔ ان کے کلام میں دکن کی مٹی کی خوشبو یقیناً ہے اور سارے ملک سے لگاؤ بھی بے اختیارانہ ملتا ہے۔

قومی یکجہتی کے سلسلے میں زبان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہوں، کوئی زبان والے نہ صرف یہ کہ اپنی زبان کو سادہ، عام فہم اور آسان بنا کر بلکہ دیگر زبانوں کے سلیس الفاظ کو اپنا کر ان زبان والوں سے قریب ہو سکتے اور ان کا دل جیت سکتے ہیں۔ دیگر زبان والوں میں ایسے افراد ہیں لیکن محدود معنی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے بھی بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو والوں میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ شعرائے جامعہ عثمانیہ نے اس دور میں جب کہ ہندی کی ترویج و اشاعت کی مساعی غیر معمولی سطح پر جاری تھیں، ہندی کے زیادہ اور کہیں کہیں ٹھیٹ دکنی اور تلگو الفاظ کے استعمال سے ایک اپنائیت اور بھائی چارے کی فضا پیدا کی اور قومی یکجہتی کے لئے حالات کو اپنے طور پر ساز گار کیا۔ اکبر وفاقانی اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ اُن کی نظم 'بنایل اور شام' کا پہلا شعر ہے ؎

شام کی سُندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خوابِ دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

اسی طرح ان کی نظم "سندر شام" میں خاص طور پر ہندی الفاظ کا اہتمام ملتا ہے۔

محمد عبدالقیوم خان باقی کی نظم "بانسری" کا تو انداز ہی اور ہے۔ ہندی الفاظ کا استعمال باقی نے خاصا کیا ہے۔ "بانسری" کا صرف ایک بند پیش کرتا ہوں ؎

میرے دھن سے دنیا جاگے   اُلجھیں من میں غم کے دھاگے
میرے کومل راگ کی لہریں   جیسے من میں ہرنا بھاگے

لیکن اس دور کے جس شاعر نے ہندی الفاظ اور تراکیب وغیرہ کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے وہ بلا شبہ اختر عادل ہے۔ انہوں نے ہندی الفاظ اور بحروں کی غنائیت سے پورا پورا استفادہ کیا اور گیت بھی لکھے۔ ان کے مزاج کی آئینہ داری ان کے شعری مجموعے کے عنوان "کلپنا" سے بھی ہوتی ہے۔ سلیمان اریب نے اختر عادل کے بارے میں "حیدرآباد کے شاعر" (جلد دوم) میں لکھا ہے:

وہ اپنے گیتوں میں نغمگی پیدا کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ ہندی بحریں ہی استعمال کرتے ہیں بلکہ ہندی اور برج بھاشا کے الفاظ بھی بڑی برجستگی سے برتتے ہیں۔ گیتوں کے علاوہ اختر کی نظموں اور غزلوں کی زبان بھی بہت میٹھی اور کومل ہوتی ہے۔ اختر ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اردو کو ہندی سے قریب لانے کی شعوری کوشش کی ہے۔"

اختر عادل کی قابلِ ذکر منظومات میں "سپنوں کی سندری"، "ہلکور"، "بھید کھلا نہ گلشن کا"، اور "اکال گیت" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ میں یہاں ان کی ایک مختصر سی نظم "بھید کھلا نہ گلشن کا" پیش کرتا ہوں، اندازہ ہوگا ؎

دھرتی نے ساون بھادوں میں دیر تلک اشنان کیا
لجا لجا کر، سمٹ سمٹ کر اپنے روپ کا دھیان کیا
ہرے ہرے گل بوٹے والے وستر پہنے، بات بنی
اتنی پیاری، اتنی سندر کوئی نہیں تھی روپ دھنی
گال کے لال گلاب نکھارے، دیر تلک سنگار کیا
اپنے روپ کے درشن کو وہ پھول بنی پھر نرگس کا
آنکھ کھلی نرگس کی لیکن روپ دکھا نہ گلشن کا
بھید کھلا نہ گلشن کا

اور ایسے کئی شاعروں اور منظومات میں شنکر موہن لال رواں کی نظم "ایک ہندی عورت عالم خیال میں" سید علی حسنین زیبا کی "پپیہا اور عورت" کاوش حیدرآبادی کی "بجارن" غفور انیس کی "اجیارا مسکائے رے" ابوظفر عبدالواحد کی منظومات "بادل" اور "پپیہا" اور صاحبزادہ میکش کی "اشنان" چند ایک ہیں۔ ہندی زبان سے استفادہ کرتے ہوئے قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے فضا کو سازگار بنانے کی روایت جامعہ عثمانیہ کی نئی نسل کو بھی ملی ہے۔ آج کے کئی شاعروں کے ہاں یہ رجحان بھرپور اور توانا انداز میں ملتا ہے۔ شاذ تمکنت کے ہاں بھی، جس نے فارسی کے خوش صوت بھر پور اور نکھرے الفاظ کے استعمال سے اپنے کلام میں بانکپن پیدا کیا ہے، ہندی الفاظ سے طرحداری پیدا ہوتی ہے۔ "نیند کی وادی" میں "لے بادِ خزاں کے نرم جھونکو"، "کوئی آئے کہ پکار

ــــــــــــ شناخت کے ہاں ایسی اور کئی منظومات مل جائیں گی۔

دیگر مذاہب اور معتقدات کے احترام کا جہاں تک تعلق ہے، شعرائے جامعہ عثمانیہ نے صدق دل سے کام لیا اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ دیگر مذاہب اور فلسفوں کی اچھی اقدار کی ترویج میں حصہ لیا کہ یہی اصل انسانیت اور روح مذاہب ہے۔ ابوالفتح محمد نصراللہ باقی نے شعرگوئی کی سمت کم کم ہی توجہ دی لیکن ان کے موضوعات میں نیا پن ہے، لطافت خیال نے ان کے کلام میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اُن کی ایک طویل نظم ہے "فلسفیوں کی محفل" ـــــــ اس میں "ویدانتی کا فلسفہ" کے تحت اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ـ

کچھ پوچھ نہ اے دوست کہ کیا راز ہے عالم اک خواب مسلسل ہے نظر آئے جو پیہم
تصویر خیالی ہے جو کچھ دیکھتے ہیں ہم یا عکس تصوّر ہے کہ جو ہو درہم و برہم
ہم دیکھتے ہیں اپنے تصور کے اثر کو
یہ اصل حقیقت ہے کہ دھوکا ہے نظر کو

تاریخی اور تہذیبی ورثے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس سے اخذ و اکتساب کرتے ہوئے ہی فن کار اپنے فن کی تزئین کرتا اور اس کو معتبر اور وزن و وقار کا حامل بناتا ہے۔ تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہی موجودہ نسل کے لئے وجہ خود اعتمادی، مشعلِ راہ اور آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت بن جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تہذیبی بحران اور قومی سطح پر انتشار کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ عوام اور عوام سے زیادہ ان کے قایدین، تاریخی اور تہذیبی ورثے سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ ان عظیم ہستیوں کو فراموش کیا جا چکا ہے، جنھوں نے ماضی میں ہماری تاریخ کو نیا رنگ دیا، ہماری تہذیب کو اجالا اور اپنی حیات کو ملک و قوم کے کام میں لایا۔ اس سلسلے میں جلال الدین اشک کی نظم "رضیہ سلطانہ میدانِ جنگ میں" خاصی توجہ کی حامل ہے۔ اکبر وفاقانی کے پاس ایسی کئی منظومات ملتی ہیں، جن میں "ساغرِ جہانگیر" اور "ٹیپو سلطان سے اہلِ ہند کا خطاب" اہمیت کے حامل ہیں۔ "ٹیپو سلطان سے اہلِ ہند کا خطاب" کے دو تین بند ـ

اے پیکرِ آزادی، اے روحِ شجاعت آ اے قلبِ محبت آ، اے جانِ حمیت آ !!
ایثار و صداقت پر کی جان فدا تو نے دکھلا دے اسیروں کو اجڑی ہوئی شوکت آ
قائم ہے ترے دم سے اندازِ جہاں بانی
باقی تھی ترے بل پر حریتِ انسانی!

ٹیپو تری ہستی پہ نازاں ہے وطن ابتک — اور تیری شہادت پہ نالاں ہے وطن اب تک
محفل تری سونی ہے اور جانِ عمل گم ہے — اک جان نہ ہونے سے بے جان ہے وطن اب تک

آنکھوں میں چمک جاتو آنسو سے ٹپک جاتو
الفت کی انی بن کر ہر دل میں کھٹک جاتو

وہ بھی کوئی جلوہ تھا جو طور پہ رہ جاتا — یا شیخ کا تقویٰ تھا جو حور پہ رہ جاتا
ٹیپو کا دلِ مسلم کونین کا حاصل تھا — کس طرح یہ ممکن تھا میسور پہ رہ جاتا

دنیا بھی ملی اس کو عقبیٰ کی حکومت بھی
اک وار میں حاصل کی شہرت بھی شہادت بھی

اسی طرح وجد نے اپنی معرکہ آرا منظومات "اجنتا" اور "ایلورہ" تخلیق کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فن کار کو فن عزیز ہوتا ہے، وہ حسن کا شیدائی ہوتا ہے، وہ تاریخی ورثے کا احترام جانتا ہے اور اپنے تہذیبی اثاثے کی توقیر کرتا ہے اور اس خصوص میں نہ مذہب مانع ہوتا ہے اور نہ عقیدہ۔!

حیدرآباد کی اپنی جداگانہ سیاسی وحدت کے باوصف شعرائے جامعہ عثمانیہ نے ہندوستان سے ذہنی طور پر اپنے تعلق کو برقرار رکھا، اس دور کے حالات کو ملحوظ رکھے، یہ بہت بڑی بات تھی اس دور کے بیشتر شاعروں کے ہاں ہندوستان سے ذہنی بلکہ جذباتی وابستگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے شاندار اور قابلِ فخر ماضی کے گیت گائے، یہاں کے ذرّے ذرّے کو سراہا، یہاں کے نظاروں کو سراہا، یہاں کے عوام کی تحسین اور یہاں کی سونا اگلتی زمین کی تعریف میں اپنے قلم سے پھول کھلائے۔ سید نبی الحسن شمیم، ایک ایسے ہی شاعر ہیں جن کے بیشتر اشعار سے ہندوستان سے محبت پھوٹ پھوٹ پڑتی ہے۔ "مادرِ ہند" ان کی ایک من موہن نظم ہے۔ ہندوستان کی کیسی دلنواز تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ اشعار ــــ

مہ کشِ چرخ ہیں گوشۂ جنت ہے یہی — چشمِ اغیار میں آئینۂ حیرت ہے یہی
نہ دلہانے کو کلی گل کی، نکلتی ہے یہاں — ہے یہ مشہور زمیں سونا اگلتی ہے یہاں
خوش فرشتے بھی ہیں یہاں دیوتوں کا تماشا کر کے — پھینک دیتے ہیں یہاں چاند کو چورا کر کے
ظاہری آنکھ میں پنہاں ہیں بلا کے جلوے — پتھروں میں نظر آتے ہیں خدا کے جلوے
سانس کا لطف ہے ہر سانس میں سنتے ہیں رباب — دل کے پیمانے میں ملتی ہے حقیقت کی شراب

مخدوم محی الدین مخدوم نے قومی آزادی کی جدوجہد کو "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" جیسا حوصلوں

محو اعجاز نے "امنگوں کو نکھارنے، دلوں کو بڑھانے اور قلب کو گرمانے والا گیت دیا۔ ہندوستان کی بے چینی کار کے نعرے بھی لگے۔ مخدوم کی نظم "ہندوستان کی جے" ایک پُربہار نظم ہے جس میں مخدوم نے ہندوستانی نوجوانوں کو سراہا اور ان کے عزائم اور حوصلوں کی داد دی ہے اور ایں وآں اور من و تو کا لحاظ کئے بغیر قوم کو یکجہت اور یک جسد کر دیا ہے۔ کیسے خون میں حدت اور جذبات میں شدت پیدا کرنے والے اشعار ہیں ؎

کہو، ہندوستاں کی جے
کہو، ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی — وطن کا پاسباں، وہ تیغِ جوہر دارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے — وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی — مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو، ہندوستاں کی جے
کہو، ہندوستاں کی جے

مخدوم نے آزادی کی مہم کو تیز تر کرنے کے لئے گیت ہی نہیں لکھے انہوں نے ہندی نوجوانوں کی ستایش کرتے ہوئے ان کو نئی راہوں پر گامزن ہونے کی ترغیب ہی نہیں دی بلکہ کبھی طنز اور برہمی سے بھی کام لیا اور ہندوستانیوں کے آگے ہندوستان کی صحیح تصویر پیش کر دی۔ یہ بھی ایک رویہ تھا حقیقت حال کو برافگندہ نقاب کرتے ہوئے قوم کو بیدار کرنے اور اس کو برطانوی سامراج کے خلاف متحد اور محکم کرنے کا۔ یوں لگتا ہے اشعار، شاعر کے دل، اس کی روح کو چیرتے ہوئے نکل رہے ہیں اور ہمارے دل، ہماری روح کو چھو رہے ہیں۔ مخدوم کی نظم "مشرق" کے چند شعر ہیں ؎

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں! — زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا زیاں
ایک ننگی لاش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی — مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہولناک کچھ بھی نہیں — اک بھٹکتی روح ہے جس کا ٹھکاں کوئی نہیں
پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول — ایک مرگِ بے قیامت، ایک بے آواز ڈھول

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

اور ادھر صاحبزادہ میکش نے لگ بھگ اپنی جذبات و احساسات کے ساتھ ہندوستان کی پستی و

افلاس پر آنسو بہائے۔ مخلش کی نظم کا عنوان ہے "ہندوستان" اور اس کے دو بند ہیں ؎

خار و خس کی جھونپڑی، مٹی کے بوسیدہ مکاں   جیسے اندھوں کے اشارے جیسے گونگوں کی زباں
جس طرح اترے ہوئے چہرے پہ آنسو کے نشاں   جس طرح سوکھی ہوئی ٹہنی پہ اجڑے آشیاں
داغ بن کے ساز و ساماں، درد جن کا پاسباں
کیا اسی دنیا میں تو پلتا ہے اے ہندوستاں

موت کی پرچھائیوں میں پلنے والی زندگی!   آندھیوں سے ٹکرا کر جلنے والی زندگی!
ظلمتوں میں اپنی آنکھیں ملنے والی زندگی!   تھام کر لغزش کا دامن چلنے والی زندگی!
غم کے سانچے میں مسلسل ڈھلنے والی زندگی!
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں!

اس دور کے تقاضے ہی کچھ اور تھے۔ ہندوستان کے اور علاقوں اور وہاں کے عوام ہی نہیں دیسی ریاستوں اور رجواڑوں کے لوگ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ان کے افلاس، پستی اور تنگی کا بڑا اور بنیادی سبب برطانوی سامراج ہے جو ہندوستان کا خون چوس رہا ہے، ہندوستانی صلاحیتوں کو سلب کر رہا ہے اور اس کو بے آبرو اور بے وسیلہ کر رہا ہے اور مزید کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانیوں کی نگاہوں سے خواہ وہ کسی دیسی ریاست میں کیوں نہ رہتے ہوں، انگریزوں کا یہ پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ انگریزوں کے ظلم و استبداد سے پوری طرح باخبر تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ برطانوی راج ہے۔ انگریزوں کی سازشیں اور ان کی بہیمیت یہاں قومی سطح پر بھی جاری تھی اور وہاں بین الاقوامی سطح پر بھی۔ جلیانوالا باغ کی قیامت صغریٰ کو کون ہندوستانی فراموش کر سکتا ہے۔ ایسا ممکن بھی کہاں اور کیسے؟ عزیز قیسی جن کی شاعری یوں بھی احتجاجی لب و لہجہ کی حامل ہے، جلیانوالا باغ کے سانحے پر اظہار خیال کرتے گویا سارے ہندوستانیوں کے احتجاجی جذبات کو سمیٹ لیا ہے۔ انگریزوں کے اس شر میں خیر کا پہلو نکلتا ہے کہ ہندوستانیوں نے اپنے اختلافات کو فراموش کیا اور ان میں یکجہتی کے جذبات فروغ پائے۔ عزیز قیسی کی نظم "جلیانوالا باغ" کے یہ چند شعر ؎

اے زمیں، ارض آغوش کا غم نہ کر   ان جواں مرگ ویروں کا ماتم نہ کر
تیرے بیٹے مقدس، امر، جاوداں!   لکھ رہے ہیں نئے دور کی داستاں
گیت لٹتے ہیں، گھٹتے ہوئے مرتے نہیں   یہ فنا کا افق پار کرتے نہیں

ہم تو کیا قاتلوں کو بھی ہے یہ پتا　　　قتل ہوتے نہیں گیت، سورج، صبا
خون کی بوند، یاں ڈوبتی ہے مگر　　　بیج کی طرح اٹھتی ہے پھر جاگ کر
چرخ پر گو اندھیرے کی تحریر ہے
رات خود اپنی قسمت کی تفسیر ہے

ہمارے شاعروں نے قومی نہیں، بین قومی سطح پر بھی انگریزوں کی بربریت کو نظر میں رکھا، اور اس کو طشت از بام کرتے ہوئے جہاں اپنی بالغ نظری اور پختہ سیاسی شعور کا ثبوت دیا، اپنے ہموطنوں کو انگریزوں کی فطرت سے آشنا بھی کرایا تاکہ وہ سامراج کے حقیقی چہرے کو دیکھیں اور اس کے خلاف ایک جان ہو جائیں۔ صمد رضوی ساز کی نظم 'ایشیا' کے مطالعے سے شاعروں کے ان جذبات کا اندازہ ہوگا۔ ساز نے 'ایشیا' اس وقت لکھی، جب کہ انڈونیشیا کی جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی لیکن یہ نظم صرف انڈونیشیا نہیں، سارے ایشیا بلکہ کل مشرق کی آزادی کی تحریکات کا اشاریہ ہے اور صرف ہندوستانیوں کے نہیں، سارے مشرق کے عوامی جذبات کی ترجمان! جذبات کا کیسا والہانہ اظہار ملتا ہے۔ کیسی وارفتگی ہے ؎

شکر صد شکر کہ مشرق کی زمیں جاگ اٹھی!　　　حکمتِ مغربِ چالاک نے دم توڑ دیا
جس کی دانستہ شب و روز پرستش کی تھی　　　ہم نے خود اپنے ہی ہاتھوں وہ صنم توڑ دیا

اے وطن دیز لہو! شمشیر کی نوکوں سے کہیں　　　روحِ آزادیٔ جمہور بھی ہوتی ہے غلام
روک سکتا ہے بھلا کیا خس و خاشاک کا بند　　　ایک بپھرے ہوئے چڑھتے ہوئے دریا کا خرام

خون میں ڈوب گئی چین کی دیوارِ عظیم　　　ویٹ نام اور ملایا کے جواں جاگ اٹھے
وقت خود جس کے تھپیڑوں میں بہا جاتا ہو　　　کس کی طاقت ہے جو اس سیلِ رواں کو روکے

ایشیا اب وہ ترا دوست وہ پیارا مغرب　　　خام اشیاء کا خریدار نہیں آئے گا
ایک معصوم تمدن کا پیامی بن کر　　　تیری عظمت کا پرستار نہیں آئے گا

قمر ساحری کی نظم "اینگلو امریکن بلاک" بھی اسی سلسلے میں پڑھی جانی چاہیئے۔ قمر ساحری نے

مشرق کے خلاف مغربی ممالک کی سازشوں کو کما حقہ محسوس کیا اور اپنے ہم وطنوں کے سامنے مغ
جبر و استبداد کا پردہ چاک کیا کہ وہ مغرب کی بد نہادی کا اندازہ کریں اور اُن کے خلاف اپنے وسا
مساعی کو مجتمع کرتے ہوئے سینہ سپر ہوں۔ طنز میں ڈوبے ہوئے لب و لہجہ نے اس نظم کو ا
اچھوتے رنگ کا حامل بنا دیا ہے۔ نظم "اینگلو۔ امریکن بلاک" کے دو بند ہیں ؎

چند مشہور دماغوں کی سیاسی محفل　　　جس میں احساسِ تخیل ہے، عمل کچھ بھی نہیں
آفتابوں کی شعاعوں پہ حکومت ہے مگر　　　ظلمتِ شب کو مٹا دینے کا حل کچھ بھی نہیں

* * *

یہی آزادیٔ انساں کے پرستار دماغ　　　فکر میں ہیں کہ کریں سب پہ حکومت کیونکر
جو ہری بم کو چھپاتے ہوئے سینوں میں بھی　　　سوچتے ہیں کہ کریں امن کی خدمت کیونکر

یہ سب بجا اور درست ———— لیکن قومی یکجہتی کی مساعی کی راہ میں
سب سے زیادہ باعثِ زیاں اور خود قومی یکجہتی پر کاری ضرب رہی وہ فرقہ واریت تھی، خواہ
میں ہو کہ مسلمانوں میں! اس فرقہ واریت اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات نے ہندوستان
نقشے کو مسخ کر دیا، جس کی ذمہ داری ہم لاکھ انگریزوں پر عائد کریں، اپنے آپ کو بھی بری الذمہ قرا
نہیں سکتے۔ آخر ہم کو بھی عقل و فہم سے کام لینا، اطراف و ماحول پر نظر رکھنا اور اپنے مسائل کا جا
تھا ———— ہم نے ایسا نہیں کیا اور انگریزوں کی سازشوں کا شکار نہیں ہونا تھا، شکار
اور پھر خود غرض، مفاد پرست اور بد نہاد سیاستدانوں نے اپنے شخصی مفادات کے حصول
قیادت کی دوکان کو چمکانے اور اپنی روٹی روزگار کے لیے عوامی جذبات کا استحصال کیا۔ ہمار
شاعروں نے جب بھی اس کو محسوس کیا، اپنے وجود کو گویا پارہ پارہ پایا کہ یہ چیز اور جو بھی ہو، قو
پر کاری ضرب تھی۔ فضل الرحمٰن نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی ہے لیکن
کلام بھی اُن کے دردمند دل کی آواز ہے۔ اپنی نظم "پریم پجاری" میں کہتے ہیں ؎

یہ دین و دھرم کے جھگڑے کیا　　　یہ دیر و حرم کے جھگڑے کیا
ناقوس و اذاں کی آوازیں　　　اک ساتھ ملانے آیا ہوں

جگ پیار سکھانے آیا ہوں
سنسار سجانے آیا ہوں

سرور ڈنڈا، دکنی، قدیم اردو کے نامور شاعر ہیں۔ انہوں نے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ

اور لب ولہجہ کا استعمال کیا ہے۔ ان کی بعض منظومات معرکۃ الآرا ہیں۔ ہنسی ہنسی میں انہوں نے کئی معاشرتی اور قومی موضوعات پر بڑے سے پتے کی باتیں کہدی ہیں' دلوں کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے فرقہ واریت پر بھی ڈبنڈلسنے اپنی کئی منظومات میں اظہار خیال کیا ہے۔ کہیں ظریفانہ انداز میں' کہیں طنزیہ لہجے میں اور کہیں یونہی ———— "ادے نامادیشم" (کیا یہی میرا دیش ہے؟) ڈبنڈا کی چند معروف ترین منظومات میں شمار ہوتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسائل پر یہ ایک بند ؎

بڑا پاپ ہے یاں کو ہنسنا ہنسانا
سداں ریت ہے یاں کی رونا رُلانا
چُپ اپنچ لڑکو مریئیں گھر ڈو ویشٹم
ادے نامادیشم' ادے نامادیشم

فرقہ واریت' ہندو مسلم مسائل اور قومی یکجہتی کا ذکر ہو تو گاندھی جی کا نام آ ہی جاتا ہے۔ قومی یکجہتی کا اُن سے بڑھ کر مظہر ہمارے ملک میں اور کون ہو سکتا ہے۔ سانحہ یہ ہے کہ گاندھی جی انہی مسائل کے حصول کی جدوجہد کرتے ہوئے قتل ہوئے۔ اُن کا قاتل گوڈسے نہیں' ہر وہ ہندوستانی ہے' ہر وہ فرد ہے' جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی' ہندو مسلم اتحاد' اور قومی یکجہتی کا مخالف ہے' اس کی راہ میں مانع ہے۔ گاندھی جی کے قتل پر ہمارے شاعروں نے جس قدر رنج کیا' جس قدر خون کے آنسو بہائے اور ماتم کیا کہ ارضِ ہند پر ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کا ایسا متوالا عرصہ دراز تک شاید ہی کوئی اُٹھے۔ گاندھی جی کی مثال کم ملے اور بہت کم' بلکہ نہیں ———— جامعہ عثمانیہ کے ایک شاعر لطیف ساجد نے زیادہ عمر نہیں پائی' صرف ۳۴ سال۔ اُن کا شعری سرمایہ کمیت کے اعتبار سے کم سہی' کیفیت کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ گاندھی جی کے قتل پر لطیف ساجد کی نظم "قتیلِ امن" ہمارے شاعروں کے قومی یکجہتی کے جذبات کی دستاویزی شہادت ہے۔ چند شعر ہیں ؎

خون رو خون' ارضِ ہند کہ آج — ہو گیا ہے ترا چمن تاراج
پستیوں سے اُبھارنے والا — تیرے گیسو سنوارنے والا
وہ امینِ شعورِ آزادی! — نورِ آزادی' طورِ آزادی
جس کے دم سے خزاں تھی لالہ فروش — جس کے دریا کی موج طوفاں جوش
ماورائے حدودِ دیر و حرم — جس کے احساس و فکر کا عالم
رازِ گلُ باریٔ تبسم تھا — وہ ترا آخری ترنم تھا

کنول پرشاد کنول نے بھی "۳۰ جنوری ۱۹۴۷ء کی خونین شام" کے بعنوان گاندھی جی
عقیدت پیش کیا۔ وہی دلوں کو محسوس کر لینے والا انداز' یہ کیا ہوا' یہ کیسے ہوا ہے

کیسا ہے آج سارے زمانے میں انتشار — ہر برگ و گل اُداس' چمن سارے سوگوار
دو گولیوں نے لوٹ لی' دولت جہاں کی آج — اس پاک خوں میں بہہ گئی قوم و وطن کی لاج
شعلہ جو اک جہان کو جلتا سکھا گیا — تاریکیوں میں آج وہ کیوں کر سما گیا
یہ کیا ہوا' یہ کیسی ہوا جگ میں چل گئی — سورج کو دوپہر میں سیاہی نگل گئی

غرض شعرائے جامعہ عثمانیہ نے قومی یکجہتی پر مختلف زاویوں سے اظہارِ خیال کیا۔ قومی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا۔ اپنے ہم وطنوں کو اس سلسلے میں کوششوں کے لیے آمادہ کیا۔ خوبیوں کو سامنے لایا اور اس کے ساتھ قومی یکجہتی کی راہ میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور سعی کی۔ اُن خطرات کی سمت عوام کی توجہ منعطف کی جو قومی یکجہتی کی مہم کو کمزور کرتے کے تھے۔ و نیز مخالف قومی یکجہتی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے اُن کے سدِ باب کے کردار ادا کیا۔ اُردو شاعری کے اوراق' اس کے شاہد ہیں۔

قومی یک جہتی کے فروغ میں اور بہت سوں کا حصہ ہے۔ کم یا زیادہ' یہ علیحدہ بات لیکن اپنے مخصوص سیاسی' معاشرتی' تعلیمی اور تہذیبی پس منظر کے باوجود شعرائے جامعہ عثما قومی یکجہتی کے استحکام اور فروغ میں جو گرانقدر حصہ ادا کیا ہے' وہ ناقابلِ فراموش رہے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ

اپنی بات

(صہ ۲ سے آگے) اُردو سے نابلد اور ناواقف نہ رہ سکے گی۔ وقت اور سیلاب انتظار نہیں کرتے۔ نہایت تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ اُردو بولنے' پڑھنے اور لکھنے سے واقف لوگوں کے لیے وقتاً فوقتاً سیمینار' کنونشن' کانفرنس اور مشاعرہ کا اہتمام و انعقاد بھی اہمیت رکھتا ہے' یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں والے اب بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۱ء میں منعقدہ پہلی اور دوسری آل انڈیا اردو مصنفین کانفرنس نے بھی اس حقیقت پر مہرِ ثبوت لگادی ہے کہ اُردو' ہندوستان میں رہنے' بسنے والے تمام قیمتی اثاثہ اور مشترکہ ورثہ ہے۔ اُردو کے مستقبل کو روشن دیکھنا ہو تو اُردو والوں پر یہ ذمہ داری عائد وہ آج ہی فکر کریں اور ہماری زبان کی بقا و ترقی اور توسیع و اشاعت کے منصوبوں اور تجاویز کو روبہ عمل

—— محمد منظور احمد

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

دو غزلیں

خزاں کی رُت میں نوید گلاب مت دیجے
ہماری جاگتی آنکھوں کو خواب مت دیجے
نفس نفس کو نہ یوں مبتلائے غم کیجے
نظر نظر کو فریبِ سراب مت دیجے
تمہارے وعدوں پہ جینے سے لوگ باز آئے
اب ان کو اور زیادہ عذاب مت دیجے
ہم اہلِ آرزو اس بات پر بھی راضی ہیں
سوال غور سے سنیئے جواب مت دیجے
ہم اپنے دل ہی جلا کر اُجالا کر لیں گے
اُدھار مانگے ہوئے آفتاب مت دیجے
حقیقتوں کی تہیں کھولتے ہیں آئینے!
بے آب چہرے کو غازے کی آب مت دیجے
جو نا سمجھ ہیں وہ کیا اس کی قدر پہچانیں
ہر اک کے ہاتھ میں دل کی کتاب مت دیجے
ہمارے صبر و تحمل کی داد تو دیجے!
خود اپنے جور و ستم کا حساب مت دیجے
نہیں ہے حشر سے کم زندگی اے منشا!
عذاب کے سوا کوئی خطاب مت دیجے

شریکِ سوز دروں جب سے ہو گئے الفاظ
نوائے درد میں شعلے پرو گئے الفاظ
سُنا کے داستاں انجانی وارداتوں کی!!
نجانے کتنوں کے دامن بھگو گئے الفاظ
کبھی کبھی تو کچھ ایسا بھی اتفاق ہوا
تڑپ کے جاگ اُٹھے ارماں تو سو گئے الفاظ
کسی کی چشمِ تغافل کا کیا گلہ کیجے!
ہجومِ شوق میں جب خود ہی کھو گئے الفاظ
ملی نہ جب انھیں ابلاغ کی توانائی
خود آپ اپنے مقدر کو رو گئے الفاظ
اُٹھے تو سارے زمانے کی بن گئے آواز
دبے تو آبرو اپنی ڈبو گئے الفاظ
خطیبِ شہر نے کی بات دوستی کی مگر
دِلوں میں تخمِ عداوت کے بو گئے الفاظ
غزل سرائی منشا یہ یوں ہوا محسوس
کہ جیسے روح کے اندر سمو گئے الفاظ

عابد پیشاوری

دوہے

جوہر اصل جواہری، بے جوہر سب سنگ — مٹی خربوزے بہم، دیکھ نہ پکڑیں رنگ

مذہب ملک زبان کے سارے رشتے جھوٹ — بس اِک آدم زادگی، رشتہ اصل اٹوٹ

چاہے کیسی دھاک ہو، چاہے کتنی ساکھ — نور سے روشن خاک ہے، نور نہیں تو راکھ

ایک نحوست کی گھڑی جس دم پر پھیلائے — آئندہ سب زندگی، سایوں سے بھر جائے

اعلیٰ فطرت، عالی ظرف رہیں سدا دل تنگ — دوں فطرت ذی مرتبت، یہ بھی اس کے رنگ

ان لوگوں کا دین کیا، کیا ان کا ایمان — ہونٹوں پر اللہ ہے اور دل میں شیطان

لاج شرم سب اس میں ہے اِسی میں تخت و تاج — ہو نہ کسی کا دہر میں، کوئی کبھی محتاج

ہاتھ پانو چلتے رہیں، بس حسبِ معمول ! — اک یہ دُعا قبول تو ہر اک دعا قبول

اوّل ہستی خواب ہے، پھر ہم خواب خراب — یہ بھی تماشا دیکھیے، خواب کے اندر خواب

صاحبِ افسر ہے کوئی، یا شاہِ بے تاج   اگر غور سے دیکھیے، سب کے سب محتاج

اُتر جائیں گی آندھیاں، ٹوٹ جائے گا زور   دو لمحے کی زندگی، لمحے بھر کا شور

موت سے سب مجبور ہیں، کیا طاقت کیا علم   موت نہ مانے سرکشی، موت نہ جانے حلم

تنگ نہیں داماں بھی، دل بھی نہیں ہے تنگ   یہ خالی محروم وہ، مولا تیرے رنگ

چشمے جھرنے پھول پھل، انساں پتھر سائے   ہم عاشق ہیں حُسن کے، حُسن جہاں مل جائے

کیا قومیں، افراد کیا، کیا اپنے کیا غیر   غرض بنائے دوستی، غرض مٹائے بیر

عابد صاحب زندگی آتی جاتی سانس   کون سانس کیا جانیے بن جائے کب پھانس

عابد اپنی لاش پر کرے نہ کوئی بین !   جب ہم سُن ہی نہ پائیں گے کیوں کوئی کھوئے نین

ہر دو میں سے آدمی ایک چلن اپنائے   تن کے وفا شعار سے، من کی کہی نہ جائے

شرح و بیاں سے ماورا، بے انداز بسیط   ارض و سما پناہ دل، دل کونین محیط

ڈوری جس کے ہاتھ میں، پُتلی اس کی میت   جو بنسی کو سانس دے، گائے اس کے گیت

مکر و ریا منافقت، گے خون میں رچ !   دلوں میں نفرت موج زن، لبوں پہ جھوٹا سچ !

انسانی انصاف ہے، انسانی قانون   امن و اماں کے نام پر، دہشت وحشت خون

ہے یہ اپنے دور کا، رحم، کرم، انصاف — اک مذہب کی آڑ میں لاکھوں خون معاف

ہے شرفا کی دہر میں، ایسے بود و باش — گدھوں کے گھیرے میں ہو، جیسے بے بس لاش

کون عزیز کیا اقربا، کون دوست کیا یار — رشتے بھی بیوپار ہیں، ناتے بھی بیوپار

ظاہر میں توقیع ہے، در پردہ تصدیع — جس کا دامن تنگ ہے، اُس پر کرم وسیع

غرض کی خاطر کیوں کوئی پوجے پیر، فقیر — بنے تو اس سے مانگیے، جو پیروں کا پیر

اتھل پتھل کر جائے سب دو پل کا طوفان — باطن کا عالم جہاں ہر لمحے گھمسان ؟

رحمت بے پایاں سہی، لیکن یہ تفریق! — ملے سمندر ظرف کو، قطرے کی توفیق!

ظاہر سب مسرور ہے باطن سب رنجور — تن سالم بے داغ ہے، من زخموں سے چور

جاہل تو بخشیدنی، لیکن جہل پرست!
جتنا اونچا مرتبہ، ذہنیت اتنی پست!

○

ڈاکٹر جیلانی بیگم

دکنی شاعری کی روایات

جس طرح زبان اُردو دہلی میں پیدا ہو کر گجرات پہنچی اور گجری کہلائی اسی طرح دکن پہنچ کر دکنی کہلائی دکنی قدیم اُردو کا وہ روپ ہے جس کی ادبی نشو و نما ابتدائی زمانے میں دکن اور گجرات میں چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے سترھویں صدی کے اواخر کے دوران میں ہوئی۔ یہ زبان بھی جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے اور اس کا آغاز بھی جدید ہند آریائی زبانوں پنجابی، سندھی، مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی، اُڑیا، بنگالی اور آسامی کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن نشو و نما کے اعتبار سے یہ ادو[ھ]ی کی معاصر ہے۔ دکنی کا سارا سرمایۂ الفاظ ہند آریائی ماخذوں پر مبنی ہے اور قواعد کا ڈھانچہ بھی ہند آریائی بولیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

علاء الدین کے حملۂ دیوگیر سے کچھ پہلے شمال کے مسلمان صوفی اس نواح میں آنے لگے تھے اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ حاجی رومیؒ ۱۱۹۰ء، سید شاہ مومنؒ ۱۲۰۰ء، بابا سید منتجب عالمؒ ۱۲۲۵ء، شاہ جلال الدین گنج رواںؒ ۱۲۴۴ء، سید احمد کبیر حیات قلندرؒ ۱۲۶۰ء، بابا شرف الدینؒ ۱۲۸۸ء، بابا شہاب الدینؒ ۱۲۹۱ء وہ چند برگزیدہ شخصیتیں ہیں جو سرزمین دکن پر تبلیغی و روحانی کام کر رہی تھیں۔ علاء الدین کی فتح دکن کے بعد روحانی پیشوائی کے اس سلسلے کو اور فروغ حاصل ہوا اور یہاں ہمیں پیر مقصودؒ ۱۳۰۰ء، پیر ہتاؒ ۱۳۰۳ء، شاہ منتجب الدین زرزری بخشؒ ۱۳۰۹ء، پیر مبارکؒ ۱۳۳۱ء، حضرت گیسو درازؒ کے والد سید یوسف شاہ راجو قتالؒ ۱۳۲۵ء، شاہ برہان الدین غریبؒ ۱۳۳۷ء علاوہ بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں تبلیغ دین میں مصروف نظر آتے ہیں ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے اظہار بیان کی مشکل حل ہو گئی، اردو زبان کی ابتدائی ترقی میں ان لوگوں کی گراں قدر خدمات ناقابل فراموش

ہیں۔

بارھویں صدی کے اواخر میں شمال سے فوجوں کی آمد کے ساتھ ہند۔آریائی کی ایک سے زیادہ بولیاں دکن پہنچی تھیں اس کا اندازہ ہم کو ادبی دکنی کے قواعد کے روپ اور خاص طور پر ضمیروں اور افعال کی شکلوں کے تنوع سے ہو جاتا ہے شمال سے دکن کا باضابطہ اور طبعی، تہذیبی اور لسانی الحاق اسی زمانے سے ہونے لگا۔ علاءالدین خلجی نے ۱۳۲۵ء میں دیوگیری پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے یہاں انتظامات کرنے کے لیے ہر حلقے میں ایک ترک سردار مقرر کیا، جو "امیر صدہ" کہلاتے تھے۔ ان امیروں نے یہاں رہائش اختیار کر کے اپنے لواحقین کو بھی بلا لیا۔ یہ امیر اور ان کے لواحقین جو مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے جب آپس میں ملتے تو اس مشترک زبان میں بات کرتے جو وہ شمال سے اپنے ساتھ لائے تھے، جس پر پنجابی، اودھی اور برج بولیوں کے اثرات تھے، مقامی باشندے بھی اپنی زبان کے الفاظ اس شمال کی زبان میں شامل کر کے اسی زبان کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ادا کرتے۔ اس صورتِ حال کے اعتبار سے مختلف بولیوں کی ملاوٹ سے جو نئی زبان بنی اسے دکنی کہا جانے لگا۔

دکن میں اس زبان کے جلد نشو و نما پانے اور ادبی بولی کی حیثیت اختیار کرنے کا ایک سبب یہ تھا کہ جنوبی ہند کے مختلف اللسان علاقوں میں شمال سے آنے والوں کے لیے اتحاد کا واحد سہارا یہی زبان تھی جب محمد تغلق کی سخت گیریوں سے برگشتہ ہو کر امیرانِ صدہ نے دہلی سے اپنا رشتہ توڑ لینے کا فیصلہ کر علم بغاوت بلند کیا اور دکن پر قبضہ کر لیا۔ گلبرگہ کو پایۂ تخت قرار دیا اور ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالی جو سلطنت بہمنیہ کہلائی۔ ان لوگوں نے شمال دشمنی کے جذبے کے تحت ان تمام عناصر کو ابھارا، جو شمال سے مختلف تھے اور جو دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے دل کھول کر مقامی روایات کی حوصلہ افزائی کی۔ دیسی رسوم و رواج، میلوں، ٹھیلوں اور تہواروں کو ترقی دی۔ باہمی ربط ضبط، میل جول اور معاشرت و تہذیب کو گہرا کرنے کے لیے اس زبان کی سرپرستی کی جو رنگا رنگ زبانوں کی اس سرزمین میں بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی اور جسے آج ہم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عمل سے جنوب نے شمال کے خلاف ایک تہذیبی دیوارِ مدافعت کھڑی کر دی اور برعظیم کے یہ دونوں حصے ایک طویل عرصے کے لیے ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۴۷ء سے لے کر تقریباً تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہ زبان جو شمالی ہند سے آئی تھی سرزمین دکن کے لسانی و تہذیبی اثرات قبول کرتی ہوئی آزادانہ طور پر نشو و نما پاتی رہی۔ لسانی ارتقا کے لحاظ سے شمالی ہند کی زبان اور دکنی کے درمیان تین سو برس کا فصل ہو گیا یہ آگے ہی بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اس نے ادبی زبان کا درجہ حاصل

لیا اور وہ اپنی جگہ رُکی رہی اور بول چال کی زبان کی سطح سے اونچی نہ اُٹھ سکی۔ جنوبی ہند کی علاقہ واری
نوں کے اثرات سے دکنی کی نشو ونما میں بڑی مدد ملی۔

شاعروں کی دلچسپی، صوفیائے کرام کی تبلیغ دین اور بادشاہانِ وقت کی سرپرستی سے یہ ایک
رمایہ دار زبان بن گئی، سیاسی، معاشرتی و تہذیبی سطح پر اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی جو کہ ان صفحات میں
نے بیان کی ہے تو قدیم اُردو کا دکن میں پھیلنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

دکنی محض اُردو کی ابتدا نہیں بلکہ ایک علیحدہ سمت میں اس کی انتہا رہے۔ یہ وہ اُردو ہے جو
ی کی اُردو سے زیادہ ہندوستانی اور مقامی رنگ کی حامل ہے۔ اس کے بعض لفظ اور بہت سی نحوی
کیبیں مرہٹی ہیں اور اس کی سُریلی تان تلنگی سے مستعار ہے۔ اینگلو سکسن کے برخلاف دکنی ایک متروک
ن نہیں ہے بلکہ آج بھی مختص اور تازہ ہے۔ دکنی کی بول چال کی روایت تو مسلسل ہے اس کی ادبی روایت بھی
ی نہیں ہے۔ دکنی ادب کے تعلق سے اقبال کہتے ہیں کہ " اُردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصّہ نسبتاً
نمایاں نظر آتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی اور اساسی ہے اس کے
وہ بھی دکنی ادبیات کو مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہے۔

قدیم دور کا ادب اسی لیے آج کل کی زبان سے مختلف ہے کہ یہ عبوری دور کا ادب ہے اُردو ادب
کے ابتدائی زمانے کے دو دور ہیں، ایک مذہبی دور جو ۱۳۵۰ء سے ۱۵۹۰ء تک ہے، دوسرا
ی دور ہے جو ۱۵۹۰ء سے ۱۷۲۷ء تک ہے۔ اس دور میں اُردو ادب عملاً دکن تک محدود تھا
ر شمالی ہندوستان کے اہل قلم فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے تھے۔ دکنی شعر و ادب کا زمانہ بہمنی
د کے آغاز یعنی ۱۴۰۰ء سے لے کر عالمگیر کی فتح دکن یعنی ۱۷۰۰ء تک تقریباً چار صدیوں پر پھیلا ہوا
ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے دکنی شاعری کے اولین نمونے ملنے شروع ہوتے ہیں اور اٹھارویں
صدی کے وسط تک دکنی کے سرمایہ میں بلند پایہ شعرا کے کلام سے اضافہ ہوتا رہا۔ سترھویں صدی دکنی
شاعری کا سنہرا دور ہے جس نے محمد قلی، وجہی، غواصی، نصرتی اور ہاشمی جیسے شاعر اُردو کو دیے،
ریزی ادب کی معاصر تاریخ میں یہ شیکسپیئر کا اور ڈرائیڈن کا عہد ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں دکنی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں اُنھیں صوفی شعرا کی
ثنویوں کے علاوہ " کدم راؤ پدم راؤ " اور اشرف کی مثنوی " نو سرہار " قابلِ ذکر ہیں۔ شاعری کے
ن نمونوں کو اُردو زبان کی تاریخ میں لسانی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے اور ادبی حیثیت سے ان کی
ندان اہمیت نہیں ہے لیکن سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے دکنی ایک بولی کی حیثیت سے گزر کر

مستقل ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکا تھا اور شاعری کے ایسے کارنامے اس عہد میں تخلیق ہوئے جن پر اُردو زبان آج بھی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے مگر اُردو کے عام قاری کی زبان کی قدامت ان ادبی شہپاروں کی تحسین کی راہ میں حائل ہے۔

قدیم دکنی شاعری پر ہندوستانی شاعری کی روایت کا اثر غالب ہے۔ دکنی کے شعرا نے فارسی شعر و ادب سے بھی استفادہ کیا ہے شاعری کی ساری اصناف غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی وغیرہ فارسی سے مستعار ہیں۔ فارسی کی بحریں بے کم وکاست دکنی میں قبول کر لی گئیں۔ دکنی کی متعدد مثنویاں فارسی کی مثنویوں کے خاکوں پر مبنی ہیں لیکن جہاں تک شاعری کی روح اور اس کے مولوی پیشکش کا تعلق ہے، دکنی کے قدیم شعرا بڑے صحت مند ادبی مذاق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنی شعری تخلیقات میں وہ فارسی کی کورانہ تقلید کو کبھی روا نہیں رکھتے۔ ان کے تخلیقی رویّے میں بڑی خود اعتمادی اور آزادروی کی شان نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری میں محبوب کے لیے ہمیشہ مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا رہا ہے جو امرد پرستی کی روایت کا اثر ہے برخلاف اس کے دکنی شعرا نے اس غیر حقیقی رجحان سے انحراف کیا اور برج کی رسم کے مطابق معشوق کے لیے مونث کا صیغہ استعمال کیا۔ دکنی شاعری میں مرد کی مخاطبت صنفِ نازک سے ہوتی ہے یا پھر قدیم ہندوستانی روایت کے مطابق عورت کی طرف سے اظہار ہو تو مخاطب مرد ہوتا ہے۔ دکنی شاعری کے اولین نمونوں سے لے کر ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں ہر جگہ محبوب کی صورت میں ایک ہندوستانی عورت کا تصوّر ملتا ہے جس کے حسن و جمال اور آرائش کے تفصیلی مرقعے ہر شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً:

توں سولہ سنگھار کوں جب ہیں آئے　　تجھے دیکھ کر عیشاں پائے آنند

محمد قلی نے بھی اپنی غزلوں میں ان حسیناؤں کے نام گنائے ہیں جو اس کے محل کی زینت تھیں، ان غزلوں میں محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کے عشوہ و جمال کی دل کھول کر داد دی ہے:

سکیاں منالیا اُو پیاری کوں آج　　کہ سب جھنو بھریاں کا اہے سیس تاج

یہ اشعار اس دور کی دکنی معاشرت، رہن سہن، لباس، زیورات اور تہذیب کی بھی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں:

ہندی شاعری کے اثر سے دکنی غزلوں میں کہیں کہیں مرد مخاطب ہوتا ہے اور جذبات کا اظہار عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔ جیسے:

جس یار کوں منگتی ہوں میں وو یار کہاں ہے　　سرسوں سکی چل جاتی وو سے ٹھار کہاں ہے

دکنی شاعری میں عورت کے جذبات کی ترجمانی کے علاوہ اس کی نفسیات اور اس کی فطرت کے ورکا احساس بھی شامل ہے مثلاً:

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانا کر کو موتیاں کا پروی ہار بیٹھوں گی

دکنی شاعری میں محبوب کا جو تصور ملتا ہے وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد حیثیت حامل ہے وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا مادی اور مجازی محبوب ہے، روایتی محبوب یا محض یل کی پرچھائیں نہیں۔ یہ محبوب اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور آرائش کے ساتھ اپنا اصلی جنس میں نمودار ہوتا ہے۔ جیسے :

مری سانولی من کی پیاری دِسے   کہ رنگ روپ میں کنول ناری دِسے

دکنی شاعری کی ایک بنیادی اور منفرد خصوصیت حقیقت نگاری ہے، آج کے دور میں اس خصوصیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ دکنی شاعری کا ایک اور نمایاں وصف اظہار بیان کی سادگی ہے جس کو ہم ایک جاندار صحت مند روایت کہہ سکتے ہیں۔ دکنی شعرا اپنے مشاہدات، تاثرات، ر جذبات کو بے جا تکلف اور تصنع کے بغیر راست، سادہ اور فطری لیکن پُرزور اور موثر اسلوب پیش کرتے ہیں۔ پُر تکلف اسلوب سے گریز اور فطرتِ انسانی کے جذبات کا موثر اظہار ہر بان کے ابتدائی دور کے فن کاروں کا ایک نمایاں وصف رہا ہے۔ انگریزی میں چاسر اور شیکسپیر بھی انہی خصوصیات کے لیے ممتاز ہیں۔ دکنی شعرا نے اپنے کلام میں اپنے ذاتی تجربات عشق کو بلا تکلف پیش کیا ہے جس کی وجہ سے اس میں حقیقت پسندی کا رجحان واضح طور پر ملتا ہے مثلاً محمد قلی نے اپنے تجرباتِ عشق کو من و عن اپنی شاعری میں پیش کیا ہے:

پیاری اور پیا ہت میں سوہت سے   سرو بن میں گلا میں گل پھول مالا

حقیقت نگاری کے رجحان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قدیم دکنی کے فن کار اپنی شاعری کا مواد اطراف و اکناف کی زندگی، مقامی ماحول اور مقامی روایات سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ سارا مواد جو ان کے جمالیاتی تجزیہ کا جزو ہے ان کی تخلیقات میں بڑی دیانت داری کے ساتھ منعکس ہوتا ہے دکنی شاعری میں کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے اور پپیہے کی پکار بھی۔ بادل کی گرج کے ساتھ مینڈک کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کہیں شاعر اپنی سکھیوں کے ساتھ بسنت کھیلتا نظر آتا ہے، کہیں دیوالی کے دیئے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً :

گرج بادل تھے داد رگیت گاوے کوئل کوکے سو پھل بن کے خیالا
بسنت کھیلیں عشق کا آپیارا تمہیں ہیں چاند میں ہوں جیوں ستارا

دکنی شاعری میں اخلاقی عناصر بھی موجود ہیں۔ دکنی شاعری میں غزل کی بھرمار نہیں ہے بلکہ یہاں ابتدا ہی سے مثنوی کا رواج زیادہ رہا ہے، بعد میں غزل اور دوسری اصناف کا رواج ہوتا گیا۔ دکنی مثنویوں کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں ہندو دیو مالا کے اثرات سے ماورائی اور غیر حقیقی فضا پیدا ہوگئی ہے، دوسری طرف یہ مثنویاں معاشرے کے لیے اجتماعی زندگی کی تفریح کا بہترین مشغلہ تھیں اسی وجہ سے ان میں عوامی مذاق سے قربت اور ان کے احساسات اور طرزِ فکر کی ترجمانی موجود ہے۔ دکنی شعرا کے کلام میں موسیقیت کا حسن بھی موجود ہے۔ ان کے اظہار میں بیساختگی، سادگی، روانی اور سلاست ہے جس کی وجہ سے کلام میں شیرینی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ دکنی شاعری رجائیت کی علمبردار ہے چوں کہ دکنی شعرا کو خوشحالی، امن وامان اور ذہنی سکون حاصل تھا اس لیے ان کی نظر ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر پڑتی تھی۔ دکنی شاعری میں خوبصورت استعارے، حسین تشبیہات، صنائع بدائع وغیرہ کی بہترین مثالیں ملتی ہیں مثلاً :

نین ہیں دو پیاری کے جیسے مولے
بھنواں کی ترازو میں بھوچند تولے

شعرائے دکن نہ صرف زبان کی انفرادیت بلکہ خیالات کے امتیازات کے باعث اس اعزاز کے مستحق ہیں کہ ان کو ایک الگ دبستانِ شاعری قرار دیا جائے بلاشبہ ہم کو ان کے یہاں اس دور کی تہذیب، آداب معاشرت، اشخاص، سلاطین، مشائخین، علما، معاشرتی و سماجی رجحانات اور سیاسی اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس نے دورِ جدید میں بہت سے مفکرین کو اس عظیم ذخیرۂ شاعری کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ دکن کی شاعری کو ہم اردو کا قدیم دبستانِ شاعری کہہ سکتے ہیں جس سے ہم کو اس زبان کے تدریجی ارتقا کا صحیح پتہ چلتا ہے ساتھ ہی ان رجحانات اور روایات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے جن سے ہم شمال اور جنوب کے دبستانِ شاعری میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

غزلیں

مجیب تابگڈھی

گفتہ حالت پر تسلی دینے آیا تھا
انساں اندر اندر سے جو خود ٹوٹا تھا بکھرا تھا
یت ناک لمحوں میں جو اکثر یاد آیا تھا
ے قرب کا لمحہ شریکِ درد میرا تھا
ں تھا بستر پہ لیکن ذہن دفتر میں بھٹکتا تھا
روں مسکے میں فائلوں میں چھوڑ آیا تھا
چہ اس کی دہشت شہر پر ہر سمت طاری تھی
س شخص کے ہاتھوں میں اک ٹوٹا کھلونا تھا
ے دنیا کی وسعت کی بھلا کیسے خبر ہوتی
وہ اب تک حصارِ ذات سے باہر نہ آیا تھا
ں تھا توانائی کا عنصر اس کے لہجے میں!
دھوکا ہے نگاہوں کا کہ وہ بیمار لگتا تھا

میرے بھوس کے چھپر پہ طعنہ زن تھا اے مہدی
دانشور تو خود بھی ریت کے ٹیلے پہ بیٹھا تھا

اقبال ہاشمی

جو اپنے لوگ تھے لگتے ہیں سب پرائے مجھے
مقابلے کو بلاتے ہیں میرے سائے مجھے

مرے وجود کو دیتی ہے اپنی رائے مجھے
میں خود سے روٹھا ہوں کیسے کوئی منائے مجھے
نجانے کون سے دیمک زدہ صحیفے پر
وہ گرد پوش کی مانند ہی چڑھائے مجھے
میں اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا ہوں کہیں
کسے پڑی ہے جو صحرا سے ڈھونڈ لائے مجھے
میں ایک برگ ہوں اور زیرِ سنگ رہتا ہوں
ہوا میں زور اگر ہے تو پھر اڑائے مجھے

میں آفتاب کی مانند جل رہا ہوں مگر
اب ہاشمی کسے حاجت ہے جو بجھائے مجھے

یوسف اعظمی

قید

میں ایک چیخ ہوں، رنگوں میں جو مقید ہے
میں ایک شہر ہوں، سناٹا اوڑھ کر چپ ہوں
میں ایک زخم ہوں، خوشبو کا رنگ پہنے ہوئے
میں ایک گونج ہوں، ذہنوں میں جو سلگتی ہے

پتہ نہیں میری چیخوں کو کون سمجھے گا
میں ایک گونگے کی مانند ہوں نگا ہوں میں
میرے وجود میں چیخوں کا اک سمندر ہے
زمانہ جس کو سمجھتا نہیں اشاروں میں
اُلجھ گئی ہے مری آگہی سرابوں میں
حیات رینگتی دیکھی فقط کتابوں میں

پتہ نہیں کہ مری چیخ کب خبر بن کر
حصار توڑ کے نکلے گی روشنی کی طرح
مجھے بہاؤ ملے گا جواں ندی کی طرح
ابھی حیات تو مٹی کا اک کھلونا ہے
بہانہ اوڑھ کے جیتا ہوا نمونہ ہے

میں منتظر ہوں میری چیخ جب نظر بن کر
ہر ایک گھر میں بکھرنے لگے خبر کی طرح
اس انتظار کی ساعت گراں سہی لیکن
اس انتظار میں جینا ہے عمر بھر کے لیے
میری صدائیں ہیں ٹھہری ہوئی سفر کے لیے

شاہدہ احمد

سوغات

زمان میاں کا اضافہ بھی خاندان میں خوب ہوا۔ اچھے خاصے آبنوس کا کندہ تھے مگر دل اتنا ہی
نے کے پانی سے دھویا آٹے کی لوئی جیسا نرم گدگدا۔ روز ایک نیا شوشہ بغل میں دبائے آموجود ہوتے
ں تو درگذر کر جاتیں لیکن بھابی جان کے ناک بھوں دیکھنے والے ہوتے۔ گورے چٹے بگلا جیسے
رانے میں واقعی زمان میاں کا اضافہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی اور یہ سارا کیا دھرا فریدہ کا تھا۔
! جانے گنوار و پنجابی لڑکے کی کیا چیز بھائی کہ بھابی جان کے رکھ رکھاؤ والے بھائی کی نسبت پر ٹھوکر
ہ زمان سے بیاہ رچا کر بیٹھ گئی۔ جس کی سیدھی بات بھی گھر والوں کے سر پر اینٹ کے ادّھے کی طرح
۔ اچھا ایم اے پاس کرنے چلی تھی کہ کالا کوا ساتھ لگا لائی۔

"ارے کوئی جوڑ ہوتا ہے، کوئی تک ہوتا ہے" بھابی جان اپنی خوبصورت ناک سکوڑ کے تیز چلاّتیں۔

"اللہ بخشے ابا مرحوم کہا کرتے تھے، خدا چمار ساجھے چمار کی سی شکل نہ بنائے"

اوپر سے زمان میاں کی خدا ترسی روز کوئی نہ کوئی نیا گل کھلائے رکھتی، آج کسی بیوہ کا شنا ہے
، کسی یتیم کا بکھیڑا ــــــــــ اور جب بات کھلتی کہ بیوہ اچھے خاصے پہنتے کھاتے خصم کی مالک اور
یم دو دو ماؤں اور ایک باپ کی وراثت رکھے بیٹھا تو سب دانت پیس پیس کر زمان پر چڑھ جاتا
رتے ان ہی سب بک بک سے تنگ آ کر فریدہ انھیں لندن گھسیٹ لے گئی جہاں پہنچ کر کم از کم
اؤں اور یتیموں سے جان چھوٹی۔

مگر جیسے ہی چار سال بعد چھٹی پہ وطن پہنچے ایک نیا چاہنے والا مل گیا۔

"سُن اوئے میاں، اچھی طرح سبق یاد کر لے۔ ماں پیو تیرے بھوکے مر رہے ہیں اور جوان بہن

بغیر دوپٹے کے بیٹھی ہے آگے جو تیری مرضی آسے بولتا جانا مگر اتنا سمجھ لے اصل بات تیرے منہ پر نہ آئے کہیں بتانے بیٹھ جا سب کے آگے کہ جی بیگار کیمپ سے بھاگا ہوا ہوں۔ مٹھے باندھ لے میری بات اچھی طرح ورنہ تجھے ہی بھگتنا پڑے گی۔"

یوں پڑھا لکھا کے وہ اُسے بغل میں دابے گھر میں داخل ہوئے، میلا چرکٹ، جگہ جگہ سے پھٹا کُرتہ، اُدھڑی ہوئی ایڑیاں، آنکھوں کے گرد بڑے بڑے سیاہ حلقے، جلی جلی رنگت، جیسے بارہ برس کے بچے کا حلیہ نہ ہو کسی کہن سال مُردے کا ڈھانچہ ہو۔

سب سے پہلے تو اماں کے سامنے اُسے انٹرویو دینا پڑا۔ انہوں نے بمشکل اپنی تسلی کر کے مارجن پر تینتیس نمبر دے کے پاس کیا۔ اس کے بعد بھابی جان کی عدالت میں حاضری ضروری سمجھی گئی۔ عین اُس وقت جبکہ وہ بھی جان سے تہیہ کیے بیٹھی تھیں کہ چھٹتے ہی بڑے سے اندیشے کے ساتھ فیل کر کے اُسے چلتا کریں۔ پپّو روتا دھوتا اُن کا دوپٹہ کھینچنے لگا۔

"بھوک لگی ہے ماما" اس نے پیٹ نکال کے بجانا شروع کر دیا، معلوم نہیں اس کے ننگے پیٹ پر ہاتھ مار مار کے رونے کا کوئی خاموش [illegible] ہوا یا بچے کی اتھل پتھل میں انہوں نے گڑبڑا کے اُسے تینتیس نمبر دے ڈالے۔ اس طرح مارے باندھے اُسے سر چھپانے کا تو آسرا مل گیا لیکن اس کی ذات سے چھٹے شکوک بدستور قائم رہے۔

"پائیو! ذرا دھیان رکھا کرو۔ سارا گھر اندر باہر کھلا رہتا ہے زمانہ [illegible] کا کیا لے کر چمپت ہو گیا کوئی قیمتی سامان تو کسے نکال کے دکھاویں گے [illegible] سا باوا کا مال ہے جو جی چاہے دیکھے گا" بھابی جان آتے جاتے چھوٹی نند کو تاکید کرنا نہ بھولتیں۔

"اماں! مجھے تو ڈر لگتا ہے اس کلموہے سے۔ کبھی غور کیا آپ نے کام کرتے کرتے کیسے ایک ہی طرف ٹکر ٹکر تکنا شروع کر دیتا ہے، پلک تک نہیں جھپکتی کم بخت کی۔ آوازیں دیے جاؤ منحوس کو خبر نہیں کہاں غارت رہتا ہے۔" پائیو نے اماں کے گھٹنوں میں گھستے سرگوشی کی۔

"آپ ہی تو کہتی ہیں کہ جن کی پتلیاں نہیں پھرتیں وہ ہم میں سے نہیں ہوتے، اس کلموہے کی پتلیاں کبھی تو لگتا ہے پھرتی ہیں اور کبھی لگتا ہے بس ایک ہی جگہ جمی ہیں، جیسے سریش لگا ہو یا گوند، سمجھ نہیں آتی یہ ہم میں سے ہے یا ہم سے باہر کا۔"

"ہوش تو ٹھکانے ہیں بچی؟" اماں نے حمائل شریف پڑھتے پڑھتے چونک کے پائیو کو ظرف دیکھا، مارے ہول کے ان کا جی اُلٹنے لگا۔

"ارے اِدھر تو آنا سوغات!" انہوں نے کانپتی کانپتی آواز میں کیاریوں میں پانی ڈالتے سوغات کو پکارا۔ اُسے یہ نام اماں نے زمان میاں پر احسان دھرتے یہ کہہ کے دیا تھا کہ: "بھیا دکھ لی ہم نے تمہاری لائی سوغات۔"

خبر نہیں کیسا کال آپڑا ہے نوکروں چھوکروں کا کہ آنکھ میں لگانے کو نہیں ملتے، پہلے تو اماں، باوا خود گھروالوں کے ہاتھ میں سونپ کے جاتے تھے، چھوکرے، چھوکریاں، اب یا تو ملیں گے نہیں یا پھر خود ہی اٹھلو چولھے کی طرح آن کھڑے ہوں گے، بڑے بزرگوں کا کوئی پتہ ٹھکانہ ہی نہیں ملتا۔

اب کسی وقت وہ کلموہے کے نام سے پکارا جاتا، کبھی ہولو، تو کبھی سوغات۔ اُس کا اپنا کیا نام تھا اُسے خود نہیں معلوم تھا، جس نے جس نام سے پکارا اُسی پہ پلٹ کے دیکھ لیا۔ امّاں نے آواز دی تو پانی کا برتن ایک طرف رکھ کے ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ حائل شریف ایک طرف رکھ کے انہوں نے ڈری ڈری نظروں سے اس کی پتلیوں میں جھانکا۔ ایسے میں انھیں لگا ابھی وہ اپنی انگشتِ شہادت اُٹھا کے ان کی طرف کرے گا اور اس کی انگلی بڑھتے بڑھتے تھک سے ان کی ناک پہ آ لگے گی تو وہ دانت نکال کے ہنستا ہوا پلک جھپکنے میں غائب ہو جائے گا۔

دہشت سے وہ پسینے پسینے ہو گئیں اور سوغات کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے بے وجہ بلائے جانے پر معصومیت سے آنکھیں جھپک جھپک کے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔

"جاوئے بچے کچھ نہیں جا کر اپنا کام کر۔" انہوں نے کس کے دو ہتڑ پائیو کی پیٹھ پہ جما دیا۔

"کم بخت لے کے جان نکال لی تو نے میری، پھا خاصہ ہم میں ہی سے تو ہے۔"

اس خوف کے دل سے نکلتے ہی کہ وہ ہم ہی میں سے ہے، ہم سے باہر کا نہیں، پائیو نے پوری چوکسی سے بھابی جان کی ہدایت کے مطابق اس پر نظر رکھنی شروع کر دی۔

"لے کلموہے ذرا یہ گنترے اور کلوٹ کھنگال کے الگنی پہ ڈال دے۔" بھابی جان نے گو موت میں بسے گنتروں کا ڈھیر اس کے سامنے انبار کیا تو وہ جو پورے گھر کے فرش پہ پوچا لگانے کے بعد اپنے سخت کھردرے ہاتھوں کو کسی بڑے فلسفی یا مفکّر کی طرح غور سے دیکھ رہا تھا، چپ چاپ گنترے اُٹھا کے نل کے نیچے لے آیا۔

گنتروں میں بسی گندگی کی طرف تکتے تکتے خبر نہیں اسے کیا ہوا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ صحرا کی بہت سی تپتی ہوئی ریت اُس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ چیتھڑوں میں لپٹے بے گنتی بے شمار ننھے ننھے کیڑوں جیسے وجود اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کھڑے ہو گئے۔ کسی کے سر بڑا اُس کے جسم سے بڑی

شکاری لاری تھی، کسی کے خراش زدہ ہاتھوں میں کدالیں کانپ رہی تھیں اور کیٹوں کی ننگی پیٹھوں پر تجریدی کے نمونے نقش تھے۔ نیلی نیلی آڑی ترچھی بدھیاں جن کے بیچ سرخ سرخ جیتا جاگتا لہو۔ وہ پڑھا لکھا ہوتا تو ان نمونوں کو آرٹ گیلری میں سجا کے دنیا میں تہلکا مچا دیتا۔ لوگ پکاسو کو بھول جاتے۔ لوگ چغتائی فراموش کر دیتے۔

"ارے منحوس تو یہاں بیٹھا جھک مار رہا ہے؟ میں تجھے سارے گھر میں جھانکتی پھری کیسے تو ہاتھوں سے پوچا لگایا ہے، یہ بڑے بڑے دھبے چمک رہے ہیں سارے فرش پر۔" پایو کی تقریر پر سے گزرتی اماں نے بھی جملہ اچھالا۔

"ہاں روٹیاں ٹھونسنے میں تو بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ دے کام کے لیے ہاتھ چلاتے ضعف پڑتا ہے۔" روٹیوں کے نام پر اس بھوکے ندیدے کے پیٹ میں پچ پچ گھڑ بڑ ہونے لگی۔ بھرے پیٹ، خبر نہیں کیوں اسے لگتا صدیاں گزریں، جب اس نے سیر ہو کے کھانا کھایا تھا۔ کب؟ یہ یاد نہیں۔

نہا دھو کر پایو نے سفید جمپر، شلوار پر نیلا دوپٹہ اوڑھا اور سر پہ تولیہ لپیٹے غسل خانے سے باہر سبزی بناتی اماں کو جانے کیا ہوا کہ یک ٹک سفید جمپر شلوار پر پھیلے نیلے دوپٹے کو تکے چلی گئیں۔ سفید ملائی جیسی پشت پر یہ بڑا پوری پیٹھ پر پھیلا نیلا لپھا۔

بھیچوں، بھیچوں کی آواز پہ پایو گھبرا کے پلٹی تو اماں پوری جان سے غافل ہو چکی تھیں، ان کی دہاںچھوں سے جھین نکل رہا تھا اور کٹی ہوئی سبزی آدھی سینی میں تو آدھی ان کے اوپر تھی۔

"ارے منحوس کھڑا تماشہ کیا دیکھ رہا ہے بھاگ کے ٹھنڈے پانی کا گلاس لا۔" بھابی جان اس کی خبطای صورت کو قہر کی نگاہ سے گھورتے ہوئے حکم چلایا اور ایک منٹ انتظار کیے بغیر وہ دوسری طرف پلٹیں۔

"اے بھیا دیکھنا تو کہاں غارت ہو گیا یہ ڈوبا۔"

اسی روز زمان میاں فریدہ سمیت اپنے چک سے واپس آئے تو سوغات نے ڈرڈر کے انہیں اماں کی حالت بتائی۔

"میاں جی! نمبر پانچ کو بھی ایک مرتبہ کیمپ میں اس طرح خبر نہیں کیا ہوا تھا، موٹے سردار نے پہلے اپنے چابک سے اسے خبردار کرنا چاہا پھر جی پتہ نہیں کیا ہوا تھا اس روز نمبر پانچ کو کہ سردار کے سے یہ بھی اچھل اچھل کر بھیچوں، بھیچوں کرتا رہا تو سردار نے اس کی گردن مروڑ دی تب وہ ٹھیک ہو گیا۔"

"کیا؟" زمان میاں ہونق رہ گئے۔

"ہاں جی پھر وہ ٹھیک ہو گیا" اس کی ہیچوں ہیچوں بند ہو گئی اور سردار نے ہم سب سے کہا "اوے اُلو دے پٹھیو چل کے اپنے پیو کی قبر بناؤ"۔ اور ہم سب نے مل کر اُسے دبا دیا جی' میری بڑی یاری تھی اُس کے بغیر میرا جی نہیں لگتا تھا اس کر کے میں بھاگ نکلا وہاں سے"۔ زمان میاں نے منہ پھیر کے سر پر ہاتھ رکھا تو ان کا کالا بھدا بھاری ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"لے چل میاں ذرا لگا تو جوتوں پہ رگڑ کے گھِسا۔ ایک دم فرسٹ کلاس پالش ہو"۔ صمد نے جوتوں جوڑی اس کے آگے ڈالی تو زمان میاں ملامتی نظروں سے اُن کے مضبوط ہاتھوں کو دیکھ کے رہ گئے۔

"فریدہ کیا ہم اس بچے کو اپنے گھر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے"۔ انہوں نے جیسے خود سے الجھ کے سرگوشی کی۔

"ارے کیا دماغ پھرا ہے وہاں پہ کوئی نہیں ملتا تو یہاں سے بٹور کے لے جاؤ گے یتیموں' غریبوں سب ؟ ارے اتنے جوتے لگائے گی وہاں کی حکومت کہ ایک بال سر پر نہ رہے گا" زمان میاں ان کے سب پر چپ چاپ اُٹھ کے کمرے میں چلے گئے۔

ہتھیلیاں کرلیں

یونہی کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹے تھے کہ گہری نیند سو گئے۔ گھنٹوں بعد تو شام جھک تھی ہر طرف دھندلے' مٹیالے اندھیرے اُتر رہے تھے۔ ایک دم وہ ڈر سے گئے نیم اندھیرے کمرے سوغات ان کے قریب بیٹھا گتے کے ٹکڑے سے آہستہ آہستہ پنکھا کرتے انھیں ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ چک نمبر ۱۵۱ کے چودھری محمد زماں نہیں آغا شریف ہوں' مقدس' متبرک' ہیں جی باجی ! ایک اور بات دستوں آپ کو وہ جو موٹا سردار تھا نا ہر چوتھے دن پہ کسی ایک نمبر کا کھانا بند دیتا' کہتا تھا کہ تم سارے کے سارے کھا کھا کے مشٹنڈے ہو رہے ہو' جب بھی میرا کھانا بند ہونے کی آتی' نمبر پانچ اپنے حصے کی آدھی روٹی میرے لئے چھپا کے رکھ لیتا۔ زمان میاں نے دوبارہ آنکھیں بند لیں' بھوک سے بلکتی نحیف اور بے بس آوازیں ان کے اندر باہر اُدھم مچانے لگیں۔

پہلے تو کبھی خیال نہیں آیا مگر اب خبر نہیں کیا گیا ہے' مجھے روٹی کھانے بیٹھتا ہوں تو سوچ سی آجاتی ہے۔ نمبر پانچ میرے لیے اپنے حصے کی آدھی روٹی بچا کے لاتا تھا مگر میں نے کبھی ایک بُرکی بھی اس کے لیے نہیں رکھی۔ کیا میرا پیٹ دنیا میں سب سے بڑا ہے ؟ مجھے سب سے زیادہ بھوک کیوں لگتی ہے۔

بھوکے پیٹ کی اینٹھن نہ کسی کو فلسفی بننے دیتی ہے نہ مفکر' تیری سمجھ میں نہیں آئے گی یہ بات یوں اب تیری سوچوں میں زندگی تھرتھرانے لگی ہے۔ اُسے جواب دینے کے بجائے زمان میاں صرف پچک کے رہ گیے۔

بھائی جان فرج سے نکالی ٹھنڈی ٹھنڈی سرد سی قاشیں کاٹ کے پھر کا دُلار بگھارتی زبردستی

بھلا جتلانے کے بگھار ہی تھیں کہ اچانک اُسے کونے میں کھڑا ٹِلّو کوّے کی طرح سموسے کی قاشوں پہ نگاہ جمائے دیکھ کے اُن کے پتنگے لگ گئے۔

"ارے موت آئے تجھے جنم جلے! کیسی ہونساں نظروں سے گھور رہا ہے" انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی گھما کے چپل پھینکی جو سیدھی سڑاک سے اس کی ناک پہ جا کے پڑی۔

"اے ہے دے دیتیں دو قتلے اسے بھی بچہ ہی تو ہے" پتلی سی سرخ دھار اس کی ناک سے بہتے دیکھ کر اماں کو ترس آگیا۔

"قسم سے آپ کو پتو کی اماں جان جو دیا ہوگا اسے ذرا سا بھی چکھنے کو! ارے ایسے گھور گھور کے دیکھ رہا تھا حرامزدہ اب خبر نہیں میرے بچے کو ہضم بھی ہوتا ہے یا نہیں" بھابی جان طنطنا کے چلائیں۔

"لے اللہ مارے گنڈیریاں چوس لیجیو اس کی" بہو کی چیخ پکار پہ اماں نے چپکے سے چوتی اس کی ہتھیلی پہ دھر دی کہ کہیں پٹ پٹا کے بھاگ ہی نہ جائے۔ مگر وہ بھی پر پیچ پورا اللہ مارا ہی تھا۔ چار آنے کی گنڈیریاں چوس ڈالنے پر بھی نیت فریج میں رکھی سموسے کی قاشوں ہی میں لگی رہی۔ موقع پاتے ہی اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کے چپکے سے فریج کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ پانچو نے عین وقت پہ چوکس سپاہی کی طرح چھاپہ مارا۔۔۔

"کمینے، چوٹے" اس نے ایسے جھٹکے سے سوغات کو پلٹایا کہ اس کی مسکی مسکائی پرانی قمیص چر چرا کے پھٹ گئی۔ پھوڑے کی پوری داہن تک، تب خدا جانے کیا ہوا یا ٹِلّو کی آنکھیں غبارے کی طرح پھیل گئیں اور اس پر دورہ سا پڑ گیا جس پہ گھر میں صرف اماں کی اجارہ داری تھی، سفید سفید جھاگ اڑاتی وہ باؤلوں کی طرح چیخنے لگی،

"اماں، اماں۔ لیما نیلا لیما پوری پیٹھ پہ لیما۔"

"کہاں، کدھر، کس کے؟"

سارے کے سارے اپنی جگہ سے ہل گئے اور وہ بوکھلا کر سراسیمگی کی حالت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھوں کی طرح، پاگلوں کی طرح اُنہی ریت کے صحراؤں کی طرف، اُنہی سوکھی سڑی جھاڑیوں میں سرسراتے سانپوں کی طرف جہاں سے نکل کے ایک روز وہ انسانوں کی بستی کی طرف بھاگا تھا۔ بڑے بوڑھے بہائیوں نے اس کے چھوٹے سے وجود کو دوبارہ نکال لیا اور سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ زبان کی نوک کاٹ کے اس کے جسم پر زخموں کی پھلواری کاشت کر ڈالی اور وہیں گھسیٹ لے گئے جہاں سے وہ نصیب کا ایک لمحہ چرا کے بھاگا تھا۔

اماں کے صدمے سے خطرناک حد تک بڑھ گئے سارا وقت ہچکیوں ہچکیوں کر کے پیٹتی رہتیں۔
زمان میاں کے پاؤں چھو چھو کے منتیں کرتیں اور پوچھتے پنجتن پاک کا واسطہ بتا دے کون تھا وہ شہزادہ۔
جسے تو تو بچی میں سوغات لایا تھا، میرے لیے خبر نہیں کتنی مسافتیں طے کر کے پہنچا ہوگا وہ دوبارہ اپنے
گھر تک، ہزار ہزار سے کھا لینے دیا ہوتا اسے ذرا سی سرحد کی تماشبیں ہی تو تھیں، تم سب کے کلیجے تو نہیں
تھے۔ مر جائے تو کھو بی۔ منحوس۔ وہ بلک بلک کے پائیو کو کوسنے لگتیں۔
دھڑ شو مڑوا کے اس کے لیے اخباروں میں لکھے یا کھنچ گئیں" زمان میاں کے ساتھ ہاشمی صاحب
کے یہاں آنے والے بچے گھر واپس پلٹ آؤ، یہاں تمہارے گھر والے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔
یہ اُس بچے کے لیے چھپا جو ایک لفظ نہ پڑھ سکتا تھا اور جانے اُن کا تھا بھی یا نہیں۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے، تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں)

نام کتاب: اردو میں نظمِ معرّا اور آزاد نظم مقالہ نگار: ڈاکٹر حنیف کیفی

قیمت: ساٹھ روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر حنیف کیفی نے گزشتہ چند برسوں میں اپنی تصانیف اور مضامین کے ذریعے اردو دنیا میں ایک معتبر محقق اور سلجھے ہوئے نقاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی ہے۔ زیر نظر کتاب ڈاکٹر حنیف کیفی کا مقالہ ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔

ایک اچھا محقق اور نقاد بننے کے لیے صاحبِ ذوق ہونا اولین شرط ہے۔ جو شخص شعر و ادب کا مذاقِ صحیح نہ رکھتا ہو وہ تحقیق و تنقید کے میدان میں کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ حنیف کیفی اس شرط کو بدرجۂ احسن پورا کرتے ہیں، انھوں نے اردو شعر و ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ مغربی ادبیات سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔ عروض و بلاغت اور بدیع پر انھیں مکمل دسترس حاصل ہے جس کے بغیر اس مقالے کے موضوع سے انصاف کرنا ممکن نہ تھا۔

اردو میں معرّا اور آزاد نظم نگاری پر بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ کنول کرشن بالی نے آزاد نظم پر ایک مختصر کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کے باوجود معرّا نظم اور آزاد نظم کے سانچوں اور فن کے تعلق سے بہت سے مسائل مزید تفتیش و تحقیق کے محتاج رہے۔ اردو میں ان سانچوں کے اختراع اور ارتقا کے بارے میں بھی کافی اختلافِ رائے رہا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے نہایت تحقیق اور غور و فکر کے ساتھ ان مسائل کا جائزہ لیا ہے اور بہت سے امور کی یکسوئی کر دی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بعض نئے مباحث اٹھائے ہیں جن سے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں اردو شاعری پر انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے اثرات پر روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے اردو میں جدید نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی اور نئی اصنافِ شاعری کا رواج

اس کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے اثرات اور ان سے ماخوذ شعری اصناف سے بھی بحث کی ہے۔ اس میں انھوں نے مستزاد [illegible]، ترائیلے، سانیٹ، اردو گیت اور گیت نما نظموں اور ادبِ لطیف کا بھی جائزہ لیا ہے۔ یہ باب نہایت معلومات آفریں ہے۔

بعد کے ابواب میں انھوں نے نظمِ معرّا اور نظمِ آزاد کی ساخت اور تکنیک سے بحث کی ہے اور ان کے اصول و ضوابط کا تعین کیا ہے۔ ایک مستقل باب انگریزی بلینک ورس کے بارے میں ہے۔ اسی طرح معرّا اور نظمِ آزاد کے آغاز و ارتقا کا جائزہ الگ الگ ابواب میں تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے اور مصنف نے ان موضوعات کو نہ صرف سلیقے کے ساتھ یکجا کر دیا ہے بلکہ اس کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے آزاد نظم میں داخلی آہنگ اور خارجی آہنگ کے توافق پر [illegible] زور دیا ہے۔ ڈاکٹر عنیب الرحمٰن کے وضع کردہ قانون کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے ایک ہی بحر کے ارکان کی کمی بیشی پر اصرار کیا ہے جو نامناسب ہے۔ آزاد نظم کے تجربے کی ضرورت اس لیے تھی کہ ارکانِ بحر کی تکرار سے پیدا ہونے والے روایتی 'غنائی' آہنگ کی یکسانیت سے بچ کر تجربے کے صوتی اظہار میں لچک حاصل کی جائے۔ اصل مقصد اسی روایتی آہنگ کی گرفت سے رہائی حاصل کرنا تھا تاکہ داخلی واردات اور تجربوں اور ان کے صوتی ابلاغ میں رکاوٹ نہ ہو۔ تاہم نہاد آزاد نظم نگاروں نے ارکانِ بحر کی پابندی اور بحروں کے محدود انتخاب کے ذریعہ اس مقصد کو کھو دیا۔ بحروں سے منسلک رہتے ہوئے بھی آہنگ کے بے شمار پہلوؤں کی گنجائش تھی جس کا کم ہی استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی اس تجویز سے اتفاق کیا ہے کہ ایک دو افاعیل کی باقاعدہ تکرار سے نظموں کا ڈھانچا تیار کرنے کے بجائے اس بحر کے زحافات کو بھی کام میں لانا چاہیے۔ علاوہ ازیں ایک ہی نظم میں مختلف بحریں استعمال کرنے کی بھی انھوں نے رائے دی ہے جس سے حنیف کیفی متفق نہیں ہیں۔ انھیں اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے آہنگ بگڑ جائے گا اور نظم ایک میکانکی عمل ہو کر رہ جائے گی۔ یہ اندیشہ درست نہیں ہے۔ شاعر اگر اچھا مشّاق ہو تو زحافات کا استعمال اس انداز سے کرے گا کہ آہنگ بگڑنے نہیں بلکہ ایک خوشگوار تنوع پیدا ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ بحروں کے استعمال کی گنجائش خود ہمارے عروضی نظام ہی سے نکل آتی ہے۔ ایک [illegible] تعلق رکھنے والی بحریں چھوٹے اور طویل مصرعوں کی مخصوص ترتیب سے بننے والی زنجیر کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان بحروں کی باہم تبدیلی اور امتزاج سے آہنگ کے نئے اور خوش گوار تجربے کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً [illegible] کو یہ آہنگ ایک دوسرے میں مدغم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے [illegible] کو حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ نظم آزاد [illegible] ہے۔

شرر نے بحر کی پابندی کے ساتھ جو منظوم ڈراما "فتح اندلس" لکھا تھا ڈاکٹر گیان چند جین نے اسے "آزاد نظم" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ اسے نظم معرّیٰ کہتے ہیں کیونکہ مختلف مکالموں کو ملا کر پڑھیں تو مصرعے مکمل ہو جاتے ہیں لیکن مختلف کرداروں کے مکالموں کو ملا کر پڑھا جائے تو ڈرامائیت باقی نہیں رہے گی اور جب ہر مکالمہ جداگانہ لہجے میں ادا کیا جائے گا تو نظم کی بحر کا روایتی آہنگ برقرار نہیں رہے گا۔ اس اعتبار سے "فتح اندلس" کے سانچے کو آزاد نظم ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اس بنا پر نظم آزاد کی ایجاد کا سہرا شرر ہی کے سر جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس تجربے کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تا آنکہ تصدق حسین خالد، ن م راشد اور میرا جی نے اس صنف کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اب رہا یہ سوال کہ نظم آزاد کے تجربے کی تجدید اور احیا میں کس نے پہل کی۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے یہ شہادت فراہم کی ہے کہ تصدق حسین خالد نے ۱۹۲۵ء میں آزاد نظمیں کہی تھیں جب کہ ن م راشد کی پہلی آزاد نظم ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے خیال میں اولیت خالد کو حاصل ہے۔ خالد کی نظموں کا مجموعہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ یہ پتا نہیں چلتا خالد نے ۱۹۲۵ء میں سب سے پہلی آزاد نظم کون سی کہی تھی اور آیا وہ اس مجموعے میں شامل بھی ہے۔ جب تک اس نظم کی نشان دہی نہیں ہو جاتی ساغر نظامی، ڈاکٹر عبداللہ اور خود ن م راشد کے بیانات کے باوجود تصدق حسین خالد کی اولیت غیر مسلّمہ رہے گی۔

ان چند اختلافی مباحث سے قطع نظر زیر تبصرہ کتاب ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔ کتاب کے مطالعے کے بعد قارئین پروفیسر مسعود حسین کی اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ "اس تصنیف سے حنیف کیفی صاحب کے وسیع مطالعے اور علمی کاوش دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ صرف اس موضوع پر ایک اہم اضافے کا حکم رکھتی ہے بلکہ عرصے تک اس موضوع پر علمی کام کرنے والے کے لیے یہ ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھے گی۔

——— پروفیسر مغنی تبسم

نام کتاب: موتی، پھول، ستارے   شاعر: بدیع الزماں خاور   صفحات: ۸۸
قیمت: ۱۰ روپے   ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

"موتی، پھول، ستارے" بدیع الزماں خاور کے طبع زاد کلام کا مختصر انتخاب ہے۔ انتخاب اور ترتیب کا کام ان کے شاگرد پرویز باغی نے کیا ہے جو جدید تر نسل کے ذہین شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔

یہ مجموعہ مئی ۱۹۸۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ بدیع الزماں خاور ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر ہیں

اب تک ان کی غزلوں، قومی وطنی نظموں، گیتوں، رباعیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اُن کے کلام کے چھ مجموعے ۱۔ حروف ۲۔ میرا وطن ہندوستان ۳۔ بیاض ۴۔ امرائی ۵۔ لفظوں کا پیرہن ۶۔ سات سمندر، شائع ہوئے ہیں۔ حروف میں نظمیں اور غزلیں ہیں۔ "میرا وطن ہندوستان" میں قومی اور وطنی نظمیں ہیں۔ "بیاض" ان کی منتخب غزلوں پر مشتمل ہے۔ "امرائی" میں نظمیں اور گیت ہیں۔ "لفظوں کا پیرہن" نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ سات سمندر میں صرف غزلیں ہیں۔ "ننھی کتاب" کے عنوان سے جنوری ۱۹۸۳ء میں خاور نے بچوں کے لئے لکھی ہوئی اپنی نظمیں شائع کی ہیں۔ انہوں نے مراٹھی نظموں کے ترجمے بھی کئے جنہیں "خوشبو" کے زیر عنوان شائع کئے ہیں، مراٹھی نظموں اور ابھنگوں کے ترجموں پر مشتمل ان کا ایک اور مجموعہ "سبیل" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ "مہاراشٹر کی تہذیبی اور ادبی قدریں" کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اس خوبصورت مجموعہ میں بدیع الزماں خاور کی منتخب نظمیں، غزلیں، تین رباعیاں اور "اشعار" کے زیر عنوان ۱۵، منتخب اشعار ہیں جو "حروف"، "بیاض" "امرائی" "لفظوں کا پیرہن" اور "سات سمندر" سے منتخب کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ مجلد اور اس کا ٹائیٹل دیدہ زیب ہے۔ کتابت اچھی، کاغذ عمدہ ہے۔ نظموں، غزلوں اور رباعیات کے انتخاب اور ترتیب سے مرتب کے پاکیزہ اور اعلیٰ شعری ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔

نظموں کے حصے میں "حروف" سے سات نظمیں، "میرا وطن ہندوستان" سے پانچ، امرائی اور لفظوں کا پیرہن سے چھ، چھ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ امرائی سے "آج رات کو" کے زیر عنوان ایک گیت بھی اس مجموعہ یعنی "موتی، پھول اور ستارے" کی زینت ہے۔ اس انتخاب میں حروف سے پانچ، "بیاض" سے چھ اور لفظوں کا پیرہن سے دس اور سات سمندر سے ۱۴ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ سات سمندر سے ایک آزاد غزل بھی شریکِ اشاعت ہے۔ لفظوں کا پیرہن سے تین رباعیاں منتخب کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک رباعی پیش کرتا ہوں۔

پوجا ہے تو پوجا ہے اُسی کو میں نے
ڈھونڈا ہے تو ڈھونڈا ہے اُسی کو میں نے
وہ بندۂ عاشق ہوں کہ جب بھی اس سے
مانگا ہے تو مانگا ہے اُسی کو میں نے

اس رباعی کے پڑھنے کے بعد کسی مشہور شاعر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے　　سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

پروین بالی نے مارچ ۱۹۸۱ء میں "گوکل کا منتی" کے عنوان سے بدیع الزماں خاور کے فن اور اعلیٰ شخصیت پر اردو کے ممتاز ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کے گراں قدر مضامین شائع کئے تھے۔ یہ کتاب پریم گوپال متل کے زیر اہتمام موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی سے شائع کی گئی۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں خاور کو ایک ممتاز شاعر، کامیاب مترجم اور ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے خراج تحسین ادا کیا گیا ہے۔ خاور نے اپنے ادبی اور تخلیقی سفر کے پچیس سال پورے کئے ہیں لیکن ان کا یہ ادبی سفر ہنوز جاری ہے۔ ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے ان کے ہنوز تازہ دم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

موجودہ زمانے میں اردو ادب ایسے جیالے قلمکاروں کی شدید ضرورت ہے، جو اپنی اعلیٰ معیاری تخلیقات سے ادب کے ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ کریں، جس سے ہمارے ادب کے مقام، مرتبہ اور مقبولیت میں اضافہ ہو، اعجاز صدیقی، مالک رام، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، گوپال متل وغیرہ جیسے اردو زبان و ادب کے ممتاز خدمتگاروں نے بدیع الزماں خاور کی مسلسل اور ان تھک علمی، ادبی اور شعری خدمات کو پُر زور الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

بدیع الزماں خاور نے انگریزی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ نے ان کے خیالات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی ہے وہ جب اپنے فکر و خیال کی شمعیں روشن کرتے ہیں تو ان کی تخلیقات کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ اُن کے جذبہ، احساس، مشاہدہ، تجربہ کی صداقت ان کے کلام کو تابندہ و پائندہ رکھے گی۔ ہماری زبان و ادب سے ان کی پُر خلوص اور والہانہ وابستگی، عشق کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اُن کی غزلیں آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔

"موتی۔ پھول۔ ستارے" میں ایسی نظمیں ہیں جن کا تاثر گہرا اور دیرپا ہے اور دل کے سوئے جذبات کو جھنجھوڑتا اور بیدار کرتا ہے۔ نظموں کے عنوانات کے تنوع سے اُن کے ذہن کی کشادگی کا ثبوت ملتا ہے۔

وہ ایک کامیاب اور کامران شاعر ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرکے زندہ اور باقی رہنے والی تخلیقات پیش کی ہیں۔

اُن کی غزلوں سے بطور مشتے نمونہ از خروارے چند اشعار پیش ہیں:

دیارِ درد سے بچ کر کوئی کہاں جائے
کہ راستہ ہے یہی ایک زندگی کے لیے

مرے بزرگو! مرا کرب تم نہ سمجھو گے — تمہارا دور کہاں تھا مری صدی جیسا

درد نے جوڑے ہیں رشتے ورنہ — کون دنیا میں کسی کا ہوتا!

جسے بھی دیکھیے پیاسا دکھائی دیتا ہے — کوئی مقام ہو صحرا دکھائی دیتا ہے

تبصرہ کچھ یوں کیا کرتی ہے میرے حال پر — مجھ سے بہتر جانتی ہے جیسے یہ دنیا مجھے

ان ہواؤں میں اگر زہر نہیں ہے کوئی — آدمی سانس بھی لیتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے؟

دیکھ سکتے ہو تو مرجھائے ہوئے پھولوں میں
کوئی بیتے ہوئے موسم کی نشانی دیکھو

بدیع الزماں خاور کی نظموں میں "امرائیوں کی شہزادی"، "لفظ اور ہم"، "والد کی یاد میں" ایسی ور تاثراتی نظمیں ہیں جن سے دل پر دیر تک اثر انگیز کیفیت طاری رہتی ہے۔ "امرائیوں کی شہزا ائی" سے "لفظ اور ہم" اور "والد کی یاد میں" لفظوں کا پیرہن سے منتخب کی گئی ہیں۔ "امرائی" سے خوبصورت گیت "آج رات کو" بھی شاملِ اشاعت ہے، جس کا یہ شعر ذہن میں گونجتا ہے:

آج رات کو اک شہزادہ میرے خواب میں آئیگا
[illegible] بکھر جائے گا

غرض "موتی، پھول، ستارے" بدیع الزماں خاور کے شعری سفر کی دلکش منزلوں کی ندہی کرتا ہے۔

محمد منظور احمد

وقار خلیل

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم ستمبر: ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی مجلسِ انتظامی کا اجلاس صدرِ ادارہ جناب حامد علی عباسی کی صدارت میں بمقام "ایوانِ اُردو" منعقد ہوا۔ مالیاتی اور دفتری اُمور کے علاوہ مدرس اور شعبہ امتحانات کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا اور ادارہ کی اشاعتی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بعض اہم مطبوعات کے سیکنڈ ایڈیشن شائع کئے جانے پر غور کیا گیا۔ مجلسِ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر جناب حامد علی عباسی، جناب محمد منظور احمد معتمد اور اراکین میں پروفیسر سراج الدین پروفیسر سیدہ جعفر، صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر مغنی تبسم ڈاکٹر انور معظم اور مولوی محمد مرتضیٰ قادری کے نام شامل ہیں۔

۴ ستمبر: کراچی (پاکستان) سے موصولہ اطلاع کے مطابق ممتاز عثمانین اور فیض شناس ادیب مرزا ظفر الحسن کا انتقال ہو گیا۔ مرزا صاحب کی پہلی کتاب "دھوپ چھاؤں" (کہانیاں) ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے چھپ چکی ہے۔ مرزا ظفر الحسن "ادارۂ غالب" کے بانی اور ایک اچھے کتب خانہ کے ناظم نیز فیض احمد فیض پر اپنی تحریروں اور تالیفات کے علاوہ حیدرآباد دکن اور جامعہ عثمانیہ کی یادوں پر مشتمل اپنی مطبوعات کے باعث برصغیر ہند و پاک کے ادبی اور علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کی وفات ادبی سانحہ قرار پاتی ہے خدا مغفرت فرمائے۔

۶ ستمبر: مرزا ظفر الحسن صاحب مصنف "ذکرِ یار چلے" اور "دکن اُداس ہے" کی وفاتِ حسرت آیات پر صدر انجمن ترقی اُردو کے صدر ڈاکٹر جمیل جالبی عبدالمنان نے تعزیتی بیان میں کہا کہ مرزا صاحب کی وفات سے مخدوم اور میر حسن کے گروپ کا ایک اہم فرد جاتا رہا۔ حیدرآباد کے ادبی ماحول اور یہاں کی نصف صدی اُدھر کی سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر دُنیائے ادب سے اپنی کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ مرزا صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے اسے ناقابلِ فراموش کارنامہ سمجھا جائے گا۔

۱۲ ستمبر: فرقہ وارانہ فسادات میں مشہور کتب خانہ سعیدیہ لائبریری کی ۲۰ مخطوطات اشرار کے ہاتھوں تباہ ہو گئیں۔ ایک اور لائبریری حیدری گشتی کتب خانہ کو بھی نشانہ بنایا گیا۔

۲۳ ستمبر: جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ایک شعری محفل میں ضیاء موسوی کی کتاب "اسرارِ حق" کی رسمِ اجرا انجام دی۔ خیرات ندیم، دلاور عزیز، ساجد رضوی، زاہد شکوہ، باقر رضوی اور ستار صدیقی نے کلام سنایا۔

1984

R. N. 10922/
Regd. H/HD. 1

The "SABRAS" Urdu Monthly

of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 482. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد

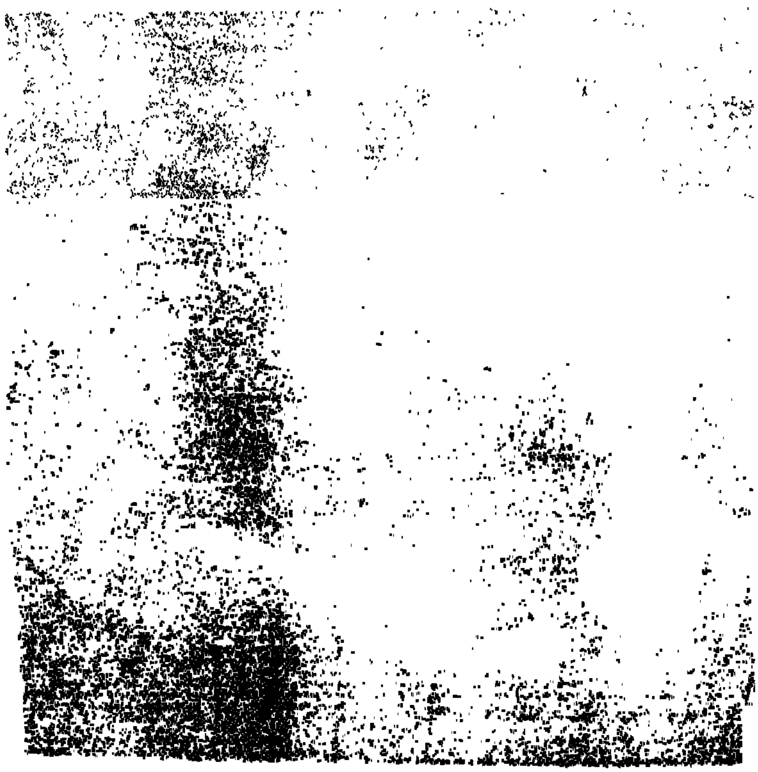
بالِ جبریل



ضربِ کلیم

مکاتیبِ رشید

سب رس



یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جلد ۴۴، شمارہ ۱۱ سن اجرا ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

نومبر ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مدیر اعزازی : پروفیسر مغنی تبسم

شریک مدیر : محمد منظور احمد

معاون مدیر : وقار خلیل

قیمت فی پرچہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرسالانہ : ۳۰ روپے، کتب خانوں سے : ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری : ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے :

ہوائی ڈاک سے :		بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

مجلس مشاورت :

صدر : حامد علی عباسی.

نائب صدر : ہاشم علی اختر

معتمد : پروفیسر مغنی تبسم

ارکان :

عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ

محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ

پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۲ ۸۲ء سے شائع کیا

کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو "ایوان اردو"

پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ 500482.

سرورق : احمد شاہ ولی بھٹی

ترتیب

علی الدین نوید

ہمالیہ میرا درپن ہے

اے دھرتی کے چاند ستارو!
تم کیوں سوگ میں ڈوب گئے ہو
ہونٹوں پر کیوں برف جمی ہے
آنکھیں نم نم، چہرے مدھم
میری موت کا اتنا ماتم:
دور اُفق کی اور مجھے کیوں ڈھونڈ رہے ہو
دھرتی کی رگ رگ میں میرا خون رواں ہے
پربت پربت میری قامت
وادی وادی میری نکہت
جمنا کی لہروں میں میرے من کی دھڑکن
گنگا کی موجیں میرے سپنوں کا درپن
نٹ کھٹ بالک کی آنکھوں میں
میرے سپنے جاگ رہے ہیں
گاؤں کی سوندھی مٹی میں میری خوشبو ہے
کِھلتے غنچوں، لہراتے کھیتوں کے من میں میں ہی میں ہوں
ہمالیہ کے دامن میں
اب راکھ کی صورت میں بکھرا ہوں
کل سونا بن کر نکلوں گی
رنگ برنگے پھولوں میں کل مسکاؤں گی
موت مجھے کیا مارسکے گی

اپنی بات

ہردلعزیز سابق وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی الم انگیز دائمی مفارقت سے نہ صرف ہندوستان کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے بلکہ تیسری دنیا، عرب دنیا اور صحیح معنوں میں ساری انسانیت، ایک نہایت باہمت، اولعزم اور حرکیاتی عالمی شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔ ان کی رہنمائی میں قومی تعمیر اور ملک کی یکجہتی، ترقی کے کئی پراجکٹ، برق رفتاری سے پایۂ تکمیل کو پہونچے۔ وہ نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان کی وزیراعظم تھیں بلکہ ان کے قلب و نظر کی وسعت نے دنیا کے تمام پسماندہ، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے عوام کے دلوں کو فتح کر لیا تھا۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا ہے لیکن وہ بلالحاظِ مذہب و ملت، زبان و نسل دنیا کے ہر خطے کے عوام کے دلوں میں زندہ ہیں اور عرصہ دراز تک زندہ رہیں گی۔

انسانیت کی خدمت کا راستہ عموماً دشوار گزار ہوتا ہے اور اس کے طے کرنے میں کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستان اور ساری دنیا میں امن، محبت، رواداری، بھائی چارگی اور خوشحالی کے عام کرنے کی بے چین تمنا نے شریمتی اندرا گاندھی کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیا بلکہ وہ جہدِ مسلسل، اور انتھک جدوجہد کرتی رہیں۔ انھوں نے اس نیک مقصد کی تکمیل کے لیے ہر چیلنج اور ہر مشکل کا ہمت، حوصلہ اور پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ان کی غیر معمولی توانائی اور تگ و دو پر سارا جہاں حیران اور ششدر رہا کرتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی جلد از جلد اپنے خوابوں کے ہندوستان کو دنیا کے نقشے میں تیزی سے ابھرتا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔

اُن کے خوابوں کا ہندوستان، ان کے تجویز کردہ بیس نکاتی پروگرام پر عمل آوری کے ذریعہ تشکیل پانا تھا۔ دنیا کی ہر قوم کی بقا اور ترقی اور کرۂ ارض پر پائیدار امن و سکون، تمام اقوام کے لیے حقیقی انصاف اور پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود اور بین الاقوامی مفاہمت کے جذبہ اور خیال کے عام کرنے کے لیے خاص اہمیت رکھنے والے فورم جیسے ادارۂ اقوامِ متحدہ، دولتِ مشترکہ اور غیر جانب دار تنظیم کے مختلف

اجلاسوں میں ایک بہت بڑی عالمی قائد کی حیثیت سے انھوں نے بلا تامل، بے ساختہ اور بے باکانہ اظہار خیال کیا۔ اُن کی آواز فضاؤں میں آج بھی گونج رہی ہے اور اس وقت تک گونجتی رہے گی جب تک کہ ناانصافی، جانب داری اور ہر طرح کے تعصب کا دنیا سے صحیح معنوں میں خاتمہ نہ ہو جائے۔ وہ ہمیشہ "جیو اور جینے دو" کی پالیسی پر عمل پیرا رہیں اور دنیا کی تمام قوموں اور حکومتوں سے بھی پُر امن بقائے باہم و جودی کی اس پالیسی پر صدق دلی سے عمل پیرا ہونے کی توقع رکھتی تھیں تاکہ ساری دنیا امن کا گہوارہ ہو اور انسانی تہذیب و تمدّن کے گراں قدر سرمایہ میں اضافہ ہو۔

ہندوستان کے مختلف طبقوں میں اتحاد اور قومی یکجہتی، انھیں دل سے عزیز تھی۔ انھوں نے سیکولرازم، سوشلزم اور انسانیت کے اعلیٰ اقدار کے حصول کو اپنا نصب العین بنایا۔ اپنے ملک اور دیگر ترقی پذیر ممالک میں ا ؛ سائنٹفک ذہن کی تشکیل و تعمیر، سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم اور ترقی کے جدید ترین عصری ذرائع اور وسائل کے استعمال پر ہمیشہ زور دیا۔

"سب رس" کی مجلس مشاورت اور مجلس ادارت شریمتی اندرا گاندھی کی دائمی مفارقت کے غم میں سوگوار ہے اور اس رُوح فرسا اور جاں گداز سانحہ پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتی ہے۔

دُعا ہے کہ خُداوند تعالیٰ، شریمتی اندرا گاندھی کی آتما کو شانتی عطا فرمائے اور ان کے باوقار غم زدہ فرزند اور موجودہ وزیراعظم ہند شری راجیو گاندھی، ان کے دیگر ارکانِ خاندان اور پوری قوم کو، اس سانحۂ عظیم کے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین،

——— محمد منظور احمد

"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی، مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ اِس قوم کے فروغ میں کام کرے گا اور اسے مستحکم اور متحرک بنانے میں کارآمد ثابت ہوگا۔"

اندرا گاندھی، ۳۰ راکتوبر ۱۹۸۴ء

محمد یوسف ٹینگ

کشمیری تمدن اور اردو

کشمیر میں اردو کے چراغ کی ننھی منی لو اس وقت ابھرنے لگی جب فارسی کی شاہانہ صدیاں اپنا بھرپور رنگ دکھا رہی تھی۔ یہ صرف جانشینی کا مرحلہ ہی نہ تھا بلکہ تہذیبی پیوند کاری کا معاملہ بھی تھا۔ اس سرزمین پر کوئی چھ سو سال پہلے کچھ ایسا ہی ماجرا بیت چکا تھا۔ اس وقت یہاں ایک سوختہ ساماں اور نیم جاں تہذیب کے کھنڈرات پر فارسی داں مسلمانوں نے ایک تازہ کار اور تازہ دم معاشرے کی تعمیر اٹھانا شروع کردی تھی لیکن اس وقت بھی وہ اپنی ساری تگ و تاز اور امنگ کے باوجود سنسکرت کو فوراً ترک نہیں کرسکے۔ اب اس بات کی شہادتیں کثرت سے سامنے آرہی ہیں کہ کشمیری سلاطین ابتدا ہی فارسی کے حلقہ بگوش ہونے کے باوجود سنسکرت میں ہی دربار کا کام کاج اور امور سلطنت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ سلطان شہاب الدین جیسا "دین پناہ" بھی کوہمیر کے مندر کی بحالی کا لطف خسروانہ سنسکرت میں ہی تحریر کرنے پر مجبور ہوگیا۔ سلطان زین العابدین نہ صرف سنسکرت پڑھ اور سمجھ لیتا تھا بلکہ ایک خیال یہ ہے کہ اس نے فارسی یا کشمیری کی چاہے کتنی ہی سرپرستی بھی کی ہو، اس کے احکامات کی زبان سنسکرت ہی ہوتی تھی۔ یہ صورت حال اس قدر عجیب تھی کہ سنسکرت اور عربی فارسی رسم ہائے خط کی کھدائی اسے قبروں کے تعویذوں پر بھی انجام دینا پڑی۔ حالانکہ قبر کے ساتھ مذہبی عقائد کے کچھ بہت سے نازک اور ناقابل مفاہمت احساسات اور توہمات وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح کشمیری سلاطین کے سکوں پر عربی فارسی کے ساتھ شاردا حروف میں عبارتیں لکھنے کا سلسلہ سلطان فتح شاہ اور احمد شاہ کے زمانے تک موجود رہا۔

بہر کیف! مغلوں کی عظیم شہنشاہیت نے اس گومگو کا خاتمہ کر کے فارسی کی فرمانروائی تقویت دی لیکن اس کے ساتھ ہی فارسی کو مقامی زبان سے آمیختہ کرنے اور اس کا ایک مقامی روپ تیار کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوگیا۔ اس سلسلے میں غنی کاشمیری کے اس شعر:

سوئے میانو توحشِ دہ کرالیہ
کردجُندا کاسۂ سرباز تن

کے علاوہ یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

شکر و دیدم بہ دست آرمو
مے کشد از خاک سنگ بناو ہمہ

گلاب سنگھ نے جب ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو خرید لیا تو فارسی کا اُٹھا ہوا ہاتھ پھر بھی سوا لاکھ کا تھا۔ مغلوں نے یہاں کی نمو آور سرزمین سے ایسے طور پیوست کر دیا تھا کہ پنجاب دربار کے خالصہ بھی اس کو سرکاری قلمرو سے الگ نہ کر سکے۔ گلاب سنگھ خیر اس کا کیا بگاڑ سکتا لیکن کشمیر کی لسانی اور تہذیبی صورتِ حال اُس وقت ایک ایسے جزیرے کی سی ہو کر رہ گئی تھی جس کو ایک نئے پیچ و تاب کی لہریں چاروں طرف اپنی آغوش میں لے رہی تھیں۔ فارسی یہاں ایک ترقی پذیر اور استقبال آگاہ تمدن کے ہمراہ آئی تھی لیکن اب اس کی سانسیں ڈوب رہی تھیں۔ جاگیرداری سماج پر سرمایہ دارانہ نظام کی پہلی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں اور اس کا خول اُدھڑ رہا تھا۔ اردو اس کے بطن سے ہی نکلی۔ اگرچہ رسمی طور پر دہلی کی حکومت نے ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اُردو کو درباری زبان بنانے کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہ عمل بہت مدت سے جاری تھا۔ یہ اتنے غیر محسوس اور بے ساختہ طریقے پر روبہ عمل آیا کہ اس کی کوئی تاریخ مقرر کرنا سمندر کی دو ایسی موجوں کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے کے برابر ہے جو ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لیے آ رہی ہوں۔ جب کشمیر میں اُردو کی آمد اور اس کے اثر و رسوخ کے عمل پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عوامی سطح پر فارسی کی جگہ کب کی لے چکی تھی اور سرکاری اور درباری سطح پر اس کی تصدیق و توثیق محض ایک رسم پوری کرنے کے برابر تھا۔ چنانچہ اس کی ایک شہادت ہمیں انگریز سیاح فریڈرک ڈریو کے اس اقتباس سے ملتی ہے۔ یہ شخص ۱۸۶۲ء میں یہاں آیا تھا:

"ہندوستان سے بہ سلسلۂ ملازمت آنے والے لوگ بلاشبہ ہندوستانی بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔"

(دی جموں اور کشمیر ٹیریٹریز)

کچھ ہی عرصہ کے بعد یعنی ۱۸۸۲ء میں مشہور کشمیری صحافی اور لیڈر ہرگوپال خستہ نے اپنی کتاب "گلدستۂ کشمیر" میں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ بازاروں میں لوگ اُردو بولتے ہیں اور انجیوں وغیرہ طائفوں کے لوگ سیاح سیلانیوں کے ساتھ اسی زبان میں ٹوٹی پھوٹی گفتگو کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد اردو کے متعلق جو اطلاع ملتی ہے وہ اس کے تہذیبی عمل کی پوری داستان دہراتی ہے۔ یعنی مہاراجہ رنبیر سنگھ نے تار برقی یعنی ٹیلی گراف کے لیے اردو الفاظ کے استعمال کا حکم دیا۔ اس سے پہلے انگریز برطانوی ہند کے ساتھ ڈاک اور تار کے تبادلے کے متعلق مفاہمت ہو چکی تھی۔ لیکن اردو ٹیلی گراف کی شناختی علامت بنانا اس سارے خطے میں ایک بہت اہم پیش قدمی تھی۔

امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے بقول اقبال یہاں "علم و صنعت و تہذیب دین" ساتھ لا کر کشمیر کے دیہاتی معاشرے کو ایک شہری سماج کی جہت عطا کی۔ اردو نے بھی انیسویں صدی کے وسط میں یہاں یہی رول انجام دیا۔ ریاست میں پہلا پرنٹنگ پریس ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا۔ جب [illegible] سنگھ کی آنکھیں کھلی تھیں۔ یہ پریس ریاست کی سرمائی راجدھانی جموں میں تھا اور یہاں فارسی اور ہلرت کی طرح اردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپتی رہیں۔ اس کے کوئی دس سال بعد یہاں وکرم بلاس اور پھر بدیا بلاس پریس قائم ہوئے۔ بدیا بلاس پریس سے اسی نام کا ایک جریدہ شائع ہونا شروع ہو گیا۔ جس میں ایک کالم دیوناگری اور ایک اردو حروف میں رقم ہوتا۔ یہ ریاست میں صحافت کی شمع روشن کرنے کی پہلی دیا سلائی تھی جس نے بعد میں سینکڑوں چراغ دیے اور ساری ریاست ان کی کرنوں سے جگمگا اٹھی۔ سری نگر میں سالگرام پریس، جو آج کے کرن نگر نزدیک واقع تھا۔ اسی زمانے کے ارد گرد قائم ہوا اور اس مطبع نے کشمیر میں اردو چھپائی کا آغاز کردیا۔

کشمیر میں اردو چھپائی کا یہ دور کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں تھا بلکہ پنجاب میں طباعت کے سلاب کا محض ایک پرتو اور عکس تھا۔ وہاں اردو کے بہت سے اخبارات شائع ہوتے تھے۔ پریس خانے سے کتابوں کی طباعت اور پھیلاؤ میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ اخبارات کشمیر میں پہنچتے اور یہاں ایک نئے افق کو روشن کر رہے تھے۔ مکند رام نے لاہور میں مطبع متروالاس قائم کیا تھا اور اردو کے اولین اخبارات میں سے ایک وہاں سے آب و تاب ساتھ شائع ہوتا تھا۔ "اخبار عام" کشمیری پنڈتوں کے زیر اثر تھا۔ اسی لیے اس میں کشمیر کے حالات پر خاص توجہ ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نشریات کشمیر میں ذہنی لس پا کر ایک نئے انقلاب کی طرح ڈال رہی تھیں۔

رنبیر سنگھ کے زمانے میں اسی کی کشمیری پنڈتوں کے ایک طبقے کے ساتھ ٹھن گئی اور اس کی وجوہات سیاست اور اقتصادیات دونوں تھیں۔ کشمیری پنڈت وادی کے سب سے زیادہ دولت مند لوگ تھے جنھیں مسلمانوں کی آمد اور ان کے اثر و نفوذ کے ابتدائی جھٹکوں کے بعد پھر سلطنت کی

کار کی امانت سپرد کر دی اور یہ اپنے قلم کے جوہروں سے حکومت کا سفینہ رواں رکھتے رہے۔

جموں کے حکمرانوں نے وہاں کے نسبتاً کم تعلیم یافتہ اقارب اور بیرون ریاست کے نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو کشمیر کی انتظامیہ میں بھرتی کرنا شروع کر دیا اور کشمیری پنڈتوں کو اپنے روزگار کے ذرائع مسدود ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ دوسری طرف ہندوستان میں سیاسی تحریکوں نے دلوں میں قومی جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا۔ انگریز اپنے نوآبادیاتی رول کے باوجود بڑے ترقی پسند اور انصاف پسند حکمران تھے۔ انہوں نے پنجاب اور دوسرے علاقوں میں تعلیم اور ترقی کی ایسی شروعات کر دی تھیں جس کا خواب بھی ریاستوں میں سودیشی حکمرانوں کے شتر غمزوں کی ماری ہوئی رعایا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ ساری وجوہات اکٹھی ہو گئیں اور ان کی ترجمانی کے لیے ہرگوپال خستہ جیسا شخص سامنے آ گیا۔ خستہ ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور دلیر کشمیری تھا۔ ۱۸۷۸ء کا قحط کشمیر میں قحطِ عظیم یعنی "بوڈ دراگ" کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اس قحط میں ہزاروں کیا لاکھوں کشمیری ایک ایک نوالے کے لیے بلکتے ہوئے وفات پا گئے۔

ہرگوپال خستہ کی کشمیر دربار سے ٹھن گئی تھی۔ وہ لاہور گیا اور اس نے اس قحط کے پیچھے راجواڑہ شاہی کی سفاکی اور سنگدلی کا سارا بھانڈا اخباری اوراق کے چوراہے پر پھوڑ دیا۔ اس نے لکھا کہ کس طرح رنبیر سنگھ کی حکومت نے اس قحط میں اپنے انسانی فرائض نبھانے میں مجرمانہ کوتاہی کی بلکہ اسے اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے استعمال کیا۔ یہ انسانیت سوز آواز اردو اخبارات کے صفحوں سے ہی بلند کی گئی۔ خود خستہ نے راوی۔ ریفارمر۔ خیر خواہ۔ پبلک نیوز جیسے اخبارات نکالے اور کشمیر دربار کو اس حد تک زچ کیا کہ آخرکار اسے باہو قلعہ میں اسیرِ زنداں بن جانا پڑا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں کہ خستہ کی عوام نواز آواز کا جواب بھی لکیر کے فقیر ایک کشمیری پنڈت راجہ کول عرض بیگی ویری نے دیا۔ لیکن یہ مصائب صفت مداحی اگرچہ دیری کے لیے منصب اور مرتبہ کا ذریعہ بنی، لیکن اس کی زبان اردو نہیں تھی۔

فارسی اور اردو کی لڑائی کشمیر کے کچھ احد فرزند کشمیر سے باہر لڑ رہے تھے لیکن اس کے دُوررس اثرات کشمیر کی لسانی صورتِ حال پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ یہ وہ کشمیری پنڈت حضرات تھے، جو اپنے وطن سے دُور صوبہ جاتِ متحدہ میں اپنی ذہانت کا لوہا منوا رہے تھے۔ فارسی زبان اس وقت طبقاتِ عالیہ و اشراف کی زبان تصور ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ بھی کہاں کس سے پیچھے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ میں کمال پیدا کیا۔ اس کا ماجرا "بہار گلشن کشمیر" کے لائق مرتب کی زبان ملاحظہ ہو:

"فارسی ان صاحبان کے زمانے میں دربار و دفتر اور ہر علمی مجلس اور
بحث و مباحثہ میں تھی۔ فارسی زبان دانی کی تکمیل کو وہ پنڈتانِ
علم و ادب کا اعلیٰ پیمانہ اور تہذیب کا نمونہ تصور فرماتے تھے
اور اگرچہ روزمرہ بول چال اور کاروبار میں اردو زبان مروجہ
استعمال میں آتی تھی۔ مگر علمی زبان فارسی قرار دی گئی تھی۔ جو
اعلیٰ صفات کا امتیازی جوہر سمجھا جاتا تھا۔"

(شائع شدہ: ۱۹۲۱ء)

فارسی میں ان کے کمال کا ایسا ڈنکا بجا کہ غالب کے ایک مشہور حریف شیخ امام بخش کی کتاب "قولِ فیصل" کا پیش لفظ ایک کشمیری پنڈت دھرم نارائن جاکسر نے لکھا جو اس وقت ایک بڑا اعزاز تھا۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزوں کی عملداری میں آگیا اور وہاں اردو تقریباً سرکاری زبان بن گئی۔

لیکن فارسی اپنی تمام ظاہری شان و شوکت کے باوجود ایک کھوکھلا درخت بن کر رہ گئی تھی۔ جس کی جڑوں سے نمو کا امرت غائب ہو گیا تھا۔ فارسی کی جگہ اس کی بیٹی اردو نے لے لی تھی اور اسی بیٹی کی رگوں میں [illegible] کے خیابانوں کی مہک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مٹی کی رنگت موجود تھی۔ چنانچہ "بہارِ گلستانِ کشمیر" میں کشمیری پنڈتوں پر اس کے اثرات کا یوں ذکر ہوتا ہے:

"یہ یاد رہے کہ ان باکمال لوگوں کو کشمیر سے گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ کشمیر کی چار دیواری میں محصور عزیز و اقارب کے ساتھ ان کی خط و کتابت بھی تھی اور آمد و رفت بھی۔ اس طرح سے اردو کشمیر کے طبقۂ عالیہ میں پہلے ہی پہنچ گئی۔ کشمیر سے باہر جانے والے کشمیری پنڈتوں نے اپنی برادری (ان دنوں "ملا" کی اصطلاح کا استعمال نہیں ملتا) کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے کچھ رسائل بھی جاری کیے جن میں تیج بہادر کا "کشمیر درپن"، برج نرائن چکبست کا "صبحِ امید" اور پنڈت لچھمن نرائن کول کا "سفیرِ کشمیر" شامل تھے۔ ایسے رسائل میں مراسلۂ کشمیر اور کشمیر پرکاش بھی شامل تھے اور یہ لکھنؤ، کانپور اور لاہور کی کشمیری پنڈت اسوسی ایشنوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ یہ اخبارات کشمیریوں کا تصور بہ حیثیت ایک منفرد قوم کے کرتے تھے۔ جیسا کہ ان میں شائع شدہ مراسلات و منظومات سے ہوتا ہے۔ نمونے کے لیے صرف ایک شعر ملاحظہ ہو:

"فارسی اور اردو علم و ادب کی تکمیل کشمیری قومی تہذیب ہندوستان کی جزو مقصود کی
جاتی ہے۔ اس تکمیل کی وجہ سے علمی مجالس اور مباحثات میں پنڈتانِ کشمیر اقتدار
اور امتیاز کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔"

اس کا وجود باعثِ اعزاز قوم ہے   یہ بزم پاک ا ... تازہ قوم ہے

[illegible] یہ ہے کہ خود رتن ناتھ سرشار اور برج نارائن چکبست جیسے کشمیری نژاد ادیبوں نے اردو میں جو فن کا مقام حاصل کر لیا' بلکہ برج نارائن چکبست کو اردو کی قومی اور انقلابی شاعری کے پیشروؤں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے اقبال اور چکبست نے ہی اردو میں قومی اور انقلابی شاعری کے فانوس روشن کیے اور سارے ہندوستانی ادب کا دھارا نئی سمت کو موڑ دیا۔ اگرچہ نند لال کول طالب کے اس بیان میں غلو کے علاوہ جانبداری کا عنصر بھی شامل ہے جس میں انہوں نے اقبال پر چکبست سے سرقے کا الزام عائد کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں "اقبال کی کئی مشہور نظموں مثلاً "میرا وطن وہی ہے"، "نیا شوالہ"، "ترانہ" وغیرہ کا مضمون چکبست کی نظم "خاکِ ہند" اور چند متفرق غزلوں کے اشعار سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ مرحوم نے یہ نظمیں اقبال سے برسوں پیشتر لکھی ہیں۔ آخر الذکر نے بعض نظموں میں تقریباً الفاظ بھی وہی استعمال کیے ہیں' جو چکبست کے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ (بحوالہ بہارِ گلشنِ کشمیر، جلد اول)

بقول مرزا محمد مدن ساحر دہلوی اردو زبان جو شمالی حصہ ہند میں زیادہ تر مروج تھی اس کی تحصیل میں تھوڑے محنت کی ضرورت ہوئی اور اس کی تکمیل اہلِ اسلام' زبان دانوں کی اصلاح صحبت اور اس درجہ ہو گئی کہ اب کشمیری پنڈتان ہندوستان کی یہ مادری زبان متصور ہوتی ہے اور فارسی اور اردو علم وادب کی تکمیل کشمیری قومی تہذیب ہندوستان کی جزو متصور کی جاتی ہے۔ (بحوالہ بہارِ گلشن کشمیر، جلد اول) کشمیر کی صفت میں ایک پنڈت شاعر کا صرف ایک مصرعہ ملاحظہ ہو:

ہر خار پر ہے مژدۂ حور کا عالم

اِدھر سے کشمیری مسلمانوں کے اس طبقے کی نس نس میں اپنے فردوس نشان وطن کی محبت چراغاں کر رہی تھی جنھیں ۱۸۱۹ء کے انتقالِ اقتدار کے بعد کشمیر بدر ہو جانا پڑا تھا۔ اپنی جنتِ گمشدہ کی یاد انھیں برابر ستاتی رہی اور بقول اقبال ان کی حالت کچھ یوں تھی:

موتی عدن سے لعل یمن سے ہوا ہے دور
یا نافۂ غزال ختن سے ہوا ہے دور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

۱۸۹۶ء میں لاہور میں ان معدودے چند کشمیریوں نے کشمیری مسلم کانفرنس پنجاب قائم کی۔ جو ۱۹۰۸ء تک

…یا مسلم کشمیری کانفرنس میں تبدیل ہوئی۔ اس انجمن کے پہلے جنرل سکریٹری علامہ اقبال اور جوائنٹ سکریٹری …ق تھے بقول محمد الدین فوق:

> "اس انجمن کے اہتمام سے ۱۸۹۶ء میں ایک رسالہ بنام "رسالہ انجمن کشمیری مسلمانان لاہور" جاری ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں میاں جان محمد گنائی نے میری زیر ادارت کشمیری گزٹ شائع کیا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے ۱۹۰۶ء کشمیری میگزین جاری کیا جو ۱۹۱۳ء میں ہفتہ وار ہو کر ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔"
>
> (بحوالہ کلام فوق (۲)، صفحہ ۹۷-۹۸)

واقعہ یہ ہے کہ اس انجمن نے سب سے پہلی اس استبداد کے خلاف آواز اٹھائی جو بیرونی استعمار نے کشمیریوں کی جنگی صلاحیتوں کا خاتمہ کرنے کے لیے روا رکھا تھا اور جس کا ایک پہلو کشمیری مسلمانوں پر فوج ورلشکر کے دروازے بند کرنا تھا۔ اگرچہ ریاست کی حدود میں ان کی مساعی رنگ نہ لا سکیں لیکن پنجاب میں آخرکار کشمیری خون کے لوگوں کو بھی فوج میں داخل ہونے کے مواقع عطا کیے گئے۔

انجمن کشمیری مسلمانانِ کشمیر کی تحریکِ آزادی کا پیش خیمہ اور ہراول دستہ ثابت ہوئی۔ اس کی آوازیں مظلوم، معتوب، مقہور اور مجبور کشمیریوں کی حمایت میں بلند ہوتی رہیں اور پیر پنجال کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتی رہیں۔ اسی انجمن اور اسی کے ارکان نے اپنے گاہ گرم اور گاہ نرم تیروں سے تیرگی کے سینے میں اُجالے کے پہلے تخم کاشت کیے۔ جن کا حشر اقبال کے اس شعر کا سا ہوا:

مصرعِ کارید و شمشیرے دارود

واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی ذہنی اساس اُردو کے اینٹ گارے سے ہی اُٹھائی گئی۔ وہ اقبال کا کلام ہو یا محمد الدین فوق کی تحریریں۔ انہوں نے کشمیر کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے ذہن میں الاؤ روشن کردیئے۔ اس الاؤ کے شعلے جب ذہن کی خلوتوں سے ذہن کی جلوتوں تک آ گئے تو کشمیر کی گول پہاڑی فصیلوں میں گھری ہوئی رزم گاہ رقصِ شرر کے مناظر پیش کرنے لگی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ۱۹۲۲ء میں علامہ اقبال لاہور سے غلام احمد مہجور کو لکھ رہے تھے کہ میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی تقدیر عنقریب پلٹا کھانے والی ہے اور دوسری طرف اپنی نظم میں یہ رجز بلند کر رہے تھے:

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشمیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

یہ بھی کوئی اتفاقی امر نہیں ہے کہ کشمیر کی تحریکِ آزادی کے قافلہ سالار اور علمبردار شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ

سیاسی شعور بھی لاہور ہی میں پختہ ہوا اور جب تک اسلامیہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں علامہ اقبال اور دوسرے کشمیر نوازوں کی صحبت مل گئی اور اسی دوران انہوں نے "مسلم آؤٹ لک" اور دوسرے اخبارات میں اپنے پہلے سیاسی مضامین لکھے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھیں "شیرِ کشمیر" کا خطاب بھی لاہور کے اردو اخبار "انقلاب" نے ہی سب سے پہلے دیا۔[1] "انقلاب" مہر و سالک کا وہ اخبار ہے جس نے ۱۹۲۸ء سے ہی کشمیر کی مظلومیت کا ڈنکا بجانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۳۱ء میں یعنی کشمیر کی تحریکِ آزادی کے رسماً آغاز سے بھی قبل، اس اخبار کے کشمیر میں داخلے پر پابندی عائد کی گئی اور یہ بات تحریکِ آزادی کے شعلوں کو ہوا دینے کا ایک کارن بھی بن گئی۔ اس اخبار کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اس کے کالم نویس ہی نہیں بلکہ اس کے تقسیم کار بھی رہے۔

اردو کے ریاست میں فروغ و فراغ کا ایک اور منظر ریاستی دربار کے سرکاری کاموں میں کھلتا۔ اس صدی کی کروٹ پر اس ریاست کے سب سے بااختیار ایوان یعنی ریاستی کابینہ کی ساری روئداد اردو میں ہی قلم بند ہوتی تھی اور ریاست کے آرکائیوز محکمے میں اب بھی نہایت خوبصورت خط اور بڑی پختہ اردو میں لکھی گئی روداد وں کی یہ کتابیں اس زبان کے اقتدار و رفعت کی گواہی دے رہی ہیں۔ کابینہ کے ان اجلاسوں کی صدارت مہاراجہ پرتاپ سنگھ بہ نفسِ نفیس کرتے۔ ایک ایسی ہی کارروائی کا اقتباس ملاحظہ ہو:

کارروائی جلسہ کونسل عالیہ ریاست جموں و کشمیر

مورخہ ۲۷ر اگست ۱۹۰۰ء بمقام سری نگر

حاضرین جلسہ

سری سرکار والا جی۔ سی۔ ایس۔ ای

راجہ امر سنگھ صاحب کے سی ایس آئی

رائے صاحب نرواس ایم۔ ای

خان بہادر غلام احمد خان صاحب

فیصلہ

تحریر ہوئے کہ اصول مندرجہ دفعہ (۴) دستور العمل

---

[1] : راقم الحروف کو یہ بات خود شیخ محمد عبداللہ نے بتائی ہے۔

مکرّر منظور کرتے ہوئے راجہ بلدیو سنگھ صاحب پونچھ کو
دربار کی تحریری اجازت پیشتر حاصل کرنے کے بغیر کسی
شخص رعایا انگریزی کو مبلغ للعہ روپے ماہوار سے
زیادہ تنخواہ پر ملازم رکھنے کا اختیار نہیں ہے' بہ لحاظ خط و
کتابت مندرجہ بالا دربار کی یہ رائے ہے کہ درحقیقت
تقرر بابو دیوی سنگھ کے بارہ میں دستورالعمل کی فی الواقعہ
تعمیل ہو گئی ہے۔

یہ امر واقعی حیران کن ہے کہ جب ریاست نے ۱۸۸۹ء کے بعد اُردو کو اپنی سرکاری زبان تسلیم کر لیا
اس وقت کس طرح اُردو کی بجائے انگریزی کو سرکاری کارروائی کی زبان بنا دیا گیا۔ حالانکہ ہندوستان
کے باقی صوبوں میں یہ رجحان بالکل مخالف سمت میں حاوی رہا۔ بہرکیف یہ بات بھی زیرِ نظر رکھی جانی
چاہیئے کہ اُردو کو ۱۹۲۰ء کے آتے آتے ریاست کی درباری سطح سے ہٹایا جانے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی
کہ سارے شمالی مغربی ہندوستان میں اُردو انقلابیوں اور باغیوں کی زبان بن گئی تھی اور اُن کی لپک کشمیر تک
پہنچ رہی تھی۔ کشمیر کے لوگ جنگ اور انقلاب کی خبریں "الہلال"، "ہمدرد"، "زمیندار" اور دوسرے
اُردو اخبارات و جرائد میں پڑھ رہے تھے اور ریاستی دربار میں جو عنصر چھا گیا تھا وہ اُردو کو اب دُشمن
زبان تصور کرنے لگا تھا۔ کشمیر میں تمدن پروری اور ادب نوازی کی فضا قائم کرنے میں خوشی محمد ناظر'
شاہ دین ہمایوں' محمد حسین عارف' منشی سراج الدین احمد خان' برج موہن کیفی اور دوسرے اُردو ادیبوں
نے جو حصہ لیا اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہوں نے حافظ و خیام کی روایات کو غالب اور میر کی معرفت
سے پھر تازہ کیا اور کشمیریوں کی نفسیات میں چھپے ہوئے ذوقِ فن کے سرچشموں کو پھر اذنِ رفتار عطا کیا۔
اس نشاۃ الثانیہ نے ایک تو کشمیری دانشوروں کو زمانے کی نئی لے سے ہمکنار کر دیا۔ دوسرے اس نے ذوق
کی تشنگی میں اپنا حصہ ادا کیا۔ بعد میں اسی روایت نے ادب اور صحافت کی دو الگ الگ شاخوں میں
بٹ کر کشمیر کے سارے اظہاری امکانات کا احاطہ کر دیا۔ اس روایت کا شعلہ شمیم احمد شمیم کے قلم میں روشن
ہوا' جس نے اپنی آتشبازی سے ادب اور صحافت کے ڈانڈے کچھ اس طرح ملا دیئے کہ اُن کے یہاں
صحافت' بہت اچھا ادب اور اچھا ادب' بہت اچھی صحافت معلوم ہوتے ہیں۔ محمد سعید مسعودی'
... پریم ناتھ بزاز اور اللہ رکھا ساغر (مدیر جاوید جموں) کو بھی اپنی طرزِ نگارش' اپنے صحافتی معرکہ

اردو نے کشمیر میں تدریس و تعلیم کے اُفق بھی روشن کر دیئے۔ اس صدی کی ابتدا میں جب میرواعظ رسول شاہ نے اپنا مدرسہ نصرۃ الاسلام شروع کیا تو اس کی تدریسی زبان اُردو تھی۔ کشمیر کے جن نوجوانوں اور رہنماؤں نے پہلے پہل کشمیر میں بیداری کا صور پھونکا، اُن میں بیشتر اسی مدرسے سے نکلے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب ایک انگریز ماہر تعلیم مسٹر شارپ نے ریاست کے تعلیمی نظام میں سُدھار کے متعلق اپنی سفارشات پیش کیں تو اُن میں اُردو اور ہندی رسم خط سکھانے پر زور دیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۰ء میں ایک اور ماہر کمیٹی نے صرف آسان اُردو کو ناگری اور فارسی رسم خطوط میں سکھانے پر زور دے کر اُس لسانی تقسیم کے بیج بو دیئے جس نے تدریسی میدان میں ریاست کو دو واضح خطوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

کشمیر کی سیاسی جد و جہد کے سارے منشور اُردو زبان میں ہی رکھے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں جب والسرائے لارڈ ریڈنگ سری نگر آئے اور اُن کا مہاراجہ نے استقبال کیا تو خانقاہ معلّٰی کے نزدیک شہر کے مسلمان عمایدین نے ان کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا۔ یہ میمورنڈم اُردو زبان میں ہی تھا اُن کے مطالبات کی شنوائی تو کیا ہوتی۔ البتہ ان میں سے سعدالدین شال، نورشاہ نقش بندی کو جلاوطن کیا گیا اور حسن شاہ نقش بندی کی جاگیر ضبط کر لی گئی اور میرواعظ صاحبان نے معذرت اور معافی لے کر چھٹکارا حاصل کر لیا۔

۱۹۳۱ء میں کشمیری نمایندگان نے مہاراجہ کو حسبِ اقرار جو میمورنڈم پیش کیا، اس کا اصل بھی اُردو ہی میں تھی اور یہ آج بھی محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ نے جن ابتدائی زمزموں سے کشمیریوں کے دل میں آزادی کی آگ لگا دی وہ اقبال، آغا حشر اور عبدالمجید سالک کے تھے۔ مثلاً

یا رب دلِ مُسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو تڑپا دے جو روح کو گرما دے

اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو (اقبال)

تمہیں سے اے مجاہدو جہاں کی ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے (عبدالمجید سالک)

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے
(آغا حشر)

اسی طرح مسلم کانفرنس کا پہلا خطبۂ صدارت جو شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۳۲ء پتھر مسجد سری نگر کے مقام پر پڑھا۔ وہ بھی اردو ہی میں تھا۔ شاید اردو کی انہی تہذیبی سماجی، سیاسی اور دوسرے روابط اور رواداری و رسم کا ہی پاس تھا کہ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے کنبے سے اردو کو دیس نکالا دیا گیا تو ریاست کی مادری زبانوں کی قیمت پر شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے کشمیری رہنماؤں نے ہراساں و پریشان اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان بنا کر پناہ دے دی۔

اردو کی گرفت کشمیر کے تمدن پر اتنی مضبوط ہے کہ اس کی پرچھائیاں ہمیں محمود گامی، رسول میر اور وہاب حاجنی جیسے شاعروں کے یہاں تو ملتی ہی ہیں، لیکن مہجور، راہی، نادم اور کامل جیسے کشمیری شاعر بھی اردو کے مے خانے سے ہی خم لنڈھا کر اپنی زبان میں مستی بکھیرنے کے لیے آ گئے۔

ان سبھی شعراء کی اردو نظمیں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی آوازوں پر اردو کے شعرا مثلاً غالب، اقبال، جوش، احسان دانش، اختر شیرانی، ناصر کاظمی وغیرہ کی جو چھاپ رہی تھی وہ پیمانہ تبدیل کرنے کے بعد بھی قائم رہی اور ان کی نظموں اور غزلوں میں اردو کے تصورات و تاثرات ایک نیا قالب بدل کر نمودار ہوتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی

منٹو اور کشمیر

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سیاسی حالات کے پیشِ نظر کشمیر کی آبادی کا ایک حصّہ کشمیر سے نکل کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوا اور اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے اپنے لیے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان ہجرت کرنے والے خاندانوں میں کئی ایسے لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان میں سے بعض ایسے مشاہیر کے نام ملتے ہیں، جن کی تخلیقات نے اردو شعر و ادب کے دامن کو مالامال کر دیا۔ ان میں سے اقبالؔ، چکبستؔ، سرشارؔ، دیا شنکر نسیمؔ، مومنؔ، آنندؔ، تربھون ناتھ ہجرؔ، علامہ کیفیؔ، آغا حشرؔ، راما نند ساگرؔ، قدرت اللہ شہابؔ اور دوسرے لوگ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی فہرست میں سعادت حسن منٹوؔ کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو کے افسانوی ادب میں اپنے تخلیقی شعور کی مدد سے گراں بہا اضافے کیے اور اردو افسانے کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔

منٹوؔ کشمیری الاصل تھے۔ ان کے بزرگ علامہ اقبالؔ کی طرح کشمیری پنڈت تھے۔ وہ برہمنوں کی سارسوت شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں بس گئے تھے۔ اس کی تصدیق خود منٹوؔ اور اُن کے دوستوں نے کی ہے۔ منٹوؔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

> "میں کشمیری ہوں۔ بہت عرصہ ہوا، ہمارے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور مسلمان ہو گئے۔"

کرشن چندر نے منٹوؔ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اپنے کتابچہ "سعادت حسن منٹوؔ" میں انھوں نے منٹوؔ کو کشمیری ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وقت گذرنے کے باوجود منٹوؔ کا مزاج کشمیری ہی رہا [illegible] اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں:

"مزاج، جسم اور روح کے اعتبار سے منٹو ٹھیٹ کشمیری پنڈت ہے۔"

منٹو کو اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اُن کی [illegible] میں جگہ جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ کشمیر کا ذکر کرنے سے کبھی نہیں کتراتے تھے۔ بلکہ اپنے آپ کو "ہاتو" کہلانا بھی پسند کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں:

"میں کشمیری ہوں ——— ایک ہاتو"

اپنی کتاب لاؤڈ اسپیکر میں اعتراف کرتے ہیں:

"میں بھی کشمیری ہوں۔ مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں، جو اپنی بیویوں سے بُرا سلوک کریں۔"

اُن کے ایک دوست محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب "منٹو — میرا دوست" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کشمیر سے والہانہ عشق کرتے تھے اور اس کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اگر کبھی کوئی امرتسری یا کشمیری آدمی ان کی طرف آنکلتا تو اس سے بڑے بے تکلف ہو جاتے۔ بار بار اس کو بتلاتے تھے کہ میں بھی کشمیری ہوں، ویسے امرتسری ہوں۔ عالم یہ ہوتا تھا کہ بار بار ناک صاف کر رہے ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہیں۔ اُٹھ اُٹھ کر اندر جا کر ایک پیگ چڑھا رہے ہیں اور امرتسر اور کشمیر کی باتیں کر رہے ہیں۔"

اُن کے لنگوٹیے ابو سعید قریشی نے بھی اپنی کتاب "منٹو" میں منٹو کی کشمیر سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اُسے اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا۔"

منٹو کی کئی پُشتیں امرتسر میں رہتی آئی تھیں، لہٰذا امرتسر کی گلی گلی سے وہ واقف تھے اور امرتسر کے ذکر سے اُن پر والہانہ کیفیت طاری ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود کشمیر ان کی دوسری کمزوری تھی۔ منٹو نے کشمیر سے یہ محبت وراثت میں پائی تھی۔ ان کے والد مولوی غلام حسن بھی کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کشمیری وضع کی پگڑی پہنتے تھے اور ان کا [illegible] کشمیریوں سے ملتا جلتا تھا۔ وہ کشمیریوں سے اس طرح ملتے تھے جیسے وہ ان کے جسم کا ایک انگ ہوں۔ [illegible] بزرگوار کے کشمیریوں سے عشق کا ذکر منٹو نے اپنے ایک مضمون "شاعرِ کشمیر مہجور" میں یوں کیا ہے:

"میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اسی عشق کے زیرِ اثر کسی ہاتو [illegible] کو پکڑ کر لے آتے [illegible] کیا کرتے تھے اور اسے بیٹھک میں [illegible] فرش پر [illegible] کھلاتے تھے۔"

میں بھی کاشر ہوں ؎

منٹو کو اکثر منٹوؔ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کہنا غلط ہے۔ منٹوؔ ان کے خاندانی نام "منٹ" سے ماخوذ ہے جو کشمیر میں ۱/۲ سیر کے بٹ کے طور پر استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہ نام اب بگڑتے بگڑتے منٹو ہو گیا ہے۔ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں خود لکھا ہے :

"کشمیر کی وادیوں میں بہت سی ذاتیں ہوتی ہیں، جن کو "آل" کہتے ہیں۔
جیسے نہرو، سپرو، کچلو وغیرہ وغیرہ۔ منٹ کشمیری زبان میں تولنے والے بٹے
کو کہتے ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد اتنے امیر تھے کہ اپنا سونا چاندی بٹوں میں
تول تول کر رکھتے تھے ؎"

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ منٹوؔ نے اپنی ذات کے بارے میں جو کلیہ پیش کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ البتہ یہ بات واضح کرنا لازمی ہے کہ منٹو ذات کے لوگ اس وقت بھی کشمیر میں ملتے ہیں اور ان کا پیشہ اکثر حالتوں میں تجارت ہے اور ان کی ذات "منٹ" یعنی ۱/۲ سیر کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ "منٹو اور من وٹی" دراصل قسط باشی پنڈتوں کی ذاتیں ہیں۔ فوقؔ کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے آگے چل کر اسلام قبول کر لیا وہ منٹو کہلائے اور جو ہندو رہے وہ "من وٹی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

منٹو کے خاندان کے ایک بزرگ خواجہ رحمت اللہ تھے، جن کا پیشہ سوداگری تھا۔ وہ اس خاندان کے پہلے بزرگ تھے جو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آ کر مقیم ہو گئے۔ ان کے پوتے خواجہ جمال الدین سکھوں کے عہدِ حکومت میں امرتسر چلے گئے اور پشمینہ سازی کے کام کو فروغ دیا اور اسے صرف لاہور تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ امرتسر اور بمبئی تک پھیلا دیا۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی غلام حسن تھے جو بعد میں سب جج ہوئے۔ مولوی غلام حسن کے بارہ[۱۲] بچوں میں سے ایک سعادت حسن منٹو تھے۔ لاہور اور امرتسر میں رہائش کے باوجود منٹو خاندان کے طرزِ حیات میں کافی عرصے تک کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ اس خاندان کے افراد کے نام بھی خالص کشمیری سے رہے۔ مثلاً حمزہ جو، رسول جو، احمد جو، تاج مالی، زون مالی، وغیرہ۔ یہ نام آج بھی ہمارے یہاں ملتے ہیں۔

منٹو کی شادی بھی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس میں ان کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی مرضی کا زبردست ہاتھ تھا۔ ان کی بیوی محترمہ صفیہ منٹو جو بقیدِ حیات ہیں[۱] افریقہ کے مشہور

---

۱ : ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

ی کارکن خواجہ شمس الدین کی بھتیجی تھیں۔ ان کے تایا افریقہ کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور جب منٹو کے ساتھ شتہ کی بات چیت ہو رہی تھی تو وہ افریقہ سے منٹو کو دیکھنے کے لیے بمبئی آئے۔ صفیہ جی کے والد کا ندان سال ہا سال سے افریقہ میں رہایش پذیر تھا۔ وہاں منٹو کے دو بڑے بھائی بھی بیرسٹری کرتے ہے تھے لہٰذا ان کو رشتہ پسند آیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ خود کشمیری الاصل تھے۔ لہٰذا لڑکی کا رشتہ کشمیری خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ صفیہ جی کے والد افریقہ میں پولیس انسپکٹر تھے لیکن وہیں کسی ی نے انھیں بلوے میں قتل کر دیا تھا۔ اب ان کے چچا ہی ان کی پرورش کرتے تھے۔ منٹو نے اپنی زندگی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی لیکن یہ جان کر منٹو کو خود بھی تعجب ہوا کہ وہ اس رشتے پر رضامند ہو گئے۔

منٹو نے شادی سے پہلے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ماں نے انھیں بتایا تھا کہ لڑکی بڑی ہشیار اور سلیقہ مند ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کشمیری ہے۔ منٹو اس سے بہت خوش ہوئے۔ انھیں جو کچھ معلوم ہوا، اس کی تفصیل مزے لے لے کر اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو اپنے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں :

"میری شادی مکمل طور نہیں ہوی ہے میں صرف" نکاحیا "گیا ہوں۔ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا باپ بھی زندہ نہیں۔ وہ چشمہ لگاتی ہے میں بھی چشمہ لگاتا ہوں۔ وہ ۱۱ مئی کو پیدا ہوی، میں بھی ۱۱ مئی کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں چشمہ لگاتی ہے، میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے۔ اس کے نام کا پہلا حرف S ہے۔ میرے نام کا پہلا حرف بھی S ہے ..."

منٹو کو زندگی بھر افسوس رہا کہ انہوں نے کبھی اپنی کھلی آنکھوں سے کشمیر کو نہیں دیکھا۔ وہ صرف بٹوٹ ب اس زمانے میں آئے تھے جب انھیں دق کا مریض قرار دے کر علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ ں وہ صرف تین ماہ رہے لیکن صحت پھر بھی سنبھل نہ سکی۔ یہیں ان کا پہلا عشق پروان چڑھا۔ جس نے کے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ اس عشق کی پرچھائیاں ان کے بہت سے افسانوں میں صاف طور پر نظر آتی ہیں ایک خط"، "بیگو"، "مصری کی ڈلی"، "لالٹین" وغیرہ اس ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ منٹو کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ کشمیری زبان لکھ اور بول نہیں سکتے تھے۔ مہجور کی شاعری کے جو تراجم انہوں نے پڑھے تھے ہے وہ مہجور کے پرستار بن چکے تھے۔ خاص طور پر جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ مہجور نے ظلم و ستم کر بھی اپنے والدین کی طرح ترکِ وطن نہیں کیا تھا تو ان کے دل میں مہجور کی توقیر اور بھی بڑھ گئی تھی۔

مہجور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے ندامت ہے کہ میرے آباواجداد نے ہجرت کی۔ جوروستم سہنا بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے۔ مہجور نے ظلم وستم سہے' اس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے' برداشت کی' مگر وہ ڈٹا رہا' ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں نہ آیا..... مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال ہے۔..."

منٹو ہند وپاک کشیدگی سے ناخوش تھے۔ آخر میں اس بات سے بے حد قلق تھا کہ ہندوستان و پاکستان کے سربراہ دونوں کشمیری ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر مہجور زندہ ہوتے تو حالت کچھ اور ہوتی۔ (حالانکہ ۴۷ء کی کشیدگی کے وقت مہجور زندہ تھے) اپنے شاعرانہ اور جذباتی نقطۂ نگاہ کو انہوں نے اپنے مضمون " شاعرِ کشمیر۔ مہجور کشمیری" میں یوں بیان کیا ہے:

" اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں' ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہرلال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو' ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہرلال نہرو بھی۔ یہ ناظم الدین ہے' دونوں کشمیری ہو...' تم گوگجی اور بتہ (شلغم اور چاول) کے ایسے دسترخوان سے کبھی نکال نہیں سکتے ہو۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو؟ شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ' کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو۔"

منٹو کی اکثر تحریروں میں کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر ملتا ہے ان کی بعض کہانیاں کشمیر اور کشمیر کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے تنازعے پر ان کی کہانیاں " آخری سلیوٹ' ٹیٹوال کا کتا" وغیرہ اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں منٹو کی انسان دوستی سے دھڑکتی ہوئی روح صاف نظر آتی ہے۔ جہاں مذہب' رنگ اور نسل کا کوئی بھید و بھاؤ نہیں۔

ان کہانیوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کشمیر ان کا سب سے بڑا مرکز عقیدت تھا۔

جیلانی بانو

اب انصاف ہونے والا ہے

"کھڑکی بند کر دو۔" ڈاکٹر شاہد حسین کی گرج دار آواز کمرے میں گونجتی ہے۔

"نہیں نہیں کھڑکی کھول دو۔" آئینہ آہستہ سے کہتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھ کر آہستہ آہستہ سسکیاں لیتی ہے کیوں کہ وہ ہر وفا شعار بیوی کی طرح اپنی سسکیوں کو حلق سے نیچے اُتار سکتی ہے کیونکہ ڈاکٹر شاہد حسین ہر محبت کرنے والے شوہر کی طرح بیوی کی سسکیوں کو برداشت نہیں کر سکتے یوں بھی ماہر سماجیات ڈاکٹر شاہد حسین، جس وقت لکھ رہے ہوتے تو وہ اپنے آپ کو بڑے اہم لگتے تھے۔ ان کی ہر بات پھول ہوتی اور ہر پھول گلاب۔ ایسے وقت دنیا انھیں بڑی حقیر سی نظر آتی تھی اور اگر آئینہ کو دیکھنا ہوتا انھیں ــــــ مگر اس کی کیا ضرورت تھی ــــ؟

آئینہ نے پیاز کی ڈلی کی طرح اپنا وپر مصلحتوں اور قربانیوں کے اتنے پرت چڑھا لیے تھے کہ اس کا انت کہیں نہیں تھا اور ڈاکٹر شاہد حسین کو اُلجھے دھاگوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔

کئی لفظ دوسروں کے منہ سے خنجر کی نوک بن کر نکلتے ہیں اور پھر کلیجے کے پار ــــــ

ڈاکٹر شاہد حسین بھی دن میں کئی بار آئینہ کو قتل کرتے ہیں پھر رات کو جب ان کا پُر جوش صحت مند بدن آئینہ کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے تو آئینہ مصری کی ڈلی بن کر گھلنے لگتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ مگر دن کا اُجالا اسے پھر ایک تھکی ہوئی بیمار عورت کے وجود میں اکیلا پلنگ پر پٹک دیتا ہے۔ اب رات کا سمندر شانت ہو چکا ہے اس لیے وہ دونوں پھر اجنبی سے بن جاتے ہیں۔ کمرے کی وسعت پھیلنے لگتی ہے ــــــ ماہر سماجیات ڈاکٹر شاہد حسین اپنے کمرے میں بند ہو کر ہندوستان کے سماجی حالات پر بہت اہم پیپر تیار کر رہے ہیں بھلا اتنا اہم کام کہیں اس طرح ہو سکتا ہے کہ باہر کی تیز ہوا ہر بار اپنے ساتھ نیچے کھینچ لے اور میز پر رکھا ہوا ہندوستان کے سماجی مسائل کا حل چاروں طرف بکھر جائے!

"کھڑکی بند کردو۔" ڈاکٹر شاہد حسین کہنے سے پہلے ہر بات کو تولتے ہیں، پھر بولتے ہیں۔

"کھڑکی کھول دیجیے نا۔" آئینہ فریادی لہجے میں کہتی ہے۔

ماہر سماجیات ڈاکٹر شاہد حسین اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ کھڑکی بند ہو جائے تو تازہ نہیں آتی ——— ؟ اور تازہ ہوا اندر نہ آئے تو کوئی عورت

"مردوں کی بات الگ ہے کہ وہ سماجی حالات پر غور کرنے کے لیے ایک : کافی سمجھتے ہیں مگر عورت ذات اپنی کھڑکیاں بند کر لے تو نیے مسائل

یوں تو تازہ ہوا گھر میں سکون کے ساتھ بیٹھ کر والے سارے دانشوروں کے لیے" مگر سب سے بڑھ کر آئینہ کے لیے ہے اس کا دل زیادہ خراب ہے یا جگر۔ گردے بدلنا ہیں یا ڈاکٹر یہ فیصلہ نہیں کر پاتے۔

اور یہ سب مرض کھلی کھڑکی کے راستے اندر آتے ہیں ——— ڈاکٹر شاہد حسین آئینہ کے علاوہ والے ڈاکٹروں سے یہی بات کہتے ہیں اور اسی لیے آئینہ کی اس خوف زدہ بیمار التجا کو ڈاکٹر شاہد اپنے علم و دانش کی قینچی سے کاٹ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسین کے ساتھ دنیا کے تمام دانشور کم سے کم ایک بات پر ضرور متفق ہو سکے کھلی کھڑکی کے بے شمار نقصان ہیں اسی لیے وہ لوگ ہمیشہ اپنی کھڑکیاں بند رکھتے ہیں اور ان لوگوں تک پہنچانے کے لیے ان کے محلوں میں لٹکے ہوئے سونے کے گھنٹے مظلوموں کو بجانا پڑتے ہیں تاکہ ان آواز سن کر سارے شہر کے لوگ اکھٹے ہو جائیں۔ چونک پڑیں کہ اب انصاف ہونے والا ہے۔

کس کے ساتھ انصاف ہونے والا ہے۔

یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھنے کے لیے آئینہ بھی بڑی مشکل سے اٹھتی ہے یوں جیسے کوئی اُسے کھینچے لیے جا رہی ہو۔ وہ مضبوطی کے ساتھ گرل پکڑ لیتی ہے اس کے باوجود کوئی سحر اسے اڑا لے جاتا ہے۔ آئینہ کے اس مرض کی تفصیل کئی بار ڈاکٹر شاہد حسین نے ڈاکٹروں کو سنائی ہے اور بڑی تشویش بھری نظروں سے آئینہ کو دیکھا ہے۔

"آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔"

وہ جانتی ہے کہ ڈاکٹر اتنے خوفناک مرض کا نام اس کے سامنے لینا نہیں چاہتے۔ وہ جانتی ہے کہ ڈاکٹر شاہد حسین اب اس کی تیمارداری سے تھک چکے ہیں۔ عورت کی چھٹی حس سمجھا دیتی ہے کہ ڈاکٹر شاہد حسین کا بلا وجہ کا پیار دراصل ان کی نفرت کا اظہار ہے کیوں کہ پیار میں

پتہ تو پیرا محق سے احمق عورت کو پل بھر میں چل جاتا ہے اسی لیے آیینہ بازی ہارنے کو تیار نہیں۔ کوئی نہ کوئی مہرہ آگے بڑھا دیئے جاتی ہے ہر عورت کی طرح کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول لیتی ہے۔

ہر بار کھڑکی کھولنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اب آیینہ خوف سے ہانپتی کانپتی پلنگ پر گر جائے گی ساتھ ہی اس کا بلڈ پریشر اپنا توازن کھو دے گا پھر اس کی کراہوں میں ہندوستان کے سارے سماجی مسائل ایک طرف دھرے رہ جائیں گے اور ڈاکٹر شاہد حسین قلم پٹک کر اٹھ جائیں گے کیوں کہ اب انھیں آیینہ کے ساتھ بڑے محبت بھرے ڈائیلاگس ادا کرنا ہیں۔

ڈرگیش میری جان۔ آنکھیں کھولو' دوا لے لو" ڈاکٹر شاہد حسین پہلے ہر بات تولتے ہیں پھر بولتے ہیں اور بعض وقت تو صرف تولتے رہ جاتے ہیں اسی لیے تو کمرے کی دم گھٹا دینے والی فضا میں یہ لفظ بےگانہ سا لگتا ہے' اب جس کا نام پیار ہے اس لیے ڈارلنگ آنکھیں نہیں کھولتی اور وہ دواؤں کی الماری کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہ وٹامن بی ہے' قوت بڑھانے کے لیے۔ یہ کرومن ڈراپس ہیں کو جگانے کے لیے۔ دواؤں کے ڈھیر ہیں ڈاکٹر شاہد حسین کو وہ دوا ڈھونڈنا پڑتی ہے جو آیینہ کو صرف اس وقت کھلانا چاہیئے جب "ہوٹل فردوس" کے بیرے چھوٹی پترولیاں سڑک پر پھینکتے ہیں اور ایک قیامت کا شور اوپر اٹھتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے دلچسپ تماشہ ہے۔ آیینہ اس وقت کا بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی ہے جیسے ایک بھاری پتھر اس کے سر پر گرنے والا ہو۔ پھر کھڑکی کھولتے ہی اسے جانے کیا ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی پھسلتی ہوئی اس ہجوم میں مل جاتی ہے۔

چھوٹی پترولیاں چاٹنے کے لیے پیروں تلے مسلے ہوئے چاول کھانے کے لیے دھکم پیل میں اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے' لوگ اسے روند ڈالتے ہیں ڈاکٹر شاہد حسین دواؤں کی ساری الماری الٹ پلٹ کر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر آدم نے آیینہ کی اس غیر یقینی بیماری کو دیکھ کر یہاں ہر مرض کی دوا رکھ دی ہے۔

گھبرا کر ڈاکٹر شاہد حسین کو اپنے پڑوسیوں سے مشورہ کرنا پڑا۔ یہ تو پوری کالونی معزز لوگوں کی ہے۔ ایک سے ایک مشہور آدمی یہاں رہتے ہیں۔ مشہور ستار نواز باسو چٹرجی' مشہور سوشیل ورکر سوم ناتھ ریڈی' مشہور ڈانسر اروشی ــــــ اور مشہور ــــــ مشہور ــــــ

ان شاندار فلیٹوں میں رہنے والے سارے جینئس لوگ کسی نہ کسی خوفناک بیماری میں مبتلا ہیں اب ایسی فضائیں ان کے لیے زہر بن چکی ہیں۔ وہ "ہوٹل فردوس" کے نیچے مٹی میں ملے ہوئے چاول کھانے والوں کو بڑی حسرت بھری نظروں سے تاکا کرتے ہیں۔

"ان کمبختوں کو ہائپر ٹینشن ہوتا ہے نہ بلڈ پریشر بڑھتا ہے" مسز وحیدالدین جل کر کہتی ہیں۔
"میں تو بچے کے شور کی وجہ سے صحیح ریاض نہیں کر سکتا" ہاسو چیڑی ہیرے کی انگوٹھیوں والے ہاتھ کو لہرا کر کہتے ہیں۔
"میری نئی دلہن گھر میں ہے، دن بھر یہ بھکاری ہماری کھڑکیوں کی طرف تاکا کرتے ہیں"
انسپکٹر جمال غصہ میں کہہ رہا ہے
"اور میری بیوی ـــــ میری ما ـــــ میری بیوی تو ان بھکاریوں کو ـــــ" ڈاکٹر شاہد حسین بات کرنے سے پہلے بات کو تولتے ہیں اور کبھی جھکتے پلڑے کو ہاتھ سے تھامنا بھی پڑتا ہے۔
چنانچہ اس سے پہلے کہ بھیروں کے شدہ سروں میں کوئی کھوٹ آئے "ہوٹل فردوس" کے مالک سے کہا گیا کہ وہ اس تماشے کو بند کر دے۔
اب امینہ چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی ہے۔ اتنی اکیلی بھی نہیں..... ڈاکٹر شاہد حسین کی شخصیت پورے کمرے میں چھائی رہتی ہے۔
اچانک چاروں طرف سونے کے گھنٹے بجنے لگے۔ اب کسی کے ساتھ انصاف ہونے والا ہے۔
امینہ گھبرا کر اٹھی اور گرتی پڑتی دوڑی، کھڑکی کی طرف، جدھر سے فردوس کی ہوا آتی ہے مگر اب ہوٹل کا مینیجر جھوٹی پتر ولیاں امینہ کے فلیٹ کے سامنے کوڑے کے ڈرم میں پھنکوا رہا تھا۔ اس لیے تمام منتظر بھوکے مکھیوں کی طرح کوڑے کے ڈرم پر ٹوٹ پڑے۔ پتر ولیوں پھینکے ہوئے چاولوں کے ساتھ ساتھ بہت سا کوڑا کرکٹ بھی چٹ کر گئے۔ خیر اس بات پر کسی نے بھی احتجاج ضروری نہیں سمجھا کہ یہ بھوکوں کا اپنا ذاتی معاملہ تھا اور ایک جمہوری ملک میں آپ کون ہوتے ہیں کہ کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے والے۔ اسی لیے تو انسپکٹر جمال اپنی دلہن کو مار رہا ہے تو مجال ہے کہ کوئی مہذب پڑوسی ادھر پلٹ کر دیکھے۔ مگر امینہ کو کہاں قرار۔ وہ کھڑکی کی گرل پکڑ کر چلانے لگی۔ "انصاف انصاف۔ جمال اپنی دلہن کو مار رہا ہے"
"چپ چپ" جمال کی اماں نے آکر روتی ہوئی دلہن کے منہ پر ہاتھ رکھا۔
"تم ہٹ جاؤ اماں، آج میں اس کا قصہ ختم کر ڈالوں گا" جمال نے اماں کو ہٹا کر اپنی کھڑکی بند کر لی۔
اچھا کیا۔ ڈاکٹر شاہد حسین ٹھیک کہتے ہیں کہ پڑوسی کی کھڑکی میں نہیں جھانکنا چاہیے۔ اب مجال ہے کہ کوئی جمال کی دلہن کی چیخیں سن سکے۔ اب جمال کی فریاد سننے کے لیے کوئی سونے کے گھنٹے بجاؤ۔ بیچارہ کتنا مظلوم ہے۔ خسر نے پچاس ہزار کا جہیز دینے کا وعدہ کر کے تیس ہزار میں ایک دبلی پتلی لڑکی سونپ دی اور پھر ستم یہ کہ عید کی سلامی پر اسکوٹر بھی نہ موٹر۔ اگر کھلے منہ میں لڈو جانے والے جوان اور

جلتا ہے۔ تب کتنا ہی جلتا ہے نا۔۔۔؟

کانپتے پیروں سے کھڑکی کی گرل پکڑے امینہ کب سے منتظر کھڑی ہے کہ جمال نے دلہن کا مزاج درست کیا یا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ سینے سے اٹھنے والا دھواں پورے کمرے میں پھیلنے لگا۔

"آگ۔ آگ۔" امینہ چلانے لگی۔ ڈاکٹر شاہد حسین گھبرا کر اُٹھے۔ ہندوستان کے سماجی نظام پر لکھے ہوئے اُن کے کاغذ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ وہ پہلے کھڑکی کی طرف آئے اور پھر الماری کی طرف، "اس دوا کا نام جان لیا ہے، جو کسی لڑکی کو جلانے کا منظر دیکھنے والوں کو کھلانا چاہیئے؟

"ٹن۔۔۔ ٹن ٹن۔۔۔ دروازے کی بیل بجتی ہے۔

"پولیس والے ہوں گے۔ گواہی لینے آئے ہیں۔ بس اب انصاف ہونے والا ہے۔"

امینہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔ "ہاں میں نے دیکھا ہے۔ پہلے اس نے جوتے سے۔۔۔ اور۔۔۔ اور پھر"

"اور پھر ہم نے کھڑکی بند کر لی۔" ڈاکٹر شاہد حسین نے جلدی سے امینہ کی بات چھین لی۔

"بات دراصل یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ میں بہت معروف آدمی ہوں۔ ہندوستان کے سماجی مسائل پر غور کرنے سے مجھے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ عورتوں کی چیخ پکار پہ وقت ضائع۔۔"

"ڈاکٹر شاہد حسین پہلے ہر بات کو تولتے ہیں۔ پھر بولتے ہیں۔ اسی لیے بعض وقت انھیں ڈنڈی بھی مارنا پڑتی ہے۔

پھر امینہ دو تین گھنٹے تک چپ چاپ لیٹی رہی۔ جمال کی دلہن کی ٹھنڈی لاش کی طرح!

مگر جانوروں کی طرح بعض انسان بھی دہشت کی بو پا لیتے ہیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

"کھڑکی کھول دو۔ خدا کے لیے۔" اس کے لہجے میں خوشامد تھی۔

"خدا کے لیے۔؟" ڈاکٹر شاہد حسین نے قلم روک کر بڑی غصہ بھری نظروں سے امینہ کو دیکھا۔ انہوں نے خدا کو بھی وقت پڑنے پر امینہ کی طرح چاہا تھا اور وقت نکلنے پر امینہ کی طرح نظر انداز بھی کر چکے تھے، اس لیے اس وقت، اس چپ چاپ کمرے کی اُداس فضا میں خدا کا کیا بیچ تھا۔۔۔؟ مگر شاید یہ ایک نئی دلہن کے جلے ہوئے بدن کی خوشبو کا اثر تھا، جو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے امینہ یہ بات جان چکی ہے کہ آپ ڈاکٹر شاہد حسین صرف اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر شاہد حسین نے دُنیا کے سارے مسائل حل کر ڈالے۔ مگر عورت کی گتھی سلجھانے کے لیے انھیں [illegible] قلم روکنا پڑتا تھا۔

کمرے کی خاموشی بڑھنے لگی۔ امینہ کو یوں لگا جیسے وہ دونوں وہم کی مدھم سی دھند میں گم ہو رہے ہوں۔ اندھیرا پھیل چکا ہے مگر اس کمرے میں روشنی ہونے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد حسین کاغذ پر اپنے خیالات کا اظہار ہمیشہ آنکھ بند کر کے کرتے رہے ہیں اور امینہ ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر اندھیرے میں پڑھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ اب وہ اس دواؤں بھرے کمرے سے وہ بہت دور نکل آئی ہے۔ اسے اپنے کمرے کا یہ منظر ایک پینٹنگ کی طرح نظر آ رہا ہے۔ ڈاکٹر شاہد حسین ایک پورٹریٹ تھے۔ دائروں ہی دائروں سے بنائی ہوئی ایک تصویر ـــــ

"ہوٹل فردوس" کے نیچے بیٹھنے والی بھکارن زور زور سے چلا رہی ہے۔ آمینہ پھر نیچے کی طرف لوٹ آتی ہے اس پینٹنگ کا ایک حصّہ بننے کے لیے۔ اُس بھکارن کا بچّہ کسی حادثے میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کہنیوں کے پاس سے ہاتھ مڑے ہوئے۔ آنکھوں کی جگہ گڑھے اور ایک ٹانگ غائب۔ امینہ کو یوں لگا جیسے کسی نے غصّے میں اسے توڑ ڈالا ہو۔ جبھی تو لوگ بھکارن پر پیسے پھینکتے ہوئے جاتے ہیں۔ دوسرے بھکاری اس پر خوب جلتے۔ اپاہج بچّے کی ماں بن کر موج اُڑاتی ہے سالی ـــ

مجبوراً امینہ کو پھر اُٹھ کر کھڑکی کھولنا پڑی۔

سامنے والے اسٹاپ پر ہر منٹ کے بعد ایک بس آ کر رُکتی ہے' لوگ بھاگتے ہوئے اس میں سوار ہو جاتے ہیں' مگر وہ لڑکی کیوں نہیں جاتی۔ دس گیارہ برس کی ایک خوبصورت سی لڑکی اسکول یونیفارم پہنے گلے میں بستہ ڈالے جانے کب سے اپنی بس کا انتظار کر رہی ہے

کھڑے کھڑے آمینہ کے پاؤں دُکھ گئے۔ مگر وہ اس بچّی کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔ لو۔ اسے لے جانے والے آگئے۔ ایک آٹو رکشا رُکا۔ چار غنڈے اُترے۔ انھوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ چیختی چلاتی لڑکی کو اُٹھا کر آٹو میں ڈالا اور چل دیے ـــ انھیں روکو ـــ امینہ چلائی مگر اس کی آواز ٹریفک کے اس سپاہی تک بھی نہیں پہنچے گی جو بیچ چوراہے پر کھڑا غلط راستہ چلنے والوں کو روکتا ہے۔ اس نے آٹو کو نہیں روکا کیونکہ وہ لڑکی وہیں جا رہی تھی جہاں اسے جانا چاہیے۔

"اُسے روکو ـــ اُسے پکڑو" امینہ نے کانپتے ہوئے ڈاکٹر شاہد حسین سے التجا کی اور انہوں نے بیزار ہو کر سماجی کام کی بحث کو روک دیا۔ کھلا ہوا قلم پیڈ پر رکھا۔ سگار ایش ٹرے میں پھینکا اور اُٹھ کر کھڑکی تک آئے۔ مگر امینہ تو اب اپنی بیماری سارے کمرے میں گھول چکی تھی۔

"اب کون سی دوا دوں؟" وہ فی الحال بولنے کے موڈ میں تھے نہ تولنے کے۔

مگر اب کوئی دوا کام نہیں آئے گی۔ دس برس کی بچّی اور چار غنڈے ـــــ دہشت کے مارے امینہ

کراہنے لگی۔

گھبرا کر ڈاکٹر شاہد حسین وہ دوا ڈھونڈنے لگے جو خون میں لت پت عورت کو دم توڑتے وقت دینا چاہیئے۔ مگر امینہ نے دوا کا گلاس ہاتھ سے جھٹک دیا۔

"سونے کے گھنگھرو بجاؤنا..... بجاؤنا ...."

جھنجھلا کر ڈاکٹر شاہد حسین نے پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ ایک یہی سڑک کیا وہ سال میں کئی بار کسی نہ کسی ملک کے ہونے والے سیمناروں میں شرکت کرنے جاتے ہیں مگر انھیں کہیں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی۔

"انصاف .... انصاف ...." بے ہوشی میں امینہ بڑبڑا رہی ہے۔

دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ڈاکٹر شاہد حسین بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد کسی کے رونے چلانے پر انہوں نے سر اٹھایا۔ امینہ کھڑکی کی گرل پکڑے باہر کی طرف جھکی کھڑی تھی اور سسکیاں لے رہی تھی۔ اب انھیں پھر دوا ڈھونڈنے سے پہلے مرض تلاش کرنا ہے.... معلوم ہوا کہ بھکارن کا اپاہج بچہ کوئی جدا کر کے لے گیا۔

تمنا کی آگ بڑی بلا ہوتی ہے۔ اس کے رونے پر ڈاکٹر شاہد حسین کو بھی افسوس ہوا۔ کوئی حد ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے اسی سڑک پر ایک لڑکی کا اغوا ہوا اور اب ایک بچے کی چوری۔

امینہ حسب عادت روتے روتے پھر بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر شاہد حسین نے گھبرا کے اسے کئی دوائیں ایک ساتھ کھلا دیں۔ ڈاکٹر آدم نے نئے سرے سے اس کے سارے چیک اپ کیے اور پھر ڈاکٹر شاہد حسین کا اہم تحریری مقالہ تیار ہوگیا کیونکہ اب یہ سڑک بالکل بڑی سنسان پڑی رہتی تھی۔ بھکارن کی جگہ ایک طوطے کے پنجرے والا نجومی بیٹھنے لگا۔ اس لیے ساری کالونی اپنے نصیبوں کا حال سُن کر سہم چکی تھی مگر ایک دن اس نجومی کی قسمت پر بھی زحل کا منحوس سایہ منڈلانے لگا۔ امینہ نے دیکھا کہ وہی بھکارن اپنی گدڑی سنبھالے پھر آگئی اور اس گدڑی میں سے اس نے ایک لعل نکالا۔ سال بھر کی دم توڑتی ہوئی بچی۔ آنکھوں کی جگہ دو گڑھے آسمان کی طرف مڑتے ہوئے... ایک ٹانگ غائب ـــ

"کھڑکی بند کر دو... بند کر دو اب ـــ" امینہ زور سے چلائی اور گرل چھوڑ کر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ ماہرِ سماجیات ڈاکٹر شاہد حسین نے عینک نیچے سرکائے بغور سڑک پر دیکھا مگر انھیں اتنا خوفناک منظر کوئی نظر نہ آیا۔ امینہ آج کھڑکی بند کرنے کا فیصلہ کر ڈالے۔ "اٹھو اٹھو امینہ ـــ اب انصاف ہونے والا ہے ـــ" وہ حسب عادت اپنے سے پہلے تولنے بیٹھ گئے۔ ●

نیّر جہاں (امریکہ)

پیچھے مُڑ کے دیکھا تو پتھر کے ہو جاؤ گے

ہم اپنی مصروف زندگی میں
وہ چند لمحے کہاں سے لائیں
وہ چند لمحے کہ جن میں اپنے
اُداس دل کی دھڑکتی راہوں کو
چند مانوس آہٹیں دیں
کہ پھر محبت کی نرم چھاؤں میں بیٹھ جائیں
[illegible] لہو ٹپک ٹپک کر
حساب دیں ان اذیتوں کا
کہ جن کی شدّت سے لمحہ لمحہ لہولہان تھا
کہ جن کو عزم اور حوصلے سے
نمائش خوش سلیقگی سے
نگاہ و قلب و جگر میں محصور ہم نے رکھا
حساب دیں ان قیامتوں کا
جُدائی کی تیرہ و تار ساعتوں کا
عذاب کی سی رفاقتوں کا
جو ہم نے مانگیں نہ ہم نے چاہیں
مگر ہمارا نصیب تھا جو

تمہاری راہوں سے آج میرا گذر نہیں ہے
مگر یہ کیا ہے
تمہارے احساس کی فضا میں
مری محبت کی سبز و شاداب فرحتیں ہیں
مرے زمان و مکان سے تم کو نہیں ہے نسبت
مگر یہ کیا ہے
مرے زمان و مکان میں ہر سو
تمہاری چاہت کی روح پرور حلاوتیں ہیں
مگر میری جاں
تمہاری مصروف زندگی میں
ہماری مصروف زندگی میں
نہ کوئی لمحہ ہے اب تمہارا
نہ کوئی ساعت ہے اب ہماری
کہ اپنا حق زندگی پہ ہم کو
نہیں رہا ہے
نہیں رہا ہے

نصرت چودھری

بر ہمن

تمہارا خط میرے سامنے ہے اور میں سوچ رہی ہوں
تمہارے الفاظ میں یہ نرم آنچ
کس دہکتے لمحے سے عبارت ہے
رات ویران ہے
دور تلک سیاہ اندھیرے
قرونِ وسطیٰ کے کسی روایتی عفریت کی طرح منہ پھاڑے
میرے منتظر ہیں
میں نادان
اب بھی سوچ رہی ہوں کہ شاید تم آجاؤ
اور پھر اچانک
کوئی خوبصورت سی ان کہی بات
ہمیں یاد آجائے
تمہاری دھندلائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں
اور میں شرم سے دُہری ہو کر
اپنی پلکیں جھکا لوں

دستک ہوئی
کیا واقعی تم آگئے ہو یا
میری سماعت مجھ سے انتقام لے رہی ہے
پھر دستک ہوئی
ہاں مجھے یاد آیا
تم میرے دل کی دہلیز پر کھڑے صدیوں سے دستک دے رہے ہو
مگر میں کواڑ کس طرح کھولوں
تم کیا جانو
اس دنیا نے کتنی زنجیریں
مجھے پہنا دی ہیں
میں تمہاری آواز سنتی ہوں
مگر مل نہیں سکتی۔

○○

ممتا کالیہ

ترجمہ: احسن علی خاں

تین نظمیں

(۱)

میں لکھتی ہوں
کیونکہ میں (کتے کی طرح) کاٹ نہیں سکتی
یہی وہ طریقہ ہے
جو کمزور لوگ
لڑنے کے لیے اختیار کرتے ہیں

(۲)

شادی کے آٹھ سال بعد
جب پہلی بار میں میکے گئی
تو ماں باپ نے پوچھا
"کیا تم خوش ہو؟ ہمیں بتاؤ"
ایک عجیب سوال تھا
مجھے اس پر ہنسنا چاہیے تھا
مگر میں رو پڑی
اور سسکیوں کے دوران
کسی طرح سر ہلایا
مگر میرا جواب نہ "ہاں" تھا نہ "نہیں" تھا
میں انھیں بتانا چاہتی تھی
کہ میں منگل کے دن خوش تھی
بدھ کو ناخوش تھی
ایک دن صبح آٹھ بجے خوش تھی
سوا آٹھ بجے بہت ناخوش تھی
میں انھیں بتانا چاہتی تھی
کہ کس طرح
ایک دن ہم سب تربوز کھا کر خوب ہنسے تھے
میں انھیں بتانا چاہتی تھی
کہ کس طرح
ایک بار میں بستر پر ساری رات روئی تھی
اور میں نے پوری کوشش کی تھی
کہ اپنے آپ کو ضرر نہ پہنچاؤں
میں بتانا چاہتی تھی
کہ بارہ افراد کے خاندان میں
خوش رہنا آسان نہیں ہوتا
مگر وہ میرے لڑکوں کی طرف دیکھ رہے تھے

جو ادھر اُدھر بکری کے بچّوں کی طرح اچھل کود رہے تھے
ان کے جھرّیاں پڑے ہاتھ
مرجھائے چہرے
دھول بھری آنکھیں
سب کچھ بتا رہی تھیں
بڑی تلخ حقیقت تھی
اس لیے میں سب کچھ پی گئی
اور مسکرائی
ایک مطمئن مسکراہٹ۔

(۳)

میں بھی ملک و قوم پر ناز کرتی ہوں
جب قومی ترانہ گاتی ہوں
مگر میرا ذہن مجھے کوستا رہتا ہے
وہ تمسخر سے پوچھتا ہے
'تم کس بات پر اتراتی ہو؟'
(آزادی نے کیا دیا ہے تم کو؟)
رہنے کے لیے ایک گندی اندھیری کوٹھری
کھٹملوں سے بھرا ایک بستر
دو بال پڑے ہوئے چینی کے برتن
تین پھٹی پرانی ساریاں
اور ایک کاغذ کا رول جسے ڈگری کہتے ہیں؟
آزادی کے نام پر

مجھے ایک بار نہیں دو بار بیوقوف بنایا گیا ہے
بس، اتنا کافی ہے
وہ دہلی والے نہیں جانتے
کہ چوہے کی طرح کیسے جیتے ہیں
میں اس وقت تک بغاوت نہیں کروں گی
جب تک مجھے واجبی قیمت پر
چینی، ڈالڈا اور مٹی کا تیل ملتا رہے گا
میں اس وقت تک
انتقامیہ کی ٹھنڈی آنکھوں کی گونگی بنی رہوں گی
جب تک مجھے نزع کے عالم میں رکھا جائے گا
اور جینے نہیں دیا جائے گا

صبیح الحق

غزلیں

[illegible]ے بجائیں گے اک اور خواب ہم
[illegible]یں گے [illegible] شب ہم
[illegible] لہو کی آگ تھی یہ بھی لہو کی آگ
[illegible] زیادہ ہو گئے لیکن خراب ہم
[illegible] جستجو کا سفر رائیگاں گیا
[illegible] گئے ہیں اپنے لیے خود سراب ہم
[illegible] کی راہ بہت پُر ہجوم تھی!
[illegible] لیے نہ ہوئے کامیاب ہم
[illegible] ملے ہیں آگ کے دریا کو پیر کے
[illegible] تک ہیں کھلا جواب ہم
[illegible] دنیا خریدتے
[illegible] ہیں تجربہ مسلسل عذاب ہم
[illegible] چلو کہ لہو رنگ ہو گئے
[illegible] راوی و ستلج و چناب ہم

خاموش رہ کے مجھ کو لگا بولتا ہوا
چہرا ہوا، چراغ ہوا، آئینہ ہوا
وہ جس کو زندگی کے سوا جانتا تھا میں
آنکھوں میں ایک خواب سا ہے ٹوٹتا ہوا
تم آس پاس تھے تو زمانہ تھا مہرباں
تم [illegible] کہ زمانہ خفا ہوا
میں اپنا حال سب سے چھپا کر [illegible]
آئینہ دیکھ کر یہ کہو تم کو کیا ہوا
اک دن کھلے گا سب کی وفاداریوں کا حال
[illegible] ان دنوں [illegible]
سب کھیل اس کے حسن کی [illegible]
پیہلت [illegible] ہے عشق میں [illegible]

محسن شمسی (ملتان)

متوازی لکیریں

دیوار کے اس پار خاموشی تھی اور اندھیرے میں چھپی چاروں طرف پھیلی قبریں اور اس طرف خنک چاندنی میں چمکتی سوکھی ٹہنیوں پر تازہ پھوٹتی کونپلیں۔ بہار ابھی پوری طرح نہ آئی تھی۔

آنے والی عورت انھیں دیکھ کر جھجکی۔ پھر دھیرے سے انھیں کی طرح دیوار کے سہارے کھڑی ہو گئی۔

ایک عورت بولی: "وہ آنے والا ہے۔" دوسری نے کہا: "مجھے انتظار ہے۔"

تیسری نے خود کلامی کی: "وہ آئے گا اور عالم نور سے بھر جائے گا اور بے معنی معنوں سے آراستہ"

لمبے قد والی باوقار عورت کی داستان جاری رہی۔ "ان کو دیکھ کر میں نے پوچھا۔ 'اس بے وقت حاضری کا مقصد نائب صاحب — میرے والد رہنماؤں کے عظیم خاندان کے پُرمرتبہ رہنما تھے — پر وہ جانتا ہے۔ میں نے اپنے قرضے چکا دیئے' میں تو ان ہی کے ساتھ ہوں جو اس کے ہیں۔ وہ جانتا ہے — اور اتنی فرصت کہ کچھ بھی تو نہیں جسے کوئی اپنا کہہ سکے۔ پھر بھوک لگتی ہے اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ تم بیٹھ جاتی ہو، جہاں وہ سب ہیں اور مایوسی کی آخری حدوں سے مسرت کے چند قطرے جھپٹ کر گانے لگتی ہو اور چھیرے اور ا چھوت اور قلی اور لاوارث اور ضعیف آجاتے ہیں۔ روٹی لے کر وہ چاہتے ہیں کہ تم گاؤ۔ وہ اس گیت کو جانتے ہیں۔ انھیں یہ گیت پسند ہے۔ یہ ان کا گیت ہے اور تم ان کا گیت گا کر انھیں بھی فخر سے سر اونچا کرنے کا موقع دیتی ہو — ہاں میں نے قرضے چکا دیئے ہیں۔ وہ جانتا ہے — پھر پولیس والا آکر کہتا ہے: 'اٹھ کے آگے بڑھو۔' اور سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ تشنگی کی۔ اور وہ تم پر ڈنڈے برساتے ہیں اور تم میں سے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور تم پھر گاتی ہو۔ مایوسی کی آخری حدوں سے گیت کے ارتعاش کا رُخ اپنے دبانے والوں کی طرف کر کے — بس یہی ہے اس کا گیت — یہی گیت میں نے شاعتا' جب میں نے ان سے پوچھا 'اس بے وقت حاضری کا مقصد نائب صاحب؟' "نہیں یہی پہیلی ہے۔" وہ تو میں جانتی تھی کہ نہیوں میں پہیلی ہے۔ وہ اور خدمت پر آمادہ جس نے ستائش کے

[illegible]

[illegible] انتظار [illegible] ہم [illegible]

[illegible]

[illegible] پہاڑوں [illegible]

[illegible] شور کرتے ” [illegible] اللہ [illegible] ایک [illegible]

[illegible] ہماری [illegible] قوم [illegible] چلے جاتے ہیں [illegible]

کمزور مخلوق بھولیں۔ ”

”یہ بے تمدن جنگلی ہیں۔ گندی چیزوں کے کھانے والے، سست اور شرابی۔ ہمارے لشکریوں کے قریب سے گزریں ان کو نابود کر دیں گے۔ ان کے گھروں کو جلا کر ان کی زمینیں چھین لو۔“

”بہت سا کھانا ملنے سے ان کی بدمستی بڑھ جائے گی۔ ہماری [illegible] سے اس کے مردوں کے سروں کو تن سے جدا کر کے ان کی عورتوں کو غلام بچوں سے بھر دو۔“

میرے [illegible] ” دشمن کو جلا دو“ اور جس کے [illegible] میں اس کو سنتا رہتی۔

وہ نغمہ تھا یا ایک چیخ۔ جو [illegible] کے راستے دل و دماغ کو ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کر گئی جیسے [illegible] ہوا۔ وہ [illegible] میں تپ کر لوہا سرخ ہو گیا۔ [illegible] [illegible] سے نغمہ کی چنگاریاں اڑنے لگیں اور آگ کی چنگاریوں کے نغمے کی ہر جست [illegible] بر جستہ [illegible] اور [illegible] اور [illegible] کی ہتک کے [illegible] کو [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

جانے گی اور میرا [illegible] کے استعمال [illegible]

تحفہ سب اس کے ترکے [illegible]

جو بچ گئے [illegible] سب [illegible] تھی

[illegible] ملک [illegible]

[illegible] سب ترے [illegible] مکمل ہو جائے گا اور [illegible]

میرا [illegible] پاس [illegible] جائے گا کہ جس کا پتا اس کا [illegible] ہے"

دوسری عورت بڑبڑائی: "میں شادی شدہ ہوں..... نہیں [illegible] تھی ___ بچے اپنا [illegible]..... ماں [illegible] اور باپ [illegible] ___ قبروں پر بکھرے ہوئے پھول..... [illegible] کے گلاب..... پھر پھول مرجھا کر بل کھا جاتا اور ایسا سخت کہ چھو جائے تو فنا ہو کر سب خاک ہوا..... ایک [illegible] ___ نیا جسم اور نیا چہرہ .... ماں [illegible] کو حد ...... سب اپنے [illegible] کانوں میں آواز نہیں پڑتی ...... اے کاش تو جو ہوتی کچھ تو ہو ہی جانے کو .... چشم [illegible] ___ ہم [illegible] ایک کائنات تعمیر ہوئی ہے۔ ست رنگ آنے کو ہے۔ اور تو اور تیرا وجود [illegible] کا تعمیر شدہ معمول بے اہم .... شاید بے کار .... یتیم خانے ___ ویرانیوں سے بھرپور ماؤں کے [illegible] " قائم [illegible] اور پھول [illegible] چاند اور ستارے اور موسم ___

ایک معمول کہ سب مشغول اس میں ___ بے منزل ... اپنی کائناتوں میں محصور اپنے محور پر گھومتے ہوئے ..... بے مقصد .... بے کار؟ ..... پہلے کام ختم کر و اپنا کہ باقی نہ رہ جائے معمول کی کوئی جنبش..... اے کاش عنایت ہو [illegible] تو ہو کچھ جانے کو ___

پھر شادی ہو گئی ___ وہ اچھا آدمی تھا۔ [illegible] بحال کرتا۔ بے کام کیے کھانے کو بھی دیتا۔ میرا جسم [illegible] اور [illegible] جسم سے [illegible] کرتا۔ [illegible] تھا [illegible] تھا۔ ایک جذبہ جیسے کہ [illegible] راتوں کو [illegible] سو جاتا۔ اے کاش [illegible] تھا [illegible] تو [illegible] سہیلی [illegible] گھر [illegible] کام میں مصروف [illegible] زندگی کے معمول [illegible]

کھولا ہے وہ تھا:

"خیال کو خریدو۔ یہ کتاب کہ تمناؤں کا جواب تم کو ناچیز [?] عطا کرنے والی ہے۔ اس کو پڑھنے والے چنیدہ ہیں' جس کی اہمیت کہ آزادی کی کنجی الفت ان کی ہے۔"

ایسے بھی لوگ ہیں جو حیات اور موت کے معمولی پن سے آزاد ہیں !!! آزادی کی کنجی اُلفت کیسے میری بھی ہو سکتی ہے !!! پھر میں نے کہا۔ "پڑھنا نہیں آتا۔"

"آ جائے گا' جب یہ کتاب تم خریدو گی۔"

ہاں کہہ دوں یا نہ کر دوں! ۔۔۔ وہ کتاب پڑھ کر سنانے لگا۔ نظریں جما کر میں نے اس کے چہرے کو دیکھا...... دمکتے ہوئے سورج اور چاند اور ستارے۔ دل مٹھی میں جکڑے قیدی پرندے کی طرح لرزا۔ "یہ کتاب تمہارے لیے ہے۔" رُک کر اس نے کہا۔

"میرے لیے !! میرے لیے !!!" کیا ضروری ہے کہ ثبوت کامل ہو۔ بس وہ یوں ہی ہمیشہ قریب کھڑا یقین دلاتا رہے اور دروازہ پار کر کے وہ اندر آ گیا ۔۔۔ میری خواہش کا بھی احترام تھا کہ کوئی سُنتا تھا.... ایک لمحہ میں چھو کر اس نے مجھے چھپانے والی چیزوں سے آزاد کر دیا اور سب خواب تک تھا غالب ہوا۔ مسرت کی پہلی لذت نے گواہی دی کہ کائناتوں میں میرا ہی وجود تھا۔ مرکز تھا اور کتاب میرے لیے تھی اور وہ اسے میرے لیے لایا تھا۔

کیف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ پہاڑ جتنا پار تھا' میں اس کی بلندی پر جا پہنچی اور نظر آنے لگا جو پہلے اوجھل تھا کہ حیات کا وقفہ تو ممکنات کی تحقیقات ہے۔ نہ رہی اب میں سہمی و خوفزدہ۔ اور نہ ہی معمول کی گردش' اب یہ مقصد تھی کہ معمول کے قابو کے اس پار ہی وہ تھا' جو لبِ ناممکن تھا۔ اور میں جان گئی کہ میری تحقیق ہی میرا مقصدِ حیات ہے .... اب جزو کل ہو جائے گا اور آخر کار وہ آئے گا اور بس میرا بن کر وہاں لے جائے گا کہ جس کا پکا اس کا وعدہ ہے۔"

تیسری عورت گنگنائی: "وہ شفا ہے۔ بچانے والا الفت ہے۔ میں اس کی ہوں۔ اس کے کرشمہ کا ثبوت ۔۔۔ وہ میرا ہے۔"

"میں دولت مند تھی۔ میری تجارت چلتی تھی۔ چیزیں خرید سکتی تھی۔ جو اوروں کے پاس تھیں اور جو اوروں کے پاس نہیں تھیں' ان کے حاصل کرنے کی تگ و دو میری زندگی کی تحریک تھی۔ ایک واحد حسرت کہ جس کے رستے میں جسم و دماغ کا کوئی بھی استعمال قابلِ اعتراض نہ تھا اور میں کام چور نہ تھی ۔۔۔ ہر رات اجنبی ہاتھ میرے کولہوں کو چھوتے' نہ جھجکوں بھرے ہونٹ میرے منہ میں بوسے انڈیلتے اور تماش بینوں کے مذاق

گھر کے پیچھے لگاتے اور صبح جب سورج کی کرنیں روشنی پھیلانے نکلتیں تو پھر سے ڈھانک کر قطار سے پیچھے
چلے جاتے اور میں تھک کر سو جاتی۔ پر میرے پاس چیزیں تھیں اور دولت جو اور چیزیں خرید لاتی
میرا امتیاز میری چیزوں سے تھا۔ وہ جاننے والوں کا علم ہے۔ پھر وہ آیا اور اس کے لبوں پر خاموشی تھی
اور نظر اٹھا کر اس نے دیکھا اور ایک آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "تم اچھی تو ہو۔" میں چپ رہ گئی سوچا میں
سے پوچھوں: "بھلا ہو تمہارا تم کون ہو؟"

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس آواز نے کہا: "میں اچھا کرنے والا ہوں۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہوں۔" چہرہ پھیر کر وہ پہلی دفعہ مخاطب ہوا: "تم اچھی نہیں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسے تھا کہ میں تو چل سکتی تھی۔ سو سکتی تھی اور کام بھی کر سکتی تھی۔ پر وہ
کہنے لگا کہ اس بیماری کا کیڑا جب پوری طرح جسم پر قابو پا لیتا ہے تو پھر جلد پر نمایاں ہوتا ہے اور پھر کوئی کچھ
نہیں کر سکتا۔ میرا یقین ادھ کچا تھا۔ میں نے کہا: "میں باحیثیت ہوں اور میرے پاس چیزیں ہیں۔"

وہ مسکرایا اور بولا: "سب جھوٹ نہیں پر جعل سب چیزوں میں ہے۔"

"میں اپنے پیشے میں کامیاب ہوں۔"

"ذاتی کامیابی سے اہم تو بہت سے مقصد ہیں۔"

"میں اہم اور با اختیار ہوں۔"

"یہ پودا کہتا ہے کہ تم اس کا پھول قبول کر لو کہ کھاد بن کر تمہارا جسم بھی ایک دن شاید اس کے کام آئے۔"

میری ہتھیلیاں پسینے سے بھر گئیں اور میں نے پوچھا: "اچھی کیسے ہوں گی؟"

"ارادہ کرو اور حلقہ بگوش ہو جاؤ۔"

"خواہشیں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور دل ستائش کا متمنی۔ حسد ہے اور انتقام سے دکھ دینے
کی خواہش اور ملکیت کی محبت، قبضہ کرنے کو اکساتی ہے۔ بس ایک ہی دھنک جو سب کے آسمانوں پہ
چمکتی۔ کس کا خیال کروں۔ کیسے کروں؟"

"مقابلہ کرو کہ قوت ہے تم کو اپنے انتخاب کے خیال کی۔ ستارے سب ہیں ایک ہی آسمان پہ
پر کچھ ان میں سے راہ دکھاتے ہیں۔"

"میں اکیلی ہوں۔"

"تنہائی تو قوت کی ہمراہی ہے۔ معنوں کا لطف ہے۔ اس آواز کو پہچانو اپنی تنہائی میں جو تمہارے

[illegible]

[illegible]

[illegible] نے تھام لیا اور بے اختیاری [illegible]

صحن پھیل گئی اور آتش [illegible] کے دہانے [illegible]
کے نیچے کھول رہا تھا ابل پڑا۔ پھر [illegible]
قائم [illegible] تھا۔ اور میں جانتی تھی کہ ایک اچھا [illegible] اور ایک [illegible]
بدلی ہوئی حد اور حد کو پالینا [illegible] تھا اور نجات۔ چیزوں کی [illegible]
اور شوق کی وقتی جل جانے والی [illegible] تتلیوں سے۔ پھر مشکل نہ تھی کہ [illegible]
تحقیر میں اب دل آزاری تھی۔ آخر کار میں آزاد تھی آنے والی [illegible] سے اور [illegible]
ہے کہ ہم بس اس کے لمس کے لیے تھے۔ جن میں ضمانت تھی۔ اس جہیز کی جو تھا [illegible]
انجام کار میں تیار تھی اس کی ہو جانے کو — ہاں وہ [illegible] والا ہے
اب جز کل ہو جائے گا اور آج رات وہ آئے گا اور بس [illegible]
اس کا وعدہ ہے۔"

پھر اندھیرے چاک کر کے انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ [illegible] کا انجام [illegible] کائنات
جاگتی رہی اور چاند کو زمین نے چھپا لیا اور چھریاں سنبھال کر انھوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹ ڈالے۔

دیوار کے اس پار خاموشی تھی اور اندھیرے میں چھپی چاروں طرف پھیلی قبریں اور [illegible]
چاندنی میں چمکتی سوکھی ٹہنیوں پر تازہ چھوٹی کونپلیں۔ بہار بھی پوری طرح [illegible] گئی تھی۔

"مجھے پہلی بار ادارۂ ادبیاتِ اردو سے متعارف ہونے کی سعادت اور مسرت
حاصل ہوئی جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا اس سے بہت دل خوش ہوا اور ساتھ ہی خلش
بھی کہ اس بے بہا خزانے جو یہاں یکجا ہے کسب فیض و بصیرت کے لیے وقت [illegible]
میسر نہیں۔ میں اس ادارہ کی فلاح و ترقی کی تمنا کے ساتھ [illegible]
کہ شاید کسی دن دوبارہ اس کی زیارت [illegible]۔"

فیض احمد فیض
۱۴ اگست [illegible]

اردو نامہ

[illegible] کی [illegible] اردو [illegible] ہفتہ [illegible]

۱۲ر اکتوبر: جناب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

۱۵ر اکتوبر: [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۱۸ر اکتوبر: [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] "[illegible]" اور [illegible] کے "[illegible]" [illegible] اردو [illegible] [illegible] [illegible] ان [illegible] کی [illegible] [illegible] پیش کرتا ہے۔

۱۲ر اکتوبر: [illegible] حیدرآباد [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دیئے گئے۔

• [illegible]

صدارت میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ناز، [illegible] اور نسیم نیازی نے کلام پیش کیا۔

۱۳ر اکتوبر: ادارہ [illegible] [illegible] محفل مشاعرہ میں قدیم مکتب فکر کے درجن بھر شعراء نے سلام [illegible] شہدائے کربلا پیش کیا۔ جناب [illegible] نے مشاعرہ کی نظامت کی۔ ابتدا میں جناب جہاندار افسر کی صدارت میں [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شہادت اور [illegible] [illegible] اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۷ر اکتوبر: ایلنڈرس کونسل آف انڈیا کی محفل شعر میں مسرز [illegible] [illegible] [illegible] سید حسین [illegible] صلاح الدین نیر، [illegible] اختر، فیض الحسن خیال، [illegible] پیرزادہ اور رضا منظور نے کلام [illegible] جناب [illegible] بلگرامی نے صدارت کی اور جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹ر اکتوبر: ممتاز مورخ اور [illegible]

[illegible]

جہاں اختر الاسلام نے ابوالکلام آزاد لوڈیل لیکچر میں انیسویں صدی میں برصغیر ہند کی تاریخ پر عالمانہ لکچر دیا۔ ڈاکٹر نواب میر اکبر علی خان سابق گورنر اڑیسہ نے صدارت کی۔

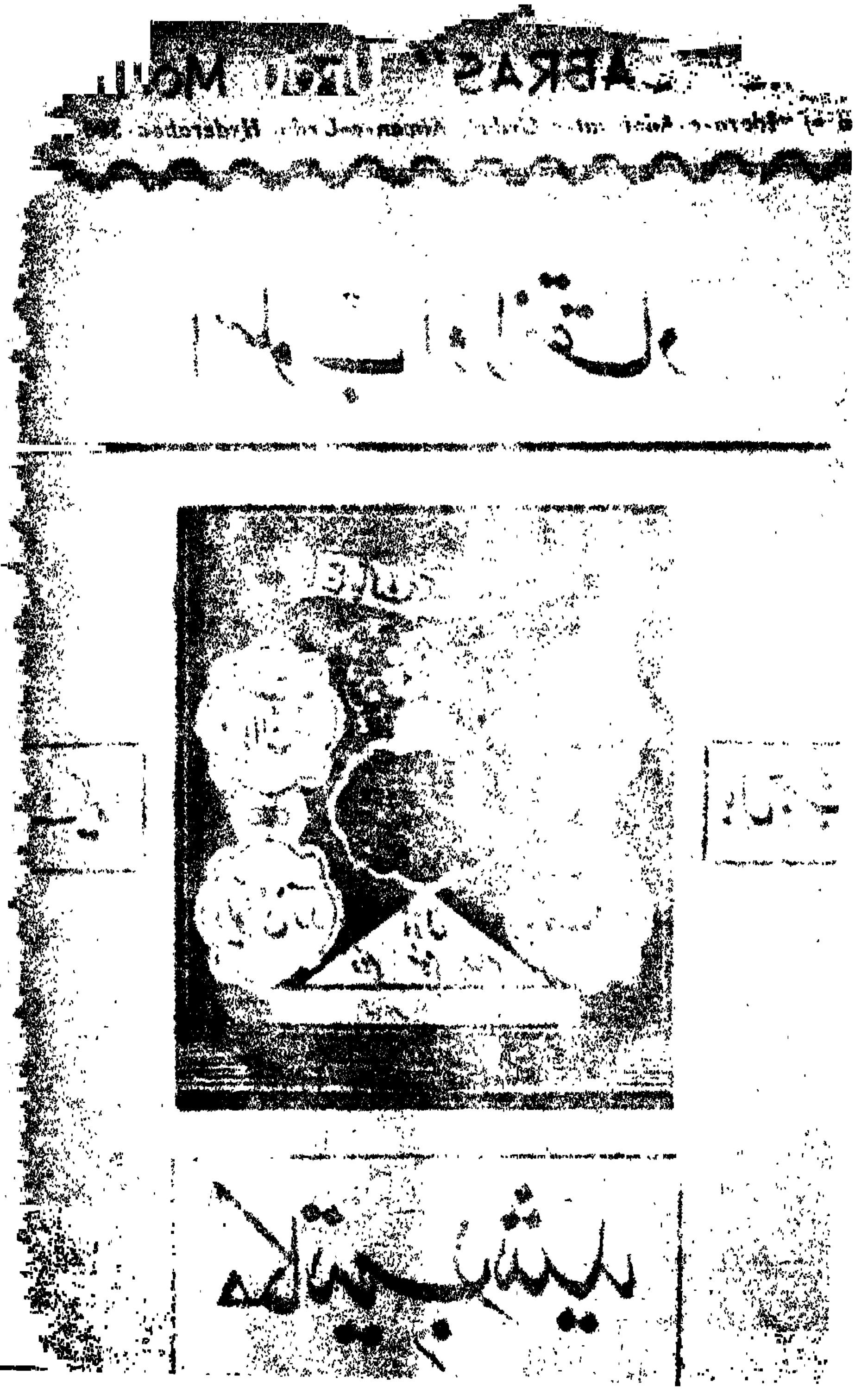
۱۷؍ اکتوبر: انجمن طلبۂ قدیم مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام یوم سید کے موقع پر سالانہ مشاعرہ علی گڑھ کلب میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ مسرز امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، مسعود فشانی، رحمن جامی، رشید اختر، فیض الحسن خیال، محمد منظور احمد، ناصر کرنولی، امان ارشد، صادق نقوی، جوہر ہاشمی، اسحٰق ملک، اور منیر الزماں منیر کے علاوہ بانو طاہرہ سعید، مظفر النساء ناز اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ ابتداً جناب مصطفےٰ شروانی نے سر سید اور علی گڑھ تحریک پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۳۱؍ اکتوبر: ترقی اردو بیورو کے زیر انتظام مرکز خوشنویسی ادارۂ ادبیات اردو کے نتائج کا اعلان کیا گیا جس میں میرزا بہادر علی بیگ، سیدہ راحت حسین اور ... بیگم کو دو سالہ ڈپلوما کورس میں کامیاب قرار دیا گیا اور سال اوّل کے طلبا و طالبات سے مقصود احمد، اسما نشاط، سیدہ سرور سلطانہ، محمد غوث محی الدین، محمد حسام، جابر بن سعید، سید ذبیح اللہ حسینی، محمد ایوب خان، محمد اطہر نہال، سید رضی اللہ حسینی، افضل بیگم، نسیم محمد اور فاطمہ بیگم کو سال دوم میں ترقی دی گئی۔

۲۸؍ اکتوبر: ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام دبستان دکن کے آخری معلم، نامور محقق و نقاد اور بانیٔ ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی ۲۲ ویں برسی کے موقع پر یوم زور کا ادبی اجلاس پروفیسر و ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداً جناب رحمن راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ نے خطاب کیا۔ یوم زور میں ڈاکٹر یم۔ یل۔ نگم، ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم نے دکنی مصوری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب میر معظم حسین سابق مشیر ادارۂ اقوام متحدہ نے دکنی کلچر پر اور جناب سرفراز علی مرزا سابق نائب ناظم تعلیمات نے ڈاکٹر زور پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ نے کہا کہ ڈاکٹر زور نے اپنی تحریروں، کتابوں اور اپنی تحقیق کے ذریعہ دکن کے کلچر کو عظمت، طاقت اور توانائی عطا کی اور تمام زیست دکن اور دکنیوں سے اپنی اٹوٹ رفاقت کا ثبوت دیا۔ جناب محمد منظور احمد کنوینر یوم زور نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● حیدرآباد لٹریری فورم حلقہ کا ہفت روزہ ادبی اجلاس ڈاکٹر انور معظم کی صدارت میں ہوا۔ جناب عوض سعید نے نئی کہانی اور جناب رؤف خیر نے نئی نظم بحث کے لیے پیش کی۔ مسرز پروفیسر مغنی تبسم، جیلانی بانو، مصحف اقبال توصیفی، مظہر مہاز، یوسف کمال، انور رشید، اکمل حیدرآبادی اور ستار صدیقی نے مباحث میں حصہ لیا۔ جناب علی ظہیر معتمد حلقہ نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۳۱؍ نومبر: وزیر اعظم ہند محترمہ اندرا گاندھی پر قاتلانہ حملہ کی اطلاع ملتے ہی ادارۂ ادبیات اردو کے دفاتر بند کر دیے گئے۔ ●●


ABRAS

/E... 1984 R. N.
Regd.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 482. (A.

سب رس



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

جلد ۴۴، شمارہ ۱۲ سن اجراء ۱۹۳۸ء

فون: ۳۸۴۶۹

ڈسمبر ۱۹۸۴ء

سب رس

ماہ نامہ

حیدرآباد

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ: [illegible] کتب خانوں سے: ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے

[illegible] ملکوں سے:

ہوائی ڈاک سے:		بحری ڈاک سے:
مشرقِ وسطیٰ:	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ:	۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان برما سیلون:	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان:	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۴۸۲ سے شائع کیا۔

کتابت: رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیاتِ اردو "ایوانِ اردو"
پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ 500482.

سرِورق: علی عادل شاہ اول

ترتیب

فیض احمد فیض کی آخری غزل

بہت ملا نہ ملا زندگی سے، غم کیا ہے
متاعِ دردِ بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے
ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لطف کیا ہے میرے مہرباں ستم کیا ہے
اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے
کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مقصد
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے

"سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے"

۱

اپنی بات

محترمہ اندرا گاندھی کے اداریۂ تعزیت کی روشنائی خشک بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ یکے بعد دیگرے اُردو ادب کی دو عظیم شخصیتیں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں اور ہماری اُردو دُنیا پر سوگواری کے گہرے بادل چھا گئے۔

جناب راجندر سنگھ بیدی عصرِ حاضر کے ایک بڑے فکشن نگار اور ڈرامہ نویس تھے۔ انھوں نے اپنی نگارشات کے ذریعہ اُردو ادب کا رُتبہ بلند کیا اور اسے دُنیا کی ساری اہم زبانوں کے ادبیات سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بنایا۔ ہر بڑا ادیب زندگی کی ایک نئی بصیرت اور آگہی عطا کرتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے بھی زندگی کو ایک خاص زاویے سے دیکھا اور اپنے پڑھنے والوں کو ایک نیا عرفانِ حیات عطا کیا۔

جناب فیض احمد فیضؔ اُردو والوں کے نہایت محبوب شاعر تھے۔ فیض شناسی ہمارے لیے "مہذب" ہونے کی ایک شرط بن گئی تھی۔ فیض احمد فیضؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ امن، آزادی اور انسان دوستی کی قدروں کو پروان چڑھایا۔ وہ بہت بڑے فن کار تھے۔ انھوں نے صناعت اور اظہار کے نئے پیرایوں سے اُردو شاعری کو روشناس کروایا۔ موجودہ صدی کے چند اہم شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

ادارۂ سب رس، جناب راجندر سنگھ بیدی اور جناب فیض احمد فیضؔ کی وفات پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ ہم ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ ان مرحومین کی ارواح کو سکون اور شانتی نصیب ہو۔

——— (م۔ق)

میرزا ادیب

درونِ تیرگی

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان ایک مدت سے بند پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیانک تاریکی رینگتی رہتی تھی۔ اس گہرے اندھیرے میں نہ تو کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوا تھا۔ اور تو اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی نحوست آثار منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہماہمیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا ——— اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو ان ننھے ننھے، نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرات کی بدولت تھا جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ یا دیوار کی درازوں میں سے اندر آجاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہل چل نظر نہیں آتی تھی وہ تاریکی کے اجزا بن کر رہ گئے تھے ——— ان میں انفرادیت نام کو بھی باقی نہیں رہی تھی۔

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک گوشے میں ایک چھوٹا سا ذرہ نڈھال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا ———

توبہ، کس قدر اندھیرا ہے۔ کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟"

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرّے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا

"خوب! ... ذرّے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو۔ بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، اس لیے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے۔ ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے!"

ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی ——— کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے!" ننھا ذرّہ بولا۔

"کبھی نہیں ——— میری مانو ایسی بیہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرّے ہو!"

یہ کہہ کر بوڑھے ذرّے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور ننھا ذرّہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی ——— اور اس وقت اس کا سینہ ایک شدید ... تمنا و ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک پُرلذّت سنسنی سی دوڑ گئی تھی، اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، ایک بے مایہ وجود نہیں ہے ——— اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے ——— وہ کچھ کر بھی سکتا ہے۔ اس میں کچھ

کر سکنے کی ہمت بھی ہے۔ اس کے سامنے ایک وسیع، ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے، ناچ سکتا ہے ـــــ مگر افسوس اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے نے اسے دروازے سے پیچھے ڈھکیل دیا۔ اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے نظر اوپر اٹھایا تو اس کے اردگرد دوبارہ بے کنارا اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے۔ اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید مایوسی بھی اس شعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی ـــــ اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دنیا میں پہنچ جائے گا۔

ـــــ اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرّے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا اس لیے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ وہ بے بس ہو کر، چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے ذرّے نے حسب معمول کرخت لہجے میں کہا۔

"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر کبھی یہاں آ جائے گی اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی۔"

ننھے ذرّے نے کوئی جواب نہ دیا ـــــ دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکے تھے۔ اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ مایوسی نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

بزرگ ذرے نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی۔ یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا اور وہ یہی سامان لینے کے لیے یہاں آ گئی تھی، ورنہ وہ اس متعفن فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سُنا بیٹا! تم سن نہیں رہے کیا؟"

ذرہ خاموش تھا۔

"غائب کہاں ہو گئے ہو ـــــ اچھا بھئی تمہاری مرضی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" بڑے ذرّے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لیے ٹھہری اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرّے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرے کی آواز نہیں سنی تھی۔ تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے بزرگ ذرّے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں، اور روشنی کی تمنا کو کتنا بیہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔

ذرّوں کی دنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حیرت و مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ احساس بھی کارفرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر دوبارہ اٹھنے کا نام ہی نہ لے۔ اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دے۔

اس سے بہت دور، کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدھم سی، ننھی سی لکیر لرز رہی تھی۔ اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی تھی ـــــ نہ صرف مرکز بن گئی تھی بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی امنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کر رہی تھی ـــــ وہ مایوسی کی سطح سے بلند ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا ـــــ "آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے۔ انہیں ہم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں۔"

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آ گیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرّے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ بوڑھا اسے مایوس کرنے کی کوشش کرے گا ـــــ اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بزرگ ذرّہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا۔

"تم نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصّہ ہیں۔ آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ ہے۔ تم بالکل ننھے ہو۔ بے فائدہ اس چیز کے لیے بے تاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو، اس قسم کی خیال آرائی نہ کیا کرو۔ سنا تم نے بیٹا!"

ننھا ذرّہ خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اٹھا۔

"وہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بہ خود اندر آ جائے گی۔"

"بہت خوب بھئی" بزرگ ذرّے نے خوف ناک قہقہہ لگایا۔ "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بیتابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دے گا۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے انسان کو سمجھا ہی نہیں ـــــ اسے ہم حقیر ذرّوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے ـــــ اگر تم نے مجنونانہ خواہش کو دماغ سے نہ نکالا تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا، اور تم مر جاؤ گے"!

اس وقت ذرّے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہو گئی۔ روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ذرّے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا ـــــ اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ارد گرد کیا ہونے والا ہے ـــــ

پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ اس تاریکی میں اس کے بزرگ، اس کے ہم عمر لاکھوں ذرّے اپنی مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر پیچھے چلے جاتے تھے۔ ان میں کئی ایک ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے روشنی کی تمنّا کی ہوگی، جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن اپنے گرد و پیش بے شمار رکاوٹیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہوں گے۔ ان کی خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی۔ اور نوجوان ذرہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی مگر طاقتور ذرّوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا ـــــ وہ ایک بیوقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تگ و دو سے بچانا چاہتے تھے ـــــ کم از کم ان کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

"کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا ـــــ؟" اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا۔ اور وہ اپنے اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

نئی فضا میں گردش کرتے ہوئے ذرے جب اس سے ٹکراتے تو وہ ایک دم کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک مرتبہ تو اسی پستی میں پہنچ گیا جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھیرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگ اور ساتھیوں نے طعن و تشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا۔

"دیکھو ایسی بیہودہ حرکت نہ کرو، تم نہیں جانتے کہ ـــــ"

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہوتا وہ تیزی سے اوپر کے کرّے میں آ گیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا جھونکا اُدھر آ نکلا اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اس حصے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا، اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرّہ رک کر اس نے نیچے دیکھا۔ دور اس کے پست ہمت ساتھی کلبلا رہے تھے اور اپنی محدود تاریک دُنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اتنا پست نظر آیا کہ وہ خود ہی اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا ـــــ مگر حیرت و مسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے۔ کیونکہ اب وہ جن ذرّوں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنا ساتھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاریک پستیوں کا باشی کہتے تھے اور اسے اپنے کرے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمت و عزم بلند پر تحسین کہیں، اُلٹا اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ایک ذرّے نے تو صاف صاف کہہ دیا۔

"بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ۔ تمہارا مقام اسی پستی میں ہے جہاں سے تم آئے ہو۔ اگر ہم میں سے کسی کے طاقت ور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے۔ یا زخمی ہو کر نیچے زمین پر گر پڑو گے، اور زمین کے ذرّوں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے اور پھر کبھی نہیں اُٹھ سکو گے!"

باقی ذروں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کیے بغیر واپس چلا جائے، لیکن وہ تھکاوٹ کے باوجود اوپر جانے لگا یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس نئی بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرہ بھی اس کی طرح ایک دور دراز گوشے سے نکل کر بالائی حصّے کی طرف پرواز کر رہا تھا چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہمسفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی چیخ اُٹھا۔

"آندھی۔"

"کیا؟" نوجوان ذرہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

"باہر آندھی آ رہی ہے۔ یہ شور سن رہے ہو نا!" اس کا ساتھی بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آ گئی ہے آج؟"

اس کے ہمسفر نے بتایا آندھی تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں تاہم آندھی کے جھونکے اندر بھی جائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آ گئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور ـــــ یہ بھی خبر نہیں کہ ـــــ"

یکایک ادھر ادھر ایک ہلچل سی مچ گئی ـــــ ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ چھوٹے ذرے نے محسوس کیا کہ سب ذرّے ٹکرا سے ستیوں کی طرف ڈھکیلے رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کا تھکا سا وجود اسی طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقت ور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی عرصے کے بعد جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چپٹا ہوا ہے۔ اور یہ تنکا دیوار کی طرف جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا ـــــ فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلط تھا، اور لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جتنے ذرّے موجود تھے وہ سب کے سب تھک کر مضمحل ہو رہے تھے ـــــ ایک بڑا مایوس کن خیال اس کے ذہن میں آیا۔ 'کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے اور کیا میں اپنا سفر پورا کر کے پھر اسی ناپید کنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں جس کے بطن سے میں پیدا ہوا تھا ـــــ کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سمندر میں چھلانگ لگا سکتا۔

۔۔ صرف ایک مرتبہ اور ـــــــ

"روشنی میں جانے کا مزا دیکھ لیا ہے نا!" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی ۔
"کیا مطلب ؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔
"مطلب کیا ــــ شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں ـــ اگر ایک بھی کھڑکی کھلی رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں اور کھڑکیوں نے بچا لیا ہے۔"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سا جھونکا اندر آسکا تھا۔ اور اس ہلکے سے جھونکے نے ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا' وہ مایوس تھا مگر اس کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گذرتا رہا اور ایک دن پھر اس نے یکایک ، بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی۔ ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع ، کس قدر خوب صورت ہے ۔ اس نے آہ بھر کر کہا۔ اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر اٹھ رہا ہے۔ ایک نئے مقام پر۔

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو۔؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اس کا پہلا باہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سفر جاری رکھنے کی امنگ از سر نو ان کے اندر پیدا ہوگئی۔ ابھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا ــــ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہم سفر بولا ۔

"مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔ دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے۔ میں اس میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں۔ نہ جانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن کہیں سے ہوا کا جھونکا آئے گا۔ اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک جھونکا آئے میں اس بوجھل غبار سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوشش تو کرو۔"

کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔ تم تنہا روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں بھی کبھی نہ کبھی آؤں گا ــــ کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔"
"نہیں ، جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے چھوٹے ذرے کا دل ہمدردی سے لبریز ہوگیا۔

دوسرا ذرہ بولا "اس کا خیال نہ کرو۔ اس وقت فضا کافی پرسکون ہے۔ تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی ! دوسرے ذرے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہم سفر سے محرومی کے احساس نے اس کے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں۔ اور اس کے ذہن میں ایک چبھن سی ہونے لگی۔ "یہیں ٹھیر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں" ــــ وہ سوچنے لگا۔ اس وقت فضا واقعی پرسکون تھی ، اور اوپر بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک نہر پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرواز کرنے لگا۔

وہ تاریک فضا میں گرگر اٹھتا رہا ، اٹھ اٹھ کر گرتا رہا۔ کبھی طاقت ور ذروں سے ٹکرا بالکل زمین کے قریب پہنچ جاتا اور کبھی مسلسل آگے بڑھ کر وہ کسی نئی فضا کو چھونے لگتا۔ نئی فضا کے ذرے اسے حقیر اور اجنبی سمجھ کر اسے اپنی دنیا سے نکال دیتے۔ متکبر ذرے اس کا راستہ روک لیتے اس کا مذاق اڑاتے ، نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کر کے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لمحہ بڑھتی ہوئی مشکل کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے ، اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ لیکن اس کے دل میں روشنی میں جلنے کی تمنا بے قرار تھی اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی ، کسی حال میں بجھا نہیں تھا۔ یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لمحہ مصائب کے ہجوم میں سرگرم سفر رکھا تھا اور جو اسے ہر گھڑی ایک حسین ، ایک شاداب

دنیا کے خواب دکھاتا رہا تھا۔ جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگین خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلملا اٹھتا، اور وہ اسی حالت میں اپنے بے دم جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا ۔۔۔ تاریکی کی دنیا میں اس کا کوئی ہم سفر نہیں تھا کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ سب کے سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کو پاگل تصور کرتے تھے۔ تاہم وہ تاریکی میں جذب ہونے کے لیے تیار نہیں تھا ۔۔۔ اور نہ اپنے دل سے اپنی عزیز ترین خواہش کو نکال سکتا تھا۔

وہ اڑتا رہا ۔۔۔ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ۔۔۔ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کثیف اندھیرے کی حدیں ختم ہو رہی تھیں اور اس کی ننھی ننھی آنکھوں کے آگے دور تک ۔ روشنی اور تاریکی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آ رہا تھا۔ جس میں لاکھوں صحت مند ذرے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی حائل تھی ۔۔۔ وہ ٹھیر نہ سکا۔ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ برابر آگے بڑھتا گیا!

اب اس پر ایک نیم بے ہوشانہ سی کیفیت طاری تھی۔

وہ کہاں ہے، کس دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے، یا ابھی تک اس دم گھٹنے والی تاریک فضا میں لڑکھڑا رہا ہے ۔۔۔ اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا ۔۔۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہوا ۔۔۔ اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی ۔۔۔ ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوب صورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے ذرے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی، اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہا ہے۔ اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا ۔۔۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا ۔۔۔ اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔ اس نے حیران ہو کر ایک ذرے سے پوچھا۔

"روشنی کہاں گئی؟"

نئے ذرے نے جواب دیا۔

"اب شام ہو گئی ہے۔ کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر رات کے غار میں اتر رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے ۔۔۔ تھوڑی سی روشنی اندر آ سکے گی ۔۔۔ آہ خوب صورت اور حیات آفریں روشنی تو باہر ہے ۔۔۔ باہر کی لامحدود دنیا میں۔"

"میں اسی لامحدود دنیا میں جانا چاہتا ہوں!" چھوٹا ذرہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"آگے ہوا کے بڑے تیز اور تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے ڈھکیل دیتے ہیں۔ باہر جانا ممکن نہیں۔"

"۔۔۔ مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ تو ہے ۔۔۔ وہ دروازے میں۔" وہ بولا۔

راستہ ہے، لیکن باہر نکلنا بہت مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے۔"

"کوئی پروا نہیں ۔۔۔ میں باہر جاؤں گا ۔۔۔ میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں گا ۔۔۔ ضرور جاؤں گا۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا! اوپر ہی اوپر ۔۔۔ بلند سے بلند تر فضا میں۔

اعتماد صدیقی

غزلیں

تنہائی نے بخشے ہیں ہنر اور طرح کے
محفل میں سجاتا ہوں گھر اور طرح کے

جس پیڑ کا ماحول سے رشتہ نہیں ہوتا
اُس پیڑ کے ہوتے ہیں ثمر اور طرح کے

ہنس لیتا ہوں احباب کی دلجوئی کو ورنہ
ہوتے ہیں بھرے شام و سحر اور طرح کے

جس شخص کی تقدیر میں ہو آبلہ پائی!
اس شخص کے ہوتے ہیں سفر اور طرح کے

یہ دن کی کڑی دھوپ تو سہہ لیتے ہیں لیکن
ہم شام کو آتے ہیں نظر اور طرح سے

رُسوائے زمانہ ہے مری خستہ مزاجی
پھولوں سے مراسم ہیں مگر اور طرح کے

کچھ نہ پوچھو کہ تھا گمان میں کیا
لوگ بدلے ہیں ایک آن میں کیا

اس قدر دھوپ سے پریشاں ہو
عمر کاٹی ہے سائبان میں کیا

تجھ سے مل کر تو یہ بھی یاد نہیں
کوئی رنجش بھی درمیان میں کیا

کھٹکھٹانے سے پہلے پوچھ تو لو
کوئی رہتا بھی ہے مکان میں کیا

کیوں پرندے سمٹ کے بیٹھ گئے
پر بھی کٹ جائیں گے اڑان میں کیا

کس لیے پھول اتنا زرد ہوا
کچھ ہوا کہہ گئی ہے کان میں کیا

جگن ناتھ آزاد

کوششِ ناتمام

یہ ملاقات بھی کیا ملاقات تھی
زندگی اس کو سمجھے نہ سمجھے مگر
دل یہ کہتا ہے اک طنزِ حالات تھی
یہ ملاقات بھی کیا ملاقات تھی

یوں تو سارا سفر چند لمحوں کا تھا
اور اس میں مجھے اور تجھے ایک لمحہ ملا
ایک لمحہ کہ پہلے کی مانند جس میں
بیشتر اک سکوت
بیشتر اک خموشی
دونوں جانب سے سوغات تھی

یہ لمحہ کہ تھا ایک کیفِ گریزاں
میری مٹھی میں آتا تو کیسے
تو اڑتا گیا موجِ صبا کی طرح

اور جو احساس الفاظ بننے نہ پائے
کپکپاتے رہے تھرتھراتے رہے میرے ہونٹوں پہ حرفِ دعا کی طرح
تو نے اس ایک اڑتے ہوئے لمحے میں بھی
کم سے کم مسکراتے ہوئے ایک دو لفظ کہہ کے
وضع پوری طرح سے نبھا دی

اور میں جو
وضع داری کے فن سے نہیں آشنا
بات کرنے کی کوشش ہی کرتا رہا
تیری آنکھوں کی جھیلوں میں
جو مسکراہٹ کی لہروں سے آباد ہیں

تیرے دل کے سمندر میں
جس کا کسی جزر و مد سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے
اترنے کی کوشش ہی کرتا رہا

اختر حسن

آخری نظم

اب نہ روکو مجھے اب جانے بھی دو
کوئی آواز پُراسراری آواز بلاتی ہے مجھے
شام ہوتے ہی دبے پاؤں مرے دل میں اُتر آتی ہے
اپنے بے نام اشاروں سے لبھاتی ہے مجھے
کششِ کافِ کرم کی صورت
جیسے کھینچے لیے جاتی ہے مجھے
اب تو جانا ہی پڑے گا مجھ کو
اب نہ روکو مجھے اب جانے بھی دو
کام باقی ہیں بہت کام ابھی باقی ہیں
وحشتِ زیست کی غم خواری کے کام
رسن و دار کی دلداری کے کام
کام دل سوزی کے دلداری کے کام
کام تو خیر سدا باقی رہیں گے
اب نہ روکو مجھے اب جانے بھی دو
ہاں مِرا زادِ سفر تو لاؤ
میری درماندہ دُعاؤں کی کتاب
میری پژمُردہ وفاؤں کے گلاب
میری ناکردہ خطاؤں کا حساب
بیتے لمحوں کے بسنتی موسم
بھیگی آنکھوں کی گلابی شبنم
عہد و پیمانِ وفا، قول و قسم
ادھ کھلے پھول، ادھورے سپنے
آرزوؤں کے اُمیدوں کے، تمناؤں کے
اور وہ ساری ہی چیزیں کہ ہیں محفوظ جو یادوں کی درازوں میں کہیں
لاؤ سب لاؤ مرے ساتھ کرو
دیر سی دیر ہوئی جاتی ہے
جو بھی دینا ہے شتابی دے دو
اپنے ہونٹوں کی گلابی دے دو
دُھند یہ کیسی ہے کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا ہے مجھے
اک ذرا اور مرے پاس آؤ
آخری بوسے کی قندیل جلاؤ
اس سے پہلے کہ بجھے شام کا تارا مجھے رخصت کر دو

اب نہ روکو مجھے اب جانے بھی دو

رابعہ برنی

اس بات کا دیکھو دھیان رہے

تم اکثر کہتے رہتے ہو
پھولوں کا کیا ہے
کچھ دیر میں مرجھا جاتے ہیں
اور یہ راتیں چاندی سی
دو دن کی کہانی ہے ان کی
لمحوں میں بکھر کر رہ جاتی ہے
موتی کی طرح شبنم کی لڑی
میں اکثر سوچا کرتی ہوں
کیا موسم گل ہی سب کچھ ہے
اور خواب بہاراں کچھ بھی نہیں
بلور سے ترشی صورت سے الگ
کیا عکس نگاراں کچھ بھی نہیں
مٹھی میں جو آ جائے دولت ہے
اور شوق فراواں کچھ بھی نہیں
مہتاب کی رنگت دیکھی ہے
تاروں کی سجاوٹ دیکھی ہے
اور قوس و قزح کی رنگینی
امبر کی جبیں پر دیکھی ہے
نظروں کا فقط دھوکا ہی سہی
لیکن اچھا لگتا ہے

تم اپنے خیالوں کے بادل سے
انوار سحر کو باطل ٹھہراؤ
اندیشوں کے تانے بانے سے
خوشبو کو شکنجوں میں کس دو
تاروں کی قبائے زر دھندلا دو
مہتاب کی کھیتی پامال کرو
کس طرح بسر ہوں شام و سحر
تاریک ہے شب مشکل ہے سفر
منزل کی نہیں راہی کو خبر
سن میرا دل ویران سہی برباد سہی
ہے آس سے جھلمل راہ گذر
خوشبو کے ڈگر، چاندی کے نگر
گیتوں کے شجر، تاروں کے ثمر
پلکوں پہ چراغاں کا منظر
تم آہ بھرو بھی تو دھیرے سے
ایسا نہ ہو سب کچھ بجھ جائے
اس بات کا دیکھو دھیان رہے

نجیب جمال

مسجدِ قرطبہ — ایک تجزیہ

مسجدِ قرطبہ اقبال کی ان شاہکار نظموں میں سے ہے جنھیں اقبال کے کمالِ ہنر کی مثال سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظم اسی شعری تجربے سے ہم آہنگ ہے جو اردو شاعری میں بیسویں صدی کے نصفِ اول کے بعد اب مکمل ہو چکا ہے اس وقت یہ تجربہ اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ وہ تجربہ یہ تھا کہ خیال کو خانوں میں تقسیم کر کے شعرا درجہ بدرجہ ایک خیال سے دوسرے خیال کی جانب راغب ہوتے تھے۔ اس نظم کا مرکزی موضوع مسجد قرطبہ ہے۔ یہ مسجد ہسپانوی تاریخ کے ایک اہم دور کی نشان دہی کرتی ہے جو خونِ مسلمان کا "امین" ہے۔ اسی لیے اقبال کی نظر میں ہسپانیہ کی سرزمین "حرم" کی مانند پاک ہے اور قرطبہ کی مسجد ایک تاریخی یادگار ہی نہیں، خود ایک تاریخ بن جاتی ہے جو سنگ و خشت سے لکھی گئی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں :

> "میں اپنی سیاحتِ اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک 'مسجدِ قرطبہ' پر بھی لکھی گئی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔"

مسجد کی اس فضا، میں جو صدیوں سے "بے اذاں" ہے، اقبال کے ذہن میں مختلف نقوش ابھرنے لگتے ہیں اور وہ ایک ایسے دور میں جا پہنچتے ہیں جس میں یہ مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ یادوں کے سلسلے صدیوں کے ورق الٹ دیتے ہیں۔ مسجد قرطبہ ایمان کی حرارت والوں نے دم بھر میں نہیں بنادی تھی بلکہ یہ ۷۸۵ء سے ۱۲۳۶ء تک تعمیر و تجدید اور توسیع و تغیر کے مسلسل عمل سے گزرتی رہی۔ اقبال اندلس میں ۱۹۳۳ء میں سفرِ یورپ کے دوران پہنچتے ہیں اور وہاں اس شاہکار مسجد کو دیکھتے ہیں، مسجد قرطبہ یونیورسٹیوں، علمی اداروں اور مسجدوں کا شہر اب ویران اور اجڑا ہوا ہے۔ حکومتوں کے ساتھ قوموں کو بھی زوال آئے

لیکن مسجدِ قرطبہ آج بھی اپنی عظمت کی کہانی کہہ رہی ہے "زمانہ سب کچھ مٹا دے گا لیکن اس کی تعمیر اور اس جذبہ کو نہیں مٹا سکتا جس کی بنیاد خلوص اور انہماکِ عمل پر رکھی گئی ہے۔ یہاں دو اور تاریخی مسجدوں کے بارے میں اقبال کی رائے مسجدِ قرطبہ کی تنقیدی تحسین میں معاون ثابت ہوگی۔ اقبال مسجد قوت الاسلام کے بارے میں کہتے ہیں :

"بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مغرب کا وقت تھا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں لیکن مسجد کی قوت اور جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا فعل جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ میرا احساس یہ تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔"

دہلی کی اس اوّلین مسجد قوۃ الاسلام پر اقبال نے اپنے انہی خیالات کو کچھ اس طرح منظوم کیا ہے :

ہے مری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز　　جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز　　بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ　　کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود

"پیرس کی مسجد" کا سیاسی پس منظر اور اس کی تعمیر میں سامراج کا ہاتھ اقبال کو ایک مختلف تجربہ سے ہمکنار کر دیتا ہے

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے　　کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ بازوں نے　　تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بت خانہ
یہ بت کدہ انہی غارت گروں کی ہے تعمیر　　دمشق ہاتھ سے ان کے ہوا ہے ویرانہ

لیکن مسجدِ قرطبہ کی زیارت اقبال کے لیے مکمل واردات اتحاد بن گئی۔ اس کے طرزِ تعمیر اور محلِ وقوع نے ان کی اس نظم کو ترکیبِ صوتی اور صوری آہنگ عطا کیا اور اس کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر نے نظم کو معنویت اور تفکر دیا۔ انھیں کمالِ ہنر میں بھی حق کی تلاش تھی، وہ صرف تنِ حرم کے عاشق نہیں تھے، روحِ حرم کو بھی لازمی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک فنونِ لطیفہ بھی معرکۂ بود و نبود سے بغیر احترام و تقدیس کے حق دار نہیں بن سکتے۔ اسلامی فنِ تعمیر کی قوت، ہیبت اور جلال و جمال کے بارے میں اقبال کہتے ہیں :

"اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوی شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔

قصرِ زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے ' مسجدِ قرطبہ مہذب دیووں کا ' مگر الحمرا
مہذب انسانوں کا ۔"

اس نظم کی بنیاد میں وہ جذبہ پوشیدہ ہے جو اقبال کے دل میں اسلام کے لیے موجزن وہ عقیدت جو انہیں عربوں سے تھی اور وہ محبت جو انہیں اسلامی تاریخ کے نامور اور قابلِ ذکر اکابر بنو امیہ کے زوال کے بعد جب بنو عباس ابو مسلم خراسانی کی تحریک کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آئے تخت پر بیٹھا۔ وہ فرضی حکومت کا بے اختیار بادشاہ تھا۔ بنو عباس سے خوف کھا کر بنو امیہ کا ایک شہزادہ اندلس چلا گیا اور حکومت کی داغ بیل ڈالی جو مسلمانوں کی اندلسی حکومت کے نام سے مشہور ہوئی شہزادہ عبدالرحمٰن اوّل تھا۔ اس نے اندلس میں یادگار کے طور پر پہلی مرتبہ کھجور کے درخت لگوائے اس کے اقبال کی علامت بن گئے۔ مسجد کے حسنِ تعمیر میں جو توجہ عبدالرحمٰن نے دی وہ تاریخ بن چکی ہے۔ حسن کا امکانی تصور اس مسجد کے بارے میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ شان و شوکت جاہ اور حسنِ تعمیر کے اعتبار سے اپنے عہد کی کوئی عمارت اس کے ہم پلہ نہ تھی۔ اس کے دالان سے بڑا کسی کا دالان نہ تھا۔ اس کے بیرون صحن کی چھت دو رویہ ایک ہزار ستون پر کھڑی ہے۔ اس مسجد کے دریائے کبیر بہتا ہے۔ اس کی لہروں کو کاٹ کر مسجد کے غسل خانوں میں لایا گیا ہے جس کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے نمازی غسل کرتے ہیں۔ اس کے ارد گرد خوبصورت باغ اور سبزہ زار ہیں۔ یہ مسجد عرب کی حسن پرستانہ اور جمال پرستانہ طبیعت کا اظہار تھی۔ اقبال نے یہ نظم مسجد کے ایک ٹوٹے ہوئے سے ٹیک لگا کر اور دریائے کبیر کی جانب رُخ کر کے بڑی وارفتگی کے عالم میں کہی۔

نظم کا پہلا بند اچانک شروع ہو جاتا ہے ' مسجد بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ نہ عمارت ' نہ وقت کا تند و تیز اور بلاخیز دھارا شور کرتا ہوا ابل پڑتا ہے۔ سلسلۂ روز و شب حلقۂ زلف گرہ گیر ہے! زمانہ اقبال کے ذہن میں ایک خواب خاص اور بھرپور معنویت رکھتا ہے۔ چنانچہ صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام خط میں لکھتے ہیں :

" میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت پہلے کبھی نہیں آیا۔"

اقبال نے نظم کے پہلے بند میں زندگی اور اعمالِ انسانی کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ کہ ہر شے کو فنا ہے لیکن اگر فنا نہیں ہے تو کمالِ حسن ' خلوصِ نیت اور حسنِ عمل کو فنا نہیں ہے مگر

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات ۔۔۔۔ سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

یہ روز و شب کی سان، یہ روز و شب کی چکی، یہ نظامِ تنفس، یہ دن رات کی چرخی اور یہ حادثات سے پُر صبح و شام نقش پر نقش بنا رہے ہیں۔ زندگی حادثوں کی ٹکسال ہے۔ زندگی تصویرِ درد ہے۔ ایک مستقل سوزش اور ایک مستقل حادثہ ہے۔ یہ سلسلۂ روز و شب، یہ کائنات، یہ زندگی، یہ دنیا، یہ نفس، یہ بشر، سب نقش گرِ حادثات ہی تو ہیں گویا زندگی حادثوں کا، سانحوں اور آلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کائنات ایک پیرہن ہے۔ اس لباس کے دو رنگ ہیں۔ کالا اور سفید۔ یہ نازک، لطیف، باریک اور ٹھنڈا کپڑا ہے یہ کائنات قدرت کا لباس ہے۔ گویا قدرت پہچانی جا رہی ہے۔ یہ کالا اور سفید لباس دراصل رات اور دن ہیں۔ یہ پیراہن صفاتِ قدرت نے اپنی ذات پر پھیلا رکھا ہے:

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

ماضی کا احساس اور یادوں کا سلسلہ "وقت" سے جا کر مل جاتا ہے جو اب شاعری کی نگاہ کو مسجد اور اس کے تعمیر کرنے والوں کی تاریخ سے ہٹا دیتا ہے۔ وقت جو ماضی بھی ہے، حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ وقت کے اس بے پایاں دھندلکے میں گرد و پیش گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ زمانہ ازل کی خبر لاتا ہے:

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات

وقت کا تسلسل ایک صراف کی مانند حسن کے ماہر اور اس کے تعمیر کرنے والوں کو پرکھ رہا ہے۔ "سلسلۂ روز و شب" کی تکرار ہمیں یونانی ڈراموں کے کورس کی یاد دلاتی ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اقبال کے ذہن میں اس نظم کی فنی تشکیل کے وقت یونانی ڈراموں کے کورس بھی رہے ہوں۔ مسجد قرطبہ کا پہلا بند فلسفیانہ گری سے ہم آہنگ ہے۔ اقبال نے اس میں روز و شب اور انفس و آفاق کے سلسلے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر منزل اور ہر شے کو فنا ہے۔ اگر فنا نہیں ہے تو خلوصِ نیت، جذبہ مستقل اور کمالِ ہنر کو فنا نہیں ہے۔ ورنہ یہ سلسلۂ کائنات فنا کے دور و بست میں منہمک ہے لیکن اگر کسی نقش کی تعمیر میں مردِ خدا نے انتہائے کمال، خلوصِ نیت اور حسنِ عمل کو برتا ہو تب اس نقش کو رنگِ ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے:

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے اثبات
اوّل و آخر فنا ظاہر و باطن فنا　　نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام　　جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

یہاں پہنچ کر وقت پسِ پردہ چلا جاتا ہے اور عشق جو اقبال کا انتہائی محبوب تصوری کردار ہے سامنے آتا ہے۔ عشق زمانے کا جواب ہے، اس کی اپنی بے پایاں قوتیں ہیں۔ اقبال کے ہاں مردِ خدا اور کیفیتِ عشق لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لیے اس نے کہا:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ

زمانہ کائنات کی ہر شئے کو فنا کر دینے والا ہے مگر عشق کو استثنا حاصل ہے۔ عشق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تیز و تند سیلِ رواں ہے جو وقت کے خوفناک دھارے کے آگے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ عشق شریعت کی تشریح و تعبیر بھی کرتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں لشکروں کی سالاری بھی، بزم و رزم، خانقاہ و میکدہ، علم و ہنر بھی عشق سے وجود میں آتے ہیں۔ "سفر" اقبال کی شاعری کا کلیدی استعارہ ہے۔ عشق بھی مسافر ہے ایک جگہ مقیم نہیں ہوتا۔ منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہ مسجد بھی اپنی بنیادوں میں خلوصِ نیت اور عشقِ کامل کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ عشق وہ عظیم الشان صورتِ رویہ ہے کہ زمانہ خود اس میں قید ہے۔ زمانہ اسے فنا نہیں کر سکتا۔ عشق کمالاتِ انسانی دکھاتا ہے۔ یہ انسان کو خانۂ آفاق سے گزار کر عرشِ معلیٰ پہ پہنچا دیتا ہے اور جب اطاعت و نیاز مندی بڑھ جاتی ہے تو خدا اسے رسول بنا دیتا ہے۔ جب اعتماد پیدا ہو جائے تو جبریل بن جاتا ہے۔ عشق کی مستی سے مٹی کا یہ مجسمہ (انسان) رسول بن گیا ہے۔ پیغمبر بن گیا ہے اور ولی بن گیا ہے۔ عشق کچی، رسیلی اور میٹھی شراب ہے، ابھی اسے کمال حاصل نہیں ہوا ہے، جب تک زمانہ بڑھ رہا ہے یہ بھی موجود ہے عشق تو فیض رساں، اثر آفریں اور عظیم الشان پیالہ ہے۔ اس میں جتنی شراب ڈالی جائے گی، یہ اتنا ہی بڑھے گا یعنی عشق کو قرار نہیں۔ یہ بتدریج بڑھ رہا ہے اور عروج کی جانب رواں ہے۔ عشق قیدِ تقویم میں نہیں۔ عشق سوزِ دروں بھی ہے، عشق، حسنِ طبیعت بھی ہے، ایک طرف عشق سرگرمیٔ عمل اور گرمیٔ جذبات ہے تو دوسری طرف عشق نورِ جہاں ہے۔ فطرت ہے، روشنی اور حسنِ طبیعت ہے:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ!　　عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیرِ جنود،　　عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

چنانچہ اقبال کے ہم زباں ہو کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں:

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود!　　عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

فنونِ لطیفہ کا مظہر رنگ ہوں، تصویریں ہوں، خشت و سنگ کی تعمیر ہو یا حرف و صوت (شاعری و موسیقی) ہو ان میں اگر عشق کی کارفرمائی ہے تو یہ ابدالآباد ہیں۔ جو شخص فن کو خونِ جگر پلاتا ہے اس کا فن ہمیشہ زندہ رہتا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت　　معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

مسجد کی فضا اگر دل افروز ہے تو شاعر کی نوا سینہ سوز۔ مسجد اگر دلوں کو لذتِ حضور بخشتی ہے تو شاعر اپنی نوا سے انھیں اس لذت کو جذب کرنے کے لیے کشادگی و وسعت عطا کرتا ہے، ایسی کشادگی جو سینۂ آدم کو عرشِ معلیٰ کی رفعت سے آشنا کر دیتی ہے ورنہ آدمِ خاکی نژاد کی پہنچ آسمان یا حدِ نگاہ سے آگے کہاں؟ اقبال خونِ جگر اور سوزِ دل کے باعث انسان کو فرشتوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ یہی ذوق و شوق اور سوز و گداز کافرِ ہندی کے دل اور لب کو صلوٰۃ و درود سے معمور کر دیتا ہے اور اس کے رگ و پے میں اللہ ہو کا نعرہ گونجنے لگتا ہے۔

چوتھا بند مسجد کی عمارت، اس کی تاریخ اور اس سے وابستہ تہذیب کے نقوش کو ابھارتا ہے۔ علمِ جمالیات میں جلال (SUBLIMITY) کا امتزاد ہے اور جمال (BEAUTY) کا۔ اقبال کو مسجدِ قرطبہ اور اس کے بنانے والے "مردِ خدا" دونوں میں جلال و جمال کا اتصال نظر آتا ہے۔ اس مردِ خدا ہی نے اس قدر پائیدار بنیادوں پر فنِ تعمیر کا یہ شاہکار کھڑا کیا ہے اور اسے اتنے ستونوں سے تقویت و استحکام بخشا کہ ان پر کھجور کے درختوں کا شبہ ہونے لگا۔ شفیق الرحمن لکھتے ہیں:

" نفاست اور نستعلیق پن میں مسجدِ قرطبہ کا مقابلہ یونانی تعمیرات سے کیا جا سکتا ہے اور کوئی طرزِ تعمیر ایسا نہیں جو ایسے لطیف تاثرات پیدا کرتا ہو۔ ستون اتنے نازک ہیں کہ تیز ہوا چلی تو سب کچھ بکھر جائے گا۔"

لیکن بارہ صدیوں سے سب کچھ اسی طرح قائم ہے۔ جس کی بنا کی پائیداری میں مردِ خدا کا جلال اور

اس کے ستونوں کی بے شمار حیں میں اس کا کمال شامل ہو اور جو خونِ جگر سے سینچے جو ستے عشق کا کارنامہ ہو اس میں رنگِ ثبات و دوام نہ ہو گا تو کس میں ہو گا۔

اس تصویر میں جو شروع میں وقت کے ویرانے سے بنائی گئی، اب "آدمی" حرکت کرنے لگتا ہے یہ آدمی اقبال کا وہ تصورِ حیات ہے جسے وہ "مردِ مومن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اقبال کے یہاں "مردِ کامل"، "مردِ مومن"، اور "مردِ خدا" انسان کا مثالی کردار پیش کرتے ہیں۔ اقبال اس بندۂ مومن کا راز مسجدِ قرطبہ سے آشکارا پاتے ہیں۔ اس مسجد کے سقف و دیوار و بام، منبر و محراب، ستون و در شہادت دیتے ہیں کہ اس مسجد کا بنانے والا بندۂ مومن کس طرح اپنے دنوں کی تپش اور راتوں کا گداز اس کی نذر کر گیا۔ بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے کہ سوائے اللہ کے کون غالب کار آفریں اور کارکشا و کارساز ہے۔ بندۂ مومن کے مقاصد جلیل اور امیدیں قلیل ہوتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک قلندری اور فقر ہی میں اصل شاہی مضمر ہے۔ بندۂ مومن کی کمالِ بندگی کا مقصود اپنے آپ میں اپنے مولیٰ کی صفات پیدا کرنا ہے۔ "مسجدِ قرطبہ"، تاریخ، فنونِ لطیفہ، فلسفہ اور مذہب سبھی کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ نظم بھی مردِ مومن کی طرح کامل ہے، مسجد کی عمارت اٹھانے والے مردانِ حق اور عربی شہسوار چونکہ خلقِ عظیم کی مجسم تصویر تھے اور حق و صداقت پر ان کا یقین محکم تھا، ان کے کردار اخلاق کے مثالی پیکر تھے۔ اس لیے مسجد کے حسن کا جواب اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف قلبِ مسلمان میں۔ یہ "مردِ مومن" مسجدِ قرطبہ کی خاموش اور افسردہ فضا میں ان کے سامنے تمام جلال و جمال کے ساتھ ایک تمدن کی بات کہتا نظر آتا ہے:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　　اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیالِ عظیم!　　　اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

اقبال نے اس مردِ مومن کے اوصاف بڑے دلکش انداز میں پیش کیے ہیں:

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل　　　اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو!　　　رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

چھٹا اور ساتواں بند اپنے نظامِ قوافی کے اعتبار سے بھی قابلِ غور ہے۔ دونوں بندوں کے اشعار نونِ غنہ پر ختم ہوتے ہیں۔ چھٹے بند کے قوافی "ایں" کی آواز پر اور ساتویں بند کے قوافی "آں" کی آواز پر ختم ہوتے ہیں اقبال اس آہ کو کھینچے بغیر نہ رہ سکے جسے وہ پوری نظم میں ضبط کیے رہے۔ ساتویں بند کا لہجہ ماضی سے مستقبل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں جس نے تاریخ کو اس کی معنویت عطا کی، کہیں آس پاس ہی ہے لیکن مسلمان کہیں کہیں وادی اور کہیں منزل میں ہے۔ آمد آمد کے آثار تو دکھائی دینے لگے ہیں۔ اقبال کے خیال میں

مسجدِ قرطبہ مردِ مومن کی کاوشوں اور جذبۂ عشق کا ایک نشان ہے اسی لیے اب ساری تاریخ، ساری یادیں مسجدِ قرطبہ میں سمٹ آئی ہیں۔ ماضی کی یہ یادیں شاعر کی فکر کو ایک ایسے شاعرانہ جذبے میں بدل دیتی ہیں جو غزلوں کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے۔ شاعر کو مسجدِ قرطبہ سے عشق ہو جاتا ہے اور یہ مسجد اس کے لیے سراپا "غزل" بن جاتی ہے اب شاعر کی نگاہ ایک بار پھر مسجدِ قرطبہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس مسجد کی تعمیر میں اب وہ ان لوگوں کے ہاتھ دیکھتا ہے:

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اُندلسی　　　خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال　　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں
بُوئے یمن آج بھی اس کی نواؤں میں ہے　　　رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

یہاں پہنچ کر اقبال کی فکر نظم کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ تکمیل کی آخری منزلوں پر آجاتی ہے۔ یادوں کا وہ سلسلہ جو اس مسجد سے وابستہ ہے، اقبال کو قوموں کے عروج و زوال اور نو بہ نو انقلابات سے دوچار کر دیتا ہے۔ خیالات کی رو اسے پھر "وقت" کے دریا کے کنارے لا کھڑا کرتی ہے۔ اب ہر چیز وقت بن جاتی ہے، جس کی آغوش میں ماہ و سال انسانی کاوشوں اور کوششوں کو کامیاب اور ناکام بناتے ہیں، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہونے والا ہے:

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

مارٹن لوتھر کی زیرِ قیادت المانیہ میں پاپائے روم کی عظمت اور روحانی قوت کے خلاف اصلاحِ دین کی تحریک نے یورپ کی تاریخ کا رُخ ہی بدل دیا تھا۔ انقلابِ فرانس یورپ کے سیاسی نظام پر ایک ضربِ کاری ثابت ہوا اور اس دھماکے سے ساری دنیا کے تخت و تاج ہل گئے۔ دھندشب نے اقوامِ مغرب کے دن پھیر دیے۔ ان حالات کو دیکھ کر اقبال اپنے دل میں محسوس کرنے لگے کہ ان کی اپنی قوم کی روح میں جو ہلچل مچی ہوئی ہے وہ بھی یقیناً کسی آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ ہے لیکن چونکہ رازِ خدائی فاش کرنے پہ زبان قدرت نہیں رکھتی اس لیے دیکھتے رہیے کہ وقت کے بحرِ بے کنار کی تہہ سے کون سا معجزہ اُبھرتا ہے اور گنبدِ نیلوفری کیا رنگ بدلتا ہے۔

آخری بند میں پھر وقت کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی۔ غروبِ آفتاب کا وقت ایک زبردست تاریخی معنویت پیش کر رہا ہے:

لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

'آفتاب' اقدارِ روحانی کی علامت بن جاتا ہے اور لعلِ بدخشاں کا ڈھیر تہذیب و معاشرت کا خزانہ جسے آفتاب ایک ورثے کے طور پر ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے۔ دخترِ دہقان کا سادہ و پُرسوز گیت کشتئ دل کو عہدِ شباب کی طرف بہائے جاتا ہے۔ آخری بند کے پہلے دو شعر پڑھتے ہوئے ورڈز ورتھ کی مشہور نظم (THE SOLITARY REAPER) کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے:

وادئ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب   لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت   کشتئ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب

شاعر اب تک اپنے اطراف سے بے نیاز تھا اب اسے دریائے وادالکبیر[1] اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اقبال اس کے کنارے کھڑے ہوئے ہسپانیہ میں ایک بار پھر احیائے اسلامی کا خواب دیکھ رہے ہیں:

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب

ان کے نزدیک جو قومیں کشمکشِ انقلاب سے نہیں گذرتیں، ان کی روح بے جان ہوتی ہے۔ انقلاب بمنزلۂ روحِ امم کی حیات ہے۔ وہ قوم جو ہر دور میں اپنے آپ کو سخت انتقاد و احتساب کے عمل سے گزارتی ہے اور ہر آن اپنے افکار و اعمال کا محاسبہ کرتی رہتی ہے، دستِ قضا و قدر میں شمشیرِ برہنہ بن جاتی ہے اور یہ تمام عمل انھیں قوموں سے متوقع ہے جن پر خونِ جگر کی کار آفرینی اور انقلاب خیزی کا بھید کھُل چکا ہے۔ نہ کوئی نقش خونِ جگر کے بغیر مکمل ہو سکتا ہے نہ کوئی نغمہ مجذوب کی بڑ اور سودائے خام کی حدود سے گریز کر سکتا ہے

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی   رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم   کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر   نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

"مسجدِ قرطبہ" اقبال کی شاعرانہ کلیت کو جس طرح معرضِ وجود میں لے آتی ہے اس طرح کا کامیاب تجربہ اور کسی نظم میں مشکل ہی سے ملے گا۔ نظم بذاتِ خود ایک "کُل" بن گئی ہے۔ آٹھ آٹھ اشعار کے آٹھ بندوں میں تک بھگ سوا ہزار الفاظ صرف ہوئے ہیں۔ ان لفظوں کے ذریعہ بارہ سو برس کی تاریخ، تہذیب، فنونِ لطیفہ، سیاسی پس منظر اور مذہبی عقاید کا نچوڑ شاعری کے کوزے میں بند ہو گیا ہے۔ گویا نظم کا ہر لفظ ایک بحرِ محیط ہے۔ ۵

---

[1] دریائے الکبیر' قرطبہ کا مشہور دریا جس کے قریب ہی مسجد قرطبہ واقع ہے۔

رفعت النسا بیگم

مجازؔ کی انفرادیت

مجازؔ کی شاعری کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب کہ ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی ہر لحاظ سے عوام بیدار ہو رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کا مقصد ملک کو سرمایہ داری اور غلامی سے آزادی دلانا تھا تو دوسری طرف کانگریس پارٹی میں بھی تحریک آزادی زوروں پر تھی اور اس کے علاوہ کانگریسی بھی سوشلزم اور اشتراکی خیالات سے متاثر ہوتے جا رہے تھے۔ انقلاب روس کی وجہ سے ہندوستانیوں میں بیداری کی لہر پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستانی پرانے ڈھرّے پر نہیں چل رہے تھے۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں، نئی قدریں وجود میں آ رہی تھیں اور ادبی سطح بھی اس زمانے میں بہت ہموار ہو چکی تھی۔ مارکسزم اور اشتراکی خیالات کے زیر اثر ادیبوں نے مفلسوں، محنت کشوں اور بھوکوں کی تصویر کشی کی۔ دوسری طرف ان شعرا کا بھی گروہ تھا جو اپنے عشقیہ نغموں میں مگن تھا۔ مجازؔ کی شاعری میں اپنے زمانے کے مزاج اور ماحول کا گہرا اثر ملتا ہے۔ تلخ حقایق نے انھیں انقلاب کی طرف مائل کیا اور علی گڈھ کے رومان پرور ماحول نے رومانیت کی طرف۔ اس طرح مجازؔ کے ہاں رومانیت اور انقلاب کا حسین امتزاج وجود میں آیا۔ منظر سلیم نے لکھا ہے:

> "مجازؔ نے رومان اور انقلاب کے تصورات کو زندگی کی الگ الگ منزلوں پر نہیں، بلکہ بیک وقت قبول کیا۔ دونوں تصورات کے خوبصورت امتزاج نے ان کی شاعرانہ شخصیت کی تشکیل کی اور ان کے فطری نظام کی عمارت کے لیے ساز و جام اور شمشیر ستون کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یہ شخصیت شاعری کے میدان میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔"

مجازؔ انقلاب اور شباب کے شاعر رہے، ان کی شاعری کا امتیازی وصف ان ہی دونوں چیزوں کی

ہم آہنگی ہے۔ شباب اور انقلاب کی ہم آہنگی نے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ مجاز تادم آخر اپنے روایت پر قائم رہے اور زمانے کے سرد و گرم اور اتار چڑھاؤ یا کسی تحریک سے وابستگی کی بنیاد پر کسی مصلحت پسندی کا شکار نہیں ہوئے۔ یوں بھی مجاز کو شباب اور حسن پرستی عزیز تھی۔ سماجی، سیاسی اور تہذیبی ماحول کے تقاضوں نے مجاز کے ہاں انقلابیت پیدا کر دی۔ اس طرح شباب اور انقلاب مجاز کی شاعری میں اس طرح گھل مل گئے کہ انھیں جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وضاحت مجاز کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے :

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعرِ محفلِ وفا مطربِ بزمِ دلبراں

شباب میں انقلابی تصور اور انقلاب میں رومانی تصور سے مجاز کے ہاں بوجھل اور پھیکی شاعری پیدا نہیں ہوتی بلکہ انقلاب کے موضوعات میں بھی انہوں نے رعنائی، دلکشی اور چاشنی سے کام لیا۔ "نوجوان خاتون سے" مجاز کی بڑی خوبصورت اور پیاری نظم ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے :

حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
دلِ مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل
تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

انقلاب اور رومان کا تصور بالکل نیا اور اچھوتا تھا۔ پہلی بار مجاز نے شاعری میں اس طرح کا تصور پیش کیا۔ اردو شاعری میں جس بنیاد پر مجاز کو شہرت نصیب ہوئی یہی وہ پہلو ہے جس کی طرف میں نے مندرجہ بالا سطور میں اشارہ کیا ہے۔ "پردہ اور عصمت"، "نذرِ دل" اور "مجبوریاں" وغیرہ وغیرہ۔ مجاز کی ایسی نظمیں ہیں جس میں انقلاب اور رومانیت کو آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ نظم "مجبوریاں" کے یہ اشعار

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام تک پہونچا نہیں سکتا

مجاز کے انقلابی اور رومانی تصورات کے سلسلے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں :

" مجاز کی رومانیت میں انقلاب کے خواب بھی شامل ہیں۔ مجاز کے یہاں رومانیت کچھ تو جوش کی طرح باغیانہ گھن گرج میں ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس میں بھی وہ اپنے آہنگ سے نہیں ہٹتے۔ دوسرے وہ بعض سماجی حقایق کا بھی گہرا احساس رکھتے ہیں اور انھیں شعر میں بیان کرسکتے ہیں۔ پھر مجاز کے لہجے میں اختر شیرانی کی سپردگی اور والہانہ پن کے ساتھ ساتھ نغمگی اور شیرینی کچھ زیادہ ہے۔ جوش کی شوکت اور جزالت میں کرختگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کے یہاں باوجود غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے ناہموار بھی ہے۔ مجاز کے یہاں ہم آہنگی ہے۔ جوش خلوت میں بھی بہت اونچی آواز سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن مجاز بھری محفل میں بھی دل نشین نرمی سے اپنی بات کہہ دیتا ہے۔"

مجاز ترقی پسند رجحانات کے حامل تھے۔ انہی رجحانات نے انھیں انقلاب کی تربیت دی۔ انھوں نے چار باتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ (۱) مسلح جدوجہد (۲) سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ (۳) مزدوروں کی حمایت اور (۴) انقلاب کی دعوت۔ مجاز کے تصورِ انقلاب میں اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی رجحانات کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ مجاز کی زیادہ تر انقلابی نظمیں دوسری جنگِ عظیم سے قبل لکھی گئی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم سے قبل ہندوستان میں کانگریس پارٹی میں تحریکِ آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی۔ کانگریس پارٹی اور اس کے علاوہ دوسرے لوگوں میں بھی اشتراکی خیالات اور سوشلزم کا چرچا ہورہا تھا۔ عوام مختلف انقلابی پارٹیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ کیمونسٹ پارٹی کا نصب العین ہندوستان کی آزادی اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ تھا۔

مجاز کیمونسٹ پارٹی سے قریب رہے' انقلابِ روس آچکا تھا اور چین میں بھی اس وقت اس قسم کی جدوجہد جاری تھی۔ ان تمام حالات اور واقعات کا عکس مجاز کی شاعری میں بالکل صاف نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ مجاز کی شاعری یعنی انقلابی پہلو ان حالات اور واقعات کا رہین منت ہے' انگریزی حکومت کے جبر' ظلم وستم اور استحصال کو برداشت کرتے ہوئے کوئی بھی حساس شخص نہیں بیٹھ سکتا تھا' پھر مجاز تو ایک شاعر تھے' ان تمام تلخ حقایق اور باتوں سے آنکھیں کیوں کر موند لیتے ؟ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں ایسی شاعری بھی ہورہی تھی جس میں تلخ حقایق سے منہ موڑ کر گھنی زلفوں کے سائے

اور نیم روشنی کی چاندنی میں پناہ لی جارہی تھی۔ مجاز نے ایک حساس شاعر اور نوجوان کی حیثیت سے شاعری کی ہے۔ نچلے اور متوسط طبقات، کسان اور مزدوروں کے انقلابی عزم کو خوب سراہا۔ مجاز کے اس انقلابی تصور پر دو متضاد قسم کی رائیں قائم کی گئیں۔ پہلی رائے تو یہ تھی کہ مجاز نے اپنے فرائض سیاسی اور سماجی بصیرت، شاعرانہ خلوص اور فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے کامیابی کے ساتھ انجام دیے فیض احمد فیض، سید احتشام حسین، ممتاز حسین اور ڈاکٹر محمد حسن اور دوسرے بہت سے ترقی پسندوں نے ان رائے سے اتفاق کیا ہے۔ دوسری طرف بعض لوگوں کا یہ اعتراض رہا کہ مجاز کا انقلابی رویہ " تعمیری کم تخریبی زیادہ ہے "

مجاز کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا اور پھر "حقیقت" کو جوں کا توں پیش نہیں کیا بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو شاعری کو ایک ایسا لہجہ دیا جو ان کا اپنا منفرد لہجہ قرار پایا۔ اس طرح انقلاب اور رومانیت مجاز کی پہچان بن گئے۔ بعض لوگوں نے مجاز کے انقلابی تصور کو دیکھ کر ان کو جوش کا مقلد کہا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ جوش کا لہجہ پُروقار اور بانکپن کا حامل ہے، مجاز نے بہت ہی نرم اور دل نشین انداز میں اپنی بات کہی ہے جوش کا انداز فکر جاگیردارانہ ہے اور مجاز کا عوامی۔ رومانیت کی چاشنی نے مجاز کے لہجہ کو سبک اور شیریں بنا دیا ہے۔ "انقلاب"، "نذرِ دل"، "مجبوریاں" اور "خوابِ سحر" "اندھیری رات کا مسافر اور "آوارہ" وغیرہ مجاز کی انقلابی نظمیں ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار سے مجاز کا انقلابی انداز ملاحظہ فرمایئے

متاعِ سوز و سازِ زندگی پیمانہ و بربط
میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے
بلا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا

(مجبوریاں)

زمیں چیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(اندھیری رات کا مسافر)

مجاز کی شاعری کا اہم پہلو ان کی عشقیہ یا رومانی شاعری ہے۔ مجاز کی رومانی شاعری میں بھی سماج کا واضح اور حقیقت پسندانہ شعور ملتا ہے۔ مجاز کو اشتراکی خیالات اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر جو نظریۂ حیات ملا تھا انھوں نے اس کو اپنی عشقیہ شاعری میں بھی ملحوظ رکھا۔ سماجی بصیرت سے مجاز کی رومانی شاعری میں نکھار پیدا ہوگیا۔ اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے :

"مجاز کا مایۂ افتخار ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ ان کی خوبی اور دلکشی اس میں ہے کہ وہ ہمیں جذبات کے تنگنائے سے نکال کر ایک صحت مند لطیف اور دلنواز ترنم میں گم کر دیتی ہیں۔ ان میں فراوانی 'اضطراب' انفرادیت' مرکزیت سے گریز' جذباتیت' تخیل کی شادابی اور بہاؤ غرض وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں' جن سے رومانیت عبارت ہے۔ یہ نظمیں اصلی اور واقعی جذبات اور حالات سے تحریک اور نمو حاصل کرتی ہیں۔ اور یہ پتہ چلتا ہے کہ حسن و عشق کی واردات نے شاعر کے حساس اور بے چین دل کو ضرور متاثر کیا ہے"

مجاز کے یہاں عشقیہ شاعری کا یہ تصور بالکل نیا تھا اور قدیم عشقیہ تصورات سے بالکل مختلف بھی۔ اختر شیرانی نے اگرچہ اس نوعیت کی شاعری کی تھی لیکن اختر شیرانی کی دنیا صرف خواب زاروں کی حد تک جا رہی۔ سماجی بصیرت اور سماجی فضا مجاز کو اختر شیرانی سے آگے لے کر نکل گئی اور اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک نے مجاز کے رومانی تصورات کو اختر شیرانی کی عشقیہ شاعری سے مختلف بنا دیا اور پھر اس کے علاوہ مجاز نے عشقیہ شاعری میں ان دو تین باتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ مجاز نے شاعری میں "محبوبہ" کو روایتی محبوبہ بنا کر پیش نہیں کیا ہے بلکہ ان کی محبوبہ گوشت پوست کی ایک ایسی عورت ہے اور وہ اس دنیا میں رہتی ہے جہاں مجاز خود بھی رہتے ہیں۔ نظم "کس سے محبت ہے" کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے :

میرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پاتے ہیں
مجھے تسکین دیتی ہے میرے اندیشے مٹاتے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گاتے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

مجاز کی عشقیہ شاعری میں عشقیہ تصور ہی نہیں' عاشق اور معشوق کا تصور بھی بدلا ہوا ہے۔ مجاز نے عاشق کو اپنے زمانے کا بیدار' باشعور اور سرکش نوجوان بنا کر پیش کیا ہے' عاشق "کوہ کن" نہیں بلکہ

زمانے اور حالات کا بوجھ اٹھانے والا ایک باہمت مرد ہے۔ مجاز نے عشق و عاشقی کے موضوعات بڑے سلیقے سے برتے ہیں، ان میں حسن، نغمگی، رنگینی و رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔ عزیز احمد کہتے ہیں :

"عشقیہ شاعری ان کا فطری موضوع ہے اور اس میں وہ جدت طرازیاں دکھاتے ہیں۔ مشاہدے اور بیان کی ندرت کبھی کبھی لطف دے جاتی ہے۔"

اور اب یہ اشعار پڑھیے :

چھلکے تری آنکھوں میں شراب اور زیادہ
مہکے ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

بہت مشکل ہے دنیا کا سنبھلنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

مجاز کے ہم عصروں میں فیض، سردار جعفری، مخدوم محی الدین قابلِ ذکر ہیں لیکن ان تمام شعرا میں مجاز اعجاز ہی ایسی تھی کہ انہوں مستی کے عالم میں انقلاب اور عشق کے نغمے کچھ اس انداز سے گائے کہ سب کی نظا مجاز پر مرتکز ہوئیں اور بعد کو بل کر مجاز کے اسلوب کو ان کے ہم عصروں نے اپنایا۔ منظر سلیم لکھتے ہیں :

"مجاز نے ترقی پسند شاعری کی اقدار کی تشکیل میں جو حصہ لیا اس کی بنا پر انھیں ترقی پسند ادب کی تحریک کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا ایک اہم خالق کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

مجاز نے اپنی شاعری میں ترقی پسند خیالات اور نظریے کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مجاز نزدیک ترقی پسندی محض ایک سیاسی نعرہ نہیں تھی بلکہ انہوں نے اس نظریے کو اپنے جذبات کی تپ سے رنگینی و رعنائی عطا کر دی۔ مجاز نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کو اسی کی شکل میں دیکھا او دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مجاز کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی ان کے آخری دم تک برقرار رہ "رات اور ریل"، "انقلاب"، "شوقِ گریزاں"، "تعارف"، "خانہ بدوش"، "مجبوریاں"، "نذ علی گڈھ"، "دلی سے واپسی"، "مسافر"، "اندھیری رات کا مسافر"، "طفلی کے خواب"، "نوجوا خاتون سے"، "آوارہ" اور "پردہ اور عصمت" مجاز کی اہم نظمیں ہیں جن میں ترقی پسند خیالا بہت خوبصورتی کے ساتھ سموئے گئے ہیں۔ "نذرِ دل" بھی ایک ایسی ہی نظم ہے اس کے اشعا

ملاحظہ ہوں :

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلاب تازہ پھر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجاز کی نظم "آوارہ" بھی بڑی خوبصورت ہے۔ اس میں نہ صرف ایک پوری نسل کا المیہ ہے بلکہ رومانیت کی روایت ایک ملتی ہے۔ "آوارہ" کا محرک شہر کی سرمایہ دارانہ خارجیت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بیگانہ اور "آوارہ" محسوس کر رہا ہے :

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا ہے، سارا قصر پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز ایک بہت بڑے فن کار تھے، اپنی شہرت کے لیے سستی پبلسٹی کا سہارا نہیں لیا، وہ اپنی دھن میں آپ اپنے ضمیر کی آواز پر شعر کہتے رہے۔ اپنے دور میں مجاز ہی نہیں تھے جنھوں نے بہ حیثیت میں تحریک کو دوام بخشا، بلکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اردو نظم روز بہ روز ترقی پذیر ہوتی جا رہی تھی۔

ایک طرف ترقی پسندوں کا گروہ تھا دوسری طرف حلقۂ اربابِ ذوق۔ ترقی پسندوں نے ایک طرف اپنی انتہا پسندی، نعرہ بازی اور انقلاب زندہ باد کی رو میں ہئیت اور فارم کو نظر انداز کیا۔ دوسری طرف حلقۂ اربابِ ذوق نے شعور، لاشعور، درون اور جنسی مسائل کی عکاسی کے لیے نئی نئی ہئیتیں استعمال کیں۔ لہٰذا فنی، تکنیکی اور ہئیتی ارتقا کے سلسلے میں اُردو نظم کے لیے یہ اہم دور تھا۔ معریٰ، آزاد، نیم آزاد، نیم پابند، نظموں کے تجربے کیے جانے لگے لیکن مجازؔ ان تمام تجربوں سے دُور ہی رہے۔ ان کے پاس کلاسیکی شعرا کی سادگی ملتی ہے۔ تکنیک کے معاملے میں مجازؔ پرانی روش سے منسلک رہے۔ مجازؔ کی نظمیں غزل کی ساخت اور تکنیک ہی میں ہیں۔ اس کے باوجود بھی مجازؔ کو شہرت اور ادبی مرتبہ ملا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مجازؔ کو اندازِ بیان پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی تمام نظمیں ایک انفرادی شان رکھتی ہیں۔ مجازؔ کی پابند نظمیں اپنے زمانے کی پابند نظموں سے ممتاز ہیں۔ مجازؔ کی شہرت اور انفرادیت کی ایک وجہ الفاظ کا استعمال بھی ہے۔ برمحل برجستہ الفاظ استعمال کرنے کا سلیقہ مجازؔ کو خوب آتا تھا۔ اس کے علاوہ مجازؔ کی خوبصورت تشبیہات و استعارات ہیں جن سے شاعری میں نکھار، رنگینی و رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ مجازؔ کے اندازِ بیان کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ تعریف ہے کہ قدیم شعری روایات سے وابستگی اور کلاسیکی سرمایے سے دلچسپی کی وجہ سے ان کے کلام میں فارسی ترکیبیں بھی آگئی ہیں۔ برمحل الفاظ، خوبصورت تشبیہات و استعارات، مترنم اور رواں دواں بحروں کی وجہ مجازؔ کی شاعری میں غنائیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ حسن و عشق کی چاشنی نے مجازؔ کی شاعری کو شہرت دوام عطا کیا۔ اس طرح مجازؔ نے اپنی آواز کو قائم رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ سماجی اور سیاسی تلخ حقایق کی ترجمانی بھی مجازؔ نے کی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا اندازِ بیان رجائی اور لہجہ پُر اُمید رہا۔ مجازؔ کا سب سے بڑا کمال تو یہ ہے کہ انھوں نے جس وقت شاعری کی اس وقت کا ماحول حوصلہ شکن تھا، ہر طرف پریشانی، الجھن، درد و کرب، انتشار برپا تھا لیکن ان تمام واقعات کے باوجود مجازؔ کے مزاج میں قنوطیت یا فرار نے راہ نہیں پائی حالانکہ فانیؔ جیسے یاسیات کے امام سے بھی انھوں نے استفادہ کیا تھا۔

مجازؔ نے بہت مختصر حیات پائی۔ اس میں انھوں نے جو کچھ اُردو شاعری کو سونپا ہے، یہ سرمایہ قابلِ قدر ہے۔ مجازؔ سے اور بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں مگر انھوں نے بہت جلد دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھا۔ اس قدر مختصر سے اثاثے اور سرمایے کے ساتھ اُردو شاعری میں شہرت حاصل کرنا بہت بڑی بات ہے۔ یہ شہرت مجازؔ کے

چھتے میں آئی۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں :

"وہ ایک شہابِ ثاقب کی طرح ہمارے ادبی افق پر رونما ہوا تھا۔ اس کی روشنی بڑی نظر نواز تھی، دیکھتے دیکھتے ، ستی داد ، طبیعت کی کمزوری اور خرابیوں کی موجودگی، شکست اور کاروباری دنیا میں کوئی قیمت نہ ہونے کی وجہ سے اس شعلے کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ مگر اس نے ہمیں درد و غم، آرزو اور جستجو کا جو خزانہ دیا ہے، اس سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔"

مجاز کی شاعری کا یہی وصف انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے مختصر سے شعری سرمایے کے باوجود جو زندگی اور زمانے سے اُن کی گہری وابستگی کی دلیل ہے۔ مجاز کی آواز بھی اپنی کھنک اور دل نوازی کی وجہ سے اُردو دنیا میں تا دیر گونجتی اور آنے والی نسلوں کو ایک عرصے تک متاثر کرتی رہے گی۔ ✣

ہندوستان میں اُردو صحافت ✣ صفحہ ۲۷ سے آگے

ہیگل اور مارکس کا یہ خیال کہ ہر شے اپنے تضاد کو جنم دیتی ہے ایک کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ یہی اخبارات جو انگریزوں نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے اور ہندوستانیوں کو رسوا کرنے کے لیے جاری کروائے تھے وہی آہستہ آہستہ ہندوستانی عوام میں سیاسی شعور کی بیداری کا سب سے بڑا ذریعہ بننے لگے اور دھیرے دھیرے اخبار بینی کا ذوق بھی بڑھا۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے اور اس کی تربیت کرنے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دو دہوں میں ایسے اخبار بھی وجود میں آئے جنھوں نے انگریزی نظام کی چولیں ڈھیلی کردیں اگر انگریزی میں "کامریڈ" کو یہ فخر حاصل رہا ہے تو اُردو صحافت بھی پیچھے نہیں رہی اور جہاں "الہلال" و "البلاغ" کی اشاعت نے ایک طرف صحافت کو ادبی وزن و وقار عطا کیا تو دوسری طرف ہندوستانی رائے عامہ کو انگریزوں کے خلاف بیدار کرنے اور اس کی تربیت کرنے میں نمایاں و اہم کردار ادا کیا۔ ✣

ڈاکٹر محمد انورالدین

ہندوستان میں اُردو صحافت کے آغاز کے محرکات

مشرق میں جاگیرداری نظام کی جڑیں مضبوط تھیں اور اس نظام کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ بادشاہ کو عوام، روسا اور جاگیرداروں کے حالات سے باخبری رہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وقائع نگاری، پرچہ نویسی اور اخبار نویسی کے شعبے قائم تھے۔ یہ اخبار نویسی ایک طرح کی جاسوسی ہوا کرتی تھی اور اس کام کو انجام دینے والے مخبر کہلاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جاگیرداری نظام میں ماس میڈیا یا عوام کا ایک دوسرے سے رابطہ یا عوام کو باخبری کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اقتدار کا مرکز بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی کو سب کچھ معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے مشرق میں صحافت کا آغاز بعد میں ہوا۔ مغرب میں چونکہ جمہوریت اٹھارویں صدی سے ہی پنپنے لگی تھی اور انقلاب فرانس کے بعد سے جمہوری اقدار فرانس اور انگلینڈ میں کافی اہمیت اختیار کر گئی تھیں۔ اس لیے وہاں صحافت کا وہ تصور تھا، جس میں سلطنت کے حالات سے لوگوں کو باخبر رکھا جاتا تھا۔ حکمراں کیا کر رہا ہے یہ بات عوام تک پہنچائی جاتی تھی اور رائے عامہ کو ہموار کیا جاتا تھا۔ مشرق اور مغرب میں یہی فرق تھا۔ مشرق میں ایک فرد ساری رعایا کے حالات جاننے کے لیے بے چین اور مضطرب رہتا تھا اور مغرب میں ساری رعایا چند افراد کے طریقۂ حکومت اور ان کے بارے میں جاننا چاہتی تھی اور پھر اس پر احتساب بھی کرتی تھی اور اس احتساب کا ذریعہ بھی صحافت ہوا کرتی تھی۔

ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام اٹھارویں صدی کے ابتدائی دو دہوں تک مضبوط رہا، اس لیے یہاں صحافت کا وہ تصور نہیں ہو سکتا تھا جو پیرس یا لندن میں ہو سکتا تھا یا تقریباً سو سال بعد واشنگٹن میں ہوا لیکن انگریزوں کے قدم جب یہاں مضبوطی سے جمنے لگے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے محروسہ علاقوں میں اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے جو اقدامات وہ کر رہی ہے اس کا زیادہ سے زیادہ پروپگنڈہ کرے اور عوام کا ردِ عمل بھی معلوم کرے۔ مغرب میں جو صحافت عوام

کے لیے تھی اور عوام کی آواز تھی، ہندوستان میں اُسی صحافت کا نقطۂ آغاز حکومت کی پروپگنڈہ مشنری کی حیثیت سے ہوا۔

چنانچہ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اُردو کا پہلا اخبار بنگال سے شائع ہونا شروع ہوا جو کمپنی کی عملداری میں آچکا تھا جہاں شورشوں کے پس منظر میں اور استمراری بندوبست کے نفاذ کے بعد سے انگریزی حکومت اپنا پروپگنڈہ بھی چاہتی تھی اور ردِّعمل بھی دیکھنا چاہتی تھی۔

یہ عجیب وغریب بات ہے کہ اواخر اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے اواخر تک اُردو زبان وادب کے فروغ وترقی کے سلسلے میں جو بھی اہم اقدامات ہوئے ان کے محرک انگریزی حکام تھے اور ان اقدامات کا منشا ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے پہلے فارسی کو ملک کی سرکاری اور تمدنی زبان ہونے کا مرتبہ حاصل رہا۔ اُردو کی حیثیت محض ایک تجارتی، معاشرتی وتہذیبی رابطے کی زبان کی رہی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی کا بھی ستارہ غروب ہونے لگا۔ اورنگ زیب کے بعد ملک میں جو سیاسی خلفشار پیدا ہوا اس کی وجہ سے سکون واطمینان کی وہ فضا باقی نہیں رہی جو درس وتدریس وتحصیلِ علم کے لیے ضروری ہوتی ہے چنانچہ عوام کی تعلیمی حالت دن بدن پست ہوتی گئی نتیجتاً فارسی کا چلن بھی کم ہوگیا۔ اس کا اثر فارسی شاعری پر بھی پڑا اور وہ بادشاہوں اور امراء کے دربار تک محدود ہوکر رہ گئی اور جب درباروں کی حالت بھی خستہ وخراب ہوگئی تو شاعر جو صرف "خواص پسند" شعر کہتے تھے اب "عوام سے گفتگو" پر مائل ہوگئے اور اُردو میں شعر کہنے لگے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

برسرِاقتدار آنے کے بعد انگریزوں نے بھی ابتداً فارسی کو اپنایا کیونکہ یہی سرکاری اور دفتری زبان تھی اسے اچانک بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ کمپنی کے ملازمین کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ فارسی سیکھیں اس کے لیے انھیں "منشی کا الاونس" دیا جاتا تھا۔

گلکرسٹ نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ فارسی صرف اونچی سطح پر سرکاری کاموں میں معاون ہوسکتی ہے لیکن عوام سے حقیقی رابطے کی زبان نہیں بن سکتی جبکہ ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو تمام اقطاعِ ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس نے کمپنی کے ملازمین کو فارسی سے زیادہ ہندوستانی سکھانے کی اہمیت پر زور دیا۔ چنانچہ اسی کی کوشش سے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان کا

ایک شعبہ قائم ہوا۔ گلکرسٹ نے اردو زبان کی تدریس کی سہولت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آسان اور بول چال کی زبان میں کتابیں لکھوائیں جس کی وجہ سے بالواسطہ طور پر اردو زبان کو فائدہ پہنچا اور اردو نثر کی ترقی کے لیے راستہ کھل گیا۔

ہندوستان میں برطانوی سیاست کا سب سے بڑا حربہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" رہا ہے۔ ان کا حربہ اس لیے کارگر اور کامیاب ثابت ہوا کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں مختلف لسانی اور مذہبی اور نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے جو صدیوں کے ارتباط اور اختلاط کی وجہ سے ایک مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے رشتہ واتحاد میں منسلک ہو گئے تھے۔ مشترک ہندوستانی تہذیب کے تشکیلی عناصر، قومی اتحاد، مذہبی رواداری اور لسانی یک جہتی وغیرہ ہمیشہ انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔

ویسے انگریزوں کی اکثریت ہندوستانی زبانوں اور ہندوستان کی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اس کی جگہ انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کو رائج کیا جائے۔ مثال کے طور پر میکالے نے یہ بات نقل کر دی:

> "..... ہندوستان کے اس حصے کے باشندوں کی عام طور پر بولیوں میں نہ تو ادبی سرمایہ ہے نہ ہی سائنٹفک معلومات، اور وہ اتنی کم مایہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں کہ جب تک انھیں کسی دوسرے ذریعوں سے مالا مال نہ کیا جائے ان میں کسی بھی ادبی، علمی کام کو منتقل کرنے کا کام آسان نہ ہوگا۔ اس بات سے بھی ہر طرف اتفاق نظر آتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی استطاعت رکھنے والوں کا ذہنی ارتقا صرف اسی زبان کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو مقامی نہ ہو..... ایک اچھے یوروپین کتب خانے کی صرف ایک الماری قدر و قیمت میں ہندوستان اور عرب کے سارے ادب کے برابر ہے۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کو اردو زبان و ادب سے بے لوث محبت نہ تھی۔ اردو زبان کی سرپرستی میں خود ان کا مفاد مضمر تھا۔ فارسی کی مخالفت کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ فارسی زبان پیشرو مسلمان حکمرانوں کی یادگار اور ان کے تمدنی ورثہ کی امین تھی۔ انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی قوم کو اخلاقی پستی کا شکار بنانے کا بہترین حربہ یہ ہے کہ اس کا رشتہ اعلیٰ تمدنی روایات

سے منقطع کر دیا جائے۔ اس لیے انھوں نے فارسی کو ختم کر کے اُردو کو اس کی جگہ دے دی جو ملک میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ انگریزی کو وہ اس لیے سرکاری زبان نہیں بنا سکتے تھے کہ اس کے جاننے والے بہت کم تھے اگرچہ، یہ بات ان کے منصوبے میں شامل تھی کہ آیندہ انگریزی زبان کی تعلیم عام ہو جانے کے بعد اس کو سرکاری زبان کا مرتبہ دیا جائے۔

انگریز چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم اور سائنس کی ترقیوں سے واقف کرائیں تاکہ ذہنی سطح پر مغربی کلچر کی مزاحمت کم ہو وہ اس کی برتری کو تسلیم کریں اور اپنے روایتی علوم و تمدن کو کمتر جان کر اس سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ سب سے پہلے یہ کام عیسائی مشنری نے انجام دیا اور پھر خود حکومت نے اس کا بیڑہ اٹھایا اور اسی مقصد کے پیشِ نظر "اخبار جام جہاں نما" ۲۷ر مارچ ۱۸۲۲ء کو اُردو زبان میں جاری کیا گیا۔

اخبار "جام جہاں نما" میں انگریزی اخباروں سے خبریں ترجمہ کر لی جاتی تھیں۔ ان خبروں میں انگریزوں کے کاموں اور کارناموں کو توصیفی انداز میں پیش کیا جاتا تھا اور ہندوستانی امرا کے بارے میں جو خبریں ہوتی تھیں ان میں بالواسطہ طور پر ان کی عیش پسندی کو شہرت دی جاتی تھی اور عوام کے بارے میں ایسی خبریں نمایاں شائع کی جاتی تھیں جن میں ان کی تہذیبی پستی اور توہم پرستی آشکارا ہوتی تھی۔ انگریزوں کے کارناموں کے تعلق سے اخبار "جام جہاں نما" کی یہ توصیفی انداز کی خبر ملاحظہ فرمائیے:

"بہت دنوں سے یہ خبر مشہور تھی کہ انگلستان میں ایک جہاز
تیار ہوا ہے کہ جس طرح ایک ناؤ پچھلے برس کلکتہ میں آئی
کہ صرف دھوئیں کے زور سے چڑھاؤ اتار پر بے تکلف
دریا میں چلی جاتی ہے۔ وہ جہاز اس طرح بے کھٹکے بحر میں
آمد و شد کرے گا اور اس جہاز کے بنانے والے نے انگلینڈ
سے کلکتے پہنچنے کی پچھتر دن کی مہلت ٹھہرائی ہے کس واسطے کہ
وہ جہاز پال (کذا) سے علاقہ نہیں رکھتا جو ہوا کا محتاج ہو اسے آندھی،
طوفان، موسم، غیر موسم سب برابر ہے بارے مہینے میں وہ جہاز
ولایت سے آیا جس دن وہ کلکتہ پہنچا، دریا کے کنارے ایک انبوہ
جمع تھا، ہفت اقلیم کے سیاح اکٹھے ہوئے تھے۔ کس واسطے کہ
اگلے زمانے میں کسو نے جہاز کا نام نہیں سنا ہے۔ چند نافہ کے

کے دیکھنے سے لوگوں نے سمجھا تھا کہ جہاز بھی بن سکتا ہے۔ بہت سے بڑے ریاضی داں جنھوں کو اس علم میں دعویٰ ہے یہ کہتے ہیں کہ ایسا ولایت سے کلکتہ ہرگز نہ پہنچے گا۔ اس جہاز کی تیاری اور جلد رفتاری کو دیکھ کر سب خلقت دنگ ہو گی اور ریاضی کے اہلِ کمال حیران ہو کر کہنے لگے کہ یہ پچ جہاز ہے جو دھوئیں کے زور سے چلا آتا ہے یا کوئی طلسم ہے کہ دکھائی دیتا ہے؟ اس جہاز کے بنانے والے کو ہزار آفرین کہا چاہیئے بشر کا یہ کام نہیں ایسی نادر صنعت کا ایجاد کرنا بہت مشکل ہے اس سبب سے بنانے والا موجود، دیکھنے والوں نے بنتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا سب کو یقین ہوا۔ اگلے وقتوں میں کسی نے بنایا ہوتا تو سب یہی کہتے کہ اس کے بنانے والے کے فرشتے مددگار تھے اس نے دھوئیں کا جہاز نہیں بنایا خلق کو اپنا معجزہ دکھلایا۔ غرض جس قدر ستائش لوگوں نے کی اگر لکھی جاوے ایک دفتر میں گنجائش نہ پاوے"

اس کے برخلاف ہندوستانی امرا کے تعلق سے اخبار کا رویہ اور خبروں کا انداز ملاحظہ اس طرح کی خبروں میں بڑی ہوشیاری سے عام دلچسپی کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا مگر خبر کی زیریں لہروں روسا اور جاگیرداروں کی منفعت مقصود ہوتی تھی۔

لکھنو کی خبر

"اخبار کے کاغذ سے دریافت ہوا کہ ربیع الثانی مہینے کی پہلی تاریخ منگل کے دن۔ اس روز موافق معمول کے صاحب رزیڈنٹ بہادر کے واسطے حاضری کی تیاری تھی۔ حضرت بادشاہ کوکرایل کی طرف سے سیر کر کے قصر شاہی میں رونق افروز ہوئے پانچ گھڑی دن چڑھے تک منتظر بیٹھے تھے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر آئے آٹھ انگریز عالی قدر

ساتھ لائے۔ جہاں پناہ نے سب صاحبوں کے ساتھ حاضری تناول فرمائی اور اس کے بعد اختلاط کی باتیں ہوا کیں۔ آفریشے صاحب رخصت کے وقت عطر پان جو کچھ رسم ہے لے کر کوٹھی کو سوار ہو گیے۔ پس پیچھے جب حضرت کے کھانے کا وقت آیا اور سب قسم کا کھانا دستر خوان پر چُنا گیا' حضرت نے خشکے کے چاولوں کو بادشاہی طعام کے لائق نہ دیکھا۔ غلام حسین خان داروغہ کو ارشاد ہوا کہ للّو مودی اور چمن لال مشرف باورچی خانے کا مقید ہو۔ آخر دونوں نے اپنی غفلت پر نادم ہو کر پانچ ہزار روپے احمقانہ کے گزرانے بادشاہ خطا بخش نے قصور معاف فرمایا۔"

لکھنو کے دربار کی کچھ اور خبریں ملاحظہ ہوں :

" ایک دن میتا بیگ کوتوال نے حکم دیا کہ جتنی لونڈیاں شہر میں بکیں انھیں حضور کی دیوڑھی پر حاضر کیا کرو۔"

" مرزا محمد تقی خاں آغا نصیر کے بھائی جو ناراض ہو کر کان پور کی طرف روانہ ہوسے۔ الہی جان ان کی طوائف چالیس رنڈیوں کے ساتھ گیروے کپڑے پہنے اور علم ہاتھ میں اٹھا کر حضرت کی درگاہ کو گئی۔"

" ایک عرضی پہنچی کہ احسان علی بردہ فروش چار کنیزیں لایا ہے اور اس نے آٹھ کنیزیں مرزا میتا بیگ کوتوال کو بھیجی تھیں وہ بھی در دولت پر حاضر ہیں۔ ارشاد ہوا کہ انھیں احسان علی کے پاس روانہ کردو' جو کنیزیں کوتوال کے پاس آئی تھیں ان کو مسترد کر دیا۔"

اخبار جام جہاں نما کے اجرا کے بعد جو اخبار مقامی لوگوں نے جاری کیے ان میں بھی مغربی علوم و فنون سے متعلق مضامین شائع کیے جاتے تھے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانیوں کے ذہنوں میں یہ تجسس پیدا کیا جاتا تھا کہ اہل مغرب اور ان کی تعلیمات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ (باقی ص ۳۱ پر)

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

۲ر نومبر: مسز اندرا گاندھی کے المناک سانحہ قتل پر ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو اور مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر انجمن شہر حیدرآباد نے اپنے تعزیتی بیانات جاری کئے اور مسز گاندھی کی وفات پر اظہار رنج والم کرتے ہوئے ان کی گرانقدر قومی خدمات کو خراج ادا کیا۔

۵ر نومبر: سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن نے قرارداد تعزیت منظور کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی کو اپنا خراج پیش کیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے قرارداد پیش کی۔

۷ر نومبر: جناب رمن راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اردو نے مسز گاندھی کے سانحہ ارتحال پر اخبارات کے لیے تعزیتی بیان جاری کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ:

"۳۶ سال قبل گاندھی جی کی شہادت پر ایک مفکر نے کہا تھا کہ نیک ہونا بھی کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ مسز گاندھی کے قتل کے بعد وہ مشہور جملہ ہمارے ذہنوں میں پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ جناب سکسینہ نے مزید کہا کہ مسز اندرا گاندھی ہندوستانی کلچر کی پرستار اور پاسبان تھیں، وہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں رہیں، امید ہے ان کے جانشین بھی قومی اور علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں رہیں گے۔"

۱۰ر نومبر: مجلس تصنیف و تالیف و ترجمہ ادارۂ ادبیات اردو کا اجلاس ایوانِ اردو میں جناب حامد علی عباسی صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداً اس اجلاس میں مسز اندرا گاندھی کے المناک سانحہ ارتحال پر قرارداد منظور کی گئی، شرکاء نے احتراماً دو منٹ کی خاموشی منائی بعد ازاں اشاعتی کتب کے سلسلے میں غور کیا گیا اور طے پایا کہ اردو شہ پارے مرتبہ ڈاکٹر زور اور تاریخ گولکنڈہ مصنفہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی کو دوبارہ ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔ ان کتابوں پر نظرثانی کی ذمہ داری علی الترتیب پروفیسر ڈاکٹر سیدہ جعفر اور جناب سید محمد مرتضیٰ قادری نے قبول کی۔ کتب خانہ ادارہ کی فہرست مطبوعات جلد چہارم کی ترتیب و تہذیب کا کام پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم کے سپرد کیا گیا اور جناب منظور احمد نے پروفیسر سید علی اکبر مرحوم کے ادبی مضامین کی ترتیب و تہذیب کی ذمہ داری کی۔ مسرز حامد علی عباسی، رمن راج سکسینہ، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر انور معظم، سید محمد مرتضیٰ قادری اور معتمد مجلس تصنیف و تالیف و ترجمہ محمد منظور احمد نے

ترکت کی اور اہم تجاویز پر اظہار
یال کیا۔

ریاستی اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ
نے اپنے اجلاس میں مسز اندرا گاندھی
فات پر قرارداد تعزیت منظور
جس میں کہا گیا ہے کہ مسز گاندھی
سانی اقلیتوں بالخصوص اردو
کاز کے لیے ان کی خدمات یاد
یں گی۔

نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری
حلقہ ارباب ذوق کا جلسہ تعزیت
یب عبدالحمود ڈائرکٹر لائبریری
صدارت میں ہوا۔ قرارداد تعزیت
ذریعہ مسز اندرا گاندھی کو خراج
ت ادا کیا گیا۔

ستقل خواتین کا جلسہ تعزیت
رابعہ برقی کی صدارت میں
س میں خواتین اہل قلم نے
ندھی کو خراج عقیدت ادا

نمبر: مسز اندرا گاندھی کی یاد
ہ ترقی اردو آندھرا پردیش
تعزیت بمقام اردو گھر
بال مسٹر کے ایم خان نے
ت کی۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان،
جسٹس سردار علی خاں، پروفیسر نارائن
کرن ریڈی، ڈاکٹر حسن الدین احمد اور
مسز منوہر راج سکسینہ نے مخاطب کیا۔
خواجہ شوق، وقار خلیل، صلاح الدین نیر
ثریا مہر اور حفیظ ساکت نے منظوم نذرانہ
عقیدت پیش کیا۔ مسٹر کمال الدین علیخاں
سکریٹری ادارہ نے نظامت کی اور
قرارداد تعزیت پیش کی۔

● حیدرآباد لٹریری فورم (حلقہ)
کی مجلس عاملہ نے مسز اندرا گاندھی
کی وفات پر قرارداد تعزیت منظور کی۔

۲۳ ر نومبر: ممتاز فکشن رائٹر
جناب راجندر سنگھ بیدی کی وفات پر
صدر ریاستی انجمن ترقی اردو ڈاکٹر
سید عبدالمنان نے تعزیتی بیان جاری
کرتے ہوئے ان کی خدمات کو
خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ بیدی
کی رحلت سے اردو زبان اور کلچر
کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔

● مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کلکتہ
نے حیدرآباد کے ۲ مصنفوں کو ان
کی مطبوعات پر ادبی ایوارڈ دیا ہے
جن میں پروفیسر سیدہ جعفر (یوسف
زلیخا) پروفیسر مغنی تبسم (آواز اور
آدمی) ڈاکٹر حمیرہ جلیلی [illegible] کی
تنقید و تدوین) اور غلام ربانی تاباں
کا مزاج) شامل ہیں۔ ادارہ ان مصنفوں
کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

● ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی بمبئی
یونٹ کے جلسہ تعزیت میں مسز
اندرا گاندھی کے سانحہ ارتحال پر صدر
جلسہ مسٹر سید وقار الدین، ایڈیٹر
رہنمائے دکن کے علاوہ مسز ڈاکٹر
رام پرشاد، محمد منظور احمد، ڈاکٹر
مجتبیٰ صدیقی، سعادت علی، عبدالکریم
ماہر، وقار احمد اور دوسروں نے
خراج عقیدت ادا کیا اور مسز گاندھی
کے قتل کو انسانیت کے لیے ناقابل
تلافی نقصان قرار دیا۔

۱۷ ر نومبر: ادبی ٹرسٹ کی
مجلس انتظامی کا اجلاس صدر ٹرسٹ
جناب حامد علی عباسی کی صدارت
میں دفتر سیاست پر منعقد ہوا۔
طے پایا کہ جنوری ۸۵ء میں ہونے
والی کل ہند صنعتی نمائش میں سابق
کی طرح اردو کتابوں کا ایک اسٹال
قائم کیا جائے۔ اکیڈیمی نے ڈاکٹر
اشرف رفیع کے زیر طبع مقالہ اور
جناب قدیر زماں کے مسودہ
(ڈراموں کا مجموعہ) کے لیے فی کس

ایک ہزار روپے کی اشاعتی گرانٹ منظور کی۔ حیدرآبادی کلچر پر آنجہانی سے محبوب نارائن کے ایک مسودہ کی ٹرسٹ کی جانب سے اشاعت کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ مسرز عابد علی خان، ڈاکٹر عبدالمنان، رمن راج سکسینہ اور منوہر راج سکسینہ نے اس اجلاس میں شرکت کی۔

● ہفتہ کتب خانہ کے سلسلے میں اسٹیٹ سنٹرل لائبریری نے سہ لسانی سالانہ مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ تلگو شاعر ڈاکٹر یم رام ریڈی نے صدارت اور نظامت کی۔ مسرز کنول پرشاد کنول، اوم پرکاش نرمل، خواجہ شوق، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، جہاں دلافروز، ڈاکٹر راہی، نہال سنگھ ورما، اختر واجدی، عزیز النساء صبا، آچاریہ نرو ملا اور نرسمہاواں شاستری نے کلام سنایا۔

۲۰ر نومبر: حیدرآباد لٹریری فورم کا ہفتہ واری اجلاس صدر فورم پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداً جناب غیاث متین نے راجندر سنگھ بیدی کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش کی۔ جناب وحید انور نے "بیدی صاحب" پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شعری نشست میں مہمان شاعر اعتماد صدیقی (جدہ) کے علاوہ رضا وصفی، اثر غوری، علی مجاز، ذکی بلگرامی، اقبال ہاشمی اور یعقوب یاور نے کلام سنایا۔

۲۱ر نومبر: لینن انعام پانے والے برصغیر ہندو پاک کے عظیم شاعر جناب فیض احمد فیض کی وفات پر محترمہ جیلانی بانو اور جناب نریندر لوتھر (آئی اے ایس) صدر زندہ دلان حیدرآباد کے علاوہ ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو اور ڈاکٹر حسینی شاہد معتمد انجمن ترقی پسند مصنفین نے تعزیتی بیانات کے ذریعہ فیض کو خراج عقیدت ادا کیا اور ان کی حیدرآباد سے رفاقت کو یاد کیا۔

۲۲ر نومبر: شعبۂ اردو پوسٹ گریجویٹ کالج عثمانیہ یونیورسٹی کا جلسۂ تعزیت پروفیسر سید سراج الدین کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر محمود قادری اور دیگر اصحاب نے فیض اور بیدی کی وفات پر اظہار الم کیا اور قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

۲۵ر نومبر: ریاستی انجمن ترقی اردو، اردو مجلس، اردو ہال ٹرسٹ اور مرکزی اردو کتب خانہ کی طرف سے فیض احمد فیض کو جلسۂ تعزیت میں زبردست خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ اور فیض کی خدمات کے اعتراف میں قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔ محترمہ جیلانی بانو، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، جناب عاتق شاہ اور جناب راشد آذر نے مخاطب کیا۔

● سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن جلسۂ تعزیت میں جناب فیض اور جناب بیدی کی وفات پر قرارداد تعزیت جناب صلاح الدین نیر نے پیش کی۔ جناب تراب الحسن نے صدارت کی۔

۲۶ر نومبر: ایلڈرس کونسل آف انڈیا کے زیر اہتمام فیض اور بیدی کا تعزیتی اجلاس مسٹر تقی بلگرامی کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم، جناب اختر حسن، مددگار معتمد اردو اکیڈیمی اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے فیض اور بیدی کو خراج عقیدت

The "SABRAS" Urdu Monthly
...gan of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 482. (A.